پہلی سی محبت

رخسانہ نگار عدنان

پہلی سی محبت

صبح کا تارا پوری شدت سے جگر جگر کرتے ہوئے اپنا وجود قائم رکھنے کی کوشش میں اُفق کے پار گم ہوا جا رہا تھا اور رات کی سیاہیاں صبح صادق کی سفیدیوں میں گھل گھل کر مٹ رہی تھیں۔ ایک لمبی سیاہ رات کا خوشگوار اختتام سنہری دن کی شکل میں ہونے جا رہا تھا اور ایک مسافر کی لمبی مسافت اپنے انجام بخیر کو پہنچی تھی۔

میں سامان کی ٹرالی گھسیٹتا علامہ اقبال انٹرنیشنل ایئرپورٹ کے لاؤنج سے باہر نکلا تو ایک خوشگوار صبح بانہیں پھیلائے مجھ سے معانقہ کرنے کو تیار تھی کہ فی الحال اس وقت میں سوائے اس خوشگوار صبح کے اور کسی سے معانقہ نہیں کر سکتا تھا۔ سرپرائز دینے کا ایک یہ نقصان لمبی مسافت طے کر کے آنے والے کے لئے کافی نہیں، بہت بڑا ہوتا ہے کہ سفر کے اختتام پر کوئی اپنا پُرجوش اپنائیت لئے، بانہیں پھیلائے آپ کو اپنے استقبال کو نہ ملے۔ اور اس نقصان کو میں نے خود اپنے لئے منتخب کیا تھا، سو ملال بھی کم تھا۔

اور سچی بات ہے ملال یوں بھی کم تھا کہ ایئرپورٹ کے کمپاؤنڈ سے باہر آتے ہوئے مجھے اس نقصان پر خوامخواہ نفع مل جانے کا خوشگوار سا احساس ہوا تھا۔ ایک بالکل دُھلی دُھلائی نکھری خوشگوار بھینی خوشبو والی کثافت و آلودگی سے پاک فضا سے ملنے کا سرپرائزنگ نفع بخش احساس!

ورنہ اس وقت آ کر مجھے سب اپنے لینے کے لئے آئے ہوتے تو اس وقت ان سے گلے ملنے، جپھیاں ڈالنے، ہاتھ ملانے، کیسے ہو؟ کیسے ہیں؟ کے مکرر سوال کے بیچ اس کنواری، نئی نویلی، سج دھج والی صبح سے ملنے کا کہاں موقع ملنا تھا۔

ٹیکسی پر سامان رکھوانے اور بیٹھنے تک میں پوری طرح اپنے پیارے وطن کی اس پیاری صبح کی نیم خنک، خوشبودار، اٹکھیلیاں کرتی بادِ نسیم کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا۔ یہ

دیکھے بغیر کہ ٹیکسی ڈرائیور کس رشک بھرے انداز میں مجھے دیکھ رہا ہے اور منور بھائی کی اس تاکید کے باوجود میں ذہنی طور پر بالکل الرٹ نہیں تھا کہ آج کل لاہور شہر چوریوں، ڈکیتیوں کے حوالے سے زندہ دلانِ لاہور نہیں بلکہ زندہ دلانِ چوروں کا من پسند جنگل بن چکا ہے۔

میں کھڑکی سے کسی دیہاتی کی طرح پوری گردن نکالے اپنے دیس کی بانکی البیلی صبح کی سانسوں کو اپنی سانسوں میں سمونے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کتنے عرصے بعد پاکستان آئے ہیں؟''

میری اس بچکانہ بے صبری حرکت کو دیکھتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور نے قیاس کیا ہوگا کہ میں شاید زمانوں بعد ادھر لوٹا ہوں۔

''ڈھائی سال بعد۔'' میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے ٹھنڈی معطر ہوا سے بڑا سا گھونٹ بھرا اور ذرا سا سر اندر کرتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔

ٹیکسی ڈرائیور لمحہ بھر کو حیران ہوا اور پھر ڈرائیونگ کرنے لگا۔ ابھی سفیدی پوری طرح پھیل کر روشنی میں نہ ڈھلی تھی۔ اس لئے سڑکیں بالکل صاف شفاف کسی بھی انسانی بھاگ دوڑ سے پاک، بڑے آرام سے ایک ہی کروٹ کے بل لیٹی تھیں اور ٹیکسی گویا بغیر چپو کی کشتی کے مانند ان پر تیرتی چلی جا رہی تھی۔

میں باہر کے نظاروں میں مگن تھا اور ڈرائیور جمائیاں لیتے ہوئے، مندی مندی آنکھوں سے ڈرائیونگ میں۔ دو ایک بار مجھے خیال آیا کہ اسے ٹوکوں، بھائی! ذرا دس منٹ کو اس نیند سے رخصت لے لو ورنہ مجھے اپنے گھر والوں سے ملے بغیر اس جہاں سے رخصت کرا دو گے۔ پھر سوچا، جیسے چل رہا ہے چلنے دو، وہ مجھے اکیلا تو رخصت نہیں کرائے گا، خود اپنا بھی ٹکٹ کٹوانا پڑے گا۔

ٹیکسی فراٹے سے کینٹ کی سیاہ چمکیلی سڑکیں روندتی مال روڈ کی طرف رواں تھی۔ خوب صورت سماں، خوب صورت ماحول اور پُر فضا مناظر انسان کی طبیعت پر کیسے خوشگوار اثرات مرتب کرتے ہیں کہ میں ایک لمبے سفر کی تکان تک بھول گیا۔

''اور سناؤ یار! کیسی چل رہی ہے آج کل ادھر؟'' طبیعت بشاش ہوئی تو میں نے یونہی بات کرنے کو ڈرائیور سے پوچھا۔

''آپ امریکہ سے آ رہے ہیں نا؟'' وہ مرر میں مجھے دیکھتے ہوئے، سرخ ڈوروں والی نیند سے بوجھل آنکھوں کے ساتھ تکتے ہوئے اُلٹا پوچھنے لگا۔

''ہاں، نیویارک سے۔ تو؟''

''وہاں تو ہمارے بارے میں ہم سے زیادہ خبریں ہوتی ہیں۔ اُلٹا ہمیں ان سے پوچھنا چاہئے، انکل سام! آج کل ہمارے ملک میں کیا چل رہا ہے؟ وہ زیادہ مفصل جواب دیں گے۔'' ایک معمولی ٹیکسی ڈرائیور کے منہ سے ایسی ہوش مندی کی بات کی مجھے توقع نہیں تھی۔

''اجی ہم تو وہ بدنصیب قوم ہیں، جس کا وجود تو ادھر اس ملک میں چل پھر رہا ہوتا ہے اور سانسوں کا ریموٹ واشنگٹن اور نیویارک کے قبضے میں ہوتا ہے۔ دفع کریں جی! کیا کرنا ہے اس موضوع کو صبح صبح نور کے تڑکے چھیڑ کر۔ جی جلانے والی بات۔'' اس نے کہتے کہتے ایک ہاتھ اسٹیئرنگ سے اٹھا کر ہوا میں چلایا اور زیادہ تن دہی سے گاڑی چلانے لگا۔

''مہنگائی تو ادھر آج کل زوروں پر ہے۔ تم سناؤ، تمہارا گزارا ٹھیک ٹھاک ہو جاتا ہے؟'' میرے منہ سے غیر اختیاری سا سوال نکلا اور سوال کرنے کے بعد اس کی کٹیلی نگاہوں سے مجھے احساس ہوا کہ یہ سوال تو پہلے سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور جلا کٹا ہے۔

''رب سوہنے کا احسان ہے۔ ہماری محنت کی کمائی میں وہ برکت ڈال دیتا ہے۔ چار کی جگہ دو روٹیاں کھا کر پیٹ بھرا بھرا سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ نہ بھی ہو تو خود کو محسوس کروانے کی کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ اس کا احسان ہی ہوا نا۔ ہاتھ پیر سلامت ہیں، محنت کر رہے ہیں۔ نہ چوری کرتے ہیں، نہ ڈاکہ ڈالتے ہیں، نہ ایسا کبھی کوئی شیطانی خیال دماغ میں آیا۔ سو رات کو دو تین گھنٹے ہی سہی، سکون کی میٹھی نیند سوتے ہیں۔ شکر ہے اس کا۔'' ٹیکسی ڈرائیور کا انداز عجیب بے نیازانہ سا تھا۔

''کبھی باہر جانے کا خیال نہیں آیا؟'' گاڑی اب جی پی او کی پُرشکوہ عمارت کے پہلو سے گزرتی ہوئی جین مندر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بائیں طرف ہائی کورٹ کی عمارت کی پیشانی پر بنا ترازو بے بسی سے سڑک پر گزرنے والوں کا دن بھر منہ تکا کرتا تھا۔ میں بھی بس لمحہ بھر کو اس کی طرف دیکھ سکا۔

''پہلے آتا تھا۔ اب نہیں۔'' اس نے سر جھٹک کر کہا۔

''اب کیوں نہیں؟'' میں نے قدرے دلچسپی سے پوچھا۔

''اب جو پاکستانی ساری دنیا میں ننگے ہو گئے ہیں۔ اپنی ہی حکومت نے دہشت گردوں کے نام پر پکڑ پکڑ کر معصوم لوگوں کو ان کے حوالے کر کے ان کی ہمدردیاں لینے

کے بجائے ان کی عمر بھر کی دشمنی خریدی ہے، اس کے بدلے جو سلوک پاکستانیوں کے ساتھ دوسرے ملکوں کی حدود میں داخل ہونے پر ہوتا ہے، اسے دیکھ کر تو جی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ سو بار اللہ توبہ کرتے ہیں۔ ادھر کی روکھی سوکھی وارے میں ہے۔ ہم ایسے ڈالروں اور پونڈوں سے باز آئے جن کے بدلے کپڑے اُتار کر نکڑ نکڑ پر تلاشی دینی پڑے۔ عزت آبرو کے ساتھ اپنے ملک میں سر اٹھا کر چلتے ہیں۔ کوئی انگلی اُٹھائے تو سینہ تان لیتے ہیں۔ آدمی کو جینے کے لئے ڈالروں سے زیادہ عزتِ نفس کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اللہ کا شکر ہے بہت نہ سہی، تھوڑی بہت ادھر مل ہی جاتی ہے۔ باہر کے لالچ میں اسے بھی گنوا دیں؟'' وہ مجھے ٹیکسی ڈرائیور کم، کوئی دانش ور زیادہ لگ رہا تھا۔ اس کی سچی باتوں نے مجھے چپ کرا دیا۔

سامنے چوبرجی کے چار مینار بڑی شان سے سر اٹھائے کھڑے تھے

صرف ان کے سر ہی اُٹھے تھے ورنہ کہن سالی اور خستہ حالی نے جو ان کا رنگ روپ اُڑا رکھا تھا، ذرا جو سر جھکا کر خود کو دیکھ لیتے تو شاید اپنے ہی قدموں پر ملبے کے ڈھیر کی صورت میں پڑے ہوتے۔ یوں بھی ملبے کو ملبہ بنانے میں دیر کتنی لگتی ہے۔ ان خوب صورت تاریخی میناروں کو یوں اُجڑی پجڑی بے رنگ سی حالت میں ندامت سے سر اُٹھائے دیکھ کر مجھے حقیقتاً دکھ ہوا۔ میرے بچپن کے دنوں میں ان کی ایسی خستہ حالت ہرگز نہ تھی۔ میرے بچپن کی یادوں میں ان کا خوب صورت تصور موجود تھا۔ میں اسی تصوراتی نقشے کو سوچنے لگا۔

راؤنڈ اباؤٹ کے گرد گھوم کر ٹیکسی اب راج گڑھ کی گلیوں کا رُخ کر چکی تھی۔

میرا دل زور سے دھڑکا۔ منزل اب دو گام ہی تو رہ گئی تھی۔

صبح سویرے کی سرگرمیاں ابھی پوری طرح سے متحرک نہیں ہوئی تھیں۔ دکانیں بند تھیں اور ان کے شٹر گرے دروازوں کے آگے کہیں کہیں کوئی مزدور منہ سر لپیٹے سو رہا تھا اور کہیں کوئی کتا اونگھ رہا تھا۔ بھولی بلیاں میاؤں میاؤں کرتی گلیوں کے اور دکانوں کے تھڑوں کے نیچے سے آ جا رہی تھیں۔

''بس یہاں سے دائیں طرف موڑ لو۔'' میرے گھر کی گلی آ گئی تھی۔ میں نے ذرا سا پُرجوش ہو کر سیٹ پر آگے کھسکتے ہوئے ڈرائیور سے کہا۔ اگلے لمحے گاڑی سرکتی ہوئی اس گہرے بھورے، تھوڑا رنگ اُڑے لکڑی کے دروازے کے آگے رُک گئی تھی۔

میں نے نیچے اُتر کر سامان اُتروایا۔ ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر دروازے کی بغل

میں گھنٹی کے بٹن کو دبا دیا۔

''بھاجی! یہ پچاس روپے زائد دے دیئے آپ نے۔'' ٹیکسی والا جاتے جاتے رُکا۔

''یار! ایئرپورٹ پر کوئی اپنا نہیں ملا۔ تم اپنے ملے تو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ پھر تمہارے ساتھ سفر بھی اچھا کٹا۔ بچوں کے لئے شام کو کوئی میٹھی چیز لے جانا۔ کہنا، ان کے چاچے نے بھیجی ہے۔ اور یہ بھی۔''

میرے کوٹ کی جیب میں چاکلیٹ کا بڑا پیک بند ہی پڑا تھا۔ سوچا تھا، راستے میں کھاؤں گا۔ اس کی نوبت نہیں آئی۔ وہ پیکٹ پکڑتے ہوئے متذبذب سا ہوا۔ میں نے اصرار کیا تو شکریہ ادا کرتے ہوئے ٹیکسی میں بیٹھ کر چلا گیا۔

میں ایک معمولی سے ٹیکسی ڈرائیور پر اتنا مہربان کیوں ہوا؟ مجھے خود پر حیرت سی ہوئی۔ واقعی کوئی اپنا نہ ملے تو اپنے وطن سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی شخص ملے، وہ اپنا ہی لگتا ہے۔

'بھا منور تو صبح سویرے اُٹھ کر موڑ کے تھڑے پر بیٹھ کر مسواک کرنے کے عادی ہیں۔ آج وہ بھی نظر نہیں آ رہے۔' میں نے ویران پڑی گلی کو قدرے تشویش سے دیکھا۔ اب تو اچھا خاصا دن نکل رہا تھا پھر..... میں نے تیسری بار گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

'کمال ہے، گھوڑے بیچ کر سوئے ہیں سب۔' اب کے میں خاصا جھلایا تھا۔

''کون ہے پاگل، سویرے سویرے گھنٹیاں بجائے جا رہا ہے؟'' فریدہ لڑکھڑاتی، سلیپر گھسیٹتی حسبِ عادت بدمزاجی سے بولتے ہوئے باہر نکلی تھی۔

اب اگر میں جواب میں ''میں'' کہہ دیتا تو اس نے اونچا اونچا شروع ہو جانا تھا۔

''کیا بکری کی طرح میں، میں لگا رکھی ہے؟ سیدھی طرح اپنا نام بتاؤ۔''

''بھئی دروازہ کھولو۔ حد ہو گئی۔ اتنی دیر سے بیل بجا رہا ہوں۔ مدثر ہوں میں۔'' بکری کہلوانے کے ڈر سے میں نے فوراً اپنا تعارف کرا ڈالا تھا۔

''ہائے اللہ جی!'' دروازہ تو وہ کھول ہی چکی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے منہ سے فوری طور پر یہی نکل سکا۔ بے یقین سی نظروں سے مجھے تکے جا رہی تھی۔ ''آپ..... تُسی..... توبہ، حد ہو گئی۔ اطلاع تو دیتے..... سویرے سویرے..... کوئی لینے آ جاتا۔'' خوشی سے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

''نہ سلام نہ دعا۔ ہائے اللہ جی، تُسی۔ کم دیکھا کرو پنجابی فلمیں۔''

میں اُس کی خوشی سے محظوظ ہوتے ہوئے آگے بڑھا اور ہولے سے اس کی کلائی

مروڑ دی۔ وہ ایک بار پھر ''ہائے اللہ جی'' کہہ کر تھوڑا پیچھے ہو گئی۔ اُس کی اسی کیفیت سے انجوائے کرنے کے لئے میں نے یہ سرپرائز دیا تھا۔

سامان اندر رکھ کر دروازہ بند کر کے میں اس کے پیچھے چلتے ہوئے صحن میں آ گیا۔

صحن کی شمالی دیوار کے ساتھ لگے نیم کے درخت پتے خوب ہرے بھرے ہو رہے تھے اور ان پر بیٹھی چڑیوں نے خوب شور مچا رکھا تھا۔

''تین دن پہلے تو بات ہوئی تھی۔ آپ نے ذکر ہی نہیں کیا۔ آج میرا ارادہ تھا آپ کو فون کرنے کا۔ اچانک پروگرام کیسے بن گیا؟'' وہ ابھی بھی خوشی اور حیرت کے بیچ ڈول رہی تھی۔

''بس دیکھ لو۔ تم لوگوں کی یاد آئی تو دوڑا چلا آیا۔''

میں اسی نیم کے درخت کے نیچے پڑی جھلنگا چارپائی پر ترچھا ہو کر نیم دراز سا ہو گیا۔ فریدہ محجوب سی میرے پاس بیٹھ کر نیچے جھکی اور میرے جوتے اُتارنے لگی۔

''رہنے دو، میں خود ابھی اُتار لیتا ہوں۔'' میں نے سیدھا ہونا چاہا تو اس نے دوسرا ہاتھ میرے پہلو پر رکھ دیا۔ میرے پورے بدن میں لطیف سی سنسنی دوڑ گئی۔ وہی ناسمجھ میں آنے والا سکون جو مجھے پردیس سے آنے کے بعد گھر میں داخل ہو کر فریدہ کے پہلے لمس سے محسوس ہوا کرتا تھا۔ میں نے بے اختیار آنکھیں میچ لیں۔

''بچے سو رہے ہیں ابھی تک؟'' میں نے اسی طرح بند آنکھوں کے ساتھ پوچھا۔

''ہاں، ابھی ٹائم کیا ہوا ہے؟'' وہ اب اپنے نرم ہاتھوں سے میرے پیروں کو جرابوں کی قید سے نکال رہی تھی۔ اس نے ہاتھ لگایا تو میرے پیروں نے اپنی تھکن کا برملا اظہار کر ڈالا۔ وہ ان ہی ہاتھوں سے میرے پیروں کو ہلکا ہلکا دبانے لگی۔

''بس کرو..... کیا مجھے یہیں سُلا دو گی؟ پہلے بچوں سے مل لوں۔ یہ لوگ نماز نہیں پڑھتے کیا؟'' بچوں کو دیکھنے کے خیال سے میں ایک دم اُٹھا اور کھڑا ہو گیا۔

''کسی کسی دن زبردستی کروں تو پڑھ لیتے ہیں ورنہ.....''

''آج تم نے خود بھی نہیں پڑھی ہو گی۔'' میں نے مڑ کر شکایتی لہجے میں کہا تو وہ کھل کر مسکرا دی اور زور زور سے بچوں کو پکارنے لگی۔

''گڈو کے پیپرز شروع ہو گئے؟''

''نہیں۔ اگلے ہفتے پہلا پرچہ ہے۔ رات کو دیر تک پڑھتا رہتا ہے، اس لئے صبح دیر سے اُٹھتا ہے۔''

بچے میری آمد کا سنتے ہی ہڑبڑا کر اُٹھ چکے تھے اور اب دائیں بائیں، آگے پیچھے سے مجھ سے لپٹے جا رہے تھے۔

''میری گڑیا اتنی بڑی ہو گئی۔'' میں واقعی صدف کو دیکھ کر حیران سا رہ گیا تھا۔ ڈھائی سال پہلے جب میں آیا تھا تو وہ میری کمر تک آتی تھی اور جب ایسے گڈو کے برابر ہوئی جا رہی تھی۔ اور ٹیپو بھی ان کے ساتھ کھڑا ان کے برابر کا لگ رہا تھا۔ صرف نوال ابھی بھی کچھ کم سن سی تھی۔

''بیٹیاں تو اسی طرح بڑی ہوتی ہیں۔ ابھی دیکھو تو گڑیا سے کھیلتی اور ابھی دیکھو تو.....'' فریدہ نے ماؤں کے روایتی فکرمند لہجے میں کہا اور میں ہنس پڑا۔

''اور میں اپنی گڑیا کے لئے ابھی بھی باربی ڈول ہی لایا ہوں۔'' وہ مجھے گڑیا سے کھیلنے کے لئے خاصی بڑی لگ رہی تھی۔

''اور ابو! میرے لئے؟'' ٹیپو فوراً اپنا چہرہ میرے سامنے کرتے ہوئے بولا تو میں نے بے اختیار جیسے اپنے ہی عکس کی پیشانی پر لب رکھ دیئے۔ ٹیپو تو بالکل مجھ جیسا لگ رہا تھا۔

''سب کے لئے سب کچھ لائے ہوں گے ابو۔ پہلے انہیں سانس تو لینے دو۔ ناشتہ بناؤں آپ کے لئے یا بازار سے منگواؤں؟'' فریدہ محبت بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ اس نے کیسا گھسا ہوا، ملگجا سا لان کا سوٹ پہن رکھا تھا، عجیب جوگیا سے رنگ کا۔ اور بال جیسے کتنے دنوں سے بنائے ہی نہیں۔ پھر بھی مجھے اس پر پیار آ رہا تھا۔ ان ہی صورتوں کو تو اس برفیلے علاقے میں، سفید سفید برف جیسی پتھریلی صورتوں کو تکتے ہوئے ترس جایا کرتا تھا۔

''ابھی تھوڑی دیر آرام کروں گا۔ پھر بھانور اور منظور کو بھی بلا لو۔ ابھی تو وہ گھر پہ ہوں گے۔ پھر کاموں پر نکل جائیں گے تو رات سے پہلے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔''

میرے دونوں بھائیوں کے گھر بھی اسی گلی میں تھے اور میرا دل اپنے ماں جائیوں کو دیکھنے کے لئے بھی اتنا ہی بے چین تھا جتنا فریدہ اور بچوں کو دیکھنے کے لئے۔

''مل لیجئے گا۔ ابھی منڈلی کی منڈلی اُٹھ کر آ جائے گی۔ پھر تو آپ کے پاس ہمارے لئے گھڑیاں بھی نہیں ہوں گی۔ وہ دونوں دیر سے ہی جاتے ہیں۔ آپ ناشتہ کر لیں، پھر بلوا لوں گی۔''

فریدہ ایک دم سے چہرہ سخت کرتے ہوئے، کوفت بھرے لہجے میں بولی۔ اسے یقیناً

ان تین سوٹ کیسوں کو پچھلے کمرے میں رکھوانے کی جلدی ہو گی کہ دونوں بھائیوں اور ان کی بیویوں، بچوں کی ان پر نظر نہ پڑ جائے۔ اس معاملے میں فریدہ کسی سے بھی رعایت نہیں برتتی تھی کہ میری حق حلال اور خون پسینے کی کمائی پر وہ خالصتاً اپنا اور اپنے بچوں کا حق سمجھتی تھی۔ اپنے دونوں بھائیوں اور ان کی بیویوں سے بھی ''مالِ غنیمت'' کو چھپایا کرتی تھی۔ یہ اس کی بچوں سی خواہش تھی تو میں اس کی خوشی میں کیوں رخنہ ڈالتا؟ یوں بھی اتنے سالوں بعد تو ہم ملتے تھے۔ میں تو ایک پل کے لئے بھی اس کی خفگی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ میرا ہی حال نہیں تھا، فریدہ بھی میری دل جوئی میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتی تھی۔ یہی سوچتا سوچتا میں غنودگی میں چلا گیا۔

❖❖○❖❖

سارا دن گہما گہمی میں گزرا۔ ایک تو میری آمد بنا اطلاع تھی، دوسرے بھا منور کی افشاں کی شادی ان دنوں طے کرنے کا سوچا جا رہا تھا۔ میری آمد نے بھا منور کے جوش کو بڑھا دیا۔

''بس بھئی، شادی کی تاریخ اسی مہینے کے آخیر تک رکھ لو۔ مہینہ تو اپنا مدثر ادھر ہی ہے۔'' لحیم شحیم سے بھا منور نے مجھے اپنی بغل میں لیتے ہوئے خوب اونچی آواز میں کہا۔

''ارے نہیں بھا! میں تو.....'' اُن کی بغل کی گرفت میں میری پسلیاں تو کیا جھنجھنائیں، سانسیں بھی گڈمڈ ہو کر باہر نکلنے سے انکاری ہو گئیں۔

''میں تو کیا؟..... کتنے دنوں کے لئے آیا ہے؟'' انہوں نے جھٹکے سے مجھے اپنی بغل سے پرے کیا۔

''صرف ایک ہفتے کے لئے۔''

بھا منور اور دوسرے تو شاید مجھے بعد میں گھورتے، برآمدے سے گزرتی فریدہ نے یہ سنتے ہی سامنے سے گزرتی گڑیا کی کمر میں زور سے دھپ لگا دی۔

''پڑھو مرو اندر جا کر۔ سارا دن ادھر تو میلہ لگا رہے گا۔ تم بھی دانت نکالتی، ڈیلے پھاڑتی اِدھر ٹکی رہو گی۔''

فریدہ کی آواز اور الفاظ دونوں ہی ایسے کاٹ دار تھے کہ صحن میں بیٹھی قہقہے لگاتی محفل کی ہنسی یک لخت تھم گئی۔

''چلو بھئی۔ کچھ دیر مدثر کو بھی آرام کر لینے دو۔ شام کو گپ شپ ہو گی۔ زبیدہ کو فون کر دیا تُو نے مدثر؟'' بھا منور سب سے سیانے تھے۔ اگلے کا چہرہ دیکھ کر اس کے

ارادے بھانپ لیا کرتے تھے، انہوں نے اُٹھتے ہوئے محفل برخاست کر دی۔

''ابھی کر دوں گا۔ ویسے میرا خیال تھا، میں کل یا پرسوں جا کر خود ہی مل آتا۔ پانچ چھ دن تو میں ہوں ادھر۔''

میں نے تھوڑا شرمندہ سے لہجے میں کہا۔ فریدہ کبھی کبھی حد ہی کر دیتی تھی۔ میں کون سا روز یوں بھائیوں کی منڈلی سجا کر بیٹھا کرتا تھا۔ سالوں بعد تو یہ موقع ملتا تھا، وہ بھی نصیبوں کی بات۔ مجھے غصے کے ساتھ رنج سا بھی ہوا۔

''اوہو! ادھر ہی بلا لیتے ہیں۔ قصور کون سا دور ہے۔ بلکہ بہن بھائی ذرا دو گھڑی بیٹھ جائیں گے۔ اب تو وہ بھی مہینوں نہیں آتی۔ شکیلہ تو چلو پردیس میں ہوئی۔ تم رہنے دو، میں جا کر اسے فون کر دیتا ہوں۔'' بھا منور بات ختم کرتے ہوئے اپنے بیٹے اور دونوں بیٹیوں کو آگے لگائے باہر نکل گئے۔ بھرجائی پہلے ہی جا چکی تھی۔

فریدہ اب کچن میں برتن کھڑکانے میں لگی ہوئی تھی۔ ان کھڑکتے برتنوں کا صاف مطلب مجھے اندر بلانا تھا۔ تھوڑا نخرا، تھوڑی اُلفت جتانی..... پر نہ جانے کیوں، اس گھڑی میرے دل میں جیسے اُداسی لہر لہر اُتر کر اپنی تہیں جمانے لگی تھی۔

اسی ویہڑے میں بے بے اور اباجی کبھی اس چارپائی پر بیٹھ کر ہم تینوں بھائیوں اور دونوں بہنوں کو اونچی اونچی آوازوں میں بلایا کرتے تھے۔ اوپر والی منزل پر چاچا بشیر، ان کے چار بچے اور بیوی رہتی تھی۔ ابے سے تین سال چھوٹا تھا چاچا بشیر۔ زمانے بھر کا نکھٹو اور ناکارہ۔ سارا دن اوپر والی منزل پر برتن کھڑکتے یا تکا فضیحتی رہتی تھی۔ تیسری منزل پر ابے کا چاچا شریف اپنی بیوہ بیٹی اور اس کے تین بچوں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ یعنی اس ساڑھے تین مرلے کے گھر میں اٹھارہ افراد رہا کرتے تھے۔ اور اوپر چوبارے میں بے بے کا نشئی بھائی ماموں طفیل، فالتو کاٹھ کباڑ کے ساتھ دن رات منہ کھول کر ہاتھ پیر چھوڑے سویا رہتا تھا۔

ہمارے گھر کے دو کمرے، یہ مٹی کا صحن اور برآمدے میں کھلا باورچی خانہ خاندان کے اچھے گھروں میں شمار ہوتا تھا۔ اپنے بھائی کے برعکس ابا مکینک تھے۔ اپنی کوئی باقاعدہ دکان تو نہیں تھی، پر سارے علاقے کو معلوم تھا، یہ سراج دین بجلی کا بڑا اچھا مکینک ہے۔ اس وقت چونکہ بجلی کے اتنے آلات نہیں تھے۔ موٹریں اِکا دُکا بلکہ نہ ہونے کے برابر لگی تھیں۔ محلوں میں سرکاری پانی کی فراوانی تھی، سو ابا کی کمائی تو زیادہ نہ ہوتی مگر پھر بھی ہمارا گزارا اچھا ہی ہو جاتا۔ محلے میں ہونے والی ایک آدھ شادی میں بتیاں لگانے کا

کام مل جاتا تو چند دن کام کے بغیر بھی اچھے گزر جاتے۔

ہم سب ابا اور ابے کی کمائی کو ''یونہی'' سمجھا کرتے تھے۔ بے بے تو اکثر طعنے بھی دیا کرتی تھی۔

''جا، جا کر دیکھ! لوگوں نے گھروں میں کیا ریل پیل لگا رکھی ہے۔ اوپر تیرا بھائی بشیر..... موسم کی پہلی سبزی، پہلا پھل خواہ کتنا مہنگا کیوں نہ ہو، اس کے گھر آتا ہے۔ اور ہم، جب وہ پھل سبزی موسم کے درمیان میں ٹکے ٹکے سیر بک رہا ہوتا ہے، تب نصیب ہوتا ہے۔ تُو ہمارے لئے کرتا کیا ہے؟ منورے کو پنج کرا کے اُٹھا لیا۔ یہ مدثر اور منظور رو رو کر پانچویں کر لیں تو انہیں بھی گھر بٹھا کر مکینکی سکھا دینا، نہیں تو منورے کی طرح بیٹھے منجیاں توڑا کریں گے۔ کوئی چار دن ہم بھی اچھے دیکھ لیں۔''

یہ شاید بے بے کا ناشکرا پن تھا کہ چار دن اچھے آتے، اللہ نے ناراض ہو کر ان گئے گزرے موافق دنوں کو بھی ہمارے بیچ سے اٹھا لیا۔

میں نویں میں تھا اور منظور ساتویں میں۔ بھا منور نے چاچا بشیر کی اُلفت سے خوب اُلفت بڑھانے کے بعد گھر میں تڑیاں دھمکیاں لگا کر ابے اور بے بے کو شادی پر راضی کر لیا تھا۔ اگرچہ ابھی تک بھا منور نے کام کے نام پر کبھی تنکا دہرا نہیں کیا تھا۔ چاچا بشیر کے ''اچھا، سوچتے ہیں۔'' کا جواب سن کر ابے نے بھا منور کو کسی دکان میں نوکر رکھوا دیا۔

پہلی تنخواہ آئی تو بقول اماں کے ''شریکوں کے منہ بند ہو گئے۔'' اور چاچے بشیر کو بغلیں جھانکتے ہوئے ہاں کرتے ہی بنی۔

اُلفت اوپری منزل سے نیچے آ گئی اور ہمارا گھر جو پہلے ہی سکڑ سکڑ کر دو کمروں میں گزارا کر رہا تھا، ایک کمرے میں آ گیا۔ ابا اور بے بے مستقل برآمدے میں منتقل ہو گئے۔ ان ہی دنوں ابا نے اپنے رشتے کی بہن کے گھر زبیدہ کا رشتہ طے کر دیا۔ تاریخ رکھی تھی کہ ایک گھر میں موٹر ٹھیک کرتے ہوئے ابے کو جو بجلی کا جھٹکا لگا، اس کا دوسرا سانس نہ نکلا اور ہمارے گھر سے وہ گئے گزرے دن بھی اُٹھ گئے۔

زبیدہ کی شادی میں گھر کے بس دو چار بھانڈے بکنے سے رہ گئے اور جو قرض چڑھا، وہ علیحدہ۔ ابے کی جدائی، معاشی ابتری اور گھر میں بڑھتی ہوئی اُلفت کی زور آوری نے بے بے کو مستقل چارپائی پر ڈال دیا۔ میں دسویں بھی مکمل نہ کر سکا اور منظور نے ساتویں بھی نہ کی۔

مجھے شروع سے ابے کے کام سے دلچسپی تھی اور میں بچپن سے اکثر ساتھ ہی جایا

کرتا تھا۔ فیوز لگانا، پنکھا لٹکانا، بلب، ٹیوب لائٹ، موٹر فٹ کرنا، شادی بیاہ میں بتیاں لگانے کے لئے کنکشن کی تاریں کہاں جوڑنا ہیں، سب ابے کے سکھائے بغیر ہی سیکھ گیا تھا اور پتہ بھی نہیں چلا، کب لوگ سراج دین کے دروازے پر آ کر مدثر کی آوازیں لگانے لگے اور میں اپنا ٹول بکس وہ پیچ کسوں، ٹیسٹر اور دوسرے اوزاروں کا تھیلا اُٹھا کر ان کے ساتھ نکل پڑتا۔

بھا منور کی ہڈ حرامی نے انہیں دو چار ماہ سے زیادہ پہلی نوکری پر ٹکنے نہیں دیا۔ وہ چار مہینے کام کرتا اور آٹھ مہینے گھر بیٹھ کر ماں اور بیوی کے معرکوں میں کبھی ایک فریق کا حامی بن کر جوتے طعنے کھاتا تو کبھی دوسرے کی لاتیں۔ اب گھر کی ساری ذمہ داری خود بخود میرے کندھوں پر آ گئی تھی۔

فریدہ، مامے صدیق کی تیسرے نمبر والی بیٹی تھی۔ اس سے پہلے دو بھائی اور بعد میں ایک بہن تھی۔ وہ خود کیسی تھی، مجھے اس کا احساس ان ہی دنوں ہوا، جب وہ بہانے بہانے سے مامی کے ساتھ بن ٹھن کر بے بے کی خیریت پوچھنے اور اُلفت بھابی سے ہونے والے معرکوں کی تفصیل جاننے کے لئے آیا کرتی تھی۔ سوکھی چوہیا جیسی چوٹی کو اپنے بالوں سے دُگنے بھاری پراندے میں لپیٹے۔ فریدہ میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ پر اُس کی غلافی موٹی موٹی آنکھیں اُس کے سوکھے ہڈیوں کے اُبھار والے رخساروں اور بڑے سے دہانے کے سارے عیب کو انوکھے سے پُرسوز حُسن میں بدل دیتی تھیں۔ ان آنکھوں نے مجھے ان دنوں ڈسٹرب کرنا شروع کر دیا، جب مجھے عشق محبت کے معنی معلوم تھے نہ ان کو پالنے کا وقت..... پھر بھی قدرت نے جیسے میرے معصوم جذبۂ شوق کو بھانپتے ہوئے فریدہ کو ہنگامی بنیادوں پر میرا نصیب بنانے کا فیصلہ لکھ ڈالا۔

بے بے کو ایک رات دل کا دورہ پڑا۔ دورہ تو معمولی تھا، پر اس کے نفسیاتی اثرات بڑے سنگین تھے۔

اور نامعلوم، میرا بے بے پر کیا بھار تھا کہ اس نے اگلے دو دنوں میں اس جان لیوا دورے سے سنبھلتے ہی شاموں شام بھائی کی منت ترلے کر کے میرا اور فریدہ کا نکاح پڑھوا دیا۔ منظور اور اُلفت کو بے بے کے ساتھ وہ دوسرا کمرہ چھوڑ کر برآمدے میں اپنے بستر لگانے پڑ گئے۔

فریدہ سے میں نے بہت توقعات نہیں باندھی تھیں اور نہ وہ مجھے کوئی سیدھی سادی لگتی تھی، جو آتے ہی اُلفت بھابی کی طراریوں کے آگے ہتھیار ڈال دے گی۔ میں دل

ہی دل میں گھر میں برپا ہونے والی نئی جنگوں کے لئے خود کو تیار کر چکا تھا۔ مگر میرے خیالات کے بالکل برعکس فریدہ بہت محنت کرنے، خیال رکھنے والی اور تھوڑی کم گو نکلی۔ اپنے طبقے کی دوسری لڑکیوں سے خاصی مختلف۔ یہ مجھے خاصی خوشگوار سی حیرت ہوئی اور بے بے اسے سراسر میری خوش قسمتی گردانتی تھیں۔

اور میں جس دورے کو معمولی جان رہا تھا، وہ میری شادی کے تیسرے مہینے بے بے کی جان لے گیا اور برآمدے میں شکیلہ اور منظور کی چارپائیاں رہ گئیں۔

برآمدے کے اس سُونے منظر کو یاد کرتے میری آنکھوں میں نمی اُتر آئی۔ میں آنکھیں مسل رہا تھا جب فریدہ کھسڑ پھسڑ کرتی، ناراض چہرہ لئے میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''چھ دنوں کے لئے آنے کی بھلا کیا ضرورت تھی جہاں ڈھائی سال سے دل پر جدائی کا پتھر رکھے بیٹھی تھی، وہاں کچھ اور مہینے سہہ لیتی۔ ڈھائی سالوں بعد مہینے کی چھٹی بہت زیادہ لگی تھی کیا؟''

وہ ناراض ناراض لہجے میں شکوہ کرتے ہوئے مجھے اس لمحے کتنی اپنی اپنی سی لگی تھی، بالکل اوّلین دنوں جیسی۔ جب مجھے رات کو کسی تقریب میں کام کی وجہ سے دیر ہو جاتی تو وہ بے چین سی برآمدے اور صحن میں بہانے بہانے سے چکراتی رہتی۔

''میں وہاں ملازم ہوں میری جان! کوئی اپنا بزنس نہیں کہ اپنی مرضی سے جب چاہوں، مہینے کی چھٹی لے کر آ جاؤں۔ مجبوری ہے۔'' میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے نرمی سے کہا۔

''اور نیا شوشا سنا ہے آپ نے، یہ جو آپ کے بھائی بیٹھے خوش گپیاں بگھار رہے تھے، یونہی بے سبب نہ تھیں۔'' وہ ایسی متعصب تو کبھی نہ رہی تھی۔ میں نے کچھ غور سے فریدہ کو دیکھا۔

''آپ آئے ہیں تو پلاٹ کا کام شروع کروا کے جائیں۔'' وہ چند لمحے میرے استفسار کا انتظار کرنے کے بعد بولی۔

''اتنے دن تو نہیں ہوں میں ادھر۔'' میں نے ذرا افسردگی سے کہا۔

''آپ کے بھائی صاحب، منور بھائے نے سارے خاندان میں پھیلا دیا ہے کہ مدثر اپنا یہ والا گھر مجھے دے جائے گا۔ اس کی تو گلبرگ میں کوٹھی تیار ہو رہی ہے، اُس نے اس کھنڈر کا کیا کرنا ہے؟ خریدنا اس ملبے کو کسی نے ہے نہیں۔ میرے بچے جوان ہیں۔ کب تک کرائے پر لے کر دھکے کھاتا رہوں۔ اس بار مدثر آئے گا تو اپنے نام پر گھر

کروا لوں گا۔'' فریدہ چبا چبا کر بول رہی تھی۔ اُس کی بات سن کر لمحہ بھر کو میں بھی چپ سا رہ گیا۔

میرے پردیس کی مشقت بھرے تکلیف دہ ابتدائی سالوں کی کمائی تو اس گھر، جسے فریدہ بھی کھنڈر اور چڑیا گھر کے نام کے سوا بلاتی نہیں تھی، کو اپنے نام کرانے میں لگ گئی۔ چاچا بشیر کو موٹی رقم دے کر ان کا حصہ دیا، پھر ابّے کے چاچا شریف اور اس کی بیوہ بیٹی کو لاکھوں دے کر نکالا اور ماما طفیل، اُس کا نشہ پانی تو ابھی تک میرے بھیجے ہوئے روپوں سے چلتا تھا۔

''اتنے سالوں کی محنت کی کمائی جو اس کھنڈر کو اپنے نام کرانے پر برباد کی، وہی ہم اپنا حصہ لے کر کہیں کرائے پر یا ایک کمرے کا گھر لے کر رہ لیتے تو آج لوگوں کی حریص نظریں نہ ہماری طرف لگی ہوتیں۔'' فریدہ اسی تپے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تمہارے اور بچوں کے اکیلے رہنے کا خیال تھا۔ یہ گھر، گلیاں، علاقے، سمجھو اپنے ہی تو ہیں سب۔ پھر تمہارے بھائیوں کے گھر بھی پاس۔ میرے بعد تم اکیلی کہیں اور کیسے رہ سکتی تھیں؟''

یہ اکلوتی دلیل تھی، جس کے ذریعے میں ہر بار فریدہ کو یہیں رہنے پر مجبور کیا کرتا تھا۔ اب سوچتا ہوں، غلط کرتا تھا۔ کیا فائدہ ہوا لاکھوں ڈبونے کا۔ اب اگر بھا منور نے یہ مشہور کر دیا ہے تو لامحالہ مجھے یہ کرنا پڑے گا۔ اس وقت خاندان بھر میں ان سے گیا گزرا اور لمبے چوڑے کنبے والا کوئی اور نہیں تھا۔ میں یہ گھر بیچ کر چار پیسے وصول کر لوں گا تو سارا خاندان تھو تھو کرے گا۔ بھا منور کے چار بیٹے تھے اور چاروں باپ کی طرح نکھٹو، کام چور۔ چار بیٹیاں کوٹھے جتنی اونچی لمبی۔ سب شادی کے لئے تیار! فریدہ کا غصہ بے جا نہیں تھا۔

''اچھا چلو، پکایا کیا ہے؟ بھوک لگی ہے۔ یہ بچے کدھر ہیں؟'' میں نے فی الحال اس بوجھل موضوع سے دماغ ہٹانے کے لئے اُٹھتے ہوئے کہا اور اندر چل دیا۔

''ہاں۔ میرے کہنے کی پروا نہ کرنا۔ سب لُٹا دو ان طفیلیوں پر۔ اُن کی نہ تو نیت بھرتی ہے، نہ بھوک مٹتی ہے۔ خود کولہو کے بیل بنے رہو اور ان کے ہاتھ پھیلتے رہیں۔ پہلی بار انکار کیا ہوتا تو آج منہ پھاڑ پھاڑ کر حق نہ جتا رہے ہوتے۔ حصہ بھی وصول لیا۔ اکڑ کر جیبیں بھر کر نکلے اور اب پھر دعوے دار بن کر آ گئے۔ سارے خسارے کیا ہمارے لئے ہیں؟ جدائی میں اور بچے جھیلیں اور میٹھا میٹھا یہ ہپ ہپ کھاتے جائیں۔ مطلبی،

موقع پرست۔ ایسے ہوتے ہیں بھائی۔"

فریدہ کی بڑبڑاہٹ کھانے کے دوران اور کھانے کے بعد بھی جاری رہی۔

میں کھانے کے بعد لیٹا بچوں سے باتیں کر رہا تھا۔ اب فریدہ کچن سے فارغ ہو کر آتی تو ان سوٹ کیسوں کو کھولنے کی مہم سر کی جاتی۔ فریدہ تو نہ آئی، اس کی دونوں بھابیاں اور بھائی آ گئے۔ پھر ان کے ساتھ باتیں کرتے، چائے پیتے شام ہو گئی۔ ان کے آنے سے فریدہ کا موڈ بھی قدرے بہتر ہو گیا۔ مگر شام ڈھلے بھا منور اور منظور پھر سے آ گئے تو اس کے چہرے کا تناؤ پہلی حالت میں چلا گیا تو میں دونوں کے ساتھ باہر نکل گیا، محلے کے پرانے یار دوستوں اور ابا کے دوستوں سے ملنے، سلام دعا کے بہانے۔

اور باہر جا کر سب سے ملنے کے دوران واقعی میرے دل پر چھائی اُداسی کی لہر کہیں کم ہوتی چلی گئی۔ جب رات گئے میں گھر لوٹا تو صاف ستھرے گھر کے ساتھ فریدہ بھی خوب بنی سنوری ہوئی تھی۔ فالسئی کلر کے سوٹ پر شاید کوئی کڑھائی تھی یا مقیش، میں تمیز نہیں کر سکا۔ جو بھی تھا، اس کے قدرے صحت مند جسم پر خوب اُٹھ رہا تھا۔ کندھوں تک کٹے بال تازہ شیمپو کئے ہوئے تھے اور ہلکے میک اپ کے ساتھ تیز کلر کی لپ اسٹک اُسے پُرکشش بنا رہی تھی اور دن بھر کے مقابلے میں اُس کے حلیے کی طرح اُس کا مزاج بھی شگفتہ ہو رہا تھا۔

اُس نے کھانے میں بھی اپنے ہاتھ اور سلیقے کی تمام تر کوشش کو مجتمع کیا تھا۔ مٹن بریانی مجھے پہلے بھی اس کے ہاتھ کی پسند تھی۔ آج تو اس کا ذائقہ اور خوشبو دونوں لاجواب تھے اور میٹھے میں فرنی دونوں میری پسند کی چیزیں تھیں۔ احتیاط کرتے ہوئے بھی میں بہت زیادہ کھا گیا۔

اس نے بچوں کو جلدی سونے کے لئے بھیج دیا۔ یوں بھی بچوں کو اپنے تحائف مل چکے تھے اور وہ زیادہ وقت اپنی چیزوں کے ساتھ گزارنا چاہتے تھے۔ ابھی رشتہ داروں کو دینے والے تحائف کی بندر بانٹ باقی تھی اور یہ تکلیف دہ مرحلہ صبح ہی طے ہونا تھا۔

"اتنا عرصہ کیسے میرے بغیر گزارا کرتے ہو؟"

اور یہی وہ مرحلہ ہوتا تھا، جب بھی میں واپس آ کر اُس کی قربت کا طلب گار ہوتا، وہ بھڑک اُٹھتی۔ پھر شکوک و شبہات، سوالوں اور مفروضوں اور میری دلیلوں، قسموں، وعدوں، ارادوں کی طویل فہرست ہوتی جو میں اُس کے حضور پیش کرتے کرتے تھک جاتا۔ اگرچہ انجام کار وہ ایک مشرقی بیوی کی طرح شوہر کی رضا و خوشی کی خاطر سرینڈر تو

کر دیتی، مگر میرے دل میں بال سا آ جاتا کہ اسے میرا یقین کیوں نہیں۔ کس طرح پردیس میں پھر اس دیس میں کہ جہاں قدم قدم پر ترغیبات یوں سرِ راہ آدمی کا راستہ کاٹتی ہیں جیسے کوئی نشانِ راہ۔ اور میں کیسے کیسے ان ترغیبات سے نگاہیں چرا کر راستہ بدلتا ہوں، یہ میں جانتا ہوں یا میرا اللہ۔

"مرد ہو کر کیسے اتنے پاک باز رہ سکتے ہو؟ وہ بھی اس شہر میں جہاں قدم قدم پر راستہ روکنے والی ہوں گی۔"

وہ سرینڈر کرتے کرتے بھی طعنہ مار جاتی اور میرے پاس دلیلیں کم پڑنے لگتیں۔

میں جانتا ہوں کہ میں اپنی قسموں میں کتنا سچا ہوں اور اس کے ساتھ بندھے ہوئے تعلق میں کتنا کھرا۔ پھر بھی اسے یقین نہیں آتا تو اس مقام پر آ کر میرا دل چاہتا، میں اسے لات مار کر سارے شکوک قبولتے ہوئے ہمیشہ کے لئے اسے چھوڑ کر دفع ہو جاؤں اور اس سے صرف ڈالرز کے ٹرانسفر کا تعلق رکھوں۔ اور سارے تعلق توڑ ڈالوں۔

مگر اس کے باوجود میں ایک کمزور شوہر تھا کہ کسی بھی صورت اپنی بیوی سے نہ تو بے وفائی کر سکتا تھا، نہ اپنی تذلیل پر قطع تعلق۔

وہ اب میرے پہلو میں مطمئن سو رہی تھی اور میں کُڑھ رہا تھا۔

❖❖○❖❖

اگلی صبح کافی لے دے کے بعد فریدہ سب کو وہی تحائف دینے پر راضی ہو ہی گئی جو میں سب کے لئے لایا تھا۔

"ابھی راشد بھائی آئیں گے۔ جا کر پلاٹ پر ہو آئیے اور ٹھیکے دار سے مل کر سارا نقشہ اور خرچ سمجھ لیجئے۔ اب میرے سارے بھائیوں نے تو سارے ٹھیکے نہیں لے رکھے۔ پلاٹ بھی خرید کر دیا۔ اب اس کی تعمیر کے لئے بھی وہی بھاگ دوڑ کریں۔"

میں بھی کچھ حیران تھا، فریدہ نے کل سے بھائی کے کارنامے کو جتایا نہیں۔ اور میں بھی جتاتا جتاتا رہ گیا کہ تمہارے بھائی نے جو پلاٹ کی رقم سے کٹوتیاں کر کے اسی علاقے میں اپنا پلاٹ خریدا ہے۔ کیا ایک کرائے کی وڈیو شاپ سے گلبرگ کے پوش ایریا میں سات مرلے کا پلاٹ لینا ممکن ہے اس کے لئے؟ لیکن میری شوہرانہ وفاداری پھر آڑے آ گئی۔

"اچھا چلوں گا۔ لیکن تعمیر کے لئے یکمشت اتنی بڑی رقم نکالنا مشکل ہو گی۔ تم سے کہا تھا، دس بارہ مرلے کا پلاٹ لے لو۔ مگر تم نے تو کنال کا لفظ منہ سے نکالا اور پورا کر

کے چھوڑا۔ اب اس کنال پر گھر بنانا آسان کام ہے؟" میں چپ رہنے کا سوچ کر بھی کہہ گیا۔

"ہاں تو ساری زندگی اس چڑیا گھر میں گزاری ہے، آثارِ قدیمہ کے کھنڈر میں کہ برسات ہو یا گرمیوں کی آندھیاں، دل ڈرتا ہی رہتا ہے کہ یہ ملبہ ہمارے اوپر آ کر ابھی ہمارا مقبرہ بنائے کہ بنائے۔ اب اگر اتنی دشواریوں کے بعد اللہ نے موقع دیا تو بندہ اتنا گھر تو لے کہ کھل کر سانس آ سکے۔ ساری زندگی تو سہم سہم کر گزار دی۔ ایک خوشی تم میری پوری نہیں کر سکتے، بہن بھائی کے منہ سے نکلا ہر غلط سلط لفظ بھی تمہارے لئے حدیث....."

وہ حسبِ توقع نان اسٹاپ بولتی چلی گئی۔ میرے سیل فون کی بیپ بج رہی تھی۔ میں جان چھڑا کر اُٹھ گیا۔

"جی جی، حاجی صاحب! خیریت سے پہنچ گیا۔ جی اللہ کا شکر ہے..... جی اچھا۔ اچھا جی نکل جاتا ہوں..... جی میں بس ابھی روانہ ہوتا ہوں..... گاڑی..... تو نہیں ہے۔ چلیں، کرلوں گا۔ بس میں ابھی گھنٹے بھر میں روانہ ہوتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں..... جی جی، ٹکٹ تو میری بھی کنفرم ہے واپسی کی..... منگل کو..... ٹھیک ہے، جو آپ کا حکم..... میں پہنچتے ہی آپ کو خبر کرتا ہوں، آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ بہتر کرے گا..... اللہ حافظ۔"

میرے بولنے کے دوران ہی فریدہ اُٹھ کر میرے پاس چلی آئی۔

"کہاں، کدھر نکل رہے ہیں ابھی؟" وہ بہت سارا غصہ دبا کر پوچھ رہی تھی۔

"میں ذرا گوجرانوالہ جا رہا ہوں۔ شام تک آ جاؤں گا۔ تم کھانا اچھا سا پکا لینا۔ اور یہ سامنے بچوں والا کمرہ تیار کر دینا۔ حاجی صاحب کی بیٹی اور بیوی آئیں گی میرے ساتھ۔ وہ یہاں کسی فوتگی پر آئی تھیں۔ ان کی واپسی میرے ساتھ ہی ہے، منگل والے دن۔ کل ہفتہ ہے۔ چار دن وہ ادھر ہی رہیں گی۔ ان کی مدارات میں کوئی کسر نہیں رہنا چاہئے۔ پتہ ہے نا تمہیں؟"

میں اس سے جلدی جلدی کہتے ہوئے الماری کی طرف اپنے کپڑے لینے کے لئے بڑھ گیا۔ وہ کچھ حیران، کچھ پریشان اور کچھ غصے میں لب بھینچے وہیں کھڑی رہی۔

اب وہ حیران ہو یا غصے میں طوفان اٹھائے، مجھے اس وقت اس چیز کی پروا نہیں تھی۔ آخر میری روزی کا معاملہ تھا، اس پر کوئی کمپرومائز نہیں ہو سکتا تھا۔

اس کے بڑبڑانے، بولنے، خفا ہونے کی پروا کئے بغیر میں گھنٹہ بھر میں تیار ہو کر باہر نکل گیا۔

رینٹ اے کار سے ایک گاڑی چار دنوں کے لئے رینٹ پر لی اور پیٹرول پانی بھروا کر گوجرانوالہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

❖❖○❖❖

بے بے کے بعد شکیلہ کی شادی، منظور کے روزگار اور شادی کا مسئلہ خود بخود میرے ذمے لگ گیا۔

بھا منور کو تو ان دنوں ایک ہی کام تھا۔ بچے پیدا کرنا اور بیوی کی حمایت میں سب سے لڑائیاں کرنا۔

میں نے مکینکی کا کام پارٹ ٹائم کرتے ہوئے ایک وڈیو شاپ پر نوکری کر لی، جہاں ان دنوں زیادہ تر شادیوں پر مووِیز بنانا، وی سی آر اور وڈیو کیسٹیں کرائے پر دینا شامل تھا۔ دو دو نوکریوں کے باوجود بھی گزارہ بہت مشکل سے ہو رہا تھا۔

اوپر تلے تین بچوں کی پیدائش نے میرے اپنے گھریلو اخراجات میں بے تحاشا اضافہ کر دیا تھا۔ پھر بہن بھائی کی ذمہ داری۔ منظور بھی بڑے بھائی کی دیکھا دیکھی کوئی کام ٹِک کر، سنجیدگی سے نہ کرتا تھا۔

یوں بھی ہمارے خاندان میں مردوں کی ہڈ حرامی ضرب المثل تھی۔ انہیں کام کرنا دوبھر لگتا۔

ان دنوں جب میری تنگ دستی عروج پر تھی، پارٹ ٹائم بہت دنوں سے کوئی کام نہیں ملا تھا جب حاجی جمال الدین اپنے بھائی کی شادی کی مووی بنوانے ہماری دکان کی خدمات لینے آئے۔ وہیں سے میں حاجی صاحب سے متعارف ہوا۔ وہ کئی سالوں سے امریکہ میں تھے اور ایک چھوٹے سے گروسری اسٹور کے مالک بھی بن چکے تھے۔ انہوں نے مجھے امریکہ جانے کو کہا تو پہلی بار مجھے بہت عجیب لگا یہ سن کر۔ اپنا گھر بار، ملک، شہر چھوڑ کر چلا جاؤں، ناممکن۔ فریدہ سے بات کی۔ وہ بھی نہ راضی ہوئی۔ اسے بھی میری رفاقت میں روکھی سوکھی گوارا تھی، مگر جدائی نہیں۔

حاجی صاحب مجھے اپنا کارڈ دے کر چلے گئے اور میں بھول بھال بھی گیا۔ حالات دن بہ دن دگرگوں ہوتے چلے گئے۔ گزارہ تو دُور کی بات، اب تو سر پر قرض ہی اتنا چڑھ گیا تھا کہ اتارنے کے لئے بھی الگ سے سرمائے کی ضرورت تھی۔

ان ہی دنوں ہمارے محلے کے ایک لڑکے نے کسی ایجنٹ کے ذریعے سمندری راستے سے امریکہ جانے کا پروگرام بنایا تو میں بھی سوچنے لگا۔ پھر بہت سارے دن اور بہت ساری راتیں ہم دونوں میاں بیوی نے سوچتے ہوئے بالآخر ''جدائی'' کا بھاری پتھر اپنے سینوں پر رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔

ایجنٹ کو دینے کے لئے نئے سرے سے قرض لیا گیا اور سب کی دعاؤں کے سائے میں، میں پردیس کے لئے روانہ ہوگیا۔ ان دنوں امریکہ کیا، کسی بھی یورپی ملک میں جانا اتنا جان جوکھوں کا کام نہیں تھا۔ اچھی رقم دے کر بندہ قانونی طریقے سے جا سکتا تھا۔

میں اور شکیل نیویارک ہی پہنچے مگر ہمارے پاس نہ تو قانونی ویزا تھا، نہ رہائش، نہ روزگار..... چوری چھپے اسی ایجنٹ کے بتائے ہوئے بندوں کے پیچھے مارے مارے پھرتے۔ بھوکے پیاسے، پولیس سے چھپتے۔

وہ چند مہینے میری زندگی کے تلخ ترین مہینے تھے۔ دو تین بار گھر خط لکھا۔ جواباً فریدہ نے رو رو کر لکھا کہ آپ کسی طرح واپس آجائیں۔ ہمیں کچھ نہیں چاہئے۔ ہم ادھر بھوکوں گزارہ کرلیں گے، آپ آجائیں۔''

میں کشمکش میں پڑ گیا کہ شکیل پکڑا گیا۔ میں اس کے ساتھ نہیں تھا، اس لئے بچ گیا۔ مگر کب تک؟

پردیس کا ہراس کم نہیں تھا کہ پکڑے جانے کا خوف۔ میں گڑگڑا کر سجدے میں گرتا، اللہ سے نیک وسیلے کی دعا کرتا۔

شاید اسی دعا کا نتیجہ تھا کہ اچانک مجھے حاجی جمال دین مل گئے۔ انہوں نے میرے ان برے دنوں کے کانٹے یوں چن لئے جیسے کوئی دوا کسی درد کے مارے مریض کا درد چنتی ہے۔

وہ دن اور آج کا دن۔ حاجی صاحب کے احسانات کا پلڑا اونچا ہی ہوتا چلا گیا۔ اب انہوں نے اگر مجھے یہ معمولی سا کام کہا تو کیا میں نہ کرتا؟ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

میں دوپہر تک گوجرانوالہ کے اس نواحی گاؤں میں پہنچ گیا اور شام سے پہلے ان دونوں خواتین کو لے کر واپس روانہ ہوگیا۔ حاجی صاحب کی بیگم کی بہن فوت ہوگئی تھیں، جس کے پُرسے کے لئے وہ پاکستان آئی تھیں۔

''میرا تو سیل فون راستے میں کہیں بیگ سے گر گیا تھا۔ جبکہ زہرہ کا کسی نے چپکے سے نکال لیا۔ فون کے لئے ادھر گاؤں کے اکلوتے پی سی او پر جانا پڑتا۔ سوچا تھا، شام کو

جا کر فون کر کے حاجی صاحب کو بتا دوں گی کہ ہم خیریت سے ہیں۔'' حاجی صاحب کی بیگم نے رابطہ نہ کرنے کی وجہ بتائی۔

دونوں خواتین اس گرم موسم میں بھی عبایا پہنے ہوئے اور اسکارف لئے ہوئے تھیں۔ میرا ان دونوں سے احترام کا رشتہ تھا کہ آج تک میرا ان دونوں ماں بیٹی سے سامنا ہو بھی جاتا تو کبھی نظر نہیں ملی تھی۔ میری شرافت اور حاجی صاحب کے احسانات مجھے نگاہ اُٹھانے ہی نہ دیتے۔

''ابھی تک ان علاقوں کی وہی حالت ہے جو آج سے تیس چالیس سال پہلے تھی۔ دیکھ کر دل دُکھتا رہا ہے۔ غربت، جہالت اور سہولتوں کی کمی۔ جیسے کوئی ان لوگوں کا والی وارث ہی نہیں۔'' بیگم جمال دین دُکھ بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ ''اور یہ غربت اور انتہا درجے کی مفلسی ہی تو ہے جو اچھے بھلے، شریف، بھلے مانس لوگوں کو عیاری اور دھوکا دہی پر اُکساتی ہے۔ ہم کسی کو کیا الزام دیں۔''

آخر میں وہ ایک آہ سی بھر کر چپ ہوگئیں تو میں نے نادانستگی میں زہرہ جمال کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ وہ گاڑی کے بند شیشوں سے باہر دھول اُڑاتی، کوڑے کرکٹ اور گند سے اٹی سڑکوں اور راستوں کو پلک جھپکے بغیر دیکھ رہی تھی۔

''ہم گناہگار ہوتے اپنے اللہ کے بھی، اپنی بیٹی کے بھی اور اس نعیم کی بیوی اور دو بچوں کے بھی... ہمارا آنا کام کر گیا۔'' بیگم جمال بولیں تو میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''نعیم کی بیوی اور بچے؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں۔ اور فقط اپنے پیر جمانے کی خاطر اس نے اپنی بیوی، اس کے گھر والوں اور اپنے گھر والوں کو سختی سے تاکید کر دی کہ کوئی تحقیق کرنے آئے تو کہہ دینا، نعیم تو اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہے۔ اللہ میری توبہ..... پیسے کے لئے یہ لوگ کیسے کیسے مقدس رشتوں کو داغ دار کر ڈالتے ہیں۔ میں نے سب سن کر اپنے لب ہی سیئے رکھے۔ جھگڑتے بھی تو کس سے؟ پہلے ہماری بچی کے ساتھ دھوکا ہوا، اُلٹا ہم نے ہرجانہ ادا کیا۔ اب اگر یہ نعیم.....''

''پلیز امی جان! چینج دا ٹاپک۔'' زہرہ جمال کی فراخ پیشانی پر بڑا نمایاں بل آیا تھا اور لہجے میں کچھ چٹخا تھا کہ بیگم جمال نے لب بھینچ لئے۔

زہرہ کی پہلی شادی بھی حاجی صاحب کے کسی رشتہ دار سے ادھر نیویارک میں ہی ہوئی تھی، جسے انہوں نے سیٹل ہونے کے لئے اپنے پاس رکھا تھا۔ زہرہ سے شادی

کرتے ہی اس نے آنکھیں پھیر لیں۔ سب کچھ فی الفور اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتا تھا۔ جب زہرہ نے اس کے گھٹیا مطالبات والدین کے سامنے پیش کرنے سے انکار کر دیا تو وہ انسان سے شیطان بن گیا۔ ایسے ایسے تشدد اس پر کرتا رہا کہ حاجی صاحب کی بیان کرتے ہوئے داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی۔

انہوں نے لاکھوں روپے اس لالچی گِدھ کو دے کر اپنی بیٹی کی جان چھڑائی۔ اور اب یہ نعیم۔ یہ بیگم جمال کے رشتہ داروں میں سے تھا۔ پڑھا لکھا۔ حاجی صاحب نے ہی بلوا کر نوکری دلوائی کہ خود منہ سے زہرہ کا رشتہ مانگ بیٹھا۔ وہ پہلے سے ڈرے ہوئے تھے۔ سو بیگم جمال کی بہن کی موت بہانہ بنی۔ انہوں نے دونوں کو نعیم سے بالا ہی پاکستان ایک ہفتے کے لئے بھجوا دیا اور اگلے روز گھبرا کر مجھے بھی روانہ کر دیا کہ کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔ اور مسئلہ ہو ہی گیا۔ نعیم بھی دہرے چہرے والا نکلا۔ اوپر سے مہذب اور معصوم، اندر سے لالچ، حرص طمع کا مارا ہوا۔

'بے چاری زہرہ جمال۔' گھر کی گلی مڑتے ہوئے میں نے ایک تاسف بھری نگاہ زہرہ کے سادہ سے چہرے پر ڈالی اور گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

❖❖○❖❖

''اب میں سمجھی، تم کیسے وہاں اتنے ''صبر'' سے بیٹھے رہتے ہو، ڈھائی ڈھائی تین تین سال مڑ کر نہیں دیکھتے۔ مرد ہو کر ایسی برداشت۔ تبھی تو میرا دل یقین نہیں کرتا۔ مدثر میاں! تم تو چھپے رستم نکلے۔ ارے جب ہر گھڑی ایسا معصوم فتنہ صورت کے سامنے ہو تو کس کافر کو بیوی جیسی مدقوق چیز یاد آئے گی۔ بس آج مجھے صاف صاف بتاؤ، میں کون ہوں؟ کہاں ہوں؟ اور یہ کون ہے؟ اور تمہارے دل میں کہاں ہے؟ کہاں تک ہے؟''

میرے فرشتوں کو بھی گمان نہیں تھا کہ فریدہ ایسا ہنگامہ کرے گی۔ اگرچہ یہ ہنگامہ رات گئے بند کمرے میں برپا تھا۔ مگر یہ کمرہ کوئی دنیا کے آخری کنارے پر تو تھا نہیں، اسی کمرے میں اس کی دیوار جڑی تھی، جس میں بیگم جمال دین اور زہرہ جمال سو رہی تھیں اور فریدہ کی پھٹے بانس جیسی آواز۔ میری گھر کی، منت، واسطے سب بے کار..... وہ تو بپھری ہوئی شیرنی بنی ہوئی تھی۔

''کیا..... کیا ہاتھ آیا مجھ بدنصیب کے..... دیکھو..... دیکھو اس جدائی نے میری کیا حالت کر ڈالی۔ لوگ ملتے ہی پوچھتے ہیں، فریدہ! کوئی بیماری تو نہیں لگ گئی تجھے؟ اور میں نصیبوں جلی کیا بتاؤں انہیں، مجھے دچھوڑے کا ساڑ لگا ہے۔ اپنے ہی شوہر کو اپنے

ہاتھوں خود سے دور کر کے کیا ہاتھ آیا میرے۔ میرا بدروح بنتا جسم اسی کھنڈر میں پڑا گل سڑ رہا ہے اور وہ..... وہ ڈالر کمانے کے بہانے وہاں عیش کر رہا ہے۔ اسے تو کوئی بیماری، کوئی روگ نہیں لگا۔ بھلا چنگا مجھ سے دونا (دوگنا) پُرشباب اور میں..... میں کیا ہو گئی۔ آج راز ہاتھ لگا تمہارے اس اطمینان کا۔ دلاسوں اور جھوٹی قسموں کا۔''

وہ اب رونا شروع ہو چکی تھی۔

''خدا کا واسطہ ہے فریدہ! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اللہ، رسول کی قسم کھاتا ہوں۔ تمہارے سر کی قسم.....''

میں لجاجت سے دھیمی آواز میں کہتے ہوئے اس کے سر کی طرف ہاتھ بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ وہ بدک کر یوں پرے ہوئی جیسے میں کوئی اچھوت ہوں۔

''مر جاؤں گی کچھ کھا کر، اگر تم نے مجھے ہاتھ بھی لگایا، جب تک ثابت نہیں کرو گے، اس سونے کی کان سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔'' وہ منہ زور بنی ہوئی تھی۔

''کیسے..... کیسے ثابت کروں؟'' میں بے بسی کی انتہا پر تھا۔

اور تنگ آ کر میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر صحن میں ٹہلتا رہا، پھر شکستہ قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گیا۔ اوپر شاید چودھویں کا چاند تھا۔ ہر طرف دودھیا چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ خستہ حال اینٹوں کی منڈیروں والی چھوٹی سی چھت، جہاں پتنگیں اُڑاتے، لوٹتے میرے بچپن کی دوپہریں اور سہ پہریں گزری تھیں، اس وقت کیسے اجنبی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

ٹہلتے ٹہلتے تھک کر میں سیمنٹ کے بنے ٹوٹے پھوٹے شہ نشین پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر فریدہ کے اشتعال پر غور کرتے جلتے کوستے سوچتا رہا، پھر کب وہیں لڑھک کر میری آنکھ لگ گئی، مجھے پتہ بھی نہیں چلا۔

صبح سورج کی تیز کرنوں نے مجھے جھنجوڑ کر اٹھایا تو تھوڑی دیر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں ادھر کیسے آیا۔ پھر رات کا سارا منظر یاد آتے ہی میں تیزی سے نیچے زینے کی طرف لپکا۔ وہ بے وقوف عورت نہ جانے ان دونوں سے کیا بک بیٹھے اور..... اس سے آگے میں کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

نیچے مکمل خاموشی تھی۔ دونوں کمروں کے دروازے بند تھے۔

میں نے شکر کا کلمہ پڑھا اور صحن میں بنے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔

❖❖○❖❖

پھر باقی کے چار دن فریدہ کا موڈ اسی طرح سیخ پر چڑھے کباب کی طرح جلا بھنا ہی رہا۔ اس کے مزاج کی یہ کیفیت دیکھ کر میں نے بھی اسے دوبارہ نہیں چھیڑا۔ پتہ نہیں بیگم جمال اور زہرہ کیا سمجھیں، کیا نہیں۔

بہرحال، اگلے دن وہ اپنے عزیزوں سے ملنے چلی گئیں اور تیسرے دن ہی واپس آئیں جب اگلی صبح ہماری روانگی تھی۔

میں نے ان دنوں میں پلاٹ کا نقشہ دیکھ کر پسند کر لیا تھا۔ گھر کی بنیادوں کا کافی کام میرے سامنے ہی ہو گیا۔

''جتنے پیسے بینک میں ہیں، اس سے بمشکل دیواریں کھڑی ہوں گی۔ باقی کے لئے کیا کریں گے؟'' یہ واحد گفتگو تھی جو فریدہ نے ان تین دنوں کی ناراضی کے دوران ذرا آرام سے کی تھی۔

''دیکھتا ہوں جا کر۔'' میں شکستگی سے بولا۔ حقیقتاً مجھے اس کے رویے نے بہت دُکھ دیا تھا۔ وہ مجھے اتنا گرا ہوا سمجھتی ہے، اس کا مجھے علم نہیں تھا۔

بیگم جمال اور زہرہ نے اسے سونے کے سیٹ کا تحفہ دیا تھا، جسے اس نے بڑی نخوت سے احسان کر کے لیا تھا۔ بعد میں، میں نے اسے اشاروں کنایوں میں سمجھایا کہ اسے بھی جاتے ہوئے انہیں کچھ تحائف دینے چاہئیں، مگر وہ اَن سنا کر کے پھرتی رہی۔ آخری شام میں خود ہی انارکلی جا کر ان دونوں کے لئے کپڑے پیک کروا کے لے آیا اور فریدہ کے اِدھر اُدھر ہوتے ہی بیگم جمال کو فریدہ کی طرف سے کہہ کر دے دیئے۔ اس لمحے زہرہ کے چہرے پر کیسی ذومعنی مسکراہٹ تھی کہ میں خوامخواہ شرمندہ سا ہو گیا۔

اور یہ میری بدقسمتی کہ فریدہ کو ان تحائف کا علم ہو گیا۔ شاید چھوٹی گڑیا نے بتایا ہو۔ اُس کے اندر جیسے کوئی منہ زور آتش فشاں کھولنے لگا۔

''اب تم جا رہے ہو تو بہتر ہے، وہاں سے کوئی فیصلہ مجھے لکھ بھیجو۔ میں تمہاری جدائی تو سہہ سکتی ہوں پر اپنے سہاگ میں دوئی برداشت نہیں کر سکتی۔ دوسری عورت خواہ کسی بھی تعلق سے تمہارے نزدیک ہو، میں مر کر بھی گوارا نہیں کر سکتی۔''

اور یہ بھی میری بدقسمتی تھی کہ میں نے فریدہ کو بتا رکھا تھا کہ حاجی صاحب کی بیٹی پہلی شادی کے بدترین تجربے کے بعد اسٹور کے آفس میں آ کر بیٹھنے لگی ہے اور میں اس کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتا ہوں۔ اس نے میری بات کو یونہی لیا تھا کہ حاجی صاحب کی بیٹی کوئی عمر رسیدہ، معمولی شکل کی یونہی سی عورت ہو گی یا شاید آنکھ اوجھل پہاڑ

اوجھل والا معاملہ تھا۔ اور اب زہرہ کو دیکھ کر تو وہ جیسے پاگل ہی ہو گئی تھی۔ شاید تصوراتی طور پر اس نے میرے اور زہرہ کے بیچ کوئی بہت ہی قریبی تعلق بھی بنا لیا تھا اور میں اس خیال پر ہی لاحول پڑھتا رہتا۔

صد شکر کہ ہماری روانگی کا وقت آ گیا۔

فریدہ کی ناراضی اور غصے میں ذرا سا بھی فرق نہیں آیا۔ مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا، وہ یوں دیوانوں کی طرح مجھے چاہتی ہے کہ مجھے تصور میں بھی کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی۔ اُس کے غصے پر مجھے غصہ بھی آ رہا تھا اور پیار بھی۔

'اب جا کر حاجی صاحب سے کہوں گا، مجھے ایک مہینے کی چھٹی دیں۔ میں اپنے گھر کا کام مکمل کروانا چاہتا ہوں اور اپنی اتنی محبت کرنے والی بیوی کے سارے گلے شکوے دور کرنا چاہتا ہوں۔'

میں ایئرپورٹ روانہ ہونے سے پہلے دل میں ارادہ باندھ رہا تھا اور مجھے نہیں پتہ تھا کہ ایک ارادہ قدرت بھی باندھ رہی تھی۔

❖❖○❖❖

''میری زندگی اب شاید چھ مہینے ہے یا سال بھر۔ ڈاکٹرز کا یہی کہنا ہے کہ پیٹ کا کینسر میرے سارے وجود میں پنجے گاڑ چکا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، اگر میرے اللہ نے میری بیٹی کو یونہی تشنہ لب رکھنا تھا تو مجھے تھوڑی مہلت ہی زیادہ دے دیتا۔ سال دو سال۔ میں کیا کروں مدثر! میرے پاس وقت بہت کم ہے۔''

حاجی صاحب ہماری آمد کے تیسرے دن میرے اپارٹمنٹ پر تشریف لائے تھے اور اسی طرح بھیگی داڑھی کے ساتھ کہہ رہے تھے۔ اور میں تو یہ انکشاف سن کر ہی بھونچکا رہ گیا تھا۔

''یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں حاجی صاحب! اللہ آپ کو سلامت.....'' میں نے سنبھل کر کہنا چاہا۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا۔

''آج تمہارے سامنے جھولی پھیلا کر آیا ہوں۔ میری بیٹی جیسی بھی ہے، تمہاری نظروں کے سامنے ہے۔ شرع کسی بھی مسلمان کو چار شادیوں کی اجازت دیتی ہے اگر وہ کفالت کر سکے۔ میرا سارا بزنس، گھر سب زہرہ کا ہے۔ تم..... تم اسے اپنا تحفظ دے دو۔ میں قبر میں لیٹا بھی تمہارے لئے دعا کرتا رہوں گا۔ میرا مان رکھ لو مدثر! میرا بیٹا بن کر مجھے اس اذیت ناک موت سے بچا لو۔ اپنی بیٹی کو یوں اس شہر بے اماں میں چھوڑ کر

میں آرام سے مر بھی نہیں سکوں گا۔"

وہ ہچکیوں سے رو رہے تھے اور میں گنگ بیٹھا تھا۔

"حاجی صاحب! پلیز، حوصلہ کریں۔ اللہ مسبب الاسباب ہے۔ آپ جانتے ہیں، میں شادی شدہ ہوں اور میرے جوان ہوتے بچے..... اللہ کوئی نہ کوئی راستہ....."

"اللہ کے آگے گڑگڑاتا رہا ہوں، وسیلہ مانگتا رہا ہوں، اب اُسی کا واسطہ دے کر تمہارے آگے گڑگڑاتا ہوں۔ مجھ پر رحم کرو مدثر! مجھ مرتے ہوئے بوڑھے پر....." وہ جھک کر میرے قدموں پر ڈھیر ہونے کو تھے کہ میں نے لپک کر انہیں اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

"حاجی صاحب! مجھے گناہ گار نہ کریں، پلیز۔ میں سوچتا ہوں۔ آپ کو سوچ کر جواب دوں گا۔ پلیز حوصلہ کریں۔ خود کو سنبھالیں۔" میں انہیں سنبھالتے ہوئے خود بکھر رہا تھا۔

یہ تقدیر نے مجھے کس موڑ پر لا کھڑا کیا تھا۔

اگر حاجی صاحب کے احسانات کو دیکھتے ہوئے، ان کے بسترِ مرگ پر پڑے وجود کا خیال کر کے زہرہ سے شادی کی ہامی بھرتا ہوں تو فریدہ کے شکوک کو یقین میں بدل دوں گا۔ اور اگر حاجی صاحب کو انکار کر کے اپنی محبت کو سرخرو کرنا چاہتا ہوں تو روزی، روزگار سے جاؤں گا۔ اوہ میرے خدایا! یہ کیسا مشکل فیصلہ تھا۔

دو راتیں جاگنے اور دن رات سگریٹ پھونکنے کے باوجود بھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

'یہ شہر اسی وقت تک آپ کا ہے، جب تک آپ کی جیب ڈالرں سے بھری رہتی ہے۔ سر پر اپنی چھت ہو تو پھر کوئی بے اماں نہیں ہوتا۔ زہرہ جمال کی جیب ہی ڈالروں سے نہیں بھری بلکہ اس کے سر پر اپنی چھت بھی ہے۔ جبکہ فریدہ اور میرے بچے تو اس خستہ حال کھنڈر میں بے اماں پڑے ہیں۔ اگر اس برسات میں زوروں کی بارشیں ہوئیں تو کہیں میرے دامن میں عمر بھر کے پچھتاوے نہ رہ جائیں۔ نہیں نہیں..... ہرگز نہیں۔ میں فریدہ سے، اپنی بیوی سے بے وفائی نہیں کر سکتا..... بالکل نہیں۔'

دوسری رات کے آخری پہر فیصلہ ہو گیا اور میں نے بیگ نکال کر اپنی پیکنگ شروع کر دی اور حاجی صاحب کو بتائے بغیر دو دن بعد سیٹ ملتے ہی پاکستان کے لئے روانہ ہو گیا۔ اور مجھے خوشی تھی اس بات کی کہ یہ میرا پردیس سے اپنے گھر کی طرف حتمی سفر

ہے۔ اب میرے اور میری بیوی اور بچوں کے بیچ کوئی سفر، کوئی دُوری نہیں آئے گی۔ اسی سرشاری نے ایک بار پھر مجھے محوِ پرواز ہونے کی طاقت دی تھی۔ کچھ دیر کے لئے میں حاجی صاحب کی بے بسی اور ان کے آنسو بھی بھول گیا۔

اور زہرہ جمال تو میرے خیالوں میں کہیں تھی ہی نہیں!

❖❖○❖❖

"پلاٹ اور یہ گھر بیچ کر ہم کوئی چھوٹا سا، مناسب گھر لے لیں گے اور جو سیونگ اکاؤنٹ میں تین لاکھ روپے ہیں، ان سے میں کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا کام شروع کر دوں گا تو کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔"

میں بے حد مطمئن، پُرسکون سا ایک بار پھر فریدہ کے پہلو سے لگا ہوا اسے اپنی پلاننگ سے آگاہ کر رہا تھا۔ میرا دل اور دماغ اتنے ہلکے پھلکے تھے، جیسے ان پر کوئی وزن ہی نہیں۔

"اور وہ میرے شان دار گھر کے خواب..." مجھے لگا، فریدہ کی آنکھوں میں اس ٹوٹتے خواب کی کرچیاں بڑے زور سے چبھی ہیں۔

"کچھ عرصہ انتظار کر لو۔ تھوڑا سیٹ ہوتے ہی ہم....."

"خدا کے لئے۔" وہ ایک دم سے پھٹ پڑی۔ "کتنی لمبی عمر نظر آتی ہے تمہیں میری؟ کیا لاٹھی ٹیکتی آنکھوں میں بس سائے دیکھنے کی چمک لئے اپنے خواب کی تعبیر دیکھوں گی؟ پچھلے گیارہ سالوں سے تم مجھے اپنے عالیشان محل جیسے خواب سے بہلا رہے ہو اور اب پھر خالی ہاتھ، خالی دامن لئے چلے آئے ہو، نئے خوابوں کے بہلاوے لے کر۔"

وہ کس زاویے سے بول رہی تھی، لمحہ بھر کو میں بالکل سمجھ نہیں سکا۔

"اور وہ جو تین لاکھ کا راگ الاپ رہے ہو، خود ہی تم نے کہا تھا، اس میں سے راشد بھائی کو اپنے گھر کی تعمیر کے لئے دو لاکھ روپے دے دو۔ جب ہم بنانا شروع کریں گے تو لے لیں گے اور انہوں نے تو ابھی گھر بنانا شروع ہی کیا ہے، وہ کہاں سے لوٹائیں گے؟ باقی ایک لاکھ سے کیا کرو گے، ذرا بتاؤ۔ یہاں ایک ڈیڑھ مرلے کا ایک کمرے کا گھر پندرہ لاکھ میں مل رہا ہے اور یہ کھنڈر جسے تم جاتے ہوئے اپنے بڑے بھائی جان کے نام کرنے کا وعدہ کر چکے ہو، وہ کیا تمہیں کرنے دیں گے؟"

وہ بول رہی تھی کہ چیخ رہی تھی۔ گیلی لکڑی کی طرح اس میں سے چنگاریاں اور دھواں نکل رہے تھے اور میں ٹکر ٹکر آنکھوں میں چبھتے دھوئیں کی پروا کئے بغیر اُسے دیکھے

جا رہا تھا۔

''اور..... اور بچے..... ان کو جو پچھلے سال مہنگے ترین اسکولوں میں داخل کرایا ہے، دو چار سالوں میں کالجوں میں اور پھر ان کی شادیاں..... ساری عمر تو کما کما کر بہن بھائیوں میں لٹاتے رہے ہو۔ اب اپنے بچوں کا ٹائم آیا تو کفایت شعاری، قناعت اور روکھی سوکھی کے سارے درس یاد آ گئے۔'' وہ ایک کے بعد ایک آئینہ تڑاتڑ توڑے جا رہی تھی اور میں کسی بت کی طرح بے حس بیٹھا تھا۔

میری مسلسل چپ پر اس نے آخری حربے کے طور پر پھپک پھپک کر رونا شروع کر دیا۔

وہ روئے جا رہی تھی اور میں..... میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اسے دلاسا دوں تو کن الفاظ میں..... اسے اس وقت لفظوں، کھوکھلے لفظوں اور غیر مرئی خوابوں کی ضرورت نہیں تھی۔

پھر کس چیز کی ضرورت تھی؟ میں نے خالی الذہنی سے اس کے بھیگے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

'تو..... تو کیا کروں؟' میری آواز کسی گہرے اندھے کنوئیں سے آئی تھی۔ آئی بھی تھی یا میرا وہم تھا۔

''تم..... تم..... واپس چلے جاؤ۔'' اس نے میرا واہمہ سن لیا تھا۔

''واپس؟'' میرے لب بہ دقت ہلے۔

''ہاں۔ تم پہلی بار اپنی مرضی سے گئے تھے۔ اپنی خوشی سے۔ اس بار ہمارے لئے، اپنے بچوں کے لئے۔''

اس نے پہلی بار جانے کو بھی میری خوشی قرار دے دیا۔ عورت بہت سارے تاوان، ذمہ داریوں کی صورت مرد کے کندھوں پر رکھ دیا کرتی ہے۔

''اور..... واپس جانے کی قیمت..... معلوم ہے تمہیں؟'' میں نے تلخی سے اسے دیکھا۔ ہماری گفتگو اسی مقام پر آ کر تھم گئی، جہاں سے چلی تھی۔

لمحے ہم دونوں کے بیچ سائیں سائیں کرتے سرکنے لگے۔

''تم جا کر زہرہ جمال سے شادی کر لو..... میں..... میں تمہیں خود..... خوشی سے اجازت دیتی ہوں۔''

مجھے اُمید تھی، یہ بم پھوڑتے ہوئے وہ دھاڑیں مار کر روئے گی۔ مگر اُس کا چہرہ

سپاٹ تھا۔ آنسوؤں سے تھوڑا گیلا، تھوڑا خشک مگر بالکل سپاٹ۔

''تم زہرہ جمال سے شادی کر لو۔'' اس نے یوں کہا تھا، جیسے کہہ رہی ہو، تم دوسرے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔

''اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ نہ بتانا اپنے قبیلے کنبے کو..... اور بتا بھی دو تو انہیں پروا نہیں ہونی چاہئے۔ جب مجھے پروا نہیں ہو تو..... ہیں۔''

اس نے ذرا دلبر سے انداز میں کہتے ہوئے انگلی سے میرے رخسار کو چھوا۔

میرا سر جھک گیا۔

''ابھی یہاں کسی کو پتہ نہیں کہ تم آئے ہو۔ اور تمہارے حاجی صاحب کو بھی شاید نہ علم ہو۔ اور اگر ہو بھی تو کوئی مضبوط بہانہ..... کہ بیوی..... مرتے مرتے بچی..... اس کا پتہ کرنے گیا تھا۔ یا کہہ دینا، وہ مر گئی..... مر گئی۔'' اُس نے بے تاثر سے لہجے میں کہا۔

کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی، پھر اُٹھ کر باہر نکل گئی۔

❖❖○❖❖

عورت کیا چیز ہے؟ اور مرد کا مقدر..... کیا ہے مرد کا مقدر؟ ساری زندگی عورت کی خوشی، اس کی رضا کے لئے بھینٹ چڑھتا رہے اور پھر بھی..... بے وفا، ہرجائی ہی کہلاتا رہے۔ یہ کیسا مقدر ہے مرد کا..... سارے فیصلے..... ظالمانہ کٹھور فیصلے عورت کرے، پھر بھی وہی مظلوم کہلائے۔ مرد ظالم، جابر..... جیسے جیسے..... سب سنیں گے تو مجھ پر سو بار لعنتیں بھیجیں گے کہ وفادار بیوی کو لات مار کر دوسری عورت کو دولت کی ہوس میں اپنا لیا۔ مجھ سے بڑا ظالم کون ہو گا اور فریدہ سے بڑھ کر مظلوم کون؟

میں یہ سب کچھ جانتا تھا۔ فریدہ کے فیصلے کے آگے سر جھکانے کے باوجود سمجھتا تھا کہ میں خود پر کیا ظلم ڈھانے جا رہا ہوں۔ ساری دنیا کی ملامت سہنے جا رہا ہوں اور اس ظالمانہ فیصلے کی ڈوری جس کے ہاتھ میں ہے، وہ سب کی نظروں میں مظلوم ہو گی۔ بے چاری..... بے بس..... اور پھر بھی..... پھر بھی میں نے اس کے فیصلے پر عمل کیا۔ کھوٹ اُس کی محبت میں تھا یا میرے ارادے میں؟ میری قسمیں بودی تھیں یا فریدہ کی محبت کمزور..... یا ان دونوں سے بھی بڑی کوئی حقیقت ہے اس کرۂ ارض کی، اس دور کی سب سے بڑی حقیقت! عاشق کی پہچان، محبوبہ کی محبت، بے لچک ارادے اور سچی محبت سے طاقت ور..... دولت کی حقیقت۔ ڈالر کی طاقت۔ جس کے آگے فریدہ کی محبت سرنگوں ہو کر رہ گئی اور میری قسمیں، وعدے، ارادے سب..... سب مٹی کا ڈھیر ہو گئے۔

میں جتنا سوچتا ہوں، اتنا اُلجھتا ہوں۔

ان تین ریشمی دھاگوں کی ڈور اُلجھتی جا رہی ہے اور میرے ہاتھ، میرا دماغ ان تین ریشمی اُلجھنوں کو سلجھاتے سلجھاتے لہو ہو رہا ہے۔

محبت، یقین اور دولت.....

ان میں سے کس کی ڈور سب سے مضبوط اور غالب ہے.....وہ حقیقت، جس کو مان کر میں اپنی بیوی، اپنے شہر، اپنے گھر اور گلیوں کو غیر معینہ مدت کے لئے الوداع کہہ آیا ہوں، آخر اس غیر متزلزل حقیقت کو میرا دل کیوں نہیں مان رہا؟ شاید محبت اور یقین کی کوئی بجھی ہوئی چنگاری سلگ رہی ہے، بجھ جائے گی۔ دولت کے ڈھیر کے نیچے دب کر وہ بھی بجھ جائے گی۔

میں نے تھک کر اپنا سر جہاز کی سیٹ سے ٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

❖❖○❖❖

باقی کیا رہ جائے گا

شادمان میں جی او آر سے آگے دائیں بائیں طرف جو سڑک مڑتی ہے، اس پر کافی آگے جا کر بائیں ہاتھ مڑیں تو جس پہلی خوب صورت چیز پر جا کر نگاہیں ٹھہر جاتی ہیں، وہ ''السید دِلا'' ہے۔ اور اگر دیکھنے والے نے سوات میں سفید محل بھی دیکھا ہو تو اسے ایک لمحے کو شبہ گزرے گا کہ شاید یہ خوب صورت محل نما کوٹھی سوات کی حسین و دلفریب وادی سے کوئی جن ہاتھوں پر اٹھا کر لے آیا ہے اور اس نے اسے شادمان کی پُرسکون اور خاموش فضاؤں میں اس سڑک کے کارنر پر بڑی شان سے ایستادہ کر دیا ہے۔

سنگ مرمر سے تراشا ہوا یہ شاہکار جس کا بھی خواب ہو گا، اس خواب کو دیکھنے والی آنکھیں اور تراشنے والا ذہن کس قدر خوب صورت ہو گا۔ یہ وہ پہلی سوچ ہو سکتی تھی، جو اس عجوبۂ روزگار کو دیکھنے والے کے ذہن میں اُبھرتی سفید سنگ مرمر سے بنا یہ زمینی جنت کا ٹکرا بارانِ رحمت کے بعد جب دھل کر نکھرتا تھا تو ایسا لگتا تھا جیسے کوئی خوب صورت بطخ یا کبوتری اپنا انڈا رکھ کر بھول گئی ہو۔ دھلی دھلائی، نکھری نکھری، سفید دودھیا دھوپ جیسا۔ اور اس باؤنڈری وال سے لپٹی دور تک جاتی بوگن ویلیا کی بیل اس کے معطر حسن کو نظر بد سے بچانے کی سعی کرتی نظر آتی تھی۔

جو کوئی اس حسین عمارت کو ایک نظر دیکھ لیتا تھا، پھر اس لین میں بنے خوب صورت گھروں میں سے کوئی بھی گھر اس کی نظروں میں جچتا نہیں تھا۔ سفید پینٹ شدہ لوہے کے کشادہ و مضبوط گیٹ سے آگے سیاہ بجری کی سڑک تھی، پورچ تک جاتی تھی اور اس کے آگے دونوں اطراف بنے خوب صورت چھوٹے چھوٹے دو لان تھے جن میں سلیقے سے اُگائی گئی گھاس آنکھوں کو سکون بخشتی تھی۔ پورچ میں ایک ہی گاڑی کی گنجائش تھی اور وہ بھی سفید مرسڈیز۔ وہی وہاں ہمہ وقت نظر آتی تھی۔ کافی عرصہ سے گاڑی والا

مہمان وہاں آ کر قیام کرتا نظر نہیں آیا تھا۔ پورچ کے ساتھ ملحقہ سفید گول ستونوں والا چھوٹا سا برآمدہ جہاں کین کا فرنیچر پڑا تھا۔ برآمدے میں ہی بنیادی عمارت کے رہائشی کمروں میں سے تین کے دروازے کھلتے تھے۔ برآمدے کی اونچی چھت پلاسٹر آف پیرس کے خوب صورت ڈیزائن سے بنائی گئی تھی۔ اندرونی عمارت میں گھر کے مکین رہتے تھے۔ اس عمارت کے پیچھے بھی خاصا وسیع رقبہ تھا، جہاں فرنٹ کی طرح خوب صورت گھاس نہیں اُگائی گئی تھی۔ چھ سات بکھرے بکھرے سے درخت ایک دوسرے سے ناراض کھڑے تھے، درختوں کے فاصلے میں کوئی ترتیب تھی، نہ ہم آہنگی۔ شاید گھر کے مکینوں کو یا اس گھر کے آرکیٹکٹ کو گھر کے اس حصے سے کچھ خاص شغف نہیں تھا۔

بہر حال، مجموعی طور پر وہ کوٹھی ایسی تھی کہ جو کوئی اسے ایک بار دیکھ لیتا، اس کا بے ساختہ دل چاہتا کہ اسے اندر جا کر بھی دیکھے اور دیکھنے والوں کی خواہش سے قطع نظر اُس کی فضا انتہائی پُرسکون اور خاموش سی تھی۔ ایسی خاموشی، جس میں اُداسی گھلی ہوتی ہے۔ شاید اس کے بے پناہ حُسن نے اسے سارے علاقے میں سب سے منفرد اور سب سے تنہا کر دیا تھا کہ خوب صورتی کی ایک قیمت تنہائی کی صورت میں بھی بھگتنا پڑتی ہے۔

''ایک تھا بادشاہ۔ بڑی پرانی کہانی ہے، ہزار بار سنی ہوئی، لیکن اس کا سبق اتنا نصیحت آموز ہے کہ جب بھی سناؤ، نئی لگتی ہے۔''

''آگے ملکہ امی!'' ثانیہ اُن کی تمہید سے زچ آ کر بولی۔

''ایک بادشاہ تھا، بہت دھن دولت والا۔ اور یہ تو تمہیں پتہ ہی ہے کہ بادشاہ کتنے دولت مند و تونگر ہوتے ہیں، دولت کے باعث ایک زمانہ ان کی ٹھوکر پر ہوتا ہے، سو یہ بادشاہ بھی بہت دولت مند، بہت مال و منال والا تھا۔ اس کے خزانے ہی اس کی طاقت کا سرچشمہ تھے۔ قارون کی طرح اس کے خزانے کی چابیاں کئی اونٹوں پر لادی جا سکتی تھیں۔ وہ اگر مال و دولت کو گننا بھی چاہتا تو بھی نہ گن پاتا۔ اسی چیز نے اسے بہت زعم و غرور میں مبتلا کر دیا تھا۔ اگرچہ اُس کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی مگر اپنی شان و شوکت کے آگے اسے یہ بات اتنی تکلیف نہیں دیتی تھی۔ اس کی تین بیٹیاں تھیں، جن سے وہ بے حد پیار کرتا تھا۔ محبت تو بے شک وہ ان سے بے تحاشا کرتا تھا لیکن اپنی دولت سے کم، کیونکہ اُسے بہر حال اپنی دولت سے زیادہ پیارا کوئی نہیں تھا۔ اُس کی تینوں بیٹیاں بے حد خوب صورت اور ذہین تھیں۔ اُسے تینوں بیٹیوں سے بہت پیار تھا لیکن چھوٹی شہزادی زیادہ عقل مند تھی اور بادشاہ کی جان اسی طوطے میں تھی۔''

''ملکہ امی! ہمیشہ چھوٹی شہزادی ہی کیوں عقل مند ہوتی ہے؟'' ثانیہ نے نیند سے بوجھل آنکھیں جھپکتے ہوئے سوال کیا۔

''پتہ نہیں کیا بات ہے بیٹا! کہ عموماً بڑی شہزادی بے وقوف اور چھوٹی شہزادی عقلمند ہوتی ہے۔ اس میں کہانی کاروں کی کوئی مصلحت ہوتی ہوگی۔'' اس کے سوال بھی تو بہت مشکل ہوتے ہیں۔ ملکہ نے سوچا۔

ایک دن بادشاہ ان تینوں کو حسین رتھ میں اپنے ساتھ بٹھا کر شہر کی سیر کروانے لے گیا۔ تینوں شہزادیاں باپ کا یہ التفات پا کر بہت خوش تھیں۔ خوب صورت، کشادہ، صاف ستھری سڑک پر رتھ رواں دواں تھا۔ راستے میں ایک بوڑھا آدمی اور اس کی کم سن بچی گزرے۔ دونوں جھک جھک کر بادشاہ کو سلام کرنے لگے۔

''دیکھو تو یہ بچی کس قدر خوب صورت ہے، جیسے کوئی شہزادی ہوتی ہے۔'' بڑی شہزادی اس بچی کو دیکھ کر بولی جو پھٹے پرانے لباس میں بھی شہزادیوں جیسا حُسن رکھتی تھی۔

''ہاں واقعی بہت حسین۔ جیسے کوئی شہزادی۔'' منجھلی شہزادی بولی۔

''ہاں واقعی، یہ حسین تو ہے مگر یہ شہزادی نہیں ہے۔ پتہ ہے کیوں؟'' بادشاہ جو دونوں بیٹیوں کی باتیں سن رہا تھا، بولا۔

''کیوں ابا حضور؟'' شہزادیاں بیک زبان بولیں۔

''کیونکہ اس کا باپ ایک غریب لکڑہارا ہے۔ اور تم تینوں شہزادیاں کیوں ہو؟'' بادشاہ نے احساسِ تفاخر سے مسکراتے ہوئے ننھی شہزادی سے سوال کیا۔

''کیونکہ ہمارے ابا حضور آپ ہیں۔ یعنی بادشاہِ عالم، اس لئے ہم شہزادیاں ہیں۔'' دونوں شہزادیاں ہنس کر بولیں۔

''اور چھوٹی شہزادی! آپ کیوں چپ ہیں؟ کیا آپ اس بات سے متفق نہیں؟'' خاموش سوچتی شہزادی سے بادشاہ نے پوچھا۔

''ہم شہزادیاں اس لئے ہیں کہ آپ کی بیٹیاں ہیں اور آپ بادشاہ کس لئے ہیں؟'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

''کیونکہ میرا باپ بادشاہ تھا۔'' بادشاہ نے فخر سے گردن اکڑائی۔

''اور وہ بادشاہ کس لئے تھا؟'' وہ پھر بولی۔

''کیونکہ اس کا باپ بادشاہ تھا۔'' بادشاہ کچھ بگڑ کر بولا۔

''اور وہ اس لئے کہ ان کا باپ بھی بادشاہ ہوگا۔ ان سب کو بادشاہ کس نے بنایا؟''

وہ بادشاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

بادشاہ، شہزادی کو اس جرأت پر کڑے تیوروں سے گھور رہا تھا۔ بے وقوف شہزادی پھر بھی نہیں سمجھی۔

''آپ کو بادشاہ خدا نے بنایا بابا جان! جیسے اس شخص کو لکڑہارا خدا نے بنایا۔ وہ اگر چاہتا تو آپ کو لکڑہارا اور اس کو بادشاہ بنا دیتا۔ تو ہم سب کا بادشاہ تو خدا ہوا نا، بابا جان!''

''گستاخ، حدِ ادب، نامعقول شہزادی۔'' بادشاہ کا چہرہ احساسِ توہین سے سرخ ہو اُٹھا۔''

''کہانی سننے کا شوق ہوتا ہے۔ بس پھر منٹوں میں سو جاتی ہیں۔ شام سے کہانی کا شور مچایا ہوا تھا اور اب کہانی شروع ہوتے ہی سو گئی ہے۔'' ملکہ نے کہانی سناتے سناتے ایک دم سے ثانیہ کو دیکھا۔ وہ بچپن کی حسین میٹھی نیند کے مزے لے رہی تھی۔ انہوں نے مسکرا کر اس کا ماتھا چوم کر بال سنوارے اور اس پر اچھی طرح کمبل اوڑھا دیا۔

''شافعہ!..... عافیہ! تم بھی سو جاؤ۔ اب کافی رات ہو گئی ہے۔'' دوسرے کمرے کی لائٹ جلتی دیکھ کر انہوں نے آواز لگائی۔ درمیان کا دروازہ کھلا تھا، روشنی ادھر سے آ رہی تھی۔

''ملکہ ابھی! ابھی تھوڑی دیر میں سوئیں گے۔ بڑی آپا پڑھ رہی ہیں۔'' عافیہ نے جواب دیا۔

انہوں نے اُٹھ کر لائٹ بجھائی اور آ کر ثانیہ کے ساتھ لیٹ گئیں۔

❖❖○❖❖

''آج محسن بھائی اور سیدہ آپا آئے تھے۔ گھر میں کچھ تھا ہی نہیں۔ دودھ بھی نہیں تھا کہ میں چائے ہی بنا لیتی۔ اس قدر شرمندگی ہوئی کہ کیا بتاؤں۔ شام کے ٹائم آئے تھے وہ۔ کھانے کا بھی وقت نہیں تھا کہ کھانے کا ہی پوچھ لیتی۔ اور کھانے میں بھی تو آج ماش کی دال پکائی تھی۔ وہ بیٹھے بھی کافی دیر آپ کا انتظار کرتے رہے تھے اور گھر کی حالت۔''

کہتے کہتے ملکہ کی آواز بھرّا گئی۔ اُنہیں اپنی شام کی کیفیت یاد آ رہی تھی۔ حالانکہ ان دونوں نے ایسا کچھ ظاہر نہیں کیا تھا، جس سے انہیں بہت زیادہ شرمندگی محسوس ہوتی۔ لیکن اتنے قریبی اور عزیز مہمان گھر میں آئیں اور کچھ کھائے پیئے بغیر اتنی دیر بیٹھ کر چلے جائیں، ان کے نزدیک تو مرنے کا مقام تھا۔ شام سے ان کے جانے کے بعد وہ کتنی بار رو چکی تھیں۔

''تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ہر وقت کا رونا دھونا۔ جب نہیں تھا گھر میں کچھ تو کیا پیش کرنا تھا؟ اور اگر کچھ پیش نہیں کیا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ وہ کون سا کسی دوسرے شہر سے آئے تھے؟ اپنے گھر ہی سے آئے تھے، کھا پی کر ہی آئے ہوں گے۔ بس تمہیں دل کو لگانے کا کوئی نہ کوئی بہانہ چاہئے۔ اور گھر کی حالت کو کیا ہوا؟ ہزاروں سے بہتر ہیں۔ بس چند ماہ اور ہیں۔ پھر دیکھنا، ایک دنیا تمہاری قسمت پر رشک کرے گی۔ جس محل کی میں تمہیں ملکہ بنانے جا رہا ہوں، محسن بھائی جیسے لوگ اس کا صرف خواب دیکھ سکتے ہیں، بنا نہیں سکتے۔ یہ تو میں ہوں جو تمہیں دنیا میں ہی جنت کا ٹکڑا دینے جا رہا ہوں۔ بس چند ماہ کی بات اور ہے۔'' سید محتشم ہاشمی پر ملکہ کے آنسوؤں کا رتی برابر اثر نہیں ہوا تھا۔ ان کا لہجہ ہمیشہ کی طرح بے مروّت اور بے نیاز قسم کا تھا۔

''چند ماہ اور..... یہ سنتے سنتے دس سال گزر گئے ہیں۔ دس سال کسمپرسی کی زندگی گزارنا آسان نہیں سید صاحب! تین بچیوں کے ساتھ ان کی تعلیم اور ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنا کسی پُل صراط سے گزرنے سے کم نہیں۔ اور میں گزشتہ دس سال سے اس پُل صراط سے گزر رہی ہوں۔ اب میرے صبر کی انتہا ہو گئی ہے بہت برداشت کر لیا ہے میں نے۔'' ملکہ کا مزاج حد سے زیادہ بگڑا ہوا تھا اور واقعی لگ رہا تھا، آج ان کے صبر کی انتہا ہو گئی ہے۔

''اچھا تو کیا کر لو گی تم، ہیں۔ ذرا مجھے بھی تو بتاؤ۔'' سید صاحب کتاب کو زور سے بند کرتے ہوئے کڑے تیوروں سے بولے۔

''اس منحوس گھر کی بنیادوں میں آپ نے سیمنٹ گارا نہیں لگایا سید صاحب! ہماری زندگی کی چھوٹی چھوٹی آرزوؤں، حسرتوں اور خواہشوں کے لہو سے انہیں سینچا ہے۔ اور ایسے گھر بہت بارآور نہیں ہوتے۔ کتنا میں نے، سب نے آپ کو سمجھایا کہ اتنے بڑے پلاٹ پر تعمیر کرنے کے بجائے اسے بیچ کر کوئی چھوٹا سا گھر لے لیں۔ ہمارے کون سے پانچ سات بیٹے ہیں، جن کے لئے ہم سب کو اس عذاب سے گزار رہے ہیں آپ؟''

''تم اور دوسرے سارے سمجھانے والے محض جلتے ہیں مجھ سے، میرے اعلیٰ تخلیقی دماغ سے، جس نے یہ حسین شاہکار تراشا ہے۔ کیا ہے جو میرے بیٹے نہیں ہیں، میری بچیاں تو ہیں نا۔ وہ رہیں گی وہاں۔ رسیں بسیں گی۔ جب وہ اس محل میں پھریں گی تو شہزادیاں لگیں گی۔ پھر دیکھنا، جلنے والوں کے کیسے منہ کالے ہوتے ہیں۔''

اتنا ایجوکیٹڈ شخص اور اتنی عامیانہ سوچ۔

''بیٹیاں کیا تاعمر بیٹھی رہیں گی وہاں؟ انہوں نے ایک روز تو اپنے گھر بھی جانا ہے۔ پھر اس بھوت بنگلے کو سناٹے چاٹیں گے۔'' ملکہ جل کر بولیں۔

''یہ تم سب کی خام خیالی ہے۔ میری بیٹیاں اس گھر کی وارث ہوں گی۔ وہاں ہی رہیں گی وہ تاعمر۔'' انہوں نے تاعمر، پر زور دے کر کہا۔

''دنیا کے انوکھے باپ ہیں آپ۔ بیٹی تو چیز ہی ایسی ہے۔ یہ تو کسی بادشاہ، کسی ولی، کسی نبی نے اپنے گھر میں نہ رکھی تو آپ کیسے رکھیں گے؟ فضول کی منطق۔ بس کریں اب اس پر اندھا دھند کمائی لٹانا اور کچھ بچیوں کا بھی خیال کریں۔ اس سال شافعہ گریجویشن کر لے گی۔ بچپن اور لڑکپن تو ان کا اچھی خوراک اور اچھے لباس کو ترستے گزر گیا اور ان کے پاس کون سے بہت سال ہیں، آپ کے پاس عیش کرنے کے؟ اب ان کو اگلے گھر رخصت کرنے کے بارے میں سوچیں۔ احتشام کو بینک میں جاب مل گئی ہے بہت اچھی۔ محسن بھائی اور سیدہ آپا یہی بتانے آئے تھے اور مجھے اشارہ بھی کرنے کہ شافعہ کے گریجویشن کرتے ہی.....''

''بس کرو یہ فرسودہ گفتگو۔ تم بھی وہی ہو روایتی ہزاروں سال پرانی ماں۔ اب ان بچیوں کے عیش کرنے کے دن آئے تو میں انہیں ان کے محل سے دھکے دے کر نکال دوں؟ اور سب سے کہہ دو، فی الحال پانچ سات سال تک میں اپنی کسی بیٹی کو بیاہنے کی نہیں سوچ سکتا۔ اور تم بھی اب جاؤ یہاں سے۔ مجھے ایک بہت اہم کیس کی فائل تیار کرنا ہے۔ صبح تاریخ ہے اس کی۔'' انہوں نے ناگواری سے بلند آواز میں کہتے ہوئے پھر سے کتاب کھول لی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا، آپ کس دنیا میں رہ رہے ہیں سید صاحب! لوگ اچھے اور خاندانی رشتوں کی تلاش میں آج کل دیوانے ہو رہے ہیں، آپ گھر آئے رشتوں کو لات مار رہے ہیں۔ اور پانچ سات سال کس خوشی میں؟ کیا بیٹیوں کو بوڑھا کرنا ہے؟ میں نے ساری زندگی آپ کی ہر ناجائز بات کو ہنس کر سہا ہے لیکن اس معاملے میں کچھ برداشت نہیں کروں گی اور نہ آپ کو من مانی کرنے دوں گی۔ اس سال نہیں تو اگلے سال شافعہ کی رخصتی ضروری ہے، میں آپ کو بتا رہی ہوں۔'' ملکہ کا چہرہ ضبط سے سرخ ہو رہا تھا۔

''شٹ اپ۔ اینڈ یو کین گو ناؤ۔ اب میں کوئی بکواس نہیں سنوں گا۔ جاؤ اب یہاں سے۔'' سید صاحب جارحانہ موڈ میں اُٹھتے ہوئے غصے سے بولے۔

''اور میں بھی اب آپ کے اس فضول جنون سے کوئی کمپرومائز نہیں کروں گی۔ لاوارث نہیں ہوں جو ساری زندگی آپ کی جوتیاں سیدھی کرنے کے باوجود آپ کے ہاتھوں ہمہ وقت ذلیل ہوتی رہوں۔ بہت کچھ سہہ لیا ہے اپنی ذات پر، بیٹیوں کے مستقبل کے لئے نہیں سہوں گی، سید صاحب!'' وہ غصے سے کہتی ہوئی پیر پٹختی کمرے سے نکل گئیں۔

''جاہل عورت، اپنی ساری عمر کی خون پسینے کی کمائی اب دوسروں کی جھولی میں ڈال دوں؟ احمق۔'' انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ کر زور سے کمرے کا دروازہ بند کیا۔

❖❖○❖❖

شادمان لاہور کا بہت پوش ایریا نہیں ہے۔ کسی زمانے میں جب اندرونِ لاہور میں لوگ چھوٹے چھوٹے، ایک دوسرے سے جڑے ہوئے گھروں میں رہتے تھے، اس وقت بہت سے لوگوں نے کھلی آب و ہوا کی تلاش میں اس علاقے کو آباد کرنا شروع کیا تھا۔ بڑے بڑے پلاٹس پر تعمیر شدہ گھر بہت جدید تراش خراش کے حامل نہیں تھے، بس سکون اور سناٹا اس علاقے کی طرح ان گھروں کی بھی نمایاں خصوصیت تھی۔ اس علاقے میں آتے ہی لگتا تھا کہ یہ علاقہ لاہور جیسے ہنگامہ خیز شہر کا حصہ نہیں ہے بلکہ وہ اس سے کٹ کر ہے۔ اس علاقے میں داخل ہوتے ہی عجیب سی خاموشی اور سکون کا احساس ہوتا تھا، بڑی بڑی کشادہ سڑکوں کے اردگرد بنے مضبوط گھر اور ان کے باہر تک پھیلا ہوا سبزہ اس پُرسکون جگہ کو مزید پُرکشش بناتے تھے۔ وہاں کے رہنے والے بے تحاشا دولت مند نہ سہی پھر بھی لکھ پتیوں کے زمرے میں آتے تھے۔ ہر گھر کے گیراج میں کم از کم ایک یا دو گاڑیاں ضرور موجود ہوتی تھیں۔

اور اس روز اس سفید کوٹھی کو اس علاقے کے لوگوں نے پہلی بار آباد ہوتے دیکھا تھا۔ کیونکہ وہاں پہلے صرف مزدوروں کو ہی آتے جاتے دیکھا گیا تھا، آج اس پوری کوٹھی کو رنگ برنگ روشنیوں سے سجایا گیا تھا۔ اس گھر کے مکین اسے آباد کرنے آ گئے تھے، اس خوشی کو سلیبریٹ کرنے کے لئے بہت بڑے فنکشن کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک سے ایک اعلیٰ ماڈل کی گاڑی اس علاقے کے سکون کو درہم برہم کرنے چلی آ رہی تھی۔ ہمسایوں میں بس اردگرد کے دو چار گھروں کو ہی انوائٹ کیا گیا تھا۔ ویسے بھی ماڈرن علاقوں کی طرح وہاں کسی کو کسی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ سب اپنے آپ میں مگن رہتے تھے۔ لیکن جس طرح یہ کارنر والی کوٹھی اپنی خوب صورتی کی وجہ

سے ہر آنے جانے والے کی توجہ ایک بار ضرور اپنی طرف کھینچتی تھی، اسی طرح آج کا یہ رنگ برنگا فنکشن بھی سڑک سے گزرنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔

باہر لان میں سید صاحب کے دوست وکلا اور جج صاحبان جمع تھے۔ ساتھ میں ان کے قریبی دوست اور عزیز بھی تھے یعنی مرد حضرات کی طعام و قیام کا انتظام باہر لان میں کیا گیا تھا، جب کہ ان صاحبان کی بیگمات اور قریبی عزیز خواتین سب گھر کے اندر بنے ہال کمرے میں جمع تھیں۔

اس روز شافعہ، عافیہ اور ثانیہ کے سر فخر سے بلند ہو رہے تھے۔ ایک مدت کے بعد تو انہیں بابا جانی نے اتنے خوب صورت ڈریسز خود بوتیک سے خرید کر دیئے تھے۔ پھر اتنا بڑا اور خوب صورت گھر، جس کا انہوں نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا، وہ ان کی ملکیت تھا۔ یہ مالکانہ احساس ہی ان کے معصوم چہروں کو تابنا کی بخشنے کے لئے کافی تھا۔

شافعہ اپنی دوستوں میں گھری ہوئی تھی۔ سب ہی اس کے گھر، اس کے لباس کی تعریفیں کر رہی تھیں۔ اسے بہت اچھا لگ رہا تھا اور بابا جان پر ٹوٹ کر پیار آ رہا تھا، جنہوں نے ان کی خاطر یہ محل تیار کروایا تھا۔ عافیہ کی دوستوں کی عمریں تو ویسے ہی بالی تھیں، پندرہ سولہ سال کی عمر تو ویسے ہی تحیر کی عمر ہوتی ہے۔ ہر حسین اور انوکھی چیز دل کو لبھاتی ہے۔ کچھ عافیہ کو رشک بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں اور کچھ حسد بھری۔۔ اور ثانیہ تو ویسے ہی ابھی حسد اور رشک کی ان کیفیات سے بے خبر تھی اور یہی اس کی ننھی دوستوں کا حال تھا۔ سات آٹھ سال کی عمر میں یہ چیزیں اتنی اٹریکٹ نہیں کرتیں۔ پھولے پھولے فراکوں میں ملبوس وہ اُس کی دوستیں تو بس اندر باہر اُچھلنے کودنے میں خوش تھیں۔ وہ اپنی سہیلیوں کو پچھلا لان بھی دکھا کر لائی تھی کہ یہاں وہ بابا جان سے کہہ کر جھولے ڈلوائے گی تو ان سب کو پھر اپنے گھر بلوائے گی۔

ملکہ آج واقعی ملکہ لگ رہی تھیں۔ عزیز، رشتہ داروں میں یکایک اُن کی اہمیت کا گراف بلند ہو گیا تھا۔ سب خواتین سید صاحب کے ذوق اور ملکہ سے ان کی محبت کے اس جیتے جاگتے ثبوت پر رشک کر رہی تھیں۔ کریم کلر کے سلکی لباس میں ان کا سرخ و سفید رنگ دمک رہا تھا۔ سب کی تعریفوں کا صرف ایک پُر وقار مسکراہٹ سے جواب دینا ان کی بردباری کو بڑھا رہا تھا۔ لوگوں کی تعریفوں کے باوجود معلوم نہیں کیوں ان کا دل اُداس ہوا جا رہا تھا۔ سب کی تعریفیں جیسے اُنہیں شرمندہ کر رہی تھیں۔ وہ دل سے چاہ رہی تھیں کہ فنکشن جلد سے جلد ختم ہو اور وہ اس فارمیلٹی سے آزاد ہوں۔

خدا خدا کر کے رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک سب مہمان جا چکے تھے۔ صرف محسن بھائی اور سیدہ آپا اور ان کی فیملی موجود تھی۔ وہ بھی سید صاحب کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہے تھے کہ ان سے رخصت چاہیں۔ سید صاحب سب مہمانوں کو فارغ کر کے جب اندر داخل ہوئے تو ان کے چہرے سے تھکاوٹ اور کچھ کچھ بیزاری ہویدا تھی، پھر بھی وہ ان لوگوں کے پاس سامنے پڑے صوفے پر ذرا سا ٹک کر بیٹھ گئے۔

''بھائی صاحب! بہت بہت مبارک ہو آپ کو۔ گھر واقعی بہت خوب صورت اور قابلِ رشد بنا ہے۔ آپ نے جیسا کہا تھا، ویسا کر دکھایا۔ بہت خوشی ہوئی ہے ہمیں یہ سب دیکھ کر۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو یہاں رہنا اور بے تحاشا خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔'' سیدہ آپا نے متانت سے مسکراتے ہوئے سید صاحب کو مبارکباد دی۔

''شکریہ آقا!'' ان کا شکریہ لٹھ مار قسم کا تھا۔ چہرہ ہر قسم کے پُر جوش تاثرات سے عاری تھا۔ ملکہ پہلو بدل کر رہ گئیں۔

''چلو بھئی، تم نے جو کہا، سو پورا کیا۔ اپنی ضد پوری کر کے رہے۔ اب ہمیں بتاؤ، ہم اپنی خواہش پوری کرنے کب آئیں؟'' محسن بھائی نے انہیں مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیسی خواہش؟'' ان کا لہجہ بے تاثر اور بے گانہ سا تھا۔

''کم آن محتشم! مانا کہ تم بہت تھکے ہوئے ہو، لیکن اب ایسا بھی کیا؟ بھئی احتشام کو جاب مل گئی ہے۔ ہم احتشام اور شافعہ کی بات کر رہے ہیں۔ آخر بچپن سے نسبت طے ہے ان کی، شافعہ کے اگلے ماہ ایگزام ہو جائیں گے، وہ بھی فارغ ہے۔ اب تم بتاؤ آگے۔'' محسن بھائی کچھ تنک کر بولے۔

''میں کیا بتاؤں؟ سارا کچھ تو آپ خود ہی طے کئے بیٹھے ہیں۔'' وہ بیزاری سے بولے۔

''کیسے طے کئے بیٹھے ہیں؟ تمہاری صلاح کے بغیر تو کچھ نہیں ہوگا نا۔ ہم تو یہ پوچھ رہے ہیں کہ ہم کب تک کی آس لگائیں؟ تم کچھ بتاؤ تو ہم تھوڑی بہت تیاری شروع کریں۔ آخر پہلے بیٹے کی شادی ہوگی، ہمارے بھی کچھ ارمان ہیں۔'' محسن بھائی نے کہا۔ سید صاحب نے غور سے ایک نظر سب کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ چاروں ہی ادھر بیٹھے تھے۔ احتشام اور ابتسام تو باہر لان ہی میں بیٹھے تھے اور تینوں بہنیں اندر کمرے میں تھیں۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ میں ابھی کوئی شادی وغیرہ افورڈ نہیں کر سکتا۔ صاف صاف

بات ہے۔ ابھی تو گھر بنایا ہے، میرے اتنے وسائل نہیں۔ عافیہ تو ابھی چھوٹی ہے اور شافعہ کی بھی ابھی نہیں، کم از کم سات آٹھ سال تک۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔ میں نے بہت ارمانوں سے یہ گھر اپنی بچیوں کے لئے بنایا ہے، وہ اس میں رہیں، یہی میری خوشی ہے۔'' سید صاحب کی اس عجیب بات پر ان دونوں نے کچھ حیرانی سے پہلے سید صاحب کو اور پھر ملکہ کو دیکھا۔ ملکہ نظریں چرانے پر مجبور ہو گئیں۔

''یہ کیا بات ہوئی بھئی؟ تم جانتے ہو، شافعہ، عافیہ میرے لئے غیر نہیں ہیں، میری اپنی بچیاں ہیں۔ مجھے جہیز وغیرہ کے نام پر ایک دھجی بھی نہیں چاہئے۔ بس اپنے گھر کو ان کے وجود سے آباد کرنا چاہتا ہوں۔ اور سات آٹھ سال کیوں نہیں کرو گے تم ان کی شادی؟ چلو عافیہ تو ابھی چھوٹی ہے اور ابتسام بھی ابھی پڑھ رہا ہے، ان کی ہمیں کوئی جلدی نہیں۔ لیکن شافعہ کی تم دیر کیوں کرنا چاہتے ہو؟'' محسن بھائی کا لہجہ کچھ تیکھا سا تھا۔

''شافعہ میری بیٹی ہے۔ میں چاہے دیر کروں یا جلدی، میری مرضی۔ مجھے کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ وہ اس گھر میں رہے گی، ابھی سات آٹھ سال۔ یہ میرے دل کی خواہش ہے اور میں اسے پورا کرنا بھی جانتا ہوں۔'' ان کا لہجہ حد درجہ اجنبی تھا۔

''سید بھائی! کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ شافی ہماری بھی تو بیٹی ہے نا۔ اور یہ گھر ان تینوں کا ہی تو ہے۔ چاہیں آپ انہیں اب یہاں رکھیں یا وہ بعد میں آ کر یہاں رہیں۔ ماشاء اللہ سے احتشام اور ابتسام بھی تو آپ ہی کے بیٹے ہیں۔ اس میں غیریت والی کون سی بات ہے؟'' سیدہ آپا بولیں۔

''تو آپ کا مطلب ہے کہ جہیز کی جگہ میں یہ گھر ان کے نام کر دوں اور ثانیہ کو دو کپڑوں میں ادھر سے رخصت کر دوں کیونکہ آپ کے تو صرف دو ہی بیٹے ہیں نا۔ بہت اچھی سکیم ہے آپ لوگوں کی، میں داد دیتا ہوں۔ میری برسوں کی شب و روز کی محنت پر اس طرح سے نظریں جمائے بیٹھے ہیں، اس کا اندازہ مجھے پہلے بھی تھا، آج آپ نے کھل کر کہہ دیا۔ جائیں، مجھے اپنی کسی بیٹی کی کوئی شادی وادی نہیں کرنی۔ اور اگر کروں گا بھی تو آپ جیسے لالچی لوگوں میں نہیں کروں گا۔'' سید صاحب کی گھٹیا بات پر ان دونوں کے چہرے جیسے خطرناک حد تک سرخ ہو گئے۔

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے، تم پاگل ہو گئے ہو۔ تم نے یہ سب بکواس ہمارے بارے میں سوچی کیسے؟ یہ گھٹیا سوچ صرف تمہاری ہی ہو سکتی ہے۔ اینٹ گارے کے اس گھر پر اس درجہ گمان تم ہی کر سکتے ہو۔ ہمیں اس سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں۔'' محسن بھائی

کا سانس پھول رہا تھا۔

''تمہاری ان سب بے ہودہ باتوں کے باوجود میں دونوں بچیوں کے رشتے ابھی بھی کرنے پر تیار ہوں اور تمہارے اس گھر پر لعنت بھیجتا ہوں۔''

''یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔'' سید صاحب کا طنزیہ لہجہ انہیں آگ لگا گیا۔

''سیدہ! اُٹھو یہاں سے۔ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہ نفسیاتی مریض بن چکا ہے۔ اس گھر کے نشے نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ جب تمہارا دماغ ٹھکانے آ جائے تو میری طرف آ جانا۔ چلو سیدہ!'' وہ غصے سے کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے۔

''پلیز آپا!..... محسن بھائی!'' ملکہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے سیدہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے لجاجت سے کہا۔ سیدہ نے بے چارگی سے بہن کی طرف دیکھا اور ذرا سا دبا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور ایک اچٹتی سی نظر پُرسکون بیٹھے سید صاحب پر ڈالی اور شوہر کے پیچھے باہر نکل گئیں۔ ملکہ صوفے پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

''ہونہہ۔'' سید صاحب نے ایک طنزیہ ہنکارا بھرا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

❖❖○❖❖

وہ آج کافی دنوں بعد کالج آئی تھی، وہ بھی اپنی سلپ لینے۔ صبح سید صاحب اسے کالج چھوڑ گئے تھے۔

''تمہیں کتنے بجے فارغ ہونا ہے شافی؟'' انہوں نے اسے ڈراپ کرتے ہوئے پوچھا۔

''بابا جان! زیادہ ٹائم نہیں لگے گا۔ یہی کوئی ایک دو گھنٹے۔'' اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''ایک دو گھنٹے۔'' وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ''مجھے تو ایک گھنٹے تک کورٹ پہنچنا ہے۔ اس کے بعد میں تقریباً ایک بجے تک فارغ نہیں ہوں گا۔''

''تو کوئی بات نہیں۔ میں پوائنٹ سے چلی جاؤں گی۔ آج کی تو بات ہے۔'' وہ فوراً بولی۔

''پھر بھی، تمہیں پریشانی تو ہو گی نا بیٹا!'' وہ ہچکچا کر بولے۔

''کوئی بات نہیں بابا جانی! میں خود ہی آ جاؤں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔ بس تھوڑی دیر

کی تو بات ہے۔ میں اب جاؤں؟'' وہ باہر نکل چکی تھی۔

''ٹھیک ہے، جاؤ۔ گھر پہنچ کر مجھے فون کر دینا۔'' وہ پھر بولے۔ ''خدا حافظ!''

انہوں نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

اور یہ تو اسے کالج سے باہر نکل کر پتہ چلا کہ دھوپ کس قدر شدید ہے اور اسٹاپ تک جانا کس قدر مشکل۔ برقعہ نما بڑی سی چادر میں منہ سر ڈھانپے وہ پسینے میں بھیگ گئی۔ سورج کی تپش اپنے عروج پر تھی۔

'کاش! میں کالج میں بیٹھ کر بابا جان کا انتظار کر لیتی۔' وہ دل میں پچھتائی۔ 'اتنی تیز دھوپ میں چلنا کتنا دشوار لگ رہا ہے۔'

اسی وقت وائٹ شیراڈ اس کے پاس آ کر رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر احتشام بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''ہیلو شافعہ! کیا حال ہے؟ آؤ، میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔''

''ٹھیک ہوں میں۔ تھینک یو، میں چلی جاؤں گی۔'' وہ ذرا سا کھڑکی کی طرف جھک کر بولی۔

''کم آن شافی! اتنے تکلف کی کیا ضرورت ہے؟ آ جاؤ، گرمی بہت ہے۔ میں گھر ہی جا رہا ہوں۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیا وہ جھجک کر کھڑی ہوئی۔

''آؤ نا بھئی۔ یوں سڑک پر اچھا لگ رہا ہے ایسے کرنا؟ میرا تم سے ایک نہیں، کئی رشتے بنتے ہیں۔'' وہ جھنجلا کر اسے جتاتے ہوئے بولا۔ وہ گہرا سانس لے کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی چلتے ہی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ گاڑی ایئر کنڈیشنڈ تھی۔

''آج کالج کس لئے آئی تھیں؟ تم لوگ تو فری نہیں ہو چکے؟'' احتشام نے کچھ دیر بعد گفتگو کا آغاز کیا۔

''رول نمبر سلپ لینے۔'' اس نے کھڑکی سے باہر تارکول کی جلتی سڑک پر رواں دواں ٹریفک کو دیکھا۔

''کب ہیں ایگزام؟''

''اسی ماہ کے اینڈ میں۔''

''تیاری ہو گئی؟''

''کر رہی ہوں۔'' فارمل سوال، فارمل جواب۔ گاڑی میں پھر خاموشی چھا گئی۔

''شافعہ! ایک بات پوچھوں؟'' احتشام نے کچھ دیر بعد کہا۔ گاڑی کی اسپیڈ کافی کم

تھی۔

''پوچھیں۔'' اُس کی نظریں ہنوز باہر تھیں۔

''تمہیں پتہ ہے نا کہ چچا جان نے..... جواب دے دیا ہے۔'' احتشام کی بات نے اسے حیران کر دیا۔ یہ تو اسے پتہ تھا کہ اس رات بابا جان نے تایا جان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ لیکن یہ اسے پتہ نہیں تھا کہ احتشام یوں اس سے اس بات کا ذکر کرے گا۔

''کس بات کا؟'' وہ کچھ دیر بعد بولی۔

''ہمارے رشتے کے سلسلے میں۔ وہ پتہ نہیں کیوں اتنے اجنبی بن گئے ہیں۔ امی جان اور ابو کو بہت غصہ آیا تھا، لیکن خالہ کی وجہ سے وہ پھر چچا جان سے بات کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن چچا جان پتہ نہیں کیوں، کوئی بات نہیں کرنا چاہ رہے۔'' اُس کا لہجہ ملول سا تھا۔

''وہ ایسے کیوں ہو گئے ہیں؟'' وہ اُس کی خاموشی پر پھر بولا۔ ''تم بھی کچھ کہو۔''

''پتہ نہیں، میں کیا کہوں؟''

''آخر وہ سات آٹھ سال کا کیوں کہہ دیتے ہیں؟'' وہ بہت پریشان لگ رہا تھا۔ وہ خاموش رہی۔

''ملکہ خالہ..... کیا کہتی ہیں؟ وہ اُن پر زور دیں۔''

وہ پھر خاموش رہی۔

''شافعہ! اگر چچا جان نے مکمل طور پر انکار کر دیا تو.....'' گاڑی کی اسپیڈ اور آہستہ ہو گئی۔

شافعہ نے ایک نظر احتشام کو دیکھا جو اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''تم کچھ نہیں کہو گی؟'' اس کی خاموشی پر وہ پھر بولا۔

''میں کیا کہوں؟'' وہ بے چارگی سے بولی۔

''چچا جان سے تم بات نہیں کر سکتیں؟''

''میں؟'' وہ تعجب سے بولی۔

''ہاں۔ تو اس میں کیا حرج ہے؟ اس طرح ان کے رویے سے نئے رشتے تو کیا جڑیں گے، پرانے بھی خطرے میں پڑ گئے ہیں۔ شافعہ! یہ ہماری خاندانی بقا کا بھی تو سوال ہے۔ انہیں یہ خیال کیوں نہیں آتا؟'' گاڑی کی اسپیڈ تیز ہو گئی۔ شادمان کا پہلا فوارہ نظر آیا۔

''بابا جان ہمارے دشمن نہیں ہیں۔ وہ جو بات، جو کام کریں گے، ہماری بہتری، خیر خواہی ہی میں کریں گے۔ مجھے نہ کل اُن کی نیت پر شک تھا اور نہ آج ہے۔ اس لئے میں ان سے کچھ نہیں کہوں گی۔'' وہ سڑک پر نظریں جمائے جمائے سختی سے بولی۔

''وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہمیں ان کے گھر کا لالچ ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمیں ان کے گھر، ان کی جائیداد کا لالچ کیوں ہوگا بھلا؟ ہمارے پاس اپنا گھر ہے۔ میں جاب پر ہوں، برسر روزگار ہوں۔ زندگی کی ہر سہولت اللہ کا شکر ہے، ہمیں حاصل ہے۔ ہم کسی کی دولت پر نظر کیوں رکھیں گے؟ پھر وہ ایسا کیوں سوچ رہے ہیں؟ تم ان سے یہ تو کہہ سکتی ہو نا کہ وہ ہمارے خلوص کو شک کی نگاہ سے نہ دیکھیں۔ ہم کوئی غیر نہیں، ابو اُن کے بھائی ہیں، امی ملکہ خالہ کی سگی بہن ہیں۔ یہ رشتے بھی ہوتے ہیں بھلا کوئی شک کرنے والے؟'' گاڑی بائیں طرف مڑی۔

''وہ بہتر جانتے ہیں۔'' اس کا مختصر جواب اسے بھڑکا گیا۔

''تو تم بھی اس بات پر راضی نہیں ہو۔'' وہ اسے گھور کر دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔'' وہ پہلو بچا کر بولی۔

''اور اس بات کا کیا مطلب ہے؟'' وہ تنک کر بولا۔

''مطلب وغیرہ تو میں نہیں جانتی، ہاں اپنے باپ کی بات کی ذرا سی بھی تردید یا حکم عدولی نہیں کر سکتی۔ وہ ہمیں سب سے زیادہ چاہتے ہیں، میں بس اتنا جانتی ہوں۔ پلیز گاڑی روک دیں۔ گھر آ گیا ہے۔'' وہ باہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا غلط کو غلط کہنا حکم عدولی ہے؟'' وہ بے دلی سے بولا اور گاڑی روک دی۔

''بات غلط یا صحیح کی نہیں ہے، بات اپنے اپنے خیالات اور نظریہ کی ہے۔ جو بات آپ لوگوں کو غلط نظر آتی ہے، کیا پتہ وہ بابا جان کے نزدیک صحیح ہو۔ اس لئے میں ان سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ آپ اندر آ جائیں، امی سے مل لیں۔'' وہ دروازہ کھول کر باہر نکلی۔

''نو، تھینک یو۔ خدا حافظ۔'' اُس کے اُترتے ہی اس نے گاڑی کو فل اسپیڈ پر چھوڑا اور منٹوں میں گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

وہ سست قدموں سے گیٹ کی طرف بڑھی۔ ایک دم سے دل پر ایک بوجھ سے آن گرا تھا۔

❖❖○❖❖

ملکہ دودھ کا گلاس لے کر آئیں تو سید صاحب لاء کی کسی موٹی کتاب کے مطالعے

میں بری طرح سے غرق تھے۔ ملکہ نے گلاس ٹیبل پر رکھا، پھر میز پر بکھری ہوئی دو تین کتابوں کو اوپر نیچے ترتیب سے رکھ دیا۔ سید صاحب قطعاً متوجہ نہ ہوئے۔ ملکہ نے ہاتھ بڑھا کر دوسری کتابیں اٹھانا چاہیں۔

''ان کو ایسے ہی پڑا رہنے دو۔ مجھے ابھی کام کرنا ہے۔'' صفحے پر سے نظریں اٹھائے بغیر انہوں نے خشک لہجے میں کہا۔

''آپ کچھ دیر کے لئے میری بات نہیں سن سکتے؟'' ملکہ کچھ چڑ کر بولیں۔

''ہاں کہو۔'' انہوں نے عینک اتار کر ہاتھ میں پکڑی۔ کتاب البتہ ویسے ہی کھلی تھی۔

''پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟'' وہ ان کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ کر بولیں۔

''کس بات کے متعلق؟'' انہوں نے آنکھوں کو سکیڑ کر پوچھا۔

''شافعہ کے بارے میں۔ محسن بھائی تو شاید خفا ہو گئے ہیں، فنکشن والے دن سے آج تک نہ انہوں نے فون کیا ہے، نہ آئے ہیں۔ مجھے تو سخت تشویش ہو رہی ہے۔'' وہ واقعی اندر سے فکر مند تھیں۔

''اوّل تو اس میں سوچنے والی کوئی بات ہی نہیں، میں نے جو کہنا تھا، اس روز ان کے سامنے ہی کہہ دیا۔ اگر وہ اس سے خفا ہو گئے ہیں یا ان کی انا کو کوئی چوٹ لگی ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ اور اس دن سے اگر وہ نہیں آئے یا انہوں نے فون نہیں کیا تو اس بات کو دل سے لگانے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟ نہیں آتے تو نہ آئیں۔ ہم کون سا ان کے دیدار کے لئے مرے جا رہے ہیں۔ تمہیں بھی خوامخواہ کوئی نہ کوئی روگ پالنے کا شوق ہے۔'' وہ اسی لٹھ مار لہجے میں بولے۔

''سید صاحب! آپ ہوش میں تو ہیں نا؟ ہم بیٹیوں والے ہیں اور بیٹیوں والے ہمیشہ جھکا کرتے ہیں، اکڑا نہیں کرتے۔ آپ نے اس روز جو بے کار قسم کی باتیں کی تھیں ان کے سامنے، مجھے تو ان پر بے حد شرمندگی ہے۔ پتہ نہیں، محسن بھائی اور سیدہ آپا کیا سوچ رہے ہوں گے۔''

''وہ میری طرف سے جہنم میں جائیں۔ مجھے ان کی سوچوں سے کوئی سروکار نہیں۔ تمہیں ہمیشہ مجھ سے زیادہ ان کی سوچوں کی فکر رہی ہے ملکہ بیگم! تم نے کبھی مجھے شوہر کی حیثیت نہیں دی، ہمیشہ اپنے میکے کے رشتوں کو اوّلیت دی ہے۔ حالانکہ محسن بھائی میرے بھی تو بھائی ہیں، میں تو اپنے آگے کسی کو کچھ نہیں سمجھتا اور سمجھنا چاہئے بھی نہیں۔ اور یہ کہاں لکھا ہے کہ بیٹیوں والے ہمیشہ جھکا کرتے ہیں؟ ہماری بیٹیاں ہمارا فخر ہیں،

ہمارا سرمایہ۔ اور مجھے ان کے ہونے پر کوئی شرمندگی نہیں۔ جن کو اپنے بیٹوں پر فخر ہے، وہ جہاں ہیں، وہیں رہیں۔ میں ان کی چاپلوسی کس خوشی میں کروں؟ اگر وہ نہیں آئے یا میری باتوں سے ان کی دل آزاری ہوئی ہے تو یہ تم بھول جاؤ کہ میں انہیں منانے جاؤں گا یا ان کی منتیں کروں گا کہ آ کر میری بیٹیوں کو قبول کر لو۔ خدا ایک در بند کرتا ہے تو ہزاروں کھول دیتا ہے۔ مجھے تو کوئی فکر نہیں۔'' پتہ نہیں ان کی سوچ اس قسم کی کیوں ہو گئی تھی۔

''کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ ایک در ہم پر جو کھلا ہے، ہم خود اپنے ہاتھوں سے بند کر رہے ہیں بلاوجہ۔ آپ مجھے بتائیں، آپ کو اس رشتے پر کیا اعتراض ہے؟'' وہ زِچ آ کر بولیں۔

''کوئی اعتراض نہیں۔''

''پھر آپ انکار کیوں کر رہے ہیں؟''

''میں انکار کب کر رہا ہوں؟''

''تو اس روز اور ان سے کیا کہا تھا آپ نے؟''

''میں نے تو یہ کہا تھا کہ سات آٹھ سال تک ابھی میں کسی بیٹی کی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ نہ میں نے انکار کیا اور نہ کوئی اعتراض کیا تو پھر اس میں خفا ہونے والی کون سی بات ہے؟''

ملکہ کا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لیں۔

''تو اور انکار کیسے کیا جاتا ہے؟ سات آٹھ سال تو آپ یوں کہہ رہے ہیں جیسے شافعہ دس پندرہ سال کی ہو۔ سید صاحب! سات آٹھ سال بعد وہ تیس بتیس سال کی ہو جائے گی۔ کچھ خبر ہے آپ کو؟ کیا بیٹی کو بوڑھا کر کے بیاہیں گے آپ؟ ایک دو سال کی بات ہو تو سمجھ میں بھی آتی ہے۔ اکٹھے سات آٹھ سال، یہ تو صاف انکار والی بات ہے۔ اور میری سمجھ میں اس کی وجہ نہیں آتی۔'' وہ عاجزی سے بولیں۔

''تمہاری سمجھ میں آئے گی بھی کیوں؟ تمہاری عقل جو محدود ہے۔ اپنے اس بہنوئی اور بہن تک پہنچ کر تو تمہاری عقل جواب دے جاتی ہے۔ تمہیں کچھ اور کیسے سمجھ میں آئے گا؟''

''تو آپ مجھے سمجھائیں، آپ ایسا کیوں چاہ رہے ہیں؟ جہیز کا مسئلہ ہے تو اس کے لئے ایک دو سال کافی ہیں۔ پھر اور کیا بات ہے؟'' وہ نرمی سے بولیں۔

''یہی تو سارا مسئلہ ہے۔ تمہیں نہیں خبر، اُن کی نظر اس گھر پر لگی ہے۔ وہ چاہ رہے ہیں کہ میں یہ گھر جہیز کے طور پر ان کے نام لگا دوں۔ جو خواب میری آنکھوں نے دس سالوں میں بُنا ہے، وہ مزے سے اس کی تعبیر پا جائیں۔ اور یہ میں کبھی نہیں ہونے دوں گا۔''

''سید صاحب! یہ زیادتی ہے۔ وہ ایسا ہرگز نہیں چاہ رہے۔ نہ انہوں نے ایسا کچھ کہا ہے۔ اس روز بھی آپ نے خود اتنی بڑی بات کہہ دی تھی، وہ تو پھر بھی خاموش رہے۔ کوئی اور ہوتا تو.....'' وہ چپ کر گئیں۔

''تو کیا میرا سر پھاڑ دیتا؟ میں اپنی چیز کے بارے میں کچھ بھی کہنے کا حق رکھتا ہوں۔ اور کوئی مجھے اس سے نہیں روک سکتا۔ تم بھی نہیں.....نہیں۔'' وہ اسی ہٹ دھرمی سے بولے۔

''آپ کا تو بھیجہ اُلٹ گیا ہے۔ کیا اس منحوس گھر کی خاطر بیٹیوں کو گھر بٹھا رکھیں گے؟ آج نہیں تو کل تو یہ گھر بیٹیوں کی ہی وراثت ہو گا۔ اس میں اتنا چڑنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''دیکھا..... دیکھا.....'' وہ انگلی اٹھا کر بولے۔ ''یہی وہ اندر کی گھٹیا سوچ ہے تمہارے بہنوئی اور بہن کی۔ وہ اس طرح اس گھر پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔ پہلے شافعہ اور پھر عافیہ کے ذریعے۔ کیا ثانیہ میری بیٹی نہیں؟ اسے کچھ نہ دوں؟ اور اگر بیچ کر اس گھر کی بندر بانٹ کروں تو میں یہ مر کر بھی گوارا نہیں کروں گا۔ یہ گھر کبھی نہیں بکے گا۔ میں نے یہ اپنی بیٹیوں کے لئے بڑے ارمانوں سے بنایا ہے، وہی اس میں رہیں گی۔ ہمیشہ۔''

''دماغ خراب ہو گیا ہے آپ کا سید صاحب! مجھے بدتمیزی پر نہ اُکسائیں۔ آپ اس گھر کو سینے سے لگا کر رکھیں لیکن میری بیٹیوں کی جوانی پر رحم کھائیں۔ آپ شافعہ اور عافیہ کو رہنے دیں۔ انہیں کچھ بھی نہ دیں۔ سیدہ آپا اور محسن بھائی انہیں ایسے ہی بیاہنے پر تیار ہیں۔ آپ ثانیہ کو گھر دے دیں۔ لیکن ان پر یہ ظلم نہ کریں۔ اتنے اچھے رشتے نہ ٹھکرائیں۔''

''ہاں تو آج وہ مجھ پر ترس کھا کر بغیر جہیز کے بیاہ کر لے جائیں اور کل کو ان ہی کے ذریعے مجھے بلیک میل کر کے گھر اپنے نام لگوا لیں۔ بچہ سمجھ رکھا ہے انہوں نے مجھے؟ ملکہ بیگم! عمر گزری ہے میری اس دشت کی سیاحی میں۔ بڑے کیس اس طرح کے لڑے ہیں میں نے۔ پہلے پیار پیار سے خالی ہاتھ بیاہ کر لے جاتے ہیں اور پھر اسی طرح خالی

ہاتھ نکال باہر کرتے ہیں کہ جاؤ، باپ سے جائیداد کے کاغذات لے کر واپس آنا۔ تم انہیں بہت پارسا سمجھتی ہو، میں انہیں اندر تک جانتا ہوں۔'' ان کی مسکراہٹ زہریلی تھی۔

''سید صاحب! حد ہوتی ہے بدگمانی کی بھی۔ اتنے پیار کرنے والے سگے خون کے رشتوں سے اس درجہ بدگمانی۔ بہت افسوس ہے۔ اور اگر وہ ایسا کر بھی لیں تو کیا یہ گھر ہماری بیٹیوں کے کام نہیں آئے گا؟ وہ کوئی اپنے ساتھ لے جائیں گے یا ہم لے جائیں گے؟'' ملکہ کو ان کی سوچ پر حیرت تھی۔

''گھر کسی کے نام نہیں ہوگا۔ میری تینوں بیٹیاں اس میں رہیں گی۔ بس، یہ میرا فیصلہ ہے۔ اور مجھے ابھی کسی کی شادی نہیں کرنی، کم از کم سات آٹھ سال تک۔ تم چاہو تو انہیں میرا یہ فیصلہ بتا دو۔ تم بے وقوف ہو، میں نہیں جو ان کی باتوں میں آ جاؤں گا۔ اور مجھے کوئی اس فیصلے سے ہٹا نہیں سکے گا۔ اب جاؤ تم بھی یہاں سے۔'' وہ حقارت سے بولے۔

''سید صاحب! بس کریں۔ خدا کی بے آواز لاٹھی کو نہ پکاریں۔ اس کی ایک ضرب نہیں جھیل سکیں گے آپ۔ اینٹ گارے پر اس درجہ گمان اور اپنوں سے اس درجہ بدگمانی۔ اُس کے قہر کو نہ پکاریں۔ وہ رحیم و کریم ہے تو جبار و قہار بھی ہے۔ آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں؟ یہ سب کچھ یہیں پڑا رہ جائے گا۔ اُسی بادشاہ کی بادشاہی ہوگی۔ پھر کون میری تیری کرے گا؟ ڈریں خدا سے، ان معصوموں کے حقوق کے بارے میں۔ اس نے آپ کو ان کا متولی بنایا ہے۔ ان کی زندگیوں سے، ان کی خوشیوں سے نہ کھیلیں۔ اسے یہ کھیل کبھی پسند نہیں آئے گا سید صاحب! غرور و تکبر اسے ناپسند ہے، شیطان کا بھی پہلا اور آخری جرم یہی تھا جو آج بھی ناقابل معافی ہے۔ آپ شیطان کے نرغے سے نکل آئیں، خدا سے توبہ کریں۔ سب کچھ یہیں رہ جائے گا۔ آپ کو خالی ہاتھ اس کے آگے پیش ہونا ہے، اپنے اعمال نامہ کے ساتھ۔ کیا لے کر جائیں گے اس کے سامنے؟ یہ غرور و تکبر کے ٹوکرے.....؟''

''بس کرو اپنا یہ تبلیغی لیکچر۔ میں کیا کر رہا ہوں، مجھے زیادہ پتہ ہے۔ پھر بھی تمہیں زیادہ شوق ہے یوں لیکچر دینے کا تو گھر میں میلاد کرا لو۔ میری جان بخشی کرو۔ جاؤ یہاں سے۔'' وہ ہاتھ جوڑ کر بولے۔

''سید صاحب! میری زندگی تو جیسے تیسے گزر گئی، مگر اپنی بچیوں کے ساتھ میں یہ ظلم نہیں ہونے دوں گی۔ یہ آپ یاد رکھیں۔ اس معاملے میں مجھے بے زبان ملکہ نہ سمجھئے گا۔'' ضبط سے ان کا چہرہ سرخ ہو چلا تھا۔

''یہ بچیاں تمہاری بھی تو میری وجہ سے ہیں نا، یہ کیوں بھولتی ہو؟ اگر بہت شوق ہے ان کو اپنے نام کروانے کا تو عدالت میں جاؤ۔ پھر دھکے کھا کر میرے پاس ہی آؤ گی کہ اولاد ہمیشہ باپ کی ہوتی ہے۔''

ملکہ نے اُنہیں یوں دیکھا، جیسے اُن کا دماغ چل گیا ہو۔ وہ کچھ لمحے بیٹھی سوچتی رہیں، پھر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''اس معاملے میں کوئی کمپرومائز نہیں ہوگا، یہ آپ یاد رکھیں۔ چاہے مجھے کچھ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔'' ان کا لہجہ حد درجہ سرد تھا۔

''کیا کر لو گی تم؟'' وہ تمسخر سے بولے۔

''سب کچھ.....سب کچھ۔ حتیٰ کہ آپ سے علیحدگی بھی، اس گھر سے جدائی بھی جو میری بیٹیوں کی خوشیوں کو ڈسنے کو منہ کھولے کھڑا ہے۔''

''چلو، اگر تم سب کچھ داؤ پر لگا رہی ہو تو پھر میں بھی پیچھے نہیں ہٹوں گا، یہ بھی تم یاد رکھنا۔ ان لوگوں کی محبت میں تم مجھے للکار رہی ہو۔'' وہ چبا چبا کر بولے۔

''ان لوگوں کی محبت میں نہیں، اپنی بیٹیوں کی محبت میں۔ ان کی خوشیوں کی چاہ میں۔''

''تم ان کی خیر خواہ ہو تو میں بھی ان کا دشمن نہیں۔ میں بھی انہیں لالچی بھیڑیوں سے بچانا چاہتا ہوں اور تم انہیں ان کا شکار بنا دینا چاہتی ہو۔''

''مجھے آپ کی عقل پر، آپ کے خیالات پر افسوس ہے۔ بے حد افسوس۔ خدا آپ کو ہدایت دے۔''

وہ افسوس سے کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ سید صاحب کچھ سوچتے رہے، پھر انہوں نے زور سے سر جھٹکا اور کتاب کھول کر اس میں محو ہو گئے۔

❖❖○❖❖

''ہیلو کون؟ سیدہ آپا، السلام علیکم۔'' ملکہ اتنے دنوں بعد ان کی آواز سن کر جیسے نہال سی ہو گئیں۔

''وعلیکم السلام۔ کیا حال ہے ملکہ؟''

''ٹھیک ہوں آپا! آپ سنائیں۔''

''میں بھی ٹھیک ہوں۔ بچیوں کی سناؤ، ٹھیک ہیں؟''

''جی سب ٹھیک ہیں۔ آپ سنائیں، محسن بھائی، احتشام اور ابتسام سب ٹھیک ہیں؟''

''ہاں ٹھیک ہیں۔ اللہ کا شکر ہے۔ شافعہ کے ایگزام ہو گئے؟''

''جی۔ پرسوں آخری پیپر تھا۔'' دوسری طرف کچھ خاموشی سی ہوگئی۔

''آپا! اتنے دن فون کیوں نہیں کیا؟'' ملکہ نے خاموشی توڑی۔

''تمہیں سب معلوم تو ہے۔ سید بھائی نے کچھ چھوڑا ہے فون کرنے کے لئے؟ اس روز.....'' وہ چپ کر گئیں۔ ''آج بھی محسن کو بتائے بغیر کر رہی ہوں۔ کیا کروں، بہن ہوں نا۔ رہ نہیں سکتی۔''

''آپا! میں تو خود بے حد شرمندہ ہوں۔ کیا کروں؟ انہوں نے تو اس روز محسن بھائی کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ پتہ نہیں، انہیں کیا ہو گیا ہے؟ میری کوئی بات سننا، سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔''

''کسی اور بات کو گولی مارو ملکہ! مگر یہ رشتے والی بات جو انہوں نے کی ہے، کیا یہ مناسب تھی؟ بچپن کے طے شدہ دونوں رشتے یوں اس طرح بغیر کسی وجہ کے توڑ دیئے جائیں۔ میری تو اُس روز سے نیند اُڑی ہوئی ہے۔''

''تو آپا! آپ کا کیا خیال ہے، میں سکون سے سو رہی ہوں؟ رات کو آنکھیں بند کرتی ہوں تو بچیوں کے مستقبل کی چبھتی ہوئی پن دماغ تک کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اگر ان کی ضد کا یہی عالم رہا تو ان کا کیا ہوگا؟ سیدہ آپا! میں بہت پریشان ہوں۔'' وہ رو دینے کو تھیں۔

''مجھے معلوم ہے ملکہ! تم پریشان نہیں ہو گی تو اور کون ہو گا؟ میری تو خود یہ دلی خواہش ہے، برسوں سے دل میں بسی ہے۔ ہمیشہ احتشام کے لئے شافعہ اور ابتسام کے لئے عافیہ کو دلہن بنے دیکھا ہے اور اب ایک دم یہ افتاد آن پڑی ہے۔ میری تو خود عقل ماؤف ہو گئی ہے کہ سید بھائی کو کیسے سمجھایا جائے؟ اور تو اور، اب تو محسن بھی اس معاملے میں کچھ سننے کو تیار نہیں۔''

''کیا..... کیا کہہ رہے ہیں محسن بھائی؟'' وہ پریشانی سے اٹک کر بولیں۔

''کہتے ہیں، سید بھائی جگہ جگہ چیمبر میں یہی کہتے پھر رہے ہیں کہ محسن میرے گھر کو میری بیٹیوں کے ذریعے حاصل کرنے کے چکر میں ہے۔ سوچیں تو قسم سے شرم آتی ہے۔ سید بھائی نے ہمیں، اپنے بھائی کو ایسا سمجھ رکھا ہے۔ اتنی گھٹیا، اتنی عامیانہ سوچ۔ میں نے تو قسم سے یہاں تک کہا تھا کہ محسن! ہم لکھ کر دے دیتے ہی، شادی کے بعد بھی شافعہ اور عافیہ اپنے حق سے دستبردار رہیں گی۔ سید بھائی وہ گھر ثانیہ کے نام کر دیں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ مگر محسن نہیں مانے۔''

''کیوں؟'' ملکہ کو لمحہ بہ لمحہ کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ ٹانگوں سے جان نکل رہی تھی۔ انہوں نے خود کو گھسیٹ کر پاس پڑے صوفے پر گرایا۔

''کیونکہ سید بھائی اس بات پر بھی یقین نہیں کریں گے۔ وہ اس معاملے میں حد درجہ بدگمان ہو چکے ہیں۔ پھر وہاں ہماری نیک نیتی کیا کر سکتی ہے؟ ملکہ! تم انہیں سمجھاؤ۔''

''آپا! آپ کے سامنے ہے۔ ساری زندگی ایسے ہی گزر گئی۔ اس شخص نے ہر معاملے میں اپنی ہٹ دھرمی سے کام لیا۔ کبھی کسی معاملے میں میری رائے کو آنہ برابر کی اہمیت نہیں دی۔ اور اب اتنے اہم معاملے کو پھر وہ اپنی ہٹ دھرمی کی بھینٹ چڑھانے پر آمادہ ہیں۔ میں کیا کروں؟ دو تین بار مغز ماری کر چکی ہوں، مگر وہ کچھ نہیں سنتے۔ یہاں تک کہہ دیا ہے کہ میں بیٹیوں پر حق ثابت کرنے کے لئے چاہے عدالت میں ہی کیوں نہ چلی جاؤں، وہ اپنے فیصلے سے نہیں ہٹیں گے۔'' اب آنسو ان کے چہرے اور گردن کو بھگو رہے تھے۔

''اوہ میرے مالک! اس شخص کو ہدایت دے۔ تم حوصلہ کرو ملکہ! اس بات میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہو گی۔ میں بھی دعا کروں گی۔ خدا کرے ان کا دل نرم ہو جائے، وہ خود ہی مان جائیں۔ لیکن جوں جوں وقت گزر رہا ہے، محسن بھی اس کو اپنی انا کا مسئلہ بنا رہے ہیں۔ وہ احتشام کے لئے اِدھر اُدھر لڑکی دیکھ رہے ہیں۔'' وہ بھی تھکے تھکے لہجے میں بولیں۔

''سیدہ آپا! خدا کے لئے ابھی محسن بھائی کو روکیں۔ وہ کچھ ماہ انتظار تو کر لیں۔ کیا پتہ وہ مان ہی جائیں۔ شاید میری کوئی بات ان پر اثر کر جائے۔ محسن بھائی سے کہیں، ابھی جلدی نہ کریں۔ ورنہ میں کیا کروں گی؟ آج کل تو رشتوں کا کال پڑ رہا ہے۔ اور پھر سید برادری میں۔ آپا! میں کہیں کی بھی نہیں رہوں گی۔ خدا کے لئے انہیں سمجھائیں۔'' وہ بات کرتے کرتے پھر رونے لگیں۔

''ملکہ! حوصلہ کرو۔ میں سمجھاؤں گی محسن کو۔ مان جائیں گے وہ کچھ انتظار کرنے پر۔ مگر شاید زیادہ دن نہیں۔ اصل میں وہ چاہ رہے ہیں کہ احتشام کی دُلہن کو سب کچھ سونپ کر ہم حج پر چلے جائیں۔ دوسرے کچھ سید بھائی کی بات سے انہیں ازحد دکھ ہوا ہے، کہتے ہیں اب کوئی یتیم و یسیر اور لاوارث لڑکی ہی لاؤں گا کہ مجھے کسی بات کا لالچ نہیں۔''

''آپا! اس سب میں میرا اور میری بیٹیوں کا کیا قصور ہے؟ ہمیں اس شخص کی ہٹ دھرمی کی سزا کیوں دی جائے؟'' وہ ہاتھ کی پشت سے چہرہ صاف کرتے ہوئے تلخی سے

بولیں۔

''کیونکہ تم اور تمہاری بیٹیاں اسی سے تو وابستہ ہو ملکہ! ہم لوگ تاعمر رشتوں کا تاوان بھرتے رہے ہیں۔ جس طرح میں محسن کو بہت عرصہ تک نہیں روک سکتی، اسی طرح تم اور بیٹیاں اس کی ضد اور ہٹ دھرمی کی زد میں آؤ گی۔'' سیدہ آپا دکھ سے بولیں۔

''آپا! تو کیا کروں؟ اس سے ہر رشتہ توڑ لوں۔ کیا اس طرح میری بیٹیوں کو خوشیاں مل جائیں گی؟''

''رشتے توڑنے سے کب خوشیاں ملتی ہیں میری بہن! ایسے تو دائمی، لاعلاج غم ملتے ہیں جو دنیا کے کسی مرہم سے نہیں بھرتے۔ یہ رشتے تو ہمارے لہو سنگ دوڑتے ہیں، ان کو کاٹ پھینکنا تو ہماری اپنی موت ہے۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بولیں۔

''تو پھر میں کیا کروں؟ ان کا ہر جبر خاموشی سے سہتی ہوں آپا! برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے، ایک عمر ہوتی ہے۔ اور اب عمر کے جس حصے سے میں گزر رہی ہوں، اس میں بہت کچھ بہت آسانی سے نہیں برداشت کیا جا سکتا۔ اب تو مجھے لگتا ہے کبھی کبھی کہ میرا دماغ پھٹ جائے گا یا میرا دل چاہتا ہے، کسی دریا میں کود کر جان دے دوں، اس لمحے کی اذیت سے تو جان چھوٹے گی۔''

''اس طرح مسئلے کب حل ہوتے ہیں ملکہ! تم حوصلہ کرو۔ ایک بار پھر انہیں سمجھانے کی کوشش کرو۔ نرمی سے، محبت سے، بچیوں کی محبت کا واسطہ دے کر۔ ان سے کہو صرف ایک بار محسن کو فون کر کے آنے کا کہہ دیں۔ محسن کو لانا میرا کام ہے۔ ہمیں ان کی ہر شرط منظور ہے۔ ہم لکھ کر دینے کو تیار ہیں کہ ہمیں کچھ نہیں چاہئے۔ صرف ان کی بیٹیاں چاہئیں۔ تم ایک بار پھر کوشش کرو۔ خدا کرے، وہ مان جائیں۔ ورنہ پھر معاملہ میرے بس میں نہیں رہے گا کہ میں بھی محسن کو بہت دنوں تک روک نہیں سکوں گی۔ آخر وہ بھی سید کے بھائی ہیں۔ کسی بات پر اڑ جائیں تو پھر نہ ٹلنے والے۔ میں دعا کروں گی۔ تم کوشش کرو اور ہمت سے کام لو۔ یوں حوصلہ نہیں ہارا کرتے۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس سے اچھی اُمیدیں لگاؤ۔ یقیناً وہ سب کی سننے والا ہے۔''

''کر لیتی ہوں پھر کوشش، اگرچہ.....'' ملکہ بے دلی سے بولیں۔

''یوں بے دلی سے نہ کہو۔ خدا سے اچھی امید لگا کر پورے جوش اور حوصلہ سے کام لو۔ وہ ضرور سنے گا۔''

''ٹھیک ہے آپا! میں آپ کو کل یا پرسوں فون کروں گی۔''

''ٹھیک ہے، میں دعا کروں گی۔ تم اپنا خیال رکھنا، زیادہ دل پر نہ لو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اچھا خدا حافظ!''

''خدا حافظ۔'' انہوں نے کہہ کر فون رکھ دیا۔ معاملہ ان کی توقع سے بڑھ کر اُلجھ گیا تھا جسے سلجھانا انہیں ناممکن نظر آ رہا تھا۔

❖❖○❖❖

رات کو کھانے کے بعد جیسے ہی سید صاحب اسٹڈی کی طرف بڑھے، ملکہ ان کے پیچھے پہنچ گئیں۔ آج کل وہ ویسے ہی بہت مصروف رہنے لگے تھے، ان کی پریکٹس بہت بڑھ گئی تھی۔ تقریباً ساری رات وہ اسٹڈی میں گزار دیتے اور وہ بھی دروازہ لاک کر کے۔ شاید ملکہ کی فرسٹریشن سے بچنے کا انہیں یہی رستہ نظر آتا تھا۔ ملکہ کی پریشانی کو انہوں نے فرسٹریشن کا نام دے کر گلوخلاصی کرا لی تھی۔

''ہاں، اب کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟'' ملکہ کو اپنے پیچھے اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ اُکتا کر بولے۔

''مسئلہ تو وہی ہے جو آپ کی ضد کی وجہ سے میری جان لے لے گا۔'' وہ کرسی پر ڈھے گئیں۔

''تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے، فضول کی بات کو جان سے لگا کر بیٹھ گئی ہو۔ کیا تمہیں میری بات سمجھ میں نہیں آتی؟ ایک بار نہیں، دس بار کہہ چکا ہوں کہ تم اس معاملے کو بھول جاؤ۔ مجھے بھی سکون کا سانس لینے دو اور خود بھی لو۔'' انہوں نے کتابیں اٹھا کر میز پر پٹخیں۔

''سید صاحب! یہ کوئی اتنی چھوٹی یا معمولی بات نہیں جسے میں یونہی سر سے اتار پھینکوں۔ یہ میری بچیوں کے مستقبل کا سوال ہے۔ میں اس سے کیسے آنکھیں بند کر سکتی ہوں؟'' وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولیں۔

''کیا بچیاں صرف تمہاری ہیں؟ میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں؟'' وہ تنک کر بولے۔

''اسی لئے تو کہہ رہی ہوں کہ کچھ خیال کریں۔ مجھ سے زیادہ تو آپ کو ان کا خیال ہونا چاہئے۔ پھر آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟'' ملکہ نے حتی الامکان لہجے کو نرم بنایا۔

''خیال ہی تو کر رہا ہوں ان کے اچھے اور محفوظ مستقبل کا۔ ورنہ کوئی اور بے وقوف باپ ہوتا تو انہیں آرام سے تباہ کر دیتا۔ مگر تم نہیں سمجھو گی۔''

''آج سیدہ آپا کا فون آیا تھا۔''

''وہ بھی تمہاری بہن ہیں۔ تمہاری طرح ڈھیٹ۔'' وہ تمسخر سے بولے۔

''سید صاحب!'' ملکہ کو ان کا لہجہ سیدہ آپا کے بارے میں بے حد ناگوار گزرا تھا۔ چند لمحے انہیں خود پر قابو پانے میں لگے۔

''محسن بھائی، احتشام کے لئے اِدھر اُدھر لڑکی دیکھ رہے ہیں۔'' وہ ضبط کے گھونٹ بھر کر بولیں۔

''تو میں کیا کروں؟ انہیں کسی میرج بیورو کا راستہ دکھاؤ۔ اخبارات میں روزانہ ڈھیروں ڈھیر اشتہار آتے ہیں، ان سے مدد لیں۔ تمہیں ان کی بیگم نے فون کیوں کھڑکا دیا؟''

ملکہ نے بے بسی سے دیکھا۔ یا اللہ! میں کیا کروں؟..... اُن کا دل چاہا کہ سامنے دیوار سے سر ٹکرا دیں۔

''سیدہ آپا کہہ رہی تھیں کہ وہ لکھ کر دینے کو تیار ہیں کہ انہیں آپ کے گھر سے کچھ سروکار نہیں۔ نہ اب، نہ شادی کے بعد۔'' انہوں نے پھر صبر کے کئی گھونٹ اندر اُتار کر لہجے کو متوازن کیا۔

''دیکھا، دل کا چور کیسے بولتا ہے۔ بار بار ایک ہی بات پر اصرار کا اور کیا مطلب ہوتا ہے؟ یہی کہ ان کے دل میں چور ہے۔ میں جب ان سے کہہ رہا ہوں کے سات آٹھ سال انتظار کر لیں تو وہ کیوں نہیں کر لیتے؟ ہوس انہیں چین نہیں لینے دے رہی۔ اب بیوی کے ذریعے نیا جال بچھا رہے ہیں۔ ملکہ بیگم! ایک بات میری کان کھول کر سن لو! اب تو میں سات آٹھ سال بعد بھی اپنی بچیاں ان کو نہیں دوں گا۔ ان کی نیت اب مجھ پر مکمل کھل گئی ہے۔ اب مجھے کچھ شبہ نہیں رہا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ میں کہیں بھی ان کی شادی کر دوں گا مگر ادھر نہیں۔'' وہ ضدی لہجے میں بولے۔

''پاگل کر دیں گے آپ مجھے۔ میں لعنت بھیجتی ہوں اس گھر پر جس کی نحوست میری بچیوں کو کھا رہی ہے۔ وہ صرف آپ کی بیٹیاں نہیں، میری بھی ہیں۔ اور اب اگر آپ نے میری بات نہ مانی تو خدا کی قسم! میں بھی حد سے گزر جاؤں گی۔ انہیں لے کر اس گھر سے چلی جاؤں گی۔ میرے صبر کی حد ہو گئی ہے سید صاحب!'' غصے سے ان کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ وہ چیختے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''یہ گھر منحوس ہے تو چلی جاؤ یہاں سے۔ تمہیں کس نے روکا ہے؟'' وہ بھی آنکھیں نکال کر بولے۔

''چلی جاؤں گی، اپنی بچیوں کو لے کر۔''

''ان کا نام نہ زبان پر لانا۔ ان سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں۔ ان سے تمہارا رشتہ میری وجہ سے ہے نا، مجھ سے نہیں رہے گا تو ان سے بھی نہیں رہے گا۔ تمہیں تمہاری اوقات سے بڑھ کر مل گیا ہے نا، اسی لئے ہضم نہیں ہو رہا۔ اب اگر تم اپنی حد سے گزر رہی ہو تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔ میری طرف سے ابھی چلی جاؤ۔'' وہ بے مروّتی، بے لحاظی سے بولے۔

''ابھی چلی جاتی ہوں۔ مگر بچیوں کو لے کر۔'' وہ بھی ڈپٹ کر بولیں۔

''ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھنا۔ تمہیں اب یہاں سے جانا ہی ہوگا، مگر خالی ہاتھ۔ یاد رکھنا!'' وہ کہتے ہوئے اسٹڈی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

''میرے مالک! رحم کر، ہمارے گناہ معاف فرما۔ میرے اللہ! میری بچیوں پر رحم کر۔ ہمیں یوں بے آس نہ کر۔ اس شخص کو ہدایت دے۔ اس کے دل کو نرم کر۔'' وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر روتے ہوئے اونچی آواز میں دعا کرنے لگیں۔

''ملکہ امی!..... ملکہ امی! کیا ہوا؟'' اُن کی آواز سن کر کاریڈور سے گزرتی عافیہ اندر آ کر پریشانی سے بولی۔

''کچھ نہیں..... کچھ نہیں میری بچی! دعا کرو، کچھ نہ ہو۔ اللہ ہم پر رحم کرے۔ کچھ نہ ہو۔'' وہ اس سے لپٹ کر رونے لگیں۔ عافیہ پریشانی سے ماں کے کندھے تھپکنے لگی۔

❖❖○❖❖

آج صبح سے ملکہ کا دل بے حد پریشان تھا۔ کل رات کی گفتگو نے طبیعت پر بڑا بوجھل سا اثر ڈالا تھا۔ رات بے تحاشا رونے کے باوجود دل کا غبار ہلکا نہیں ہوا تھا۔ کوئی پتھر سا تھا جو سینے پر آن گرا تھا۔ رات کی گفتگو سے اور کچھ نہیں تو کم از کم یہ نتیجہ ضرور نکلا تھا کہ اب بات کرنے کا کچھ فائدہ نہیں۔ پتھر سے سر ٹکراؤ تو کچھ فائدہ نہیں ہوتا، صرف اپنا وجود ہی لہولہان ہوتا ہے۔ پتھروں پر کچھ اثر نہیں ہوتا اور رات انہوں نے بھی ایسے ہی پتھر سے اپنا سر پھوڑا تھا، جس پر ان کے خونِ رائیگاں کا کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔

صبح سید صاحب ناشتے کے بغیر ہی کورٹ چلے گئے تھے۔ ناشتہ تو خود انہوں نے بھی نہیں کیا تھا۔ عافیہ اور ثانیہ تو سکول چلی گئی تھیں۔ شافعہ آج کل فارغ تھی، کچن کا کافی کام اب وہ کر لیتی تھی۔ طبیعت کے اضطراب کی وجہ سے آج انہوں نے خود کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ سارا دن یونہی پڑے پڑے گزر گیا۔ بچیوں کے اصرار پر دوپہر کو ان

کے ساتھ کھانا کھایا۔ عصر کی نماز پڑھ کر وہ جوں ہی لیٹیں، اسی وقت پورچ میں گاڑی رُکنے کی آواز آئی۔ اُن کا دل خوامخواہ دھک دھک کرنے لگا۔ حالانکہ یہ تو روز کا معمول تھا۔ بلکہ آج تو سید صاحب کچھ لیٹ آئے تھے۔ قدموں کی چاپ دروازے تک آئی تو وہ دوپٹہ درست کرتے ہوئے اُٹھ بیٹھیں۔ انہوں نے کمرے میں آ کر بریف کیس سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ ملکہ کے سلام کا جواب شاید نہیں دیا کیونکہ ان کے لب بھی نہیں ہلے تھے۔ چہرہ سخت پتھریلا ہو رہا تھا۔

''چائے لاؤں آپ کے لئے؟'' وہ میز پر جھکے بریف کیس کھولنے میں مگن تھے۔ وہ اُٹھ کر بولیں۔

''تم اس گھر کو منحوس کہتی ہو نا اور اس پر لعنت بھیجتی ہو۔ میرے ساتھ رشتہ ہونے پر تمہیں ندامت ہے۔ میرے ساتھ زندگی تم نے ضبط کے مرحلوں سے گزر کر گزاری ہے اور تمہارا یہ خیال ہے کہ بیٹیاں صرف تمہاری ہیں اور مجھے ان کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے نا۔ تو یہ لو ملکہ بیگم! تمہاری رہائی کا پروانہ۔ اور اب اپنے اس حق کو آزمانے کے لئے دنیا کی کسی بھی عدالت میں چلی جاؤ، میں سامنا کرنے کو تیار ہوں جو چاہو، اس گھر سے لے جاؤ۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا میری بچیوں کی طرف بس آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھنا۔ میری رات تک میٹنگ ہے۔ اُمید ہے، تم رات کو اپنے مبارک وجود سے اس گھر کو آزاد کر دو گی۔''

وہ الفاظ تھے یا پتھر جو دھائیں دھائیں ملکہ کے سر، بدن، بازو، گردن سب کو جیسے پل بھر میں لہولہان کر گئے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی سید صاحب کو اور کبھی ان کے ہاتھ میں پکڑے خاکی لفافے کو دیکھ رہی تھیں۔

''خدا حافظ!'' انہوں نے لفافہ میز پر پٹخا اور بریف کیس اٹھا کر انہی قدموں پر واپس پلٹ گئے۔ چند ہی لمحوں میں ان کی گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ اس آواز نے بھی ملکہ کے وجود میں کوئی حرکت پیدا نہیں کی۔

اسی وقت شافعہ دوڑی دوڑی اندر آئی۔

''ملکہ امی! بابا جانی کیوں چلے گئے؟ میں تو چائے لا رہی تھی۔'' وہ کچھ پریشان آواز میں بولی۔ پھر جیسے ہی اس کی نظریں ماں کے لٹے پٹے، لہو نچڑے چہرے پر پڑیں، وہ خوف زدہ ہو گئی۔

''ملکہ امی!..... ملکہ امی! کیا ہوا؟ کیا بابا جانی نے کچھ کہا؟'' وہ آہستہ سے ان کے

پاس آ کر ان کے بازو تھام کر بولی۔ ملکہ بے جان وجود کی طرح اس کے سینے سے آ لگیں۔

''ملکہ امی! کیا ہوا ہے؟ کچھ بتائیں تو سہی۔ بابا جان کچھ کہہ کر گئے ہیں؟ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟'' وہ ماں کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر چومتے ہوئے بولی۔

''ہاں، ٹھیک ہوں میں۔ مجھے بیٹھنے دو۔'' ملکہ نے اس کے ہاتھ چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ کر خود کو کرسی پر گرا لیا۔

''شافعہ! مجھے یہ لفافہ دو۔'' انہوں نے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ شافعہ نے لفافہ اٹھا کر ان کی گود میں رکھا۔ ملکہ کے منہ سے ایک سسکی سی نکلی۔ انہوں نے لفافہ اٹھا کر کھولا، اس میں سے تہہ کیا ہوا ٹائپ شدہ کاغذ نکالا اور پلک جھپکے بغیر اسے پڑھے گئیں، پھر کاغذ ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا۔

''ملکہ امی! اس میں کیا ہے؟'' شافعہ کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔

''تم خود پڑھ لو۔'' ان کی بند آنکھوں کے کناروں سے آنسو بہنے لگے۔ شافعہ نے جھک کر کاغذ اُٹھایا اور پڑھنے لگی۔ کاغذ پڑھ کر اس نے ایک نظر بے یقینی سے ماں کے چہرے کی طرف دیکھا جو لٹھے کی طرح سفید تھا اور اب آنسوؤں سے دُھل رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر کاغذ پر لکھی اس قاتل تحریر کو پڑھا۔

''ملکہ امی! یہ کیا، کیا بابا جانی نے؟'' انہوں نے ایسا کیوں کیا؟'' وہ ان کے قدموں میں بیٹھ کر ان کے دونوں گھٹنے تھام کر بڑی مشکل سے بولی۔

''ملکہ امی! یہ کیا ہو گیا؟ ہمارا گھر ٹوٹ گیا۔ ہمارے گھر کو کس کی نظر کھا گئی؟ ملکہ امی! ہم کیا کریں گے؟'' وہ ان کے گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی۔ کتنی ہی دیر گزر گئی دونوں ماں بیٹی خاموش آنسوؤں سے روتی رہیں۔

''شافی! اُٹھو بیٹا! ہمت کرو۔'' کافی دیر بعد ملکہ کی آواز جیسے کسی گہری کھائی سے برآمد ہوئی۔ شافعہ اسی طرح روتی رہی اور ایک جملہ بول کر جیسے ملکہ کی ہمت بھی جواب دے گئی۔ وہ پھر خاموش ہو گئیں۔

بائیس سالہ رفاقت کو یوں یک لخت ختم کرتے ہوئے اس نے بائیس پل بھی نہ سوچا ہو گا، میں سمجھتی رہی کہ میں پل صراط سے گزر رہی ہوں جو ایسے شخص کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوں، جس کے نزدیک صرف اپنی خواہش اور اپنی ذات سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ تو میرا یہ کانٹوں بھرا سفر ایک جہدِ لاحاصل تھی۔ جو ایک سراب کے تعاقب میں گزری اور انجام ندی کے دو کناروں جیسی دائمی جدائی۔ ہاہ! نہیں، یہی تو آغاز تھا۔

بائیس برس ہم ساتھ ساتھ رہے مگر ایک نہ ہو سکے۔ نہ ہمارے دل، نہ ہماری سوچیں، تو یہ جدائی کیسی؟ یہ تو دنیا کو دکھانے کے لئے ہے۔ اس علیحدگی کا زندہ ثبوت ہے۔ ورنہ تو ہم پہلے ہی سے جدا ہیں۔ پھر سوگ کیسا؟

جدا ہونے کے سوا
کوئی چارہ بھی نہ تھا
وہ رستہ جو دُور تک تنہا گیا تھا
بالآخر دو سمتوں میں بٹ گیا!

❖❖○❖❖

ملکہ نے دونوں آنکھیں اور چہرہ رگڑ کر صاف کیا۔

''شافعہ! اُٹھو بیٹا! اور محسن تایا کو فون کر کے آؤ کہ مجھے لے جائیں آ کر۔'' ان کی آواز صاف مگر بے تاثر تھی۔

''نہیں ملکہ امی! ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے۔'' وہ اپنا سر ان کے گھٹنوں سے ٹکراتے ہوئے بولی۔ اس کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔

''نہیں شافی بیٹا! اب تم مجھے نہیں روک سکتیں۔ بلکہ کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ مجھے جانا ہی ہوگا۔ ہاں، اگر تم لوگ میرے ساتھ جانا چاہو تو چلو اپنی خالہ کے گھر۔ اور ایسا تمہارا باپ کبھی نہیں چاہے گا۔ تم ان سے بات کر کے مجھے بتا دینا، میں تمہیں بلوا لوں گی۔''

''زندگی کے کس موڑ پر آ کر دغا دی ہے سید صاحب! کہ اب میرا کوئی ٹھور ہے نہ ٹھکانہ۔ کس برتے، کس بھروسے پر جوان بیٹیوں کو ساتھ لے کر نکل پڑوں کہ اپنا سر چھپانے کو بھی چھایا نہیں۔'' وہ مدھم آواز میں بڑبڑاتے ہوئے پھر سے رونے لگیں۔

شافعہ ان کی بات سن کر اور زور زور سے رونے لگی۔

''شافی بیٹا! ایسا نہ کرو۔ مجھے جانا تو ہے۔ میرا رستہ دشوار نہ کرو۔ بیٹا! تم پڑھی لکھی ہو، سمجھ دار ہو، بہنوں کا خیال رکھنا اور گھر کا بھی.....'' وہ ایک پل کو رکیں۔ ''اور اپنے باپ کا بھی۔ میرا اور اس گھر کا ساتھ بس یہیں تک تھا۔ کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے نا، بظاہر سب سے مضبوط نظر آنے والا تعلق ٹوٹنے میں ایک پل نہیں لیتا۔ بس ذرا سی بات پر ٹوٹ جاتا ہے۔ اس شخص سے میرا تعلق کیا ٹوٹا، تم لوگوں پر میرا استحقاق بھی ختم ہوا۔ اب تمہارا حصول عدالت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ آگے جو میرے اللہ کو منظور۔ جوان

بیٹیوں کو عدالتوں میں گھسیٹوں گی۔'' پھسل پھسل کر آنے والے آنسوؤں کو انہوں نے بے دردی سے رگڑا۔

''اُٹھو، اب دیر نہ کرو اور اپنی خالہ کو فون کر کے آؤ کہ آ کر میری زندہ لاش یہاں سے لے جائیں۔ عافیہ اور ثانیہ کو ابھی نہ بتانا، وہ سمجھ نہ پائیں گی اور سہ بھی نہ پائیں گی۔ آہستہ آہستہ وقت انہیں سمجھا دے گا۔ تم دونوں کا خیال رکھنا اور گھر کا بھی۔ اُٹھو، اب دیر نہ کرو۔'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

''ملکہ امی! نہیں۔ خدا کے لئے نہ جائیں، میں کیا کروں گی آپ کے بغیر؟'' آنسوؤں کی شدت سے اس کی آواز پھٹ رہی تھی۔

''نہیں میری جان! یوں حوصلہ نہیں ہارتے۔ یہ زندگی ہے۔ اس میں اس سے بھی زیادہ مشکل مرحلے آتے ہیں۔ حوصلہ نہ ہارنا۔ ہمت سے کام لینا۔ اچھا اُٹھو، اب مجھے دیر ہو رہی ہے۔ اب اس گھر کی چھت کے نیچے گزرنے والا ایک ایک پل مجھے کاٹ رہا ہے۔ اُٹھ جاؤ بیٹا! ماں کی تکلیف کو نہ بڑھاؤ۔'' انہوں نے اس کا سر اٹھا کر اوپر کیا اور بازو پکڑ کر اٹھانا چاہا۔ وہ بے بسی سے ماں کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

ملکہ نے سر ہلا کر اسے اُٹھنے کا اشارہ کیا اور اب اس کے سوا چارہ بھی تو کوئی نہیں تھا۔ اُس کے بلکتے دل نے اسے سمجھایا۔ وہ اپنے وجود کو کھینچ کر کھڑی ہوئی اور چہرہ صاف کرتے ہوئے مرے مرے قدموں سے باہر نکل گئی۔

ملکہ نے بے یقینی سے کمرے کے در و دیوار کو دیکھنا شروع کیا۔ ابھی تو اس کمرے میں آئے چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ کوچ کا حکم مل گیا۔ ساری عمر جس کی تپسیا میں تیاگ دی، اس نے خدمت کا، رفاقت کا یہ صلہ دیا میرے اللہ! یہ کہاں کا انصاف ہے؟..... انہوں نے دیوار پر لگے آیت الکرسی کے سنہری قطعے کو دیکھ کر فریاد کی۔ ہر چیز جیسے ساکت تھی، بے حس، اس کمرے کے مالک کی طرح۔ انہوں نے آنکھیں میچ لیں اور سر کرسی کی پشت پر گرا دیا۔

❖❖○❖❖

ملکہ کے جاتے ہی جیسے گھر میں ویرانیوں نے ڈیرے ڈال لئے تھے۔ عجیب سا سکوت اور سناٹا ہر طرف چھا گیا تھا۔ حالانکہ پہلے بھی ملکہ کون سا اونچی آواز میں بولتی تھیں یا شور و ہنگامہ کی شوقین تھیں، وہ تو بس چپ چاپ، قدموں کی مدھم آہٹ کے

ساتھ گھر کے چھوٹے موٹے کام نمٹائے جاتی تھیں۔ کبھی شافعہ کو آواز دے لی کہ کھانے کے برتن رکھوا کر، کبھی عافیہ کو ڈسٹنگ کا کہہ دیا، کبھی ثانیہ کو پڑھنے کی آواز لگا دی۔ آتے جاتے سید صاحب کو کچھ نہ کچھ کھانے کا پوچھ لیا۔ کاموں سے فارغ ہو کر وضو کیا اور ململ کے دوپٹے کی بکل مار کر بیڈ روم کے ایک کونے میں جائے نماز سنبھال کر بیٹھ گئیں۔ کبھی فارغ ہوئیں تو سلائی کڑھائی لے کر بیٹھ گئیں۔ ثانیہ کے قمیض کے گلے پر کڑھائی کر دی۔ شافعہ، عافیہ کے لان، کاٹن کے کپڑے سی دیئے۔ تو ان ساری مصروفیات میں بھلا بولنے یا شور مچانے کی گنجائش کہاں نکلتی؟ مگر اس کے باوجود ایسا لگ رہا تھا، گھر کے دس پندرہ افراد کہیں روٹھ کر چلے گئے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو سید صاحب بھاگ کر انہیں منا لاتے۔ مگر اب تو کچھ بھی ممکن نہیں تھا۔

رات کو بستر میں دبکی ثانیہ کی دبی دبی سسکیاں دونوں بہنیں کان لپیٹ کر سنتی رہیں۔ اس بچی کے دل میں خدا جانے کس نے دائمی جدائی کا احساس ڈال دیا تھا کہ وہ دونوں بہنوں سے کچھ نہ پوچھتی۔ جب پہلے ہی دن شافعہ نے سختی سے کہہ دیا تھا کہ ملکہ امی چلی گئی ہیں، اب نہیں آئیں گی۔ روئیں تو بابا جانی سے پٹو گی۔ پتہ نہیں، اس پٹائی کے خوف نے اس سے اظہار کی قوت چھین لی تھی۔ ماں کی یاد آتی تو وہ خود ہی روتی، پھر خود ہی چپ کر جاتی یا کبھی کبھار بجوا سے چپکے سے آ کر بانہوں میں سمیٹ لیتیں یا شافعہ اُس کی روئی روئی آنکھوں کو نظر انداز کر کے اسے پڑھانے بیٹھ جاتی۔ گھر کی ساری فضا ہی جیسے ٹھہر سی گئی تھی۔

اور شافعہ کا رویہ سید صاحب کے ساتھ بہت سرد اور اجنبی سا ہو گیا تھا۔ وہ ان کے گھر آتے ہی کسی معمول کی طرح کھانے کا پوچھتی، کپڑوں کا پوچھ لیتی۔ رات کو دودھ یا چائے ان کے کہنے پر دے جاتی۔ سب کام ہو رہے تھے۔ بس زندگی جیسے خالی خالی سی ہو گئی تھی۔ عافیہ ان کے گھر میں داخل ہوتے ہی پڑھنا شروع کر دیتی۔ ویسے بھی اس کے میٹرک کے امتحان ہونے والے تھے۔ ثانیہ سرِ شام ہی پڑ کر سو جاتی۔

ان کا دل چاہتا کہ سب کچھ پہلے کی طرح ہو جائے۔ تینوں پہلے کی طرح صرف انہی کی دیوانی ہوں، وہ گھر میں داخل ہوں تو وہ تینوں پہلے کی طرح خوش دلی سے ان کا استقبال کریں، ان سے اپنی چھوٹی چھوٹی فرمائشیں بیان کریں۔ سکول کی باتیں، دوستوں کی باتیں، ملکہ امی کی سختی کی شکایتیں۔ چوکیدار کا ان کے باہر جانے پر ڈانٹنا، لان میں کھلنے والے پھولوں کا تذکرہ۔ وہ تینوں تو جیسے ماں کے جاتے ہی اپنے خول

میں سمٹ کر رہ گئی تھیں۔ وہ باپ سے نظر ملا کر کوئی بات نہ کرتی تھیں۔ ان کی بنیادی ضروریات بھی شافعہ سامنے دیوار کو تکتے ہوئے بیان کرتی تھی۔

اس روز وہ جیسے ہی گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے اندر جانے لگے، باہر کاریڈور میں اپنی گڑیا کے ساتھ کھیلتی ثانیہ انہیں دیکھ کر اپنی گڑیا کو سینے سے لگا کر اندر مڑ گئی۔

''ثانیہ بیٹا! ادھر آؤ۔ کہاں جا رہی ہو؟'' وہ اس کے قریب جا کر محبت سے بولے۔

''اندر کمرے میں۔'' وہ گڑیا کے سنہری بالوں کو انگلیوں سے سنوارتے ہوئے ان کو دیکھے بغیر بولی۔

''بابا جانی کے پاس نہیں بیٹھنا؟ باتیں کرتے ہیں۔ پھر آئس کریم کھانے چلیں گے۔'' انہوں نے پیار سے اسے چمکارا۔

''ملکہ امی کب آئیں گی بابا جانی؟'' ان کی چمکار پر اس نے ایک لمحے کو سر اٹھا کر اونچے لمبے باپ کے بارعب چہرے کو دیکھ کر پوچھا جو اس کے سوال پر ایک دم سے سخت پتھریلا سا ہو گیا تھا۔

''یہ گڑیا ثانیہ کی ہے، بڑی پیاری ہے۔'' انہوں نے گڑیا کو پیار سے اس کے ہاتھ سے لینا چاہا۔

''میں اسے آپ کو نہیں دوں گی۔'' اس نے گڑیا کو اور اپنے سینے سے بھینچ لیا۔

''کیوں بیٹا؟'' انہوں نے جھک کر اس کے ماتھے پر پیار کیا۔

''آپ اسے بھی مجھ سے چھین کر دُور کر دیں گے، جیسے ملکہ امی کو کر دیا۔ آپ گندے ہیں، اچھے نہیں ہیں۔'' وہ کہہ کر تیزی سے اندر کی طرف دوڑ گئی۔

'کہیں کچھ غلط تو نہیں ہو گیا؟' انہوں نے پریشانی سے سوچا۔ 'بچی ہے، ابھی ماں سے جدائی نئی ہے۔ خیر، سب ٹھیک ہو جائے گا۔' انہوں نے خود کو دلاسا دیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

''حیرت ہے، تین ہفتے گزر گئے اور ملکہ نے بچیوں کے حصول کا دعویٰ کورٹ میں دائر نہیں کیا اور اس نے یہ تین ہفتے ان کے بغیر کیسے گزار لئے؟ وہ تو کہتی تھی کہ ان بچیوں میں میری جان ہے۔ اب اسے اپنی جان کی کچھ پروا نہیں رہی۔'' انہوں نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی اور جوتوں سمیت بیڈ پر دراز ہو گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ ان کے سر میں درد تھا اور تھکن بھی ہو رہی تھی۔

'پتہ نہیں، آج کل اتنی تھکن کیوں ہونے لگی ہے؟' انہوں انگلیوں سے اپنی کنپٹیاں

دباتے ہوئے سوچا۔

بائیس برس کی عادتیں اتنی جلدی کہاں چھٹتی ہیں، انہوں نے لاشعوری طور پر دوسرے تکیے پر ہاتھ مارا۔ ان کا پہلو بھی ان کے دل کی طرح خالی اور ویران تھا۔ درد کی ہلکی سی لہر بائیں پہلو میں اُٹھی۔

'وہ تو بچی ہے۔ ماں کی جدائی سہارنے میں کچھ دن لے گی اور میں؟' ان کا دل چاہا وہ کہیں دور بھاگ جائیں۔ یہ کیسی وحشت سی ہونے لگی تھی انہیں اس کمرے سے، اس گھر سے۔

'کیا میں نے غلط فیصلہ کیا تھا؟' وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے اور سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینہ میں خود کو دیکھنے لگے۔

'نہیں..... بالکل درست کیا تھا۔ وہ میری بچیوں کا حق اپنی بہن کو دینا چاہتی تھی۔ یہ گھر اس کے بھانجوں کے نام کر کے میں کنگال ہو کر بیٹھ جاتا۔ فٹ پاتھ پر سوتا جا کر۔ اور میرے مرنے کے بعد میرا نام بھی میری طرح خاک برد ہو جاتا۔ کوئی بھی نہ جانتا کہ یہ گھر سید محتشم ہاشمی نے کتنی اُمنگوں، کتنے ارمانوں سے بنایا تھا اور اس کے مین گیٹ پر لگی سنگ مرمر کی خوب صورت نیم پلیٹ جس پر ''السید دِلا'' لکھا ہے، اس پر کسی اور کا نام کندہ ہو جاتا۔ میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔ اس گھر کے دروازے پر ہمیشہ میرا نام کھدا رہے گا اور میری بیٹیاں میری وارث ہوں گی۔ اس گھر کی وارث، میرے نام کی وارث۔ میں اپنی جائیداد، اپنا نام کسی اور کو کیوں دوں؟ اور میری بیوی، میری ہم سفر ہوتے ہوئے بھی مجھے بے نشان کر دینا چاہتی تھی۔ پھر وہ کہاں کی میری خیر خواہ، ہم نفس ہوئی؟ وہ تو ساری زندگی اپنی بہن اور بہنوئی کی خیر خواہی کی تمنا کرتی رہی۔ اس نے کبھی میری رفاقت کو فخر اور محبت کی نظر سے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ اس ساتھ کو ایک بوجھ ہی گردانا۔ ایک عذاب، ایک مصیبت، جس میں کبھی خوشی اور سکون کا گزر نہیں ہوا۔ تو ایسی ناشکری عورت کا یہی انجام ہونا چاہئے تھا۔ اسے اپنے ساتھ رکھنے کا کیا فائدہ، جب دن رات اذیت اور ذہنی تکلیف سے گزریں۔'

'ہاں، میرا فیصلہ بالکل صحیح تھا۔ بالکل درست۔ اب میں اپنی مرضی سے اپنی بیٹیوں کے مستقبل کا فیصلہ کروں گا۔ اور اگر اُس نے اس میں حائل ہونے کی کوشش کی تو میں اسے کورٹ میں بھی نیچا دکھا سکتا ہوں کہ اس وقت شہر میں میرے پائے کا کوئی وکیل نہیں۔ ہاں..... میں اسے ہرا دوں گا۔ یہ میری بیٹیاں ہیں اور میرے پاس ہی رہیں

گی۔ میرا فیصلہ بالکل صحیح تھا۔ بالکل صحیح۔'

'اتنی دیر میں تو ملکہ چائے لے کر آ جاتی تھی۔ چائے آ جاتی تو میں کوئی پین کلر لے لیتا ساتھ۔' وہ لاشعوری طور پر پھر ملکہ کے بارے میں سوچنے لگے۔

❖❖○❖❖

اور سید صاحب کو تو ملکہ کے جانے کے بعد صرف ایک ہی خبر کا انتظار تھا کہ وہ کورٹ میں بچیوں کے حصول کے لئے دعویٰ دائر کرے گی، لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ ایک ہفتہ، پھر دو، پھر تین چار پانچ مہینے گزر گئے۔ ملکہ کی عدت بھی ختم ہو گئی۔ اس طرف سے ایسا کوئی سگنل نہ ملا تو سید صاحب جیسے دل میں اپنے جلد باز فیصلے پر کچھ پچھتانے لگے، وہ تو کورٹ میں ملکہ کو بلا کر اسے ذلیل کرنا چاہتے تھے۔ اس کی جگ ہنسائی کروانا چاہتے تھے۔ لیکن اس طرف تو بالکل خاموشی تھی۔ ان کی اپنی چال جیسے خود ان پر اُلٹ گئی تھی۔ ان کی بے چین فطرت کو قرار نہیں آ رہا تھا۔ اور اب تو ایسا لگ رہا تھا، جیسے وہ تینوں بچیوں کو بالکل بھول ہی گئی ہے۔ یہاں سے جانے کے بعد اس نے نہ تو کوئی فون کیا تھا اور نہ کسی اور ذریعے سے بچیوں کی خیر خبر لی تھی۔

'کہیں میں نے طلاق دے کر اُس کے دل کی مراد تو پوری نہیں کر دی؟' اب دن رات انہیں یہ سوچیں پریشان کرنے لگی تھیں۔ ملکہ کی خاموشی اور سکون انہیں بے قرار کئے دے رہا تھا۔

اور اس روز ان کی بے قرار طبیعت کو جیسے سکتہ ہو گیا کہ خبر ہی ایسی تھی کہ وہ سن کر دنگ رہ گئے۔ ایسا تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ محسن بھائی نے احتشام کی شادی کر دی تھی۔ ان کی خالہ کی کوئی یتیم نواسی تھی، جس کے ماں باپ بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے، جسے شروع میں نانی نے پالا تھا اور بعد میں قریب کے رشتہ داروں نے۔ وہ لڑکی جہیز کے نام پر صرف اپنی گریجویشن کی ڈگری لائی تھی۔ تن پر کپڑے بھی محسن بھائی کی طرف سے تھے اور انہوں نے بیٹے کی شادی خوب دھوم دھام سے کی تھی۔ سارے شہر کے بڑے لوگ اس کے ولیمے میں مدعو تھے اور اس ولیمے کے اختتام پر اسی تقریب میں محسن بھائی نے ملکہ کا نکاح اپنے چچا زاد بھائی وجاہت حسین سے کر دیا تھا، جو دونوں ٹانگوں سے معذور تھے۔ ان کے تین بچے تھے۔ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں۔ بیٹا امریکہ میں ہوتا تھا اور بیٹیاں باپ کے پاس۔ اور بتانے والے نے سید صاحب کو بتایا

کہ یہ نکاح ملکہ کی مرضی اور خوشی سے ہوا تھا۔ نکاح کے بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ کراچی چلی گئی تھیں کہ وجاہت حسین کا گھر کراچی میں تھا، جہاں اس کی ایک کاغذ کی فیکٹری تھی اور ایک پٹرول پمپ تھا۔ اس کی کوٹھی چار کنال کی تھی اور اس قدر خوب صورت تھی کہ لوگ اسے دور دور سے دیکھنے آتے تھے جو اس نے حق مہر کے طور پر تحفتاً ملکہ کو دی تھی۔ اس کے علاوہ پٹرول پمپ بھی ملکہ کے نام کر دیا اور بے تحاشا زیور دیا تھا۔ وجاہت حسین کی بہاول پور سائیڈ پر زمینیں بھی تھیں، جن سے ٹھیک ٹھاک آمدن آتی تھی۔

تو بالآخر ملکہ کو حکومت کے لئے راجدھانی مل ہی گئی۔ اتنی ساری جاہ وحشمت کے مقابلے میں وجاہت حسین کی وہیل چیئر کس کو نظر آنی تھی؟ اور اس بار ملکہ نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔ اپنے نام بہت کچھ کروا کے اس نے اپنے پاؤں مضبوط کئے، پھر اپنا آپ کسی کو دان کیا تھا کہ بائیس سال سید صاحب کی خدمت و ریاضت کا صلہ تو کپڑے کی ایک دھجی نہیں تھا۔ لیکن اب اس نے محض وعدوں کے حسین جال سے دھوکا نہیں کھایا تھا، اپنے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لئے ٹھوس فیصلہ کیا تھا کہ اب کوئی اسے یونہی لات مار کر باہر نہیں کر سکتا تھا۔

یہ کیا خبر ملی، سید صاحب کا دن رات کا چین لٹ گیا۔ انہوں نے تو ملکہ کہ دن رات تکلیف و اذیت کا جہنم جھیلنے کے لئے طلاق دی تھی۔ مگر اسے تو یہ جہنم راس آ گیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ طلاق ملنے کے بعد اور بیٹیوں کے حصول میں ناکامی کے بعد ملکہ شاید چند ماہ ہی جی سکے۔ اس کی اذیت سے ان کے دل کو جو سکون ملتا تھا، وہ سب خواب برباد ہو گئے۔ انہیں یقین تھا کہ اس سفید محل سے دھتکارے جانے کے بعد ملکہ بہت پچھتائے گی۔ پھر اسے سید صاحب کی اہمیت کا احساس ہوگا۔ بچیوں کے لئے ہی سہی، وہ ان کے آگے گڑگڑائے گی۔ مگر وائے نصیب ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ دوزخ سے نکلنے کے بعد سیدھی بہشت میں چلی گئی تھی۔

گھر آ کر بھی انہیں ایک پل کو چین نہیں مل رہا تھا۔ رات کروٹیں بدلتے گزر گئی۔ اور اگلا دن جیسے پہاڑ کی طرح طلوع ہوا تھا اور شاید پندرہ سولہ سال بعد انہوں نے چیمبر سے چھٹی کی تھی۔ سارا دن کمرے میں پڑے سود و زیاں کا حساب لگاتے رہے۔ سارے خسارے ان کے حصے میں آ رہے تھے۔ سارا نفع تو ملکہ کما گئی تھی۔ سوچ سوچ کر ان کا دماغ پھٹنے لگا۔ انہوں نے ناشتہ بھی نہ کیا۔ دوپہر کو شافعہ ان کا کھانا کمرے میں لے آئی۔

''بابا جانی! کھانا کھا لیں۔'' اس نے کھانا ان کے آگے میز پر لگاتے ہوئے کہا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' انہوں نے غائب دماغی سے ٹیبل کو دیکھا۔

''آپ نے صبح بھی کچھ نہیں کھایا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟ ڈاکٹر کو بلا لوں؟'' وہ ان کے پاس آ کر بولی۔

''ٹھیک ہوں میں۔ تم لوگوں کو کیا پروا؟ میں تو ظالم ہوں نا تمہارے نزدیک۔ تمہاری ماں کو تم لوگوں سے دور کر دیا۔ اب تم میری کیوں پروا کرنے لگیں۔'' ایک دم ان کے دل میں خیال آیا تھا۔

''بابا جانی! کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ آپ کی پروا کیوں نہیں ہے؟ میں تو صبح بھی آپ کو پوچھنے آئی تھی۔ عافیہ کے تو ایگزام ہیں، وہ تیاری کر رہی ہے۔ اور ثانیہ ابھی سکول سے آئی ہے۔'' اس نے توجیہہ پیش کی۔

''تمہیں پتہ ہے شافی بیٹا! تمہاری ماں نے کیا کیا ہے؟'' وہ اُٹھ بیٹھے تھے، دُکھی لہجے میں بولے۔ وہ خاموشی سے انہیں تکنے لگی۔

''وہ ساری زندگی مجھ سے شاکی رہی کہ اس گھر میں وہ آسودگی کو ترس گئی ہے۔ ترس ترس کر اس نے زندگی گزاری ہے اور اس کی بچیوں نے بھی اور میں..... بیٹا! سب کچھ تمہارے سامنے ہے، کس طرح زندگی بھر کولہو کے بیل کی طرح جُتا رہا ہوں، محنت کرتا رہا ہوں تو کس کے لئے؟ اس کے لئے۔ تم لوگوں کے لئے۔ اس گھر کے لئے۔ اور جب یہ گھر میں نے اسے دیا تو بھی وہ شکرگزار نہ ہوئی۔ کہنے لگی کہ اس گھر کو احتشام اور ابتسام کے نام کر دوں۔ اسی طرح محسن بھائی ہماری دونوں بیٹیوں کو بیاہیں گے۔ بیٹا! میرا کیا ہے؟ میں آج ہوں، کل نہیں ہوں گا۔ یہ گھر تم ہی لوگوں کا ہے۔ میں نے تمہارے لئے ہی بنایا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اسے دوسروں میں بانٹ دوں۔ میں نے انکار کیا تو اس نے طلاق مانگ لی۔ بائیس برس کی رفاقت کا بھی اس نے ذرا خیال نہ کیا۔ میں نے بہت سمجھایا، مگر اس کی ایک ہی ضد تھی کہ وہ اب میرے ساتھ رہتے رہتے تنگ آ چکی ہے، اب وہ رہائی چاہتی ہے۔ نہیں تو گھر اس کے بھانجوں کے نام کر دوں۔ گھر میں بدمزگی سے بچنے کے لئے بہت مشکل سے میں نے اس کی خاطر خود کو طلاق دینے پر راضی کر لیا۔ اور اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ طلاق کیوں مانگ رہی تھی۔'' وہ چپ ہو گئے۔ شافعہ ان کی شکل دیکھنے لگی۔

''جوان بیٹیوں کا بھی اس نے کچھ خیال نہیں کیا، دوسری شادی کر لی ہے اس نے،

سندھ کے ایک کروڑ پتی شخص سے۔ جس نے لاکھوں کا حق مہر دیا ہے اسے۔ آسودہ زندگی کی خاطر اس نے نہ تو تم تینوں کی پروا کی اور نہ میری عزت کا ہی کچھ خیال کیا۔ اس نے جو حرکت کی ہے، کل سے سننے کے بعد میرا سکون غارت ہو گیا ہے۔ شافی بیٹا! تمہاری ماں نے اچھا نہیں کیا، مجھے کسی کو شکل دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔'' ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شافعہ خود شاک کی کیفیت میں تھی۔ کچھ دیر کھڑی انہیں روتا دیکھتی رہی۔

''بابا جانی! آپ کھانا کھائیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ آئی پرامس یو بابا جانی! آئی لو یو۔'' اس نے ذرا سا جھک کر باپ کی پیشانی چومی اور میکانکی انداز میں مڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ سید صاحب نے آنسو صاف کئے۔ ان کے دل کا بوجھ ایک دم سے ہلکا ہو گیا تھا۔ انہوں نے کھانے کی ٹیبل اپنے آگے کھسکائی اور پوری رغبت سے کھانا کھانے لگے۔

❖❖○❖❖

پھر دن ایک ایک کر کے گزرنے لگے۔ بے سبب، بوجھل سے دن۔ اور وہ جو دل میں اِک ملال سا تھا ملکہ کے جانے کا، اس کی شادی کے بعد وہ بھی جیسے مٹ سا گیا۔ سید صاحب کی چیمبر میں مصروفیات بہت بڑھ گئیں۔ گھر آ کر بھی وہ رات گئے تک اسٹڈی میں مصروف رہتے۔ رات کے کھانے پر وہ کچھ وقت تینوں بیٹیوں کو دیتے اور صبح بھی جلدی چیمبر چلے جاتے۔ شافعہ کا رزلٹ نکل آیا تھا، وہ پاس ہو گئی تھی۔ سید صاحب نے اسے آگے ایڈمیشن لینے کو کہا مگر اس نے سہولت سے انکار کر دیا۔

''پھر گھر میں کون رہے گا بابا جانی! ان دونوں کو بھی تو پڑھنے جانا ہوتا ہے نا۔ مجھے آگے نہیں پڑھنا۔'' یہ کہہ کر اس نے بات ختم کر دی۔

پھر دن مہینوں کو اپنے گرد لپیٹنے لگے۔ پھر مہینے سالوں میں گم ہونے لگے۔ اس گھر کے سکوت اور سناٹے میں کچھ فرق نہ آیا۔ ہاں، سید صاحب کی صحت دن بہ دن گرنے لگی۔ وہ بے تحاشا کام کی وجہ سے بہت کمزور ہو چلے تھے۔ ہائی بلڈ پریشر اور انجائنا کے روگ ان کو اندر ہی اندر چاٹنے لگے۔ زندگی ڈھلنے کے آثار نظر آنے لگے تھے کہ انہیں یک بیک تینوں بیٹیوں کے تنہا رہ جانے کا خیال ستانے لگا۔ اِدھر اُدھر شافعہ اور عافیہ کے رشتوں کے لئے واقف کاروں سے کہا۔ عافیہ نے اسی سال بی۔اے کیا تھا اور ثانیہ تو ابھی میٹرک میں تھی۔

پھر رنگ رنگ کے لوگ، سید بن کر رشتے دیکھنے آنے لگے اور پہلی بار انہیں شافعہ سے یہ بات کہنا کس قدر دشوار لگا تھا کہ بیٹا! کل تم تیار ہو جانا۔ شام کو کچھ لوگ آئیں گے۔ اور اسی شام شافعہ نے ایک مدت بعد قد آدم آئینے میں اپنے آپ کو غور سے دیکھا۔ اُسے بی۔اے کئے چھ سات سال ہونے والے تھے۔ اس کی ہم عمر کزنز اور دوستیں ایک ایک دو دو بچوں کی مائیں بن چکی تھیں۔ اس کے بالوں میں کہیں کہیں سفید بال جھانکنے لگے تھے۔ اُس روز تو اس نے بالوں کو اُلٹا سیدھا سنوار کر چاندی کے ان تاروں کو چھپا لیا۔ مگر وہ بھی شاید اس کی توجہ کے منتظر تھے۔ چند ہی دنوں میں ان میں یکایک مزید اضافہ ہو گیا۔ اور اب بالوں کو اُلٹا پلٹا کر بھی انہیں نہیں چھپایا جا سکتا تھا۔ عافیہ کے ساتھ وہ بازار گئی تو ڈیپارٹمنٹل اسٹور پر عافیہ کو گھر کے سامان کی لسٹ دے کر خود وہ کاسمیٹکس والی سائیڈ پر آ گئی اور جلدی سے ایک ہیئر ڈائی خرید کر بیگ میں چھپا لیا۔

اب سفید بالوں کو چھپانا کچھ مسئلہ نہیں رہا تھا۔ وہ ہر مہینے انہیں آرام سے ڈائی کر لیتی۔ مگر مسئلہ صرف سفید بالوں کا ہی تو نہیں تھا، ڈھلکتی ہوئی جلد اور مرجھایا ہوا رنگ روپ بھی تھا۔ اسے کس ڈائر سے فریش کرتی؟ اس لئے آنے والوں کی نگاہیں اس کے وجود پر تو اچٹتی سی پڑتیں مگر ''السید وِلا'' پر آ کر جیسے ٹِک کر رہ جاتیں۔

''اچھا، بیٹا کوئی نہیں۔ گھر تو پھر بیٹیوں کا ہی ہوا نا۔'' کئی لالچی منہ پھٹ تو آپے سے باہر ہو کر منہ پر ہی کہہ بیٹھتے۔ سید صاحب نظریں چرانے لگتے۔ آٹھ برس پہلے کا گمان ننگا ہو کر آنکھوں کے سامنے ناچنے لگا تھا۔ انہیں جو اپنے بہن بھائیوں پر صرف شک تھا کہ وہ گھر کے لالچ میں ان کی بیٹیاں بیاہنا چاہ رہے ہیں، آج یہ گمان مجسم ہو کر سامنے آ گیا تھا۔ اور پھر رشتے بھی تو کوئی ڈھنگ کے نہ آتے تھے۔ اوّل تو پورا سید ذات کا ہی مسئلہ تھا۔ ساری دنیا میں نمبر دو کا رواج سا ہو چلا تھا اور جو کوئی اصل سید مل بھی جاتا، وہ کنگال اس حد تک ہوتا کہ جیسے اب نکاح کر کے یہاں سے وہ تا عمر نہیں ہلے گا۔

شافعہ جو اتنے برسوں میں نہیں تھکی تھی، صرف چند دن ایسے لوگوں کی آمد و رفت نے اسے چڑچڑا بنا دیا تھا۔ کوئی بھی تو اسے پسند نہیں کر رہا تھا۔ سب سید صاحب کی جائیداد کے طلب گار بن کر آتے تھے اور جائیداد تو ان تینوں کا حق تھا۔ اکیلی شافعہ کو کیسے مل جاتی؟ اس ذہنی کشمکش نے اسے تھکا کر رکھ دیا۔ اور سید صاحب بھی جیسے چند ہی دنوں میں اُکتا گئے۔ اس روز جب رشتے کے لئے آنے والوں نے صاف کہہ دیا کہ آپ بچی

کو جہیز میں گھر دیں گے تو ان کے غصے کی انتہا ہو گئی۔ انہوں نے انہیں دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ رات کو وہ کھانا کھائے بغیر اسٹڈی میں چلے آئے۔ شافعہ ان کے لئے دودھ لے کر آئی تو وہ ایزی چیئر پر جھولتے، خلاؤں میں گھور رہے تھے۔

''بابا جانی! دودھ پی لیں۔ آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا۔'' اس نے دودھ ٹیبل پر رکھا اور باہر جانے لگی۔

''شافعہ! ادھر آؤ بیٹا!'' انہوں نے کرسی روک کر اسے آواز دی۔

''جی بابا جانی!'' وہ رک گئی۔

''بیٹھو ادھر۔'' انہوں نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''بیٹا! میں بہت شرمندہ ہوں تم سے۔ مگر میں کیا کروں، میرے پاس اور کوئی راستہ بھی تو نہیں۔ آج تمہاری ماں ہوتی تو مجھے ان حالات کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ آنے والے آتے بعد میں ہیں، ماں کے بارے میں معلومات پہلے لے کر آتے ہیں۔ پھر خوامخواہ باتوں باتوں میں طلاق کا سبب پوچھنے لگتے ہیں۔ اور پھر گھر کی ملکیت کا لالچ۔ میرا تو دماغ ماؤف ہونے لگا ہے بیٹا! میں بہت پریشان ہوں اور شرمندہ بھی۔'' ان کا سفید کالے کھچڑی نما بالوں والا سر جھکا ہوا تھا۔

''بابا جانی! آپ ٹینشن نہ لیں۔ پہلے ہی آپ کی صحت اچھی نہیں ہے۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

''تو بیٹا! اور کیا کروں؟ تمہارا خیال آتا ہے تو جی کٹنے لگتا ہے۔ اتنی نیک، سعادت مند بچی میری اور ایسے حالات اور لوگ تو صاف کہتے ہیں کہ جی جیسی ماں ویسی بیٹی ہو گی تو جی چاہتا ہے، ان کے منہ نوچ لوں۔ بیٹا! تمہارا باپ بوڑھا اور لاچار ہو گیا ہے۔ کچھ نہیں کر سکتا تمہارے لئے۔'' وہ ایک دم سے رونے لگے۔ ''میری نیت پر شک نہ کرنا۔''

''بابا جانی! پلیز ایسا نہ کہیں۔ آپ تو ہمارے لئے سب کچھ ہیں، ہمارا فخر ہیں۔ ہم سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ پھر میں آپ کی نیت پر کیسے شک کر سکتی ہوں؟ آپ پلیز روئیں نہیں۔'' وہ ان کے قدموں میں آ بیٹھی۔

''مجھ سے یہ اذیت سہی نہیں جاتی۔ اور پھر بھانت بھانت کے لوگ..... بیٹا! مجھ سے کہاں بھول ہو گئی؟ میں کیا کروں؟'' وہ بلک بلک کر بچوں کی طرح رونے لگے۔

''بابا جانی! پلیز۔'' وہ ان کے ہاتھ سہلانے لگی۔ انہوں نے اپنا سر اس کے ہاتھوں پر ڈال دیا۔

''بابا جانی! دنیا میں سب کی شادیاں تو نہیں ہوتیں، کچھ کی نہیں بھی ہوتیں۔ اور یہ کوئی ایسی ضروری بات نہیں۔ اور میری شادی کا مطلب ہے، میری بہنوں کی اس گھر سے دستبرداری۔ یا پھر مجھے شادی کے بعد سخت ترین آزمائشوں سے گزرنا پڑے گا اگر میں جہیز میں یہ گھر اپنے ساتھ لے کر نہ گئی۔ آج کوئی بھی نیک اور پُرخلوص نہیں۔ ہر چہرے کے اندر ایک اور چہرہ ہے۔ بابا جانی! میں شادی نہیں کروں گی۔ میں یہاں ایسے ہی بہت خوش ہوں۔ آپ کے پاس، عافیہ اور ثانیہ کے ساتھ۔ آپ فکر کیوں کرتے ہیں؟ آپ پرپوزلز لانے والوں کو منع کر دیں۔ پلیز بابا جانی! مجھ سے ان ٹرائلز سے نہیں گزرا جاتا اور پھر آپ کی تکلیف۔ پلیز بابا جانی! آپ سب کو منع کر دیں۔'' اس کی آواز بھرانے لگی۔ اس نے خود پر قابو پایا۔

''بیٹا! تم.....'' انہیں کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہیں۔

''میں ایسے ہی ٹھیک ہوں، آپ فکر نہ کریں۔'' وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ''دودھ پی لیں بابا جانی! ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' اس نے گلاس اٹھا کر ان کی طرف بڑھایا۔

''رکھ دو۔ ابھی پیتا ہوں۔'' انہوں نے افسردہ آواز میں کہا تو وہ گلاس رکھ کر آہستگی سے شب بخیر کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اور ضبط کا جو بند اس نے باپ کے سامنے خود پر باندھا تھا، وہ کمرے میں آتے ہی ٹوٹ گیا۔ کمرے کو لاک کر کے اس نے لائٹ آف کر دی اور تکیے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُس کی سسکیاں چیخوں میں ڈھلنے لگی تھیں۔ اس نے لحاف منہ پر اوڑھ لیا۔ ساری رات وہ اس قدر روئی جیسے اس کی ماں مر گئی ہو۔ اور اسے واقعی لگ رہا تھا کہ ملکہ امی آج ہی مری ہیں اور ان پر رونے والا اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ یا شاید وہ خود مر گئی تھی اور اس کے زندہ جنازے پر بھی اس کے اپنے سوا کوئی رونے والا نہیں تھا۔

❖❖○❖❖

پھر رشتے آنے بالکل موقوف ہو گئے۔ شاید سید صاحب نے سب کو منع کر دیا تھا۔ بظاہر اس نے شکر ادا کیا تھا، مگر اندر کوئی اس لاوارث زندہ لاش پر ہمک ہمک کر رونے لگا، جسے چپ کرواتے کرواتے وہ خود فرسٹریٹ ہو جاتی۔ وہ کمرہ بند کر کے گھنٹوں تنہا بیٹھی چھت کو گھورے جاتی۔ اسے لگتا، اس پوری کائنات میں وہ بالکل تنہا ہے، بالکل اکیلی۔ ملکہ صحیح کہتی تھیں، اس گھر کی بنیاد کو اینٹ گارے سے نہیں، ان کی حسرتوں اور آنسوؤں کے لہو سے سینچا گیا ہے اور یہ لہو اس گھر میں کسی خوشی کو نہیں آنے دے گا۔ اس

گھر سے خوشیاں ناپید ہو چکی ہیں۔

سید صاحب اب چھڑی کے سہارے چلنے لگے تھے۔ ان کی اکڑی ہوئی کمر میں خم آ گیا تھا۔ تھوڑا سا چلنے کے بعد وہ تھکنے لگتے تھے۔ وہ اب ریٹائرمنٹ کے بارے میں سوچنے لگے تھے۔ عافیہ کا ایم۔اے اسلامیات کا رزلٹ آتے ہی اسے کالج میں لیکچرر شپ مل گئی تھی۔ اتنے سارے سالوں میں یہ واحد ننھی سی خوشی تھی، جو لمحہ بھر کو اس گھر میں ٹمٹمائی تھی۔ عافیہ، شافعہ کی طرح ہی خاموش طبع اور سنجیدہ تھی۔ سید صاحب کی سعادت مند بیٹی، اُن کی ہر بات بلا چوں چرا ماننے والی، سید صاحب کی چھڑی کی ٹِک ٹِک سنتے ہی اچھی طرح دوپٹہ اوڑھ کر سر جھکا دینے والی۔ البتہ ثانیہ کچھ کچھ شوخ اور لاپروا تھی۔ ویسے بھی بڑی دونوں بہنیں اُس کا بے حد خیال رکھتی تھیں۔ پھر وہ سید صاحب کی بھی لاڈلی تھی۔ اس کی بہت سی بچکانہ حرکتوں اور باتوں پر جان کر بھی انجان بن جاتے۔

دوسرے گھر کے کرائسز کے بارے میں اسے زیادہ علم نہیں تھا اور لاعلمی تو ہزار نعمت ہے۔ اور وہ اسی نعمت سے فیض یاب ہو رہی تھی۔ کچھ اس کی عمر بھی ایسی تھی کہ جب کوئی بھی فکر، کوئی بھی ٹینشن ذہن پر بہت دیر تک طاری نہیں رہتی۔ وہ اب فرسٹ ایئر میں تھی۔ شوخ رنگوں کے لباس پہننا پسند تھا۔ گھر کے دوسرے تینوں افراد کی پسند سے قطع نظر جن کے لباس میں سفید رنگ لازمی جزو ہوتا تھا۔ سید صاحب لٹھے کی کڑکڑاتی شلواریں، سیاہ شیروانی کے ساتھ پہنتے تھے تو شافعہ اور عافیہ کے لباس اگر رنگین ہوتے تھے تو دوپٹے سفید براق۔ کبھی کبھی تو ثانیہ کو ان کی سفید رنگ سے اس درجہ محبت سے چڑ ہونے لگتی۔

''توبہ ہے آپا! ہر وقت سفید رنگ، جیسے گھر میں انسان نہیں روحیں رہتی ہوں۔ کبھی تو پورا کلرڈ سوٹ پہن لیا کریں۔'' وہ بول اُٹھتی۔ مگر ان دونوں پر اس بات کا کم ہی اثر ہوتا تھا۔

اسے زندگی سے پیار تھا، وہ ٹی وی کے میوزیکل پروگرامز بھی بلند آواز میں سنتی، چاہے سید صاحب گھر پر موجود ہوتے۔ وہ دونوں بہنوں کے گھورنے کی بھی پروا نہ کرتی۔ اس کی عمر ہی ایسی تھی۔

❖❖○❖❖

دسمبر کا مہینہ تھا اور سردی اپنے پورے جوبن پر تھی۔ ہر دوسرے تیسرے دن سردی کی دھیمی دھیمی بارشوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اس روز بھی صبح سے بارش ہو رہی تھی۔ دھند اور بادل نے سارے آسمان کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ سید صاحب کا پہلے تو ارادہ نہیں تھا چیمبر جانے کا، مگر پھر کسی کلائنٹ کا فون آ گیا۔ وہ آفس میں بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ انہیں رات ہی سے کچھ بخار تھا۔ گرم بستر سے اُٹھ کر چل پڑے۔ شافعہ نے انہیں بہت روکا مگر وہ ایک آدھ گھنٹے میں آنے کا کہہ کر چلے گئے۔ گاڑی سے نکلتے ہی سرد برفیلی ہواؤں اور ٹھنڈی بارش کی بوندوں نے ان کا استقبال کیا۔ گاڑی پارکنگ سے کافی دور کھڑی کرنا پڑی۔ سیڑھیاں چڑھ کر جان بھی بے کار ثابت ہوا کہ وہ کلائنٹ واپس جا چکا تھا۔ سردی سے ان کا جسم کپکپا رہا تھا، انہی قدموں پر واپس لوٹ آئے۔ پھر جو گھر آ کر انہیں سردی لگی کہ شام تک جسم کی کپکپاہٹ ہی ختم نہ ہوئی۔ ڈاکٹر نے گھر آ کر چیک کیا۔ انجکشن لگایا، دوا دی، مگر ان کی سردی کو افاقہ نہ ہوا۔ اگلے روز انہیں ٹوٹ کر بخار چڑھا اور نمونیہ ہو گیا۔

عافیہ نے اُس روز کالج سے چھٹی کی۔ دونوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ باپ کی حالت دیکھ کر۔ دوپہر تک ان کی حالت بگڑ گئی۔ انہوں نے ڈاکٹر کو فون کر کے پھر بلوا لیا۔

''انہیں ہاسپٹل ایڈمٹ کر دیتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد کہا۔

''نہیں ڈاکٹر صاحب! میں ہاسپٹل نہیں جاؤں گا۔ آپ یہیں کوئی دوا لکھ دیں۔ میں ٹھیک جاؤں گا۔'' سید صاحب نے نیم بے ہوشی کے عالم میں جواب دیا۔

''سید صاحب! آپ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ہاسپٹل ایڈمٹ ہو جائیں۔ دو تین روز میں ٹھیک ہو جائیں گے۔'' ڈاکٹر نے نرمی سے کہا۔

''نہیں ڈاکٹر صاحب! میں گھر پر ہی ٹھیک ہوں۔ آپ یہیں کوئی دوا لکھ دیں۔'' وہ پھر نقاہت بھری آواز میں زور سے بولے تو ڈاکٹر نے بے بسی سے شافعہ اور عافیہ کی طرف دیکھا۔

''بابا جانی! ڈاکٹر صاحب کہہ رہے ہیں۔ ہم آپ کو ہاسپٹل لے چلتے ہیں۔'' عافیہ آگے بڑھ کر ان کے چہرے پر جھک کر بولی۔

''نہیں بیٹا! میں یہیں ٹھیک ہوں، تم لوگ اصرار نہ کرو پلیز۔'' وہ بڑی مشکل سے بولے ان کے چہرے کا رنگ پیلا زرد ہو رہا تھا۔

''چلیں پھر رہنے دیں۔ میں دوا بدل دیتا ہوں۔ آج رات دیکھتے ہیں نہیں تو کل

کچھ سوچیں گے۔ اللہ کرے رات بھر میں یہ بہتر ہو جائیں۔'' ڈاکٹر نے نسخہ لکھنا شروع کیا۔ رات تک ان کی حالت بہتر ہو گئی۔ مگر آدھی رات کو ان کی طبیعت اچانک پھر بگڑ گئی۔ شاید سردی کی شدت کی وجہ سے۔ باہر ہوائیں یکایک برفیلی ہو گئی تھیں۔ عافیہ جو ان کے پاس ہی بیٹھی تھی، گھبرا کر اُٹھی۔ بھاگ کر شافعہ اور ثانیہ کو بلا لائی۔

''بابا جانی!..... بابا جانی! کیا ہوا؟..... کیا زیادہ طبیعت خراب ہے؟'' شافعہ نے انہیں اپنا سینہ زور زور سے رگڑتے دیکھ کر پوچھا۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ان کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا اور ماتھا پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے تھے، انہیں ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے، جو صاف ہارٹ اٹیک کی نشانی تھی۔

''او میرے مالک۔ جاؤ ثانیہ! بھاگ کر ڈاکٹر صاحب کو فون کر کے آؤ۔ بابا جان کی طبیعت بہت خراب ہے۔'' شافعہ ان کی ہتھیلیاں رگڑتے ہوئے بولی۔

ثانیہ جلدی سے بھاگ گئی۔ باہر بارش ہو رہی تھی بادل گرج رہے تھے۔ ایسے میں ڈاکٹر کا آنا بھی مشکل لگ رہا تھا۔

''بابا جانی! بولیں نا، آپ ٹھیک ہیں؟'' عافیہ ان کا ماتھا پونچھتے ہوئے بولی۔

''شافعہ.....!'' سید صاحب نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''جی بابا جانی!'' وہ ان کے چہرے پر جھک آئی۔

''بیٹا! میرے بعد تم لوگ اکیلے رہ جاؤ گے نا؟'' انہوں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے عجیب سی وحشت برس رہی تھی، جس میں بے بسی، خوف اور لاچاری تھی۔ شافعہ کا دل جیسے تھم سا گیا۔

''مگر میں.....'' ان کا سانس پھولنے لگا۔ ''تنہا نہیں ہونے دوں گا۔'' وہ بے قراری سے اُٹھنے لگے۔ ''تم تینوں کو.....'' انہیں سانس لینا دشوار ہو گیا۔

''بابا جانی! لیٹے رہیں۔'' شافعہ نے انہیں لٹانا چاہا۔

''میں تم لوگوں کے ساتھ ہی رہوں گا، اس گھر میں ہمیشہ۔'' ان کا سانس اُکھڑنے لگا۔ حلق سے عجیب طرح کی آوازیں آنے لگیں۔ رنگ ایک دم سے نیلا سیاہ پڑنے لگا۔ ہوا کے تیز جھونکے سے کھڑکی کے دونوں پٹ کھل گئے۔ تیز بوندوں کی بوچھاڑ سی اندر آ گئی۔ باہر ہوا ہولناک آوازیں نکال رہی تھی۔

''بابا جانی!..... بابا جانی!'' عافیہ رونے لگی۔

''بڑی آقا! بڑی آپا! فون ڈیڈ پڑا ہے۔ باہر بارش کے ساتھ بہت تیز ہوا چل رہی

ہے۔ لائنوں میں گڑبڑ ہو گئی ہے شاید۔'' ثانیہ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ اندر آ کر بولی۔

''شافعہ!'' سید صاحب نے بمشکل پکارا۔

''جی بابا جانی!'' اس نے آنسوؤں کو جھٹکا۔

''بیٹا! میری وصیت ہے کہ.....'' انہیں ہچکی سی آئی۔ ''مرنے کے بعد مجھے اس گھر کے پچھلے لان میں دفن کرنا۔ میں تم لوگوں کے پاس ہی رہوں گا، ہمیشہ۔ وعدہ کرو، مجھے یہیں دفن کرو.....'' انہوں نے تیزی سے جملہ مکمل کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کا چہرہ تاریک پڑ گیا تھا اور سینے میں سانسوں کا زیر و بم مدھم پڑ رہا تھا۔ انہوں نے دایاں ہاتھ اٹھا کر سینے پر رکھنا چاہا، مگر راستے میں ہی ہاتھ بے جان ہو کر گر پڑا۔

''مم..... میں.....'' انہوں نے وحشت بھری آنکھیں کھول کر تینوں کی طرف بے بسی سے دیکھا۔

''بابا جانی!..... بابا جانی!'' عافیہ چیخنے لگی۔ ''ایسا نہ کہیں۔ ہم اکیلے رہ جائیں گے۔''

انہوں نے زور سے سر ہلایا۔

''نن..... نہیں۔ میں تم لوگوں کے پاس رہوں گا۔ وعدہ کرو شافی!'' انہوں نے پھر ہاتھ اٹھانا چاہا۔

''بابا جانی! وعدہ، آپ کو..... بابا جانی!..... بابا جانی!''

اُن کا جسم زور سے لرزا۔

''ثانیہ کا خیال رکھنا۔ مم..... میں.....'' ان کی بند آنکھوں اور ڈھیلے پڑے ہاتھ پاؤں اور جسم نے بتا دیا کہ انہوں نے اس وعدے کے آگے کچھ اور نہیں سننا۔ ان تینوں کی چیخوں سے وہ کبوتری کے انڈے جیسی سفید کوٹھی اس تاریک بھیگی رات میں لرز اُٹھی۔

❖❖○❖❖

پھر ان کی میت کو دفنانے والے کتنے ہی لوگوں نے چاہا کہ سید صاحب کو میانی صاحب میں دفن کیا جائے، مگر ان کی بیٹیاں نہیں مانیں اور قریبی رشتہ دار کوئی تھا نہیں کہ محسن تایا کینیڈا میں احتشام کے پاس ہوتے تھے، ابتسام فرانس میں اور سیدہ خالہ کا دو سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ اور ملکہ کہاں تھیں، اس کی کسی کو کچھ خبر نہ تھی۔ ان کی ضد پر مجبوراً انہیں گھر کے پچھلے لان میں دفن کر دیا گیا۔ اور وہ جو مُردے کو دفن کرنے کے بعد

لوگ گھر لوٹتے ہیں تو ایک سکون سا محسوس کرتے ہیں، تو اس گھر کو وہ سکون بھی نصیب نہ ہوا۔ اب اس گھر کے مکینوں میں تین زندوں کے ساتھ ایک مُردہ بھی تھا۔ ثانیہ کو اس خوف سے کئی راتیں نیند نہیں آئی۔ وہ تو پچھلی طرف کھلنے والی کھڑکی سے جھانکتی بھی نہیں تھی کہ مبادا مٹی کے اس گیلے ڈھیر پر نظر نہ پڑ جائے، جہاں بڑی آپا روز فاتحہ خوانی کے لئے جاتی ہیں۔ وہ سید صاحب کی زندگی میں جتنی ان کی پیاری تھی، ان کے بعد ان کے مرقد سے سب سے زیادہ وہی خوف زدہ تھی۔ اور یہ عجیب انسانی نفسیات ہے کہ وہ لوگ جو ہمیں اپنی جان سے بھی بڑھ کر پیارے ہوتے ہیں زندہ حالت میں، مُردہ حالت میں ہم ان ہی سے خوف کھانے لگتے ہیں، ان کے بے جان وجود سے جلد سے جلد پیچھا چھڑا لینا چاہتے ہیں۔ گھر کی فضا اور بھی خاموش اور پُرہول ہو گئی تھی۔ اسی سناٹے اور اُجاڑ پن سے گھبرا کر ثانیہ نے اگلے ہفتے ہی کالج جانا شروع کر دیا۔

ہال کمرے میں سفید چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں، جن پر گٹھلیوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ بڑی آپا، بجو اور کچھ اردگرد کے گھروں سے آئی خواتین صبح سے لے کر مغرب تک وہ گٹھلیاں پڑھتی رہتیں اور ثانیہ ان کا ساتھ دینے کے لئے قرآن پاک لے کر بیٹھ جاتی۔

اور وقت بھی کبھی تھما ہے؟ وہ گنتی کے چالیس دن بھی گزر گئے۔ ان کے گزرنے کا گھر کی فضا پر تو کوئی خاص اثر نہ پڑا بلکہ وہ اور بھی اُداس اور ویران سی ہو گئی کہ لوگوں کا آنا جانا بالکل ختم ہو گیا۔ ہال کمرے سے چاندنیاں اُٹھا لی گئیں۔ عافیہ کالج جانے لگی اور شافعہ پھر سے گھر کے کاموں میں جت گئی۔ فرصت کے اوقات میں وہ سید صاحب کی قبر پر پہنچ جاتی پتہ نہیں، اسے وہاں کیا طمانیت ملتی تھی۔

ایسے ہی ایک روز جب ثانیہ اور عافیہ کالج گئی ہوئی تھیں، بیل بجنے پر شافعہ نے گیٹ کھولا تو سامنے ملکہ کھڑی تھیں۔

''شانی!'' ان کے ترسے ہوئے ہونٹوں سے صرف یہی نکلا۔

''جی فرمائیے۔'' وہ سرد لہجے میں بولی

''شانی! میں ملکہ امی ہوں۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟'' وہ اسے گلے لگانے کے لئے آگے بڑھیں۔ ان کے رنگ روپ میں ذرا فرق نہ آیا تھا۔

''کوئی کام ہے آپ کو؟'' وہ اسی سرد لہجے میں بولی۔

''میں تم سے، عافیہ اور ثانیہ سے ملنے آئی ہوں۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟'' انہوں نے آگے بڑھنا چاہا۔ وہ مضبوطی سے دروازے میں جم کر کھڑی تھی۔

''مگر ہم آپ سے نہیں ملنا چاہتے۔'' وہ بیگانگی سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

''شانی! مجھے اندر تو آنے دو۔ مجھے صفائی کا موقع تو دو۔'' انہوں نے پھر ایک قدم آگے بڑھایا۔

''یہاں آپ کا شناسا کوئی نہیں رہتا۔ یہاں ہم رہتے ہیں، سید محتشم ہاشمی کی بیٹیاں، جن سے آپ کا کوئی تعلق، واسطہ نہیں۔ اس لئے اندر آنے کی ضرورت نہیں۔ جائیں یہاں سے۔'' کہہ کر اس نے زور سے گیٹ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔

''شانی!.....شانی بیٹا! ایسا نہ کرو۔ بیٹا! میں نے بارہا ادھر آنے کی کوشش کی، مگر تمہارے باپ نے اجازت نہیں دی بیٹا! میری بات تو سن لو۔ یوں مجھ سے خفا نہ ہو۔'' وہ بند گیٹ کو دھڑ دھڑاتے ہوئے بے قراری سے بولیں۔

''آپ چلی جائیں یہاں سے۔ یہاں آپ کا کوئی نہیں رہتا۔'' وہ کہہ کر دوڑتی ہوئی اندر چلی گئی۔ پیچھے سے گیٹ کتنی دیر بجتا رہا اور وہ ساعتوں کو پتھر کئے کچن میں کھڑی ہنڈیا بھونتی رہی۔ آخر گیٹ بجنا بند ہو گیا تو اس نے ایک دم سے چولہا بند کر دیا اور زمین پر اکڑوں بیٹھ کر رونے لگی۔

'مائیں ایسی ہوتی ہیں، بے حس اور خود غرض۔ ایسی ماؤں کو تو مر جانا چاہئے۔ یہ ابھی تک زندہ کیوں ہیں؟ اپنی خواہشوں کے آگے جنہوں نے بیٹیوں کے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ ایسی خود غرض ماؤں کو مر جانا چاہئے۔ میں انہیں ماں کیوں کہوں، جو میرے مرے ہوئے باپ کو برا کہتی ہیں؟ ان سے اچھا تو ہمارا باپ ہی ہے، جس نے ہمیں مر کر بھی تنہا نہیں چھوڑا۔'

وہ تپتی دوپہر میں اُٹھ کر سید صاحب کی قبر پر آ گئی۔

❖❖○❖❖

''ثانیہ یار! تم لوگوں نے ایک بات نوٹ کی ہے؟'' علینہ نے فائل بند کرتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' ثانیہ نے اسے دیکھا۔ فروا بھی متوجہ ہو گئی تھی۔

''یہ جو حضرات ہمارے سامنے بینچ پر بیٹھے ہیں، اتنی کڑکتی دھوپ میں بلیک سوٹ پہنے کئی دنوں سے ہم جہاں جاتے ہیں، یہ ہمارے پیچھے ہوتے ہیں۔'' علینہ نے ترچھی نگاہوں سے سامنے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ان دونوں نے بھی بچی نظروں سے

دیکھا۔ وہ واقعی ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔

''بندہ تو ہینڈسم ہے اور بلیک کلر اس پر خوب جچ رہا ہے۔'' ثانیہ بولی۔

''ارے یہ پروفیسر زمان کا بھانجا معاذ ہے۔ ایم فارمیسی کے فائنل ایئر کا اسٹوڈنٹ ہے۔ بلکہ فائنل والوں کا یہ جو آخری پیپر اٹکا ہوا ہے، اس کے لئے یہ لوگ یونیورسٹی آ رہے ہیں۔'' فروا نے انہیں معلومات پہنچائیں۔

''تمہیں کیسے معلوم ہے یہ سب؟'' علینہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

''یہ میرے کزن عاطف کا کلاس فیلو ہے۔ ایک دو بار چچا جان کے گھر ہی ملاقات ہوئی ہے۔ آؤ، تعارف کروا دوں۔'' اس نے آفر کی۔

''تھینک یو۔ ہمیں کوئی شوق نہیں۔'' علینہ بڑبڑائی۔

''نہ سہی۔'' فروا نے کندھے اچکائے۔

''لیکن میری بات پھر وہیں رہ گئی کہ یہ حضرت ہم میں سے کس کے پیچھے آتے ہیں۔ پچھلے ایک ہفتے سے میں نوٹ کر رہی ہوں۔''

''گولی مارو، جس کے بھی پیچھے آتے ہیں۔ کلاس کا ٹائم ہو گیا ہے، چلو چلتے ہیں۔'' ثانیہ کہہ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دونوں بھی اس کے ساتھ ہی کھڑی ہو گئیں۔

اور کلاسز آف ہونے کے بعد علینہ اور فروا اپنے اپنے پوائنٹ سے گھر چلی گئیں، وہ اپنے پوائنٹ کے انتظار میں کھڑی تھی، جب وہی شخص گاڑی لے کر اس کی طرف آیا۔

''آیئے مس ثانیہ! میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔'' اس نے کھڑکی سے سر نکال کر اسے آفر کی۔

''جی نہیں، تھینک یو۔'' کہہ کر وہ اپنے پوائنٹ کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''پلیز مس ثانیہ! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔'' وہ پھر بولا۔

''میرا آپ سے ایسا کوئی تعلق نہیں۔ میرا پوائنٹ آ گیا۔'' وہ تیزی سے اپنے پوائنٹ کی طرف بڑھ گئی۔

چوتھے روز جب علینہ اور فروا دونوں ہی یونیورسٹی نہیں آئی تھیں، معاذ اس سے لائبریری جاتے ہوئے ٹکرا گیا۔

''ہیلو مس ثانیہ! کیا حال ہے؟'' وہ بے تکلفی سے بولا۔ وہ اسے محض گھور کر رہ گئی۔

''میں نے حال پوچھا ہے، ٹیکس تو نہیں مانگا۔'' وہ اس کے گھورنے پر بولا۔

''پلیز مس ثانیہ! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔'' وہ اسے قدم آگے بڑھاتے

دیکھ کر تیزی سے بولا۔

''مگر مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننی۔ آخر آپ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟'' وہ جھنجلا کر بولی۔

''آخر بات سننے میں کیا حرج ہے؟ پلیز! صرف پانچ سات منٹ لگیں گے یا اس سے بھی کم۔'' وہ لجاجت سے بولا۔

''اچھا سنائیں۔'' وہ اکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

''یہاں نہیں، کسی پُرسکون جگہ پر۔'' وہ اردگرد سے گزرتے اسٹوڈنٹس کو دیکھ کر بولا۔

''لائبریری جا رہی ہوں میں۔ وہ خاصی پُرسکون جگہ ہے۔'' اس نے قدم آگے بڑھائے۔

''نہیں، اب اتنی بھی پُرسکون جگہ نہیں چاہئے۔ یہ ذرا ادھر دوسری طرف آ جائیں۔'' وہ لائبریری کے پچھلی طرف بڑھا تو مجبوراً اسے بھی اس کے پیچھے جانا پڑا۔

''جی فرمایئے۔'' وہ بولی۔

''پلیز بیٹھ جائیں۔'' وہ سیڑھیوں میں بیٹھ کر بولا تو وہ پھر ذرا فاصلے پر بیٹھ گئی۔

''ثانیہ! آپ مجھے نہیں جانتیں۔ میں آپ کو تقریباً اس وقت سے جانتا ہوں، جب سے آپ نے یہاں ایڈمیشن لیا تھا۔ کسی میں دلچسپی لینے کا کیا مطلب ہوتا ہے، یہ آپ جانتی ہوں گی۔ مگر میں اپنی دلچسپی آپ پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ یونیورسٹی کی فضا اسکینڈلز کے لئے بڑی زرخیز ہوتی ہے۔ دوسرے اس سے آپ کا تعلیمی کیریئر ڈسٹرب ہوتا۔ اب جبکہ میری تعلیم مکمل ہے اور مجھے فوراً جاب بھی مل گئی ہے، آپ کا بھی فائنل ایئر ہے، اب بار بار میرا اس طرح یونیورسٹی آنا مشکل ہو گا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ جانے سے پہلے آپ سے بات کر لوں۔''

وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

''آپ سن رہی ہیں نا؟'' وہ بولا۔

''جی۔'' اس نے سر ہلایا۔

''ثانیہ! اب جبکہ مجھے رزلٹ سے پہلے ہی اتنی اچھی جاب مل گئی ہے۔ میرے دو بھائی اور ایک بہن ہیں، تینوں شادی شدہ ہیں۔ یعنی گھر کی طرف سے بھی کچھ خاص پابندی نہیں۔ اس لئے میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں.....'' وہ جھجک کر چپ کر گیا۔

''ثانیہ! آئی وانٹ ٹو میری یو۔'' وہ کچھ دیر بعد مدھم آواز میں بولا تو اس کا دل زور

سے دھڑک اٹھا۔ وہ خاموش رہی۔

''آپ کچھ نہیں کہیں گی؟'' وہ کچھ دیر بعد بولا۔

''آپ کو اس کام کے لئے تھرو پراپر چینل آنا چاہئے کہ یہ فیصلے بڑوں کے کرنے کے ہوتے ہیں۔ میری کلاس کا ٹائم ہے۔ ایکسکیوز می۔'' کہہ کر وہ پل بھر میں وہاں سے غائب ہوگئی۔ معاذ کے ہونٹ اس کی بات پر مسکرا اُٹھے تھے۔ اور اسے تو اس بات کا یقین ہی نہیں تھا، جب تیسرے روز سر زمان ایک مدبر خاتون کے ساتھ معاذ کا پرپوزل اس کے لئے لے کر آئے۔ وہ تو انہیں سلام کر کے فوراً ہی ڈرائنگ روم سے نکل کر پچھلی طرف آ گئی، جہاں کھڑکی سے صاف آوازیں آ رہی تھیں۔

''زمان صاحب! ہمیں خوشی ہے کہ آپ چل کر ہمارے گھر آئے ہیں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں یہ رشتہ قبول نہیں کر سکتی۔ ہم سید ہیں۔ آؤٹ آف کاسٹ شادی نہیں کرتے۔ آپ کھانا کھا کر جائیے گا۔''

یہ کہہ کر بڑی آپا کمرے سے باہر نکل آئی تھیں اور سبکی کے احساس سے ثانیہ کے ماتھے پر پسینہ آ گیا تا۔ اس کا اتنا قابل استاد اور اس کے ساتھ یہ سلوک۔ بڑی آپا بھی حد کرتی ہیں کبھی کبھی۔ وہ ساری رات اپنا خون جلاتی رہی۔

❖❖○❖❖

''ثانیہ! یہ کیا طریقہ ہوا جواب دینے کا؟ ہم آج بھی اس جہالت کا مظاہرہ کر رہے ہیں، جس میں چودہ سو سال پہلے اُلجھے ہوئے تھے۔'' اگلے روز چھٹی تھی، فون کی چوتھی بیل پر اس نے ریسیور اٹھایا تو معاذ نے چھوٹتے ہی کہا۔ وہ تو اس کی آواز سن کر ہی حیران رہ گئی تھی۔

''آپ کو میرا فون نمبر کہاں سے ملا؟'' وہ حیرت سے یہی کہہ سکی۔

''اس بات کو چھوڑیں، میں جو بات کہہ رہا ہوں، اس کا جواب دیں۔''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں؟'' وہ بے بسی سے بولی۔

''آپ نے مجھے تھرو پراپر چینل آنے کو کہا تھا۔ وہی تو میں نے کیا ہے۔ اب یہ ذات پات کا مسئلہ کیوں اٹھایا گیا؟'' وہ خوامخواہ ہی اس پر خفا ہو رہا تھا۔

''یہ مسئلہ تو پہلے دن سے ہے، یہ تو حقیقت ہے نا کہ ہم سید ہیں۔''

''لیکن یہ کس حدیث میں آیا ہے کہ سید، غیر سید میں شادی نہیں کر سکتے؟''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں؟''

''کوئی بیچ کا راستہ نہیں ہے؟''

''شاید نہیں۔''

''اور یہ نہیں اس لئے بھی کہ آپ کی دونوں بڑی بہنوں نے شادی نہیں کی اور شاید وہ آپ کی بھی نہیں کرنا چاہتیں۔ وہ اس گھر کو قبرستان بنا کر رہنا چاہتی ہیں، قبروں کی مجاور بن کر۔ ثانیہ! یہ سراسر جہالت ہے۔'' اسے سب باتوں کا علم تھا۔ وہ خاموش رہی۔

''تمہاری کیا رائے ہے؟''

''میں کیا کہوں؟ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیونکہ آج نہیں تو کل ایسا کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی تھا۔ تب بھی بڑی آپا کا یہی جواب ہونا تھا۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

''مگر میں ان کے جواب کو نہیں مانتا۔ تم عاقل و بالغ ہو، خود فیصلہ کرو۔'' وہ اسے بغاوت پر اُکسانے لگا۔

''معاذ صاحب! میں ایسا کچھ بھی، کبھی بھی نہیں کروں گی۔'' وہ مستحکم لہجے میں بولی۔

''اچھا خیر، میں کل یونیورسٹی آؤں گا۔ بیٹھ کر بات کریں گے۔''

''نہیں، میں اس بات کو مناسب نہیں سمجھتی۔ آپ کل نہیں آئیں گے۔''

''میں کل ضرور آؤں گا۔ گیارہ بارہ بجے کے درمیان۔ اوکے، خدا حافظ۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

بہت سوچ بچار کے بعد اس نے اگلے روز یونیورسٹی سے چھٹی کر لی۔ ابھی وہ ان مسئلوں میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ شام کو ہی اس کا فون آ گیا۔

''تم یونیورسٹی کیوں نہیں آئیں؟''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔''

''جھوٹ مت بولو۔''

''میں جھوٹ نہیں بول رہی۔'' اس کے حاکمانہ انداز سے وہ چڑ کر بولی۔

''اچھا خیر۔'' وہ ایک لمحے کو چپ کر گیا۔ ''ثانیہ! یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ تم فرار کی راہ اختیار مت کرو۔''

وہ خاموش رہی۔

''تم خود عقل مند ہو۔ خود سوچو۔ اپنا برا بھلا سوچ سکتی ہو۔''

''ابھی میں ان سوچوں میں نہیں پڑنا چاہتی۔ کم از کم سات آٹھ ماہ تک۔ میرا فائنل ایئر ہے، مجھے اس کی زیادہ فکر ہے۔ آپ اس دوران مجھے کچھ سوچنے دیں۔ اور ہاں، اس

دوران آپ نہ تو مجھ سے ملیں گے نہ کوئی رابطہ رکھیں گے۔'' صبح سے سوچی ہوئی بات اس نے کہہ دی۔

''ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔ آج سے ٹھیک چھ ماہ بعد شام پانچ بجے میں تمہیں فون کروں گا، اٹھارہ تاریخ کو۔'' وہ بھی شاید سارا کچھ پہلے سے طے کئے بیٹھا تھا۔

''ٹھیک ہے، میں اس بارے میں سوچوں گی۔''

''جواب مثبت ہونا چاہئے۔''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اوکے، خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔''

''اچھا ہے، چھ ماہ تک میں دل جمعی سے ایگزام تو دے سکوں گی۔ شاید آپا کے روّیے میں بھی اس دوران کچھ لچک پیدا ہو جائے۔'' وہ سوچتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

❖❖○❖❖

اور چھ ماہ کون سے بہت طویل تھے، ایک ایک کر کے گزرتے چلے گئے اور وہ تو پڑھائی میں اس بری طرح مگن ہوئی تھی کہ معاذ کو تقریباً بھول ہی چلی تھی کہ اٹھارہ تاریخ کو پانچ بجے اس کا فون آ گیا۔ بڑی آپا نماز پڑھ رہی تھیں۔ بجو کچن میں تھیں۔ ثانیہ نے فون اٹھایا۔

''السلام علیکم ثانیہ! کیا حال ہے؟ پہچانا؟'' اس کی آواز پہلے دن کی طرح تروتازہ تھی۔

''وعلیکم السلام۔ پہچان لیا۔'' اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

''دیکھو، چھ ماہ گزر گئے اور جس طرح گزرے ہیں، میرا دل جانتا ہے۔ اب تم بتاؤ، تم نے کیا سوچا ہے؟'' وہ چھوٹتے ہی موضوع کی طرف آ گیا۔

''معاذ! میرے ایگزام ہیں اگلے ماہ۔ پلیز مجھے دو ماہ کی مہلت اور دیں۔ میری دو سال کی محنت ہے، پھر میں بالکل فارغ ہوں گی۔'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی لجاجت سے بولی۔

''ہاں مجھے معلوم ہے۔ چلو ٹھیک ہے۔ جہاں چھ ماہ، وہاں دو ماہ اور سہی۔ تم اچھی طرح پوری یکسوئی سے ایگزام دے لو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' اس نے آرام سے کہا۔

''اچھا، پھر بات ہو گی۔'' اس نے فون بند کرنا چاہا۔

''حال چال نہیں پوچھو گی؟'' اس کا دل باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا۔

''نہیں، فی الحال کچھ نہیں۔ اوکے، خدا حافظ!''

''خدا حافظ!''

اگلے ماہ اس کے ایگزام شروع ہو گئے۔ اس نے پوری یکسوئی سے پیپرز دیئے۔ ایک پورا دن اس نے بھرپور نیند لی۔ اگلے روز وہ ناشتے سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ فون کی بیل بج اٹھی۔

''السلام علیکم ثانیہ! کیا حال ہے؟'' اس کے کان جس آواز کو سننا چاہتے تھے، دوسری طرف وہی آواز تھی۔

''وعلیکم السلام! فائن۔ آپ سنائیں۔''

''میں بھی ٹھیک ہوں۔ ایگزام کیسے ہوئے؟''

''بہت اچھے۔''

''چلیں، یہ تو خوشی کی بات ہے۔'' دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔

''ثانیہ! اب میرے لئے کیا حکم ہے؟'' وہ کچھ دیر بعد بولا۔

''میں کیا بتاؤں؟''

''یہ بات تو تم نے آٹھ ماہ پہلے کہی تھی، مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟''

''معاذ! آپ ایک بار پھر اپنے گھر والوں کو بھیجیں۔ دیکھتے ہیں، بڑی آپا کیا کہتی ہیں۔ اس کے بعد پھر سوچیں گے۔'' وہ کچھ دیر بعد بولی۔

''یہ ہوئی نا بات۔ میں کل ہی ماموں جان اور امی کو بھیجتا ہوں۔'' وہ خوش ہو گیا۔

''ٹھیک ہے، اب اجازت دیں۔''

''اتنی جلدی، مجھے تو بہت سی باتیں کرنی ہیں ابھی۔''

''نہیں، بڑی آپا چائے پر میرا انتظار کر رہی ہیں۔ پھر سہی۔ خدا حافظ!''

❖❖○❖❖

اگلے روز پروفیسر زمان اپنی بہن کے ساتھ پھر آ گئے اور شافعہ نے پھر انہیں وہی جواب دیا۔ عافیہ نے ثانیہ کو بتایا تو اسے شدید غصہ آیا۔ اس نے غصے میں رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ دونوں بہنوں نے اصرار کیا، وہ انکار کر کے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

'آخر بڑی آپا کیوں نہیں مانتیں؟' وہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔

اگلے روز پھر معاذ کا خفگی بھرا فون آ گیا۔ وہ اس کی باتیں چپ کر کے سنتی رہی، پھر خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ کچھ دیر بیٹھی وہ وچتی رہی۔ تین چار سال پہلے تک عافیہ بجو کے بھی اسی طرح پرپوزل آتے رہتے تھے۔ کبھی ان کی کسی کولیگ کے بھائی کا، کسی کزن کا، کسی رشتہ دار کا۔ اور بڑی آپا ہر بار ذات پات کا مسئلہ کھڑا کر کے پرپوزل کو ریجیکٹ کر دیتی تھیں۔ اس کے بعد پرپوزلز آنا بند ہو گئے۔ عافیہ بجو نے بھی حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ بڑی آپا کی طرح سفید شلوار اور دوپٹے کو ہر لباس کا لازمی جزو بنا لیا۔ اور انہوں نے تو بڑی آپا کی طرح بال بھی ڈائی نہیں کئے تھے۔ ان کا آدھا سر سفید ہو چکا تھا۔ کبھی ان دونوں کے ساتھ اسے اپنا آپ بھی اسی طرح چلتا پھرتا نظر آتا، جیسے سید صاحب کی قبر کے ساتھ دو قبریں اور بن گئی ہیں اور تیسری قبر بڑی آپا آج کل اس کے لئے کھودنے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''نہیں، مجھے اپنی قبر خود نہیں کھدوانی۔ نہ میں اپنی آنکھوں کے سامنے خود کو درگور ہوتا دیکھ سکتی ہوں۔ مجھے زندہ رہنا ہے۔ کیونکہ میرے خدا نے مجھے یہ زندگی دی ہے۔ چھیننی ہو گی تو وہ چھینے گا۔ میں یوں قطرہ قطرہ دیواروں کے بیچ دم گھٹ کے نہیں مروں گی۔' وہ اُٹھ کر بڑی آپا کے کمرے کی طرف آ گئی۔ عافیہ لاؤنج میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔

اس نے شافعہ کے کمرے میں جھانکا۔ وہ الماری بند کر کے مڑ رہی تھی۔ اس کے سر سے دوپٹہ ڈھلکا ہوا تھا۔ اس کا سر مکمل طور پر سفید ہو چکا تھا۔ اس نے سید صاحب کی وفات کے بعد بال ڈائی کرنا چھوڑ دیئے تھے۔ ان کی کمر میں بھی خم آ گیا تھا۔

''بڑی آپا! ایک بات پوچھوں آپ سے؟'' وہ اندر آ کر بولی۔

''ہاں پوچھو۔'' وہ تھک کر بیڈ پر آ بیٹھیں۔

''آپ نے پروفیسر زمان اور ان کی بہن کو کیا جواب دیا ہے؟'' شافعہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ ثانیہ یہ بات پوچھے گی۔

''وہی، جو پہلے دیا تھا۔'' اس نے اچھی طرح دوپٹہ سر پر اوڑھا۔

''کیا؟'' وہ بغور اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''یہی کہ ہم غیر سید میں شادی نہیں کرتے۔'' اس کے ماتھے پر بل آ گئے تھے۔

''یہ کس حدیث میں لکھا ہے؟'' اس کا لہجہ نڈر اور نگاہیں بے باک تھیں۔

''ثانیہ! کیا تم نہیں جانتیں کہ ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔'' وہ بلند آواز سے غصے میں بولی۔ اس کی آواز سن کر عافیہ بھی اندر آ گئی۔

''کیا ہوا؟''

''پوچھو اس سے۔ بہت دکھ ہے اسے پروفیسر زمان کے خالی ہاتھ لوٹنے کا۔'' وہ غصے سے بولی۔

''ہاں ہے دکھ۔ آپ بلاوجہ بار بار انہیں جواب دے رہی ہیں۔''

''بلاوجہ؟'' وہ دھاڑی۔ ''کیا تم نہیں جانتیں کہ ہم سید لوگ غیر ذات میں شادی نہیں کرتے۔''

''کیا سید، کیا غیر سید۔ کیا سید آسمان سے اُترتے ہیں یا غیر سید مسلمان نہیں ہوتے؟ بڑی آپا! بڑے افسوس کی بات ہے۔ پڑھی لکھی ہو کر آپ ایسی باتیں کر رہی ہیں۔ ہمارے مذہب نے آ کر جو ذات پات کی زنجیریں توڑی تھیں، ہم آج بھی انہیں اپنی گردنوں کی زینت بنائے بیٹھے ہیں۔ مگر میری بات یاد رکھیں، میں اس جہالت میں آپ کا ساتھ نہیں دوں گی۔ میں ان رسموں کو توڑ دوں گی۔'' وہ جارحانہ انداز میں بولی۔

''کیا کر لو گی؟ خود شادی کر لو گی جا کر؟ بولو!'' وہ غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ کیوں چاہیں گی کہ میری شادی ہو؟ آپ کی جو نہیں ہوئی، اسی لئے آپ نے عافیہ بجو کی بھی نہیں کی۔ بڑی آپا! وہ آپ کی قسمت، ہماری قسمتوں پر اپنے نصیب کی کالک نہ ملیں۔ آپ کی بڑی مہربانی۔ آپ کو زندہ درگور ہونے کا شوق ہو گا، مجھے نہیں ہے۔ آپ کو اپنا یہ فیصلہ بدلنا پڑے گا، میں آپ سے کہہ رہی ہوں۔ ورنہ آپ کو پچھتانا پڑے گا۔''

''تم ثانیہ!'' شافعہ جو تھپڑ مارنے کے لئے اس کی طرف بڑھنے لگی تھی، سینہ پکڑ کر وہیں دوہری ہو گئی۔

''شافعہ!.....شافعہ! کیا ہوا؟'' عافیہ نے لپک کر اسے اپنے ساتھ لگا کر بیڈ پر لٹایا۔

''عافیہ! اس سے کہو چلی جائے یہاں سے۔'' وہ ثانیہ کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

عافیہ نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ باہر نکل آئی۔

''پانی دو مجھے۔'' اس کا رنگ ایک دم زرد ہو گیا تھا۔ عافیہ دوڑ کر پانی لے آئی اور اس کے منہ سے لگا دیا۔

''عافیہ! تم اب جاؤ، مجھے آرام کرنے دو۔'' وہ کچھ دیر بعد بولی۔

''نہیں شافی! تم ٹھیک نہیں ہو۔ میں یہیں بیٹھتی ہوں۔'' عافیہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

''نہیں عانی! میں ٹھیک ہوں۔ میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔''

''ثانیہ بے وقوف ہے، جذباتی پن میں یہ باتیں کہہ گئی ورنہ.....''

''اچھا، صبح بات ہو گی۔ اب تم جاؤ۔'' شافعہ نے کہہ کر کروٹ بدل لی۔ ''لائٹ آف کر کے، دروازہ بند کر کے جانا۔''

عافیہ کچھ دیر کھڑی اسے دیکھتی رہی، پھر لائٹ آف کر کے باہر نکل آئی۔ ثانیہ کے کمرے کی بھی لائٹ آف تھی اور دروازہ بند تھا۔ عافیہ پھر لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔ مگر اب اس سے کچھ پڑھا نہیں جا رہا تھا۔

'کیسی احمق ہے یہ ثانیہ۔' وہ سوچتے ہوئے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

اگلی صبح نماز کے لئے بھی اس کی آنکھ دیر سے کھلی۔ وہ جلدی سے نماز پڑھ کر شافعہ کے کمرے کی طرف بڑھی۔

'شافعہ ابھی تک سو رہی ہے۔' اس نے دروازہ کھول کر حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ چادر منہ تک اوڑھے چت سیدھی بے خبر سو رہی تھی۔ عافیہ باہر نکل کر ٹہلنے لگی۔

ثانیہ اُٹھ کر کچن میں گئی اور چائے بنانے لگی۔ لگتا تھا، وہ رات بھر نہیں سوئی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد عافیہ پھر بے قراری سے شافعہ کی طرف بڑھی۔

''شافعہ! اُٹھو نا۔ اتنی دیر ہو گئی ہے۔ تم نے آج نماز بھی نہیں پڑھی۔ باہر دن نکل آیا ہے۔ رات موسم بڑا خراب ہو گیا تھا۔ بارش بھی ہوتی رہی۔ اب تو ہلکی ہلکی دھوپ نکل آئی ہے۔ بادل ابھی بھی ہیں ویسے۔'' اس نے کمرے کی کھڑکیاں کھولتے ہوئے کہا۔

شافعہ اسی طرح بے حس پڑی رہی۔

''شافعہ!'' اس نے آگے بڑھ کر اس کے منہ سے چادر اُتاری۔ اُس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔

''شافعہ!'' وہ زور سے چیخی۔

''ثانیہ!.....ثانیہ! دیکھو شافی کو کیا ہوا ہے۔''

ثانیہ اُس کی چیخیں سن کر دوڑی دوڑی اندر آئی۔

''یا اللہ!'' بڑی آپا کی حالت دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔ میز پر سلیپنگ پلز کی خالی شیشی منہ چڑا رہی تھی۔

''ثانیہ کو معاذ سے شادی کی اجازت دے دینا اور مجھے بابا جانی کے پہلو میں دفن

کرنا۔ شافعہ۔''

عافیہ کاغذ اٹھا کر زور زور سے رونے لگی۔ ثانیہ ڈاکٹر کو فون کرنے دوڑی۔ مگر اب اس کا کچھ فائدہ نہیں تھا۔ عافیہ نے اس کی کلائی پکڑی جہاں نبضیں نامعلوم کب کی سرد ہو چکی تھیں۔

بڑی شہزادی واقعی بے وقوف ہوتی ہے۔ کہانی کار صحیح کہتے ہیں!

❖❖○❖❖

سید صاحب کی قبر کے ساتھ ایک اور قبر کا اضافہ ہو گیا۔ عافیہ نے اس سلسلے میں ثانیہ کی ایک نہیں سنی تھی۔ وہ اسے عام قبرستان میں دفنانا چاہتی تھی۔ معاذ کے گھر والے بھی افسوس کرنے آئے تھے اور ثانیہ کے دل سے تو احساسِ ندامت ہی نہیں مٹ رہا تھا کہ اس کی وجہ سے اس کی اتنی صابر، اتنی اچھی، بڑی آپا اس دنیا سے اُٹھ گئیں۔ اس نے معاذ کے فون بھی اٹینڈ نہیں کئے، نہ گھر آنے پر اس کے سامنے گئی کہ اس کی وجہ سے تو وہ زندگی میں پہلی اور آخری بار بڑی آپا سے لڑی تھی۔

چالیسواں بھی ہو گیا۔ گھر کی سوگوار فضا مزید ویران ہو گئی۔

اس نے معاذ کو فون پر شادی سے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ اگلے دن ہی گھر چلا آیا۔ عافیہ کالج گئی ہوئی تھی، اس نے ملنے سے انکار کر دیا۔ وہ بیل بجا بجا کر تھک گیا اور ناکام لوٹ گیا۔ پھر اگلے روز اس کا فون آ گیا۔

''پلیز ثانیہ! مجھے میرا قصور تو بتا دو۔''

''آپ کی.....آپ کی وجہ سے میں بڑی آپا سے لڑی اور انہوں نے خودکشی کر لی۔'' وہ رونے لگی۔

''ثانیہ! ان کی ایسے ہی لکھی تھی۔ تم نے تو انہیں نہیں مارا ہے نا۔''

''مگر یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے، مجھے معلوم ہے۔'' وہ اور رونے لگی۔

''اگر ایسا ہوا بھی ہے تو اب کیا ہو سکتا ہے؟'' کافی دیر بعد اس کے رونے سے زِچ آ کر اس نے کہا۔

''میں اب شادی نہیں کروں گی۔'' وہ آنسو پونچھ کر بولی۔

''تو کیا تم باقی کی زندگی ان قبروں کی مجاور بن کر گزارو گی؟'' وہ تلخی سے بولا۔

''گزار لوں گی۔''

''تم جذباتی ہو رہی ہو۔ ٹھنڈے دل سے سوچنا۔ میں ایک ہفتے بعد پھر فون کروں

گا۔کل میں اسلام آباد جا رہا ہوں۔خدا حافظ!''

اور ایک ہفتے بعد ابھی اس کا فون نہیں آیا تھا جب شام کو عافیہ بجو نے اسے تیار ہونے کو کہا۔

''کیوں بجو؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''معاذ کے گھر والے اور معاذ آ رہا ہے۔تمہارا نکاح ہے معاذ کے ساتھ آج۔'' وہ بے تاثر لہجے میں بولیں۔

''چھوٹی آپا!'' وہ چیخی۔

''چلاؤ مت۔ یہ تمہاری خوشی تھی اور اب شافعہ کی وصیت بھی، جس کو پورا کرنا میرا فرض ہے۔''

''میں یہ نکاح نہیں کروں گی۔'' وہ فیصلہ کُن انداز میں بولی۔

''تمہیں کرنا پڑے گا۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔ ورنہ تمہیں کل پچھلے لان میں تیسری قبر کھدوانا پڑ جائے گی، یہ یاد رکھنا۔ یہ کپڑے اٹھاؤ اور تیار ہو جا کر۔'' وہ سرد لہجے میں کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اس نے بیڈ پر پڑے فیروزی کامدار سوٹ کو دیکھا اور کرسی پر گر کر رونے لگی۔لیکن اس کا رونا دھونا کچھ کام نہ آیا۔ایک گھنٹہ بعد اس کا نکاح معاذ کے ساتھ ہو گیا۔

''یہ ڈیڑھ لاکھ کا چیک ہے، ثانیہ کے جہیز کے طور پر۔'' عافیہ نے چیک معاذ کو دیا۔ اس نے لینے سے انکار کر دیا۔

''یہ تو تمہیں لینا ہی پڑے گا۔'' چیک دوبارہ اسے تھما کر وہ ثانیہ کی طرف مڑی۔

''اور ثانیہ! میری بات سنو۔'' وہ ثانیہ کو ایک طرف لے گئی۔''تم اب دوبارہ اس گھر کا رخ نہیں کرو گی۔تم سمجھنا کہ اس گھر میں تم دو نہیں، تین قبریں چھوڑ کر آئی ہو۔ اور زندہ لوگ، مُردوں کا پیچھا نہیں کیا کرتے۔ اب جاؤ، خدا تمہیں سچی خوشیاں نصیب کرے۔'' اس کا لہجہ سرد اور اجنبی تھا۔

''چھوٹی آپا! پلیز، میں نہیں جاؤں گی آپ کو اکیلا چھوڑ کر۔'' اس نے اس سے لپٹ کر رونا چاہا۔

''میں اکیلی نہیں ہوں، بابا جانی اور شافعہ میرے پاس ہیں۔تم اب جاؤ۔ اللہ نگہبان۔'' اس نے ثانیہ کا ہاتھ پکڑ کر معاذ کو تھمایا اور خود پیچھے ہٹ گئی۔

❖❖○❖❖

اور اسے قدرت کی طرف سے دوبارہ آنے کی مہلت نہ مل سکی۔اگلے ہی ہفتے معاذ کو کمپنی کی طرف سے جدہ جانا پڑ گیا، پانچ سال کے لئے۔وہ جانے سے ایک دن پہلے شام کو عافیہ سے ملنے آئی۔گیٹ پر اتنا بڑا تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔پوچھتی کس سے؟ اور ارد گرد تو کسی سے اتنے تعلقات نہیں تھے۔نہ تو سید صاحب ہی بہت سوشل تھے اور نہ ان کی بیٹیاں۔کافی دیر انتظار کرنے کے بعد وہ لوٹ آئی۔رات کو فون کیا، عافیہ نے اس کی آواز سن کر فون بند کر دیا۔پھر اس نے کوئی چار پانچ بار فون کیا۔عافیہ نے ریسیور کریڈل سے اٹھا کر صبح تک نیچے رکھ دیا۔صبح آٹھ بجے ان کی فلائٹ تھی۔وہ دل میں تشنگی لئے وطن سے نکل آئی۔

جدہ میں انہیں کمپنی کی طرف سے ہی گھر، گاڑی سب کچھ مل گیا تھا۔زندگی ہر اعتبار سے پُرسکون ہو گئی تھی۔مگر دل کا ایک گوشہ دو قبروں اور ایک زندہ لاش کے تصور میں ہر لمحہ کھویا رہتا۔وہ کوئی بھی کام کر رہی ہوتی، کہیں بھی مگن ہوتی، دھیان کا ایک علاقہ ادھر ہی متوجہ رہتا۔کبھی کبھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر عافیہ کو فون کر بیٹھتی جو اس کی آواز سنتے ہی فون بند کر دیتی تو وہ بے ساختہ رو پڑتی۔

پھر اگلے سال صہیب اور دو سالوں بعد دانیال نے آ کر اس کی ساری توجہ بانٹ لی۔دونوں بچوں کی مصروفیات میں اسے پتہ ہی نہ چلتا کب دن نکلا، کب رات ہوئی۔ اگرچہ معاذ بھی بچوں کے سلسلے میں بہت کوآپریٹو تھا مگر وہ پھر بھی جان بوجھ کر خود کو ان میں مصروف رکھتی کہ ذرا سی فرصت دل کے درد جگا دیتی تھی۔

بچوں نے اسکول جانا شروع کر دیا۔معاذ کا ایگریمنٹ کمپنی سے مزید چھ سال کے لئے ہو گیا تھا۔

اور اب ان کا یہاں آخری سال تھا۔گیارہ سال گزر گئے تھے۔دو ماہ بعد وطن واپسی تھی۔دونوں بچے بڑے ہو رہے تھے اور یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ جانے سے پہلے حج کا عظیم موقع انہیں مل رہا تھا۔ویسے تو ان دس سالوں میں اس نے معاذ اور بچوں کے ساتھ دس حج کئے تھے مگر اس دفعہ کی لگن اور تھی کہ اس کے بعد پتہ نہیں، کب دوبارہ آنا نصیب ہو۔خانۂ خدا کا طواف کرتے ہوئے اسے لگا کہ کوئی چہرہ ہے جو اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرا ہے اور اس کے دماغ میں کھب گیا ہے۔باقی کا طواف اسی تلاش میں گزرا۔پھر دوسری بار صفا و مروہ کی سعی کے دوران اسے لگا کہ کسی نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہے تو اس کا دل لبیک کہتا ہوا دیوانہ وار بھاگا۔مگر اس کی تلاش لاحاصل رہی۔پھر مزدلفہ

کے سفر کے دوران لوگوں کی بھیڑ میں سے اسے پھر وہ چہرہ نظر آیا۔ اس کے دل نے اب کے سنجیدگی سے اس کے بارے میں سوچا کہ اسے کہاں دیکھا ہے؟ میدانِ عرفات میں قیام کے دوران وہ رات کو ایک پل نہ سو سکی۔ بس اِدھر اُدھر خیموں کے اردگرد بھٹکتی اس چہرے کو تلاشتی رہی۔ معاذ بھی اس کے کھوئے کھوئے، اُلجھے انداز کو دیکھ رہا تھا۔ دو ایک بار پوچھا، اس نے ٹال دیا۔ جس اُلجھن کا کوئی نام ونشان ہی نہ ہو، وہ اس کے بارے میں کیا بتاتی؟ آخر حج کے ضروری ارکین ختم ہوئے۔

اگلے روز مدینہ منورہ مسجد نبوی کی زیارت کو چل پڑے۔ پھر وہ چہرہ جیسے گم ہو گیا۔ اسے لگا، نہ اسے حج کی سعادت ہی مل سکی، نہ خدا کی قربت اور نہ اپنی تلاش کا کوئی نتیجہ۔ آج مدینہ میں ان کا آخری دن تھا۔ ٹھیک دس دن بعد ان کی وطن روانگی تھی۔ معاذ بچوں کو لے کر مدینہ منورہ کے بازار میں شاپنگ کے لئے نکل گئے تھے۔ وہ روضۂ رسول ﷺ پر حاضری دے کر باہر کے برآمدے میں آ بیٹھی۔ ٹھنڈے ستون سے سر ٹکائے، آنکھیں موندے نا معلوم کتنی دیر گم صم بیٹھی تھی۔ ابھی اندر روضۂ رسول ﷺ پر بے تحاشا روتے ہوئے اس نے سید صاحب اور شافعہ کی مغفرت کی دعا مانگی تھی۔ عافیہ کی خیر و عافیت کی اور اس کا دل نرم ہونے کی۔ اور آخری دعا پر جیسے اس کا دل ایک پل کو ساکت ہو گیا تھا۔ اُسے یاد آ گیا تھا کہ وہ چہرہ کس کا تھا۔ کس کے پیچھے وہ دیوانہ وار اتنے دنوں سے بھاگ رہی تھی۔

اس نے آنکھوں کے نم گوشے انگلی کی پوروں سے صاف کرتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سامنے اس کے قریب وہی چہرہ اسے یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے ہی دھیان میں مسکرا اُٹھی۔ وہ چہرہ اور اُس کے قریب ہو گیا۔ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتی رہیں۔

''آ.....آپ ملکہ ہیں نا، ملکہ امی؟'' اُسے اپنی سرگوشی بھی سنائی نہیں دی تھی۔

''ثانیہ!'' ان کے لب کپکپائے۔

''ملکہ امی!'' وہ اُٹھ کر ان سے لپٹ گئی اور دھواں دھار رونے لگی۔

''آپ کہاں چلی گئی تھیں؟ میں نے ہر پل آپ کو یاد کیا۔ ملکہ امی! کوئی اپنے بچوں کے ساتھ یوں بھی کرتا ہے؟'' وہ روتے روتے بولی۔

''میری بچی! میری جان! ماں کو بھی صفائی کا موقع دو گی یا شافعہ اور عافیہ کی طرح دھکے دے کر نکال دو گی؟'' وہ اُس کا سر، ماتھا چومتے ہوئے بولیں۔

''کیا مطلب؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''نکاحِ ثانی میرا جرم بھی ٹھہرا اور گناہ بھی۔ جب تمہارے باپ نے بائیس سالہ رفاقت کو ایک پل میں ٹھوکر مار دی تو بتاؤ میں کہاں جاتی؟ سیدہ آپا کے گھر کتنے دن رہتی؟ وہ سہار لیتیں، ان کی آنے والی بہوئیں سہارتیں مجھے؟ وہیں اتفاق سے وجاہت حسین آ گئے۔ ان کی جواں سال بیٹی کو بلڈ کینسر تھا۔ وہ اس کے علاج کے سلسلے میں لاہور آئے تھے۔ وہ ہمارے کزن ہوتے ہیں۔ انہیں میری طلاق کا پتہ چلا تو بہت دیر افسوس کرتے رہے۔ ایک ایکسیڈنٹ میں ان کی دونوں ٹانگیں ضائع ہو گئی تھیں۔ ان کی بیٹی جتنے دن لاہور میں رہی، ہمارے پاس ہی رہی۔ مجھ سے کافی مانوس ہو گئی۔ مجھے بھی وہ عافیہ جیسی لگتی۔ پھر سیدہ آپا اور محسن بھائی نے وجاہت حسین سے مشورہ کر کے مجھے ان سے نکاح کا کہا۔ میں ہتھے سے اُکھڑ گئی۔ بہت دن یہ کشمکش چلتی رہی، پھر ان کی بیٹی فائزہ نے مجھ سے التجا کی کہ اس کی زندگی کے دن تھوڑے ہیں۔ آپ میری خاطر ہمارے گھر آ جائیں۔ میں بیٹا! اس بچی کی التجا کے آگے ہار گئی۔ دوسرے میں تم لوگوں کے حصول کے لئے کورٹ نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس طرح تم لوگوں کو بھی کورٹ آنا پڑتا اور یہ مجھے گوارا نہیں تھا۔ بہرحال نکاح ہو گیا اور میں کراچی چلی گئی۔ بعد میں فائزہ کو علاج کے لئے لندن لے گئے۔ وہ کافی عرصہ وہاں رہی اور ٹھیک ہو گئی۔ اس کی شادی وہاں ہی ایک پاکستانی لڑکے سے کر دی۔ چھ سات سال وہ ٹھیک رہی، اس کے بعد پھر اس کی بیماری حملہ آور ہوئی۔ اس دوران میں نے پاکستان سید صاحب سے کئی بار رابطہ کیا اور انہیں شافعہ اور عافیہ کے رشتوں کے لئے کہا۔ چھ سات پرپوزلز میں نے بھیجے مگر انہوں نے ہمیشہ لعن طعن کر کے فون بند کر دیا۔ پھر مجھے فائزہ کے لئے دوبارہ لندن جانا پڑا۔ تین سال تک اس نے بیماری سے جنگ لڑی اور بالآخر بیماری جیت گئی۔ وہ دو چھوٹے بچے چھوڑ کر مر گئی۔ میں ان بچوں کو لے کر کراچی آ گئی۔ وہیں سید صاحب کے انتقال کی خبر ملی۔ میں لاہور گئی۔ شافعہ نے مجھے اندر نہ آنے دیا۔ پھر ایک بار نہیں، میں تین چار بار ادھر گئی اور تینوں بار دھتکاری گئی۔ فون وہ نہیں سنتی تھی۔ باپ کی طرح پتھر ہو چکی تھی۔ پھر وجاہت حسین کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ میں کراچی آ گئی۔ تین سال پہلے لاہور گئی تھی۔ عافیہ نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا اور گیٹ بند کر دیا۔ اب بتاؤ، میں کیا کرتی؟ کسے اپنا حال سناتی جا کر؟ اب وجاہت حسین ٹھیک نہیں ہیں، حج کی لگن تھی، سو وہ بھی خدا نے اس سال پوری کر دی۔ اسی کے حضور گڑگڑا کر دعائیں کی ہیں کہ ان

لوگوں کے دلوں کو میرے حق میں نرم کرے۔ اور میں کیا کر سکتی ہوں؟'' وہ خاموشی سے آنسو بہانے لگیں۔

''ملکہ امی! میں نے آپ کا بہت انتظار کیا، آپ نہیں آئیں۔ بڑی آپا نے مجھے بتایا کہ آپ ہمیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔ پھر بابا جان کا انتقال ہو گیا۔ آپ کو پتہ ہے، انہوں نے وصیت کی تھی کہ انہیں گھر کے پچھلے لان میں دفن کیا جائے۔ اور اس کے بعد ملکہ امی! جب معاذ کا پرپوزل میرے لئے آیا اور بڑی آپا نے انکار کر دیا کہ وہ غیر سید ہیں تو میں ان سے لڑ پڑی۔ انہوں نے رات کو سلیپنگ پلز کھا لیں اور اپنی قبر بھی بابا جان کے ساتھ بنانے کی وصیت کی۔ اور اس کے ڈیڑھ ماہ بعد ہی عافیہ بجو نے میرا نکاح معاذ کے ساتھ کروا کے اس گھر کے دروازے مجھ پر ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے۔ اس کے بعد وہ نہ مجھ سے ملیں، نہ میرا کوئی فون اٹینڈ کیا۔ ملکہ امی! میرا دل معاذ کی محبت اور بچوں کی خوشیوں کے باوجود عافیہ بجو کی تنہا زندگی اور اس گھر کی ویرانی پر ہر لمحہ روتا رہتا ہے۔ ملکہ امی! وہ گھر جیتا جاگتا قبرستان بن گیا ہے، جہاں میں عافیہ بجو کو چھوڑ کر آئی تھی۔ پتہ نہیں، اب وہ کس حال میں ہیں۔'' وہ ان کی گود میں سر رکھ کر رونے لگی۔

''شافعہ مر گئی..... میری صابر بیٹی، جس کے لئے میں نے ہر پل دعا کی۔ سید صاحب کی ضد اور ہٹ دھرمی اس کی زندگی کو بھی کھا گئی۔ میری شافی.....'' وہ نئے سرے سے زار و قطار رونے لگیں تو وہ انہیں چپ کرواتے ہوئے خود بھی رو پڑی۔

❖❖○❖❖

''معاذ! یہ وہ علاقہ تو نہیں لگتا جہاں ہمارا گھر تھا۔ یہ تو کوئی بہت بارونق مارکیٹ ہے۔ آپ راستہ بھٹک گئے ہیں۔'' ابھی تو شام بھی نہیں ڈھلی تھی کہ اس سر بہ فلک پلازہ کی لائٹس جل اُٹھی تھیں۔ ہر طرف گہما گہمی کا عالم تھا۔ دکانیں لوگوں کے رش سے اٹی پڑی تھیں۔ کار پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ نہ تھی۔ میوزک سینٹر سے تیز میوزک کا شور اُٹھ رہا تھا۔ ثانیہ کا دل گھبرانے لگا۔

''نہیں ثانیہ! یہ وہی جگہ ہے، مجھے یاد ہے۔ بائیں طرف کا پہلا کارنر، یہیں تو تمہارا گھر تھا۔ مگر اب تو یہاں پلازا ہے۔ یہ کیا چکر ہے؟ میرا تو خود دماغ ماؤف ہوا جا رہا ہے۔ ٹھہرو، میں کسی سے پوچھ کر آتا ہوں۔''

اس نے گاڑی سائیڈ پر کھڑی کی اور باہر نکل گیا۔ وہ چکراتے سر کو تھام کر پھر کھڑکی سے سر نکال کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ ان کے گھر کے ساتھ والا گھر بھی بڑی بڑی دکانوں

میں بدل چکا تھا۔ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

چوتھا گھر۔ ہاں، چوتھا گھر وہی تھا۔ اسے یاد آیا، سرخ اینٹوں والا، ساتھ ہی آنٹی کا گھر، جن کی چھوٹی بیٹی اُس کی کلاس فیلو تھی اور اس سے آگے پیلی سفیدی والی بوسیدہ سی کوٹھی مرزا صاحب کی تھی، جس کی نیم پلیٹ ابھی بھی لگی ہوئی تھی۔ اور سامنے فواد انکل کا گھر تھا، نیلی کھڑکیوں والا۔ اس سے آگے شاید زیتون لوگوں کا۔ اس نے ذہن پر زور دیا۔

'پھر تو اس مارکیٹ کی جگہ ہمارا گھر ہونا چاہئے۔ کیا عافیہ بجو نے گھر بیچ دیا؟..... پھر بابا جانی اور شافعہ بجو کی قبریں۔'

وہ پاگلوں کی طرح سر گھما گھما کر اس عالیشان ملٹی اسٹوری پلازے کو دیکھنے لگی۔ اسی وقت معاذ آ گیا۔

''ثانیہ! واقعی اس پلازے کی جگہ آج سے پانچ سال پہلے کوئی کوٹھی ہی تھی۔ مجھے ایک دکاندار نے بتایا ہے۔ زیادہ اُسے معلوم نہیں، اس نے پلازہ کے مالک سے ملنے کو کہا ہے، یہ ادھر دائیں طرف اس کا آفس ہے۔ آؤ چلتے ہیں۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ وہ بے جان قدموں کے ساتھ چل پڑی۔

باہر کے شور و غل کے برعکس آفس پُرسکون جگہ پر بنایا گیا تھا۔ گلاس ڈور دھکیل کر دونوں اندر داخل ہوئے۔ اندر آفس ٹیبل کے پیچھے بیٹھا ادھیڑ عمر کا شخص کسی سے فون پر باتیں کر رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر اس نے سر کے اشارے سے انہیں بیٹھنے کو کہا۔ وہ اس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''جی فرمائیے، کس سے ملنا ہے آپ کو؟'' فون رکھ کر وہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔

''کیا آپ ہی اس پلازہ کے مالک ہیں؟'' معاذ نے پوچھا۔

''جی میں ہی ہوں۔''

''آپ سے کچھ معلومات لینی تھیں۔''

''جی فرمائیے، میں حاضر ہوں۔'' وہ خوش اخلاقی سے بولا۔ ''مگر پہلے یہ بتائیے، آپ کے لئے کافی منگواؤں یا کولڈ ڈرنک؟''

''نو تھینکس۔ آپ کو معلوم ہے، اس پلازہ کے بننے سے پہلے یہاں ایک سفید کوٹھی تھی؟'' معاذ نے بات شروع کی۔

''جی مجھے معلوم ہے۔''

"آپ نے وہ کوٹھی خریدی تھی؟"

"جی نہیں، میں آپ کو بتاتا ہوں۔" وہ ٹیبل پر کہنیاں ٹکا کر بولا۔ "اصل میں یہاں کوئی سید صاحب رہتے تھے۔ ان کی تین بیٹیاں تھیں۔ سید صاحب کے انتقال کے بعد ان کی بیٹیاں یہاں اکیلی رہتی تھیں۔ پھر ان کی بڑی بیٹی کا انتقال ہو گیا۔ تیسری بیٹی کی شادی ہو گئی اور وہ ملک سے باہر چلی گئی۔ دوسری بیٹی یہاں ہی رہ گئی۔ وہ اکیلی رہتی تھی۔ پھر ایک رات سوتے میں وہ بھی مر گئی۔ مگر دو تین دن کسی کو اس کی موت کا پتہ نہ چلا۔ وہ تو ان کی کام والی چھٹی سے آئی تو گیٹ نہ کھلنے پر اس نے شور مچایا۔ علاقے کے لوگوں نے گیٹ پھلانگ کر اندر کا دروازہ توڑا تو وہ اندر مُردہ پڑی تھی۔ اسے میانی صاحب میں دفنا دیا گیا۔

پھر اس کوٹھی کی ملکیت کا سوال اٹھا۔ ان کے قریبی عزیز تو کوئی تھے نہیں۔ جو تھے، وہ ملک سے باہر تھے۔ دور پرے کے عزیز ادھر آ بیٹھے اور ہر کوئی کوٹھی کی ملکیت کا دعوے دار تھا۔ وہاں روز لڑائیاں ہونے لگیں۔ بالآخر علاقے کے لوگوں نے انتظامیہ کو اطلاع دی۔ انہوں نے آ کر کوٹھی کو سیل کر دیا، پھر اخبار میں کوٹھی کے قریبی وارثوں کو دعوے کے لئے اشتہار دیا۔ تین ماہ تک کوئی نہ آیا تو حکومت نے وہ کوٹھی اپنی کسٹڈی میں لے کر نیلام کروا دی۔ میں نے وہ کوٹھی خریدی۔ کوٹھی تو بڑی خوب صورت تھی، مگر مشہور تھا کہ وہ کوٹھی بڑی منحوس ہے۔ میں چند دن یہاں آ کر رہا تو بیمار ہو گیا، میرے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا، اور بھی چھوٹے چھوٹے نقصانات ہوئے یہاں جس کی وجہ سے میں نے پلازہ بنانے کا سوچا۔ اللہ کا شکر ہے، آج یہ پلازہ اس سارے علاقے کی جان بنا ہوا ہے۔"

ثانیہ سناٹے میں گھری ہوئی تھی۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔

"عافی بجو بھی....." اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔

"اور وہاں جو دو قبریں تھیں، وہ؟" معاذ نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"جی، جب میں نے کوٹھی خریدی تو وہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔ ہاں، میں نے بھی سنا تھا ان کے بارے میں۔ شاید وہ جو لوگ پہلے آ کر رہے تھے، انہوں نے انہیں زمین بوس کر دیا یا پھر بارشوں کی وجہ سے وہ خود ہی ڈھے گئی ہوں۔ مجھے تو بہر حال کھدائی کے دوران ایسا کچھ نہیں ملا جس سے ان قبروں کا پتہ چلتا۔"

اُس کی بات نے ثانیہ کی رہی سہی ہمت بھی ختم کر دی۔ وہ میز پر سر گرا کر بے تحاشا رونے لگی۔

"کیا ہوا میڈم! خیریت تو ہے؟" وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

"اُٹھو ثانیہ! گھر چلیں۔ حوصلہ کرو۔" معاذ نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھایا۔

"کیا ہوا سر! بیگم صاحب کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" وہ گھبرا کر بولا۔

"ہاں ٹھیک ہیں۔ چلو ثانیہ!" معاذ اُسے لے کر مڑا۔ وہ گھسٹتے ہوئے اس کے ساتھ چلنے لگی۔ گاڑی تک پہنچتے پہنچتے اس کی ٹانگوں سے جان ختم ہو گئی۔ وہ گاڑی سے ٹیک لگا کر اس بلند و بالا روشن عمارت کو دیکھنے لگی۔

"جو لوگ اللہ کے بنائے ہوئے راستوں سے ہٹ کر چلتے ہیں، اللہ تعالیٰ اسی طرح ان کا نام و نشان مٹا دیتا ہے۔ سید صاحب کو اپنے نام کی فکر تھی اور اب ان کی قبر کا نشان بھی کہیں نہیں ہے۔" اتنی روشنیوں کے باوجود اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرے چھا رہے تھے۔ وہ اُداس، ویران سفید کوٹھی اسے اپنے پاس بلا رہی تھی، مگر وہ کیا کرتی؟

بچپن میں ان کے علاقے سے ایک فقیر گزرا کرتا تھا جو ایک ہی صدا لگاتا تھا۔

"ہمارا تمہارا بادشاہ کون؟" وہ زور سے ڈنڈا زمین پر مارتا۔

"بولو اللہ بادشاہ۔"

اور علاقے کے سارے بچے اس کے پیچھے نعرے لگاتے جاتے۔

"ہمارا تمہارا بادشاہ کون؟..... بولو اللہ بادشاہ، بولو اللہ بادشاہ۔"

❖❖○❖❖

نیلی قمیض

"آج کا دن ہی بڑا منحوس تھا میرے لئے۔"

احمد وقار نے گول کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا کپ گھما کر کونے والے صوفے پر پھینکا اور اپنا بایاں بازو آگے لا کر اس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ہش، بری بات۔" بی اماں نے ہاتھ میں پکڑے کروشیے کے نمونے کو نیچے رکھتے ہوئے فوراً تنبیہی انداز میں کہا۔ "کبھی وقت کو، زمانے کو، دن کو برا مت کہو۔ یہ رب تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں۔ ان کو منحوس یا بدشگون کہنا اللہ کو سخت ناپسند ہے۔"

"بی اماں! آپ کو نہیں معلوم، ہر چیز کو ہر وقت مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ہر گھڑی، ہر اہم، غیر اہم چیز کو مذہب کے فریم میں سجا کر اس کا تقدس بجا لایا نہیں جا سکتا۔ کبھی کبھی یہ ہماری روزمرہ کی روٹین کو بری طرح سے ڈسٹرب کر کے رکھ دیتے ہیں۔ آج صبح کالج جاتے ہوئے پہلے گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوا، آپ کی یہ صاحبزادی جو آج کل لگتا ہے کچھ زیادہ ہی دنیا میں قحط ڈالنے کے موڈ میں ہیں۔ خوب کھا کھا کر وزن گین کر رہی ہیں...." اس نے بی اماں کے دوسری طرف بیٹھی، کتاب میں گم علیزہ کو دیکھ کر کہا۔

"شٹ اپ احد! میں تمہیں موٹی نظر آ رہی ہوں؟" علیزہ نے کتاب زور سے تخت پر پٹخی اور احد کو خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

وہ تو یوں بھی بہت فگر کانشس تھی۔ اُس کی کلاس فیلوز اُس کے منہ پر اُس کے قابل رشک فگر کی تعریف کیا کرتی تھیں۔ وہ خود دوسرے چوتھے ہفتے اپنا ویٹ چیک کرتی رہتی تھی۔ باقاعدگی سے ایکسرسائز اور واک کی وجہ سے سولہ سولہ گھنٹے بیٹھ کر پڑھنے اور سب کچھ کھانے کے باوجود اس کی کمر کبھی پچیس سے چھبیس انچ نہیں ہوئی تھی۔ احد کے اس برملا جھوٹ پر تو اس نے بلبلانا ہی تھا۔

"کیونکہ ٹائر تمہاری سائیڈ والا پنکچر ہوا تھا۔ اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا، تمہارے

غبارہ بننے کا؟ تم نے جو واویلا مچا رکھا ہے، پھر وزن بالکل مین ٹین ہے۔ میرا مشورہ ہے تم اپنی ویٹ مشین چینج کرو۔ اس کی ڈیٹ ایکسپائر ہو چکی ہے۔"

"ڈیٹ تو تمہاری زبان کی ایکسپائر ہوئی لگتی ہے۔ موقع بے موقع چلنے لگتی ہے۔ اور صبح میں لیفٹ سائیڈ پر بیٹھی تھی، جب کہ کالج آتے جاتے دونوں بار ڈرائیونگ میں نے کی تھی۔ تم لیفٹ سائیڈ پر بیٹھے تھے۔ ٹائر آل ریڈی تمہارے وزن سے پنکچر ہو چکا تھا، میرا....."

"اوہ خدا کے لئے، چپ کر جاؤ۔ یہ کیا تم دونوں نے فضول بحث شروع کر دی ہے۔ احد! کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟" بی اماں دونوں کی لاحاصل بحث سے اُکتا کر بولیں۔

"بحث میں نہیں، آپ کا لاڈلا کر رہا ہے۔" علیزہ نے بے زاری سے کہہ کر کتاب دوبارہ اٹھا کر منہ کے آگے کر لی۔

"بی اماں! صبح ٹائر پنکچر ہوا۔ نتیجتاً سر رضوی کی کلاس مِس ہوتے ہوتے بچی، سات منٹ لیٹ ہونے پر انہوں نے مجھے کلاس میں بیٹھنے کی اجازت تو دے دی، مگر دل میں کینہ پورے ستائیس منٹ دبائے رکھا۔ کلاس ختم ہوتے ہی مجھے آفس تشریف لانے کا عندیہ دے گئے، اور وہاں بلا کر پیار بھری ڈانٹ کا ایک کپ صبح صبح پلا دیا۔ میں نے بہتیرا واویلا کیا کہ میں ناشتہ کر کے....."

"احد.....!" بی اماں نے آنکھیں نکالیں۔ "ذرا جلدی بات ختم کرو۔ تمہاری بے تکی باتوں سے میرے سر میں درد ہونے لگا ہے۔" وہ سخت بے زاری کے عالم میں بولیں تو علیزہ نے کتاب کے ایک حصے کو دوسرے ہاتھ سے تالی کے لئے بجایا۔

"کیفے میں اشو چچا نے خراب پزا چائے کے ساتھ رکھ دیا۔ اُف بی اماں! اتنی گندی بُو آ رہی تھی۔ مجھے ابکائی آتے آتے رہ گئی۔ وہ پزا کم اور بُسا ہوا نان زیادہ لگ رہا تھا۔"

"ڈاکٹری پڑھتے پڑھتے تم دونوں کی ناک کچھ زیادہ ہی کھل گئی ہے۔ اچھے بھلے اللہ کے رزق میں نقص نکالنے بیٹھ جاتے ہو۔" بی اماں نے پھر ٹوکا۔

"چچ، چچ..... آج تو بے چارے احد صاحب کی کوئی بات بھی بی اماں کے سامنے جم نہیں رہی۔ بڑا کڑا دن ہے واقعی۔" علیزہ پھر بولی۔

"بی اماں! اس کو چپ کرائیں۔" احد تپ کر بولا۔

"نہ تم میرے کہنے سے چپ ہو گے نہ یہ۔ بہتر ہے، تم بات جلدی سے مکمل کر لو۔"

وہ تخت سے اُترتے ہوئے بولیں۔ ''زینب! دیکھو نذیر نے چائے تیار کی یا میں پہلے عصر کی نماز پڑھ لوں؟'' وہ اُٹھنے لگی تھیں۔

''یہ تو دیکھ لیں، میری اتنی قیمتی، اتنی پیاری شرٹ کا کیا حال ہوا ہے۔'' وہ دادی کی عدم توجہی دیکھ کر جھنجلاتے ہوئے آگے بڑھا اور کہنی سے پھٹی ہوئی شرٹ ان کے آگے کر دی۔

''ہائیں، یہ کیا ہوا؟ چوٹ تو نہیں لگی؟ دیکھو آستین ہٹا کر۔'' وہ فوراً گھبرا گئیں۔

''بی اماں! معمولی سی رگڑ لگی ہے۔'' وہ بے مزہ سا ہو کر بولا۔ اسے تو شرٹ کے پھٹنے کا غم تھا۔

''تھینک گاڈ! تمہاری شرٹ تو فارغ ہوئی۔ ساتویں نیلی قمیض۔ جب سے تم نے میوزیکل کالج میں حصہ لیا ہے۔'' علیزہ نے جلدی سے کہا۔

''کیوں، تمہیں کیا تکلیف ہے میری پسند سے؟'' وہ جل کر بولا۔

''کیونکہ مجھے نہیں پسند۔ تم صرف پہنتے ہو، دن میں نو گھنٹے دیکھنا مجھے پڑتی ہے۔ اب تو سارے کالج کو پتہ ہے، وہ نیلی قمیض والا احد تمہارا کزن ہے۔ عظمیٰ کہہ رہی تھی، لگتا ہے تمہارے کزن نے نیلے کلر کا اسٹاک خرید رکھا ہے۔''

''پرسوں وہی کہہ رہی تھی، احد! تم پر یہ کلر بہت سوٹ کرتا ہے، بالکل ٹام کروز لگتے ہو۔'' وہ اسے جتا کر بولا۔ علیزہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''اتنے برے دن آ گئے بے چارے ٹام کروز پر۔ چہ، چہ۔''

''پھر فضول کی بحث۔ میں تو تم دونوں کی ان بے سروپا باتوں سے تنگ آ چکی ہوں۔'' بی اماں تنک کر بولیں۔

''ہاہ جی! یہ کیا ہوا؟'' زینب اسی وقت اندر آئی تھی۔ کہنی سے پھٹی شرٹ کو دیکھ کر لمبی سی ''ہاہ'' کے ساتھ بولی۔

''ہاہ..... یہ پھٹ گئی ہے جی۔'' احمد بھی اسی کے لہجے میں بھنا کر بولا۔

''وہ کیسے جی؟'' وہ کچھ ڈر کر بولی۔

''بی اماں! میری اتنی قیمتی، اتنی پسندیدہ شرٹ دیکھیں تو....'' وہ پھر روہانسا ہو کر بولا۔

''کنجوس! کتنی بار کہو گے اتنی قیمتی؟ لگتا ہے، تمہارے پاس یہی ایک قیمتی شرٹ تھی، باقی تو لنڈے بازار سے خریدتے ہو۔'' علیزہ پھر نہ رہ سکی۔

''میں کہے جا رہی ہوں، چوٹ تو نہیں لگی؟ اس منحوس کو ہٹا کر تو دیکھو۔'' بی اماں

خود ہی بٹن کھولنے لگیں۔

''نہیں، کچھ خاص نہیں۔ بال دلدلی زمین میں چلی گئی تھی۔ ایک پاؤں پھسلا تو کہنی کے بل خود کو سہارا دیا۔ میری تو بچت ہو گئی، شرٹ قربان ہو گئی۔ دیکھ لیں، چوٹ تو نہیں لگی۔'' اس نے آستین اوپر کر کے دادی کی تسلی کرا دی۔

''چلو اللہ نے کرم کیا۔ تم کپڑے بدل آؤ، چائے تیار ہے۔ شام کی چائے بھی تمہارے انتظار میں لیٹ ہو جاتی ہے۔''

''بی اماں! یہ رفو ہو جائے گی نا؟'' وہ چند منٹوں بعد کپڑے بدل کر شرٹ ہاتھ میں لئے آ گیا۔

''رکھ دو۔ شرافت کو بھیج کر پتہ کرا لوں گی۔ میں تو کہتی ہوں دفع کرو، کل جا کر اسی کلر کی نئی لے آنا۔'' بی اماں بولیں۔

''خبردار، تم نے اس کلر کی اب دوبارہ کوئی شرٹ خریدی تو.....'' علیزہ بولی۔

''تو کیا کر لو گی تم؟'' وہ بھی چمک کر بولا۔

''قینچی سے کتر دوں گی۔''

''زبان کی قینچی سے، ہے نا؟''

''سچ مچ کترنیں ملیں گی اگلے روز تمہیں اس کی۔'' وہ جارحانہ لہجے میں بولی۔

''اوکے بابا!'' احد جیسے ہار کر بولا۔ ''اب اس کلر پر بین۔ ٹھیک، خوش؟'' اس وقت تو اُس نے علیزہ کی بات مان لی۔ مگر تیسرے روز پھر بی اماں سے پوچھ رہا تھا۔

''بی اماں! میری شرٹ رفو ہو گئی تھی؟''

''نہیں۔ کہاں؟ مجھے تو دوبارہ وہ قمیض نظر ہی نہیں آئی۔ یوں بھی تم نے اس روز علیزہ سے وعدہ کر لیا تھا، اس لئے میں نے بھی پروا نہیں کی۔ رفو ہو بھی جاتی تو دوبارہ اس نے جلد پھٹ جانا تھا، کہنی کا رفو کتنے دن چلنا تھا۔''

''لگتا ہے، نذیر چاچا نے غائب کر دی ہو گی، اپنے شہری بیٹے کے لئے۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گیا۔

❖❖○❖❖

''احمد نگر'' شہر کے مضافاتی علاقوں سے آگے ایک چھوٹے سے گاؤں کا نام تھا۔ آج کل جب کہ چھوٹے سے چھوٹا گاؤں بھی اچھی خاصی گنجان آبادی رکھتا ہے، احمد نگر میں کئی سالوں سے آبادی آٹھ نو ہزار نفوس کے درمیان ہی کھڑی تھی۔

شہر سے قربت کے باعث جن لوگوں کی زمین داری تھی، ان کو چھوڑ کر باقی جو نسبتاً نچلا طبقہ تھا، جس کا ذریعۂ معاش زمینوں میں اُجرت پر کام کرنا یا چھوٹی موٹی مزدوری کر کے اپنا اور کنبے کا پیٹ پالنا تھا، وہ احمد نگر میں ملنے والی معمولی اُجرتوں کے مقابلے میں بڑھتی ہوئی مہنگائی سے تنگ آ کر شہر آ گئے تھے۔

شروع میں وہ شہر میں دیہاڑی دار مزدور کے طور پر کام کرتے رہتے، پھر جس کے جیسے جیسے پاؤں جمے، ذرا سی سر پر چھت کا آسرا ہوا، وہ اپنے بال بچے اٹھا کر مستقل شہر میں سکونت اختیار کر گیا۔ ان بے شمار ہجرتوں کے نتیجہ میں شہروں میں آبادی کا بوجھ بڑھ گیا تھا اور اچھے خاصے خوب صورت کشادہ شہر بھی گنجان اور چھوٹے نظر آنے لگے تھے۔ اور ان کی فضا بھی آلودہ اور کثافت زدہ ہو رہی تھی۔ مگر احمد نگر جیسے دیہاتوں میں آبادی کنٹرول تو نہیں مگر پھر بھی شہروں کی نسبت ادھر سکون تھا۔

نواب سراج احمد اور نواب منیر احمد کو یہ حویلی کلیم میں الاٹ ہوئی تھی۔ اور اس کے اردگرد میلوں تک پھیلی سرسبز کھیتوں سے لہلہاتی زمینیں اور پھلوں کے باغات بھی۔ نواب سراج احمد، نواب منیر حمد سے عمر میں چھوٹے تھے مگر ان سے زیادہ سمجھ دار اور زمانہ شناس تھے۔

پاکستان بننے سے پہلے اگرچہ ہندوستان میں اس کلیم سے ملنے والی اراضی سے کئی گنا رقبہ ان کی وراثت میں پشتوں سے چلا آ رہا تھا۔ مگر ادھر آ کر جب انہیں محض پانچ کنال پر پھیلی یہ وسیع و عریض حویلی اور اردگرد کی زمین الاٹ ہوئی تو انہیں احساس ہوا کہ وقت بہت بدل چکا ہے۔ اس تھوڑے کو بہت سمجھنا چاہئے۔ اسی لئے وہ بہت محنت اور تندہی سے حویلی کی دیکھ بھال اور زمینداری میں جت گئے۔ جب کہ منیر احمد کا حال ان سے مختلف تھا۔

اوّل تو وہ اپنے پُرکھوں کی حویلیاں، زمینیں اور چار گاؤں پر پھیلی اپنی جاگیر چھوڑ کر ادھر آنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ مگر سراج احمد، مسلم لیگ کے سرگرم کارکن ہی نہیں بلکہ پاکستان کی خاطر اپنی جان کی بازی لگانے پر تُلے ہوئے تھے۔ ان کی نظر میں جاگیر و جائیداد کی اہمیت آزادی سے بڑھ کر نہ تھی۔ اور منیر احمد نظریاتی طور پر بھائی کے جتنے مخالف تھے، ان کی محبت میں اسی قدر دیوانے بھی تھے۔

ماں باپ کے بعد انہوں نے پانچ سال چھوٹے بھائی کو بہت محبت سے پالا تھا۔ سراج احمد کے بغیر اتنی بڑی جاگیر میں رہنے کے خیال سے ہی ہراساں تھے۔ پھر انہیں

ہندو دوستوں اور انگریز افسروں کے بدلے ہوئے تیور اور ملک بھر میں جگہ جگہ بھڑکنے والی آگ کے بلند ہوتے شعلے بہت کچھ سمجھا رہے تھے۔ اس لئے جیسے ہی پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کا اعلان ہوا، وہ بے حد افسردہ دل اور لٹی پٹی سی کیفیت میں اپنی وسیع و عریض سلطنت، سونے چاندی اور موتی جواہرات سے بھری تجوریاں پچھلی کوٹھریوں میں مقفل کر کے پاکستان آ ہی گئے تھے۔

پاکستان کی طرف ہجرت کرنے والے پچیس تیس فیصد نوابین کی طرح ان کو بھی پکا یقین تھا کہ یہ "تقسیم" چند روز یا چند ماہ کے لئے ہو گی۔ اگر ایسا نہ بھی ہوا تو کم از کم ان کی ریاست ضرور پاکستان میں شامل کر دی جائے گی، جس کے بارے میں آخر تک کوئی واضح اعلان نہیں کیا گیا تھا۔

پندرہ اگست کی روشن صبح جب ہری بھری کھیتیوں کے اُفق سے روپہلا سورج طلوع ہوا، سراج احمد اپنی نو بیاہتا بیوی روشن سلطانہ، بھائی منیر احمد، اس کی بیوی خدیجہ بانو اور چند دوسرے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ واہگہ بارڈر کے راستے کچھ پاپیادہ اور کچھ سواری پر ایک لمبی زخم زخم مسافت طے کر کے باٹا پور تک پہنچے تو سونے جیسی نقرئی کرنوں کا نور پھیلاتا سورج جیسے ہی ان کے گرد آلود پژمردہ چہروں پر چمکا تو سراج احمد بے اختیار ٹوٹی پھوٹی، گرد کا غبار اُڑاتی پگڈنڈی پر سر رکھ کر سربسجود ہو گئے۔

کچھ ایسی ہی کیفیت باقی افراد کی بھی تھی۔ انہیں لگ رہا تھا، وہ کئی صدیوں کا سفر کر کے اس معجزاتی سرزمین پر پہنچے ہیں۔ حالانکہ نہ تو ان کے لئے یہ زمین نئی تھی، نہ علاقہ، نہ ملک، نہ سر پر سایہ فگن سفید نیلگوں آسمان اور نہ توانائیاں لٹاتا سنہرا روپہلا سورج۔ نئے تھے تو وہ جذبے جنہوں نے اس سرزمین پر قدم رکھتے ہیں ان کے دلوں میں بے اختیار انگڑائی لی تھی۔

'ہمارا ملک، ہمارا وطن، ہمارا اپنا پاکستان، جہاں ہم حاکم ہوں گے، ہم ہی افسر اور ہم ہی خادم۔ کوئی ہندو، کوئی انگریز ہم پر حکومت نہیں کرے گا۔' صرف ایک ہی خیال زخم زخم اس قوم کو صبح نو کا پورے جوش سے استقبال کرنے پر اُکسا رہا تھا۔

نہیں تھا تو ایسا کوئی بھی جذبہ منیر احمد کے دل میں وہ بے حد سپاٹ نظروں سے سربسجود اپنے جذباتی بھائی کو دیکھ رہے تھے جس کی وجہ سے، جس کی خاطر منیر احمد کو اپنی بیش بہا قیمتی اور وسیع جاگیر سے (فی الحال) ہاتھ دھو کر آنا پڑا تھا۔

پھر یہ ملال آنے والے دنوں میں ان کی ہر سوچ کو زنگ آلود بلکہ زہر آلود کرتا چلا

گیا۔ انہیں حویلی، زمینوں، باغات کسی بھی چیز سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ چند ہفتے، چند مہینے تو بے حد خاموشی اور صبر سے وہ تقسیم کے بعد کے حالات، لوگوں کا مصنوعی جوش و خروش، بھائی کی زمین کی دیکھ بھال کی لگن کا جائزہ لیتے رہے، آہستہ آہستہ سب کچھ معمول پر آتا جا رہا تھا۔ ان کی توقع کے بالکل برعکس۔ انہیں تو سو فیصد اُمید تھی کہ سب لوگ نہ سہی، کم از کم ان کے رفقاء جو اپنی جاگیریں، سونے چاندی، ہیروں، اشرفیوں کے مٹکے جو پچھلی کوٹھڑیوں میں دفن کر کے آئے ہیں، وہ دولت ادھر چند دن بھی انہیں چین سے رہنے نہ دے گی۔ مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔

ایسا اس لئے بھی کچھ نہ ہوا کہ ان جیسے نوابین نے اس سرزمین پر آتے ہی بہت مہارت، ہنرمندی و ہوشیاری سے وسیع جاگیریں اور زمینیں اپنے نام الاٹ کروا کر اپنے قدم مضبوط کر لئے۔ ہندوستان جتنی نہ بھی سہی، اس کے نصف کے برابر انہیں جو کچھ ملا، سمیٹ لیا اور نواب منیر احمد محض بساط اُلٹنے کے منتظر اپنی ناکام حسرتوں کو سینے میں دبائے پہلے تو ڈیپریس ہوئے، پھر فرسٹریٹڈ۔

''مجھے کلیم میں ملنے والی اپنی جائیداد میں حصہ چاہئے۔''

تقسیم کے بعد صرف ساتویں مہینے وہ سراج احمد کے سامنے سرد چہرہ لئے، سینہ تانے کھڑے تھے۔ سراج احمد حق دق انہیں دیکھتے رہ گئے۔

''منیر بھائی! یہ سب ہم دونوں کا ہی تو ہے۔''

''یہ..... یہ سب کچھ.....'' انہوں نے حقارت سے دونوں بازو پھیلائے حویلی کے گرد پھیلی زمینوں کو دیکھا۔ ''یہ ہے کیا؟ جو یہ دونوں میں مزید تقسیم ہوگا؟''

''منیر! یہ بہت ہے۔ کم از کم ہم دونوں بھائیوں کی ضرورتوں سے بہت زیادہ۔'' سراج احمد نے تحمل سے کہا۔

''آپ کی ضرورتیں اگر ادھر اس غریب ملک میں آ کر اتنی سکڑ گئی ہیں کہ اس چند گز کے ٹکڑے میں پوری ہو سکتی ہیں تو ہوں۔ مگر میں یہاں مزید چند سانسیں بھی نہیں لے سکتا۔''

''تو کیا کرو گے؟'' وہ حیرت سے بولے۔

''واپس جاؤں گا۔'' وہ عزم سے بولے۔

''پاگل ہو گئے ہو؟ وہاں اب تمہارے لئے کیا بچا ہے؟'' وہ متحیر لہجے میں بولے۔

''پاگل تو ہو گیا تھا، جو تمہارے ساتھ اس غریب نگری میں اُٹھ آیا۔ بھوکے ننگے اس

ملک کے پاس.....''

''منیر احمد! زبان کو لگام دو۔ اگر تمہیں یہاں رہنا گوارا نہیں تو یہ تمہاری ذاتی سوچ ہے۔ میرے سامنے میرے پاکستان کی شان میں ایک لفظ بھی مت کہنا، ورنہ.....'' وہ طیش میں بہت کچھ کہتے کہتے رہ گئے۔

''ورنہ کیا؟ میری گردن اُڑا دو گے؟ اچھا ہے، اُڑا دو۔ اسی لئے تو میں تمہارے ساتھ چلا آیا تھا۔'' وہ تلخی سے بولا۔

''منیر! تم اس وقت جذباتی ہو رہے ہو۔ دیکھو، آرام سے، تحمل سے بیٹھ کر سوچو، غور کرو۔ ادھر کسی بھی چیز کی کمی نہیں، سب کچھ اللہ نے فراوانی سے عطا کیا ہے۔''

''فراوانی۔ ہونہہ..... چند سو گز کی ترکاریاں، پھلوں، پھولوں کی کیاریاں تمہیں فراوانی نظر آتی ہیں؟'' وہ حقارت سے بولے۔

''شکر ادا کرو، ورنہ دیکھو جا کر، لوگ ایک چھت کو ترس رہے ہیں۔'' وہ سلگ کر بولے۔

''تو پاگل تھے نا جو اچھے بھلے گھر، حویلیاں محل، چوبارے، ڈھور ڈنگر چھوڑ کر اس افلاس زدہ ملک میں اپنے پیاروں کی جانیں گنوا کر چلے آئے۔''

''بہت افسوس ہے مجھے تمہاری سوچ پر..... تم اتنی گری ہوئی گھٹیا سوچ رکھتے ہیں۔ انہوں نے یہ جانیں کسی خزانے، سونے یا زمینوں کے لالچ میں نہیں گنوائی تھیں۔ اس کے ایک ایک انچ کے لئے انہوں نے اپنے پیاروں کے خون کی نہریں بہا دیں۔ دیکھا تھا نا تم نے راستے میں آتے ہوئے، جا بجا بکھری ہوئی، اُجڑی کٹی پھٹی لاشوں کی اُگی فصل کو جنہیں کفن تک نصیب نہ ہوا تھا۔ وہ کٹی پھٹی لاشیں ہمارے وطن کی حیات ہیں۔ اس خوب صورت پاک سرزمین کی زکوٰۃ، اس کا سنگھار ہیں۔ انہوں نے نیک مقصد کے لئے جانیں دیں۔ اپنے فانی جسموں کی پروا نہ کی۔ ان فانی جسموں نے ایک دن تو مٹی میں فنا ہونا ہی ہے، انہوں نے تو فنا ہو کر دوام حاصل کر لیا ہے اور تم اسی فانی جسم میں پرورش پانے والے، منہ زور نفس کی کبھی نہ تمام ہونے والی خواہشوں کے سیلاب میں خود کو بہا دینے پر تلے ہو جس کا اجر و عوض صرف تمہاری ذلت بھری شکست کے سوا.....''

''سراج احمد! مجھے اس کتابی لیکچر کی ضرورت نہیں۔ مجھے بتاؤ، میرا کوئی حصہ ہے اس الاٹمنٹ میں کہ وہ بھی خود ہضم کرنے کا منصوبہ بنائے بیٹھے ہو؟'' وہ بیزاری سے بولے۔

''بہت افسوس ہے مجھے تمہاری سوچ پر۔'' وہ دکھی ہو کر بولے۔

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔"

"یہ الاٹمنٹ کے کاغذات ہیں، جو چاہے لے لو۔ تمہیں قدر نہیں اس بے بہا نعمت کی جو قدرت نے بن مانگے تمہاری جھولی میں ڈال دی ہے۔ اور نہ جانے تم جیسے کتنے ناشکرے، ناقدرے اس وطن میں اُٹھ آئے ہوں اور ان کی مفاد پرست سوچ میرے وطن کے ساتھ آگے جا کر کیا کرے گی، اس کا اندازہ مجھے تمہیں دیکھ کر ہو رہا ہے۔ میں اپنے وطن کی مٹی کے صدقے تمہیں بہت کچھ دینے کو تیار ہوں۔" وہ بے حد رنجیدہ ہو رہے تھے۔ منیر احمد نے کاغذات کا پلندہ اٹھایا اور کمرے سے نکل گئے۔

روشن سلطانہ نے متورم آنکھوں کے ساتھ اپنے دکھی شوہر کے جھکے کندھوں پر نرمی سے ہاتھ رکھا تو انہوں نے ذرا سا سر اٹھا کر بیوی کو دیکھا۔

"روشن! میں تم سے شرمندہ ہوں۔ بلکہ ہر اس شہید، ہر اس قربان ہو جانے والے وجود سے شرمندہ ہوں جنہوں نے مٹ کر اس سرزمین کو نام دیا ہے۔" وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تو روشن سلطانہ کا ضبط بھی جواب دے گیا۔ وہ ان کے کندھے پر سر رکھ کر سسک اُٹھیں۔

❖❖○❖❖

"بی اماں! ایک بات پوچھوں؟" رانیہ، بی اماں کے کمرے کے بستر کی چادر بدل رہی تھی۔ تکیوں کے غلاف وہ پہلے بدل چکی تھی، ابھی دونوں جہازی سائز صوفوں کے کور بدلنے باقی تھے۔ صوفوں کا نہ صرف ڈیزائن 1950ء کے اوائل کا تھا بلکہ بار بار مرمت کروانے کے بعد ان کی حالت بھی اتنی اچھی نہیں رہی تھی کہ انہیں یوں عزت دے کر بی اماں کے کمرے میں سجایا جاتا۔

مگر بی اماں کو پرانی چیزوں سے جیسے عشق تھا۔ احد اور علیزہ نے ڈرائنگ روم کا سارا فرنیچر، پردے، ڈیکوریشنز سب تبدیل کروائے تھے، نئے فیشن کے مطابق اور بی اماں نے پرانا فرنیچر اپنے بیڈروم کے ساتھ والے سٹنگ روم میں رکھوا دیا تھا۔

"پوچھو۔" بی اماں پرانی بیڈشیٹ کی جھالر اُدھیڑ رہی تھیں۔

"یہ نذیر چاچا کا بیٹا شہر میں کیا کرتا ہے؟"

"پڑھتا ہے اور کیا کرتا ہے؟"

"وہ بھلا پڑھ کر کیا کرے گا؟"

"کوئی پڑھ کر کیا کرتا ہے جھلی! ماں باپ کا سہارا بنے گا۔ اسے اچھی نوکری ملے

گی۔ سب سے بڑھ کر عزت اور شرف ملے گا۔ ہمارے معاشرے کا یوں بھی رواج ہے نا، پڑھے لکھوں کو اَن پڑھوں سے زیادہ عزت ملتی ہے۔"

"پر بی اماں! نذیر چاچا تو ادھر ملازم ہے۔ اس کا بیٹا کون سا افسر لگے گا؟ زیادہ سے زیادہ ایف اے کر لے گا۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"افسر لگے یا نوکر، علم تو حاصل کر رہا ہے نا۔ علم کو بڑا شرف ہے۔ میرے سوہنے نبی ﷺ کا فرمان ہے، علم حاصل کرنا ہر مرد و عورت پر فرض ہے۔"

"وہ کیا پڑھ لکھ کر احد لالہ کے برابر آ جائے گا؟" وہ چند لمحوں بعد بولی۔

"یہ کیا سوال ہوا؟" بی اماں کچھ بگڑیں۔

"بی اماں! کہتے ہیں نا، علم ہر امیر غریب کو برابر کر دیتا ہے، میرا مطلب ہے....."

"بالکل صحیح سنا ہے تم نے۔ یہ علم ہی تو ہے جو بادشاہوں کو فقیروں، ولیوں کی خانقاہوں میں ننگے پاؤں جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔"

"بی اماں! وہ تو پرانے وقتوں کی باتیں ہیں نا۔" وہ بیڈشیٹ بدل چکی تھی، رک کر بولی۔

"ارے وقت کبھی نہیں بدلتا۔ بس ہم لوگوں کی ذہنیت بدل جاتی ہے، چیزوں کو دیکھنے کا انداز بدل جاتا ہے اور میں تو کہتی ہوں، آج کل تو پرانے وقتوں سے بھی اچھا زمانہ ہے۔ علم ہر امیر غریب، چھوٹے بڑے کو ایک دوسرے کے بالمقابل لے آیا ہے۔ دیکھا نہیں، غریب طبقے کے لڑکے لڑکیاں بڑی بڑی ڈگریاں باہر کے ملکوں سے پڑھ لکھ کر حاصل کر رہے ہیں اور بڑے بڑے اداروں کے افسر لگ رہے ہیں۔ اب ذات برادری، اونچائی نیچائی کوئی ان کے ماتھوں پر لکھی ہے؟ اور یہ کوئی اب پوچھتا بھی نہیں۔"

"کیا واقعی علم سے سارے فرق مٹ جاتے ہیں، امیری غریبی کے؟ مالک ملازم کے؟"

"لو تو اور کیا۔ آج کل کون سا زمانہ ہے ان باتوں کو پوچھنے کا۔ آج کل تو آدمی کو ناپنے کا سب سے بڑا پیمانہ ہی صرف علم بن گیا ہے۔ اب تم دیکھ لو، بڑے سے بڑا سرجن کتنی مہارت سے آپریشن کرتا ہے۔ وہ یہ کب دیکھتا ہے کہ مریض امیر ہے کہ غریب۔ اور علاج کروانے والا چاہے کروڑ پتی ہو، وہ کون سا پوچھتا ہے کہ سرجن نائی کا بیٹا ہے، دھوبی کا یا لوہار کا۔ میں تو کہتی ہوں، آج جیسے زمانے کو تو پرانے لوگ ترستے چلے گئے۔ آج جس طرح بڑائی چھوٹائی، ذات قبیلے کی درجہ بندی کا خاتمہ ہو رہا ہے، ایسا

تو پہلے سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ تم لوگ بہت خوش قسمت ہو جو اس دور میں پیدا ہوئے ہو۔ خوب علم حاصل کرو اور اپنا قد کاٹھ بڑھاؤ۔'' بی اماں بھی جوش میں آ چکی تھیں۔

''بی اماں! مجھ جیسی بھلا اپنا قد کیا بڑھائے گی؟ پشت در پشت سے خدمت گار، خاندانی ملازمہ۔'' وہ مایوسی سے بولی۔

''یہ مایوسی ہے۔'' بی اماں نے انگلی اٹھا کر جیسے خبردار کیا۔ ''اسی مایوسی نے شیطان کو مردود کیا تھا۔ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہو گیا تھا۔ اس کے گناہ نے اسے اتنا نقصان نہیں پہنچایا تھا، جتنا اس کی مایوسی نے۔ امید..... اللہ کی رحمت کی امید ہر ڈوبتے انسان کا آخری سہارا ہوتی ہے۔ وہی لوگ ڈوبتے ہیں جو اس سہارے کا دامن چھوڑ دیتے ہیں، رانیہ بی بی! گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی جو لوگ روشن جگنو کے وجود کا یقین رکھتے ہیں، وہی روشن صبح بھی دیکھتے ہیں۔

''بی اماں! آپ بہت مشکل باتیں کرتی ہیں۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''اری احمق! اس میں مشکل کون سی بات ہے؟ میں تو کہہ رہی ہوں حالات کو، ہر قسم کے حالات کو بدلنا انسان کے بس میں ہے۔ بس اسے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔''

''بی اماں! حالات کی بات کون کر رہا ہے؟'' رانیہ جھلا کر بولی۔ ''میں تو مقام و مرتبے کی بات کر رہی ہوں، جو ہمارے معاشرے میں امیر اور غریب کو ملتا ہے، محض دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کی بنیاد پر۔''

''شاباش رانیہ بیٹا! خود کون سی آسان زبان بول رہی ہو۔ اور یاد رکھو، دولت کی تقسیم کبھی غیر منصفانہ نہیں ہوتی۔ انسان کے اعمال، اس کا کردار اس تقسیم کو متعین کرتا ہے۔ اس پر کبھی تجھ کوڑھ مغز کو سمجھاؤں گی۔ تُو وہ پوچھ مجھ سے، جس کے لئے تُو نے اتنی لمبی بحث کا آغاز کیا ہے۔'' وہ صوفوں کے کورز سے باقاعدہ کشتی کرتی رانیہ سے بولیں۔

''بی اماں! بڑی چالاک ہیں آپ۔'' وہ بے ساختہ ہنس کر مڑی۔

''تُو بالشت بھر کی تھی، جب اس حویلی میں آئی۔ پھر تین سال کی کو چھوڑ کر تیری میا اپنے پیدا کرنے والے کے پاس پلٹ گئیں تو میں نے ہی تم تینوں کو سمجھو چڑیا کے بوٹ کی طرح سینے سے لگا کر پالا ہے۔ تم، احد، علیزہ تینوں کے مزاج کی ایک ایک رمز کی مجھے خبر ہوتی ہے۔ اس وقت جو اُلجھن تیرے دل میں ہے، وہ مجھ سے بول۔'' بی اماں سے کوئی بھی بات چھپانا بہت مشکل تھا۔

''دیکھیں بی اماں! مثلاً.....'' وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور سمجھانے والے انداز

سے بولی۔ ''اب اگر نذیر چاچا کا بیٹا خوب پڑھ لکھ کر بڑا افسر بن جاتا ہے۔ لمبی گاڑی والا۔ دولت، روپیہ پیسہ بھی خوب آ جاتا ہے اس کے پاس۔ پھر وہ بڑی ہمت کر کے، سمجھیں آپ کے خا..... خاندان کی کسی بہت اچھی دولت مند پڑھی لکھی لڑکی کا ہاتھ مانگتا ہے تو..... بی اماں.....'' وہ ان کی گھوری پر کچھ گڑبڑا گئی۔

''آپ..... میرا مطلب ہے..... رشتہ دیں گی؟'' وہ اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ان کے دودھیا نرم نقوش والے چہرے پر جما کر بولیں۔

''اس میں بظاہر تو مجھے کوئی حرج نظر نہیں آتا۔'' وہ آرام سے بولیں۔

''نذیر چاچا کا بیٹا۔ نذیر چاچا کا باپ، ایک دھوبی تھا۔ یاد ہے نا آپ کو؟''

''یاد ہے مجھے۔'' وہ اسی طرح سر ہلا کر بولیں۔ ''اپنے ہنر کا استاد۔ اس سے اچھے کپڑے گاؤں میں کوئی نہیں دھوتا تھا، جیسے دودھیا چاندنی بچھ گئی ہو۔ اُس کے پھیلے کپڑے دیکھ کر ایک بار تو گمان گزرتا تھا.....''

''آپ کر دیں گی رشتہ؟'' وہ پھر بولی۔

''مگر کس کا؟'' بی اماں تنگ آ کر بولیں۔

''مثلاً علیزہ جی..... جی..... کا..... فرض ہے نا بی اماں!'' بی اماں نے ایک دم آنکھیں نکالی تھیں۔ وہ بے ساختہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''تیرا آج کام میں دل نہیں شاید۔'' وہ اسے گھور کر بولیں۔

''بی اماں! میرے سوال کا یہ جواب تو نہیں۔'' وہ کچھ مایوس سی ہو کر بولی۔

''علیزہ کی بات جانے دو۔ جو مثال تم دے رہی ہو، اس میں کچھ خرابی نہیں۔ اگر رشتہ ایسا ہو، جیسا تم کہہ رہی ہو۔ اگر وہ پہلے سے منگنی شدہ نہ ہو تو میرے خیال میں کوئی حرج نہیں۔ لڑکی کی رضا پوچھ کر ہامی بھر لوں گی۔'' وہ رسانیت سے بولیں۔

''اگر ایسا ہی رشتہ..... میرا مطلب ہے کسی لڑکی کا آئے، آپ کے خاندان کے کسی اعلیٰ نسب لڑکے کے لئے۔ جب کہ لڑکی خوب پڑھی لکھی ہو، خوب صورت بھی مگر غریب۔''

''رانیہ!'' بی اماں نے بلند آواز میں اسے گویا جھڑکا تھا۔ وہ سر جھکا کر کورز بدلنے لگی۔

''بیٹا! یہ ذات پات، امیری غریبی کی اونچ نیچ تو حجتہ الوداع کے مبارک دن مسلمانوں میں تمام کر دی گئی تھی۔ فرق ہے تو صرف تقویٰ کی بنیاد پر۔ باقی سب پیمانے تو ہم لوگوں نے گھڑ رکھے ہیں جن کی کوئی مضبوط بنیاد یا عمارت نہیں۔ یہ ذات پات کی

تفریق ہم نے ہندو سے سیکھی، اتنی صدیوں کے ساتھ نے کچھ تو اثر ڈالنا ہی تھا، ورنہ ایسی کسی صورتِ حال میں ایک پڑھے لکھے لڑکے یا لڑکی سے رشتہ جوڑنے میں کوئی برائی نہیں اور اس سلسلے میں، میں لوگوں کی باتوں یا معاشرے کی اُٹھتی انگلیوں کی پروا کرنے والی نہیں ہوں، اتنا تو تم مجھے جانتی ہو نا۔ پھر یہ فضول سوال کیوں کر رہی ہو؟'' وہ تحمل سے بولیں۔

''ایسے ہی بی اماں! کل نذیر چاچا بڑی شیخیاں مار رہا تھا کہ میرا بیٹا بہت بڑا افسر بننے والا ہے، تو وہ اس کا رشتہ کسی اعلیٰ خاندان کی پڑھی لکھی، خوب صورت اور دولت مند لڑکی سے کرے گا، تو اماں میراثن اس کا مذاق اُڑانے لگی کہ ذات کی چھپکلی اور اُڑان دیکھو۔ جب اماں میراثن نے یہ کہا تو نذیر چاچا کو ایک چپ سی لگ گئی۔ آگے سے اس سے کچھ کہا ہی نہیں گیا تو اس کی چپ نے میرے اندر یہ سوال اُگائے۔'' وہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔

''اچھی بات ہے سوال کرنا، اپنے دل کی اُلجھن کو رفع کرنا۔ تمہارا دماغ بہت اچھا ہے۔ ہزار بار کہا ہے، آگے پڑھ لو، آٹھ کے بعد دو ماہ ہی نویں کلاس میں گئی ہو اور ہاتھ اٹھا دیئے۔ پھر کہتی ہو خاندانی ملازمہ..... بچی! میں نے کب تمہیں ملازمہ سمجھا ہے؟ اپنے گھر کا کام کرنے سے کوئی ملازمہ ہو جاتا ہے؟ تو میں تجھے آج سے کام کرنے کو نہیں کہوں گی، تم تو علیزہ کی طرح میری بیٹی ہو۔ اس کو میں کام کے لئے اس لئے نہیں کہتی کہ ڈاکٹری کی تعلیم بڑی مشکل ہوتی ہے۔ دن رات اس کا پڑھائی میں گزرتا ہے۔ اس کا شوق تھا۔ وہ پڑھ لے گی تو اللہ کے بندوں کی کچھ خدمت کرے گی، ورنہ تجھ میں اور علیزہ میں کب فرق جانا ہے؟'' بی اماں جیسے دکھی ہو کر بولیں۔

''سوری بی اماں! اور میں میٹرک کا امتحان دوں گی۔ وہ بھی سائنس سبجیکٹ کے ساتھ، دیکھئے گا۔ اور میں ڈاکٹر بھی بنوں گی، علیزہ باجی اور احد لالہ کی طرح۔ بی اماں! میں بن سکتی ہوں نا؟'' وہ اُن کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔ اُس کا دل یکایک پھولوں کی طرح ہلکا ہو گیا تھا۔

بی اماں اسے بھی علیزہ کی طرح سمجھتی ہیں۔ اسے یکایک اپنی منزل دو گام پر کھڑی نظر آ رہی تھی۔ صرف پڑھنے کی مشقت ہی تو اٹھانا تھی، جس کے لئے وہ خود کو تیار کر چکی تھی، مسکراتے ہونٹوں کے ساتھ وہ جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی۔

❖❖○❖❖

پھر یہ آنسو، سب سے چھپ کر چپکے چپکے رونا سراج احمد کی زندگی کے معمولات میں شامل ہوتا چلا گیا۔ منیر احمد ایک رات نہ جانے کون سے پہر چپکے سے حویلی چھوڑ کر چلے گئے تھے، واپس ہندوستان۔ ایک رقعہ میں دو سطریں انتہائی عجلت میں گھسیٹی گئی تھیں، جو اُن کے سرہانے سے ملا تھا۔

''سراج احمد!

میں واپس جا رہا ہوں۔ اپنے گھر، اپنی عالیشان حویلی اور جاگیر کی طرف۔ ادھر سے اپنے حصے کی زمین اور باغات بیچ کر یہ حویلی اور دو باغات جو آپ کے نام ہیں، چھوڑے جا رہا ہوں۔ نہ جانے آپ لوگوں کو اپنی بے جا ہٹ دھرمی کا احساس کب ہو گا۔ خدیجہ فی الحال آپ کے پاس میری امانت ہے۔ جیسے ہی وہاں جا کر سیٹ ہوا، خدیجہ کو بلوا لوں گا۔ آپ آنا چاہیں تو آپ کے لئے بھی حویلی کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔

منیر احمد۔''

پتہ نہیں، منیر احمد کو واپس جا کر وہ حویلی اور جاگیر ملی یا نہیں، انہوں نے سراج احمد کے لئے حویلی کے دروازے کھلے رکھے یا نہیں، مگر سراج احمد نے اس رات کے بعد سے حویلی کا بڑا دروازہ کبھی مقفل نہ ہونے دیا۔

ایک دن، دو دن، ہفتہ دو ہفتے، مہینے دو مہینے، سال دو سال۔ پھر نہ جانے کتنے سال بیت گئے۔ منیر احمد کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ سراج احمد نے اپنے ذرائع سے بہت کوشش کی کہ کسی طرح منیر احمد کا کچھ پتہ چل سکے۔ یہ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ منیر احمد حویلی تک زندہ سلامت پہنچ گئے تھے، اس کے بعد وہ کہاں گئے یا ان کے ساتھ کیا بیتی؟ اس کا پتہ سر توڑ کوشش کے باوجود نہ چل سکا۔

گمان غالب یہی تھا کہ وہ انتہا پسند ہندوؤں کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں، حویلی اب ایک ہندو صنعت کار نٹور لال کے نام الاٹ ہو چکی تھی، اسی طرح جاگیر اور زمین بھی۔ منیر احمد کو زمین کھا گئی کہ آسمان نگل گیا۔ ان کے مرنے کی خبر مل جاتی تو شاید سراج احمد کو سکون مل جاتا۔ یہ بے نام گمشدگی انہیں شب و روز بے چین و مغلوب رکھتی۔

پھر اس بے چینی کا منبع خدیجہ بانو کا وجود تھا، جو دن رات غمگین صورت بنائے ملگجے حلیے میں دنیا جہاں کی رونقوں سے منہ موڑے حویلی کے کسی کونے میں پڑی رہتی، ان کی سوچوں کو اور بھی پریشان کئے رکھتی۔

''منیر احمد اگر زندہ ہوتے تو خدیجہ بانو کو وہ ضرور اپنے پاس بلوا لیتے۔ کیونکہ بھائی

کے بغیر تو وہ رہ سکتے تھے مگر خدیجہ بانو سے تو انہیں عشق تھا، جس نے دس سال کی بے اولادی کے باوجود خدیجہ بانو پر سوکن لانے نہیں دی۔

''اللہ نے مجھے اولاد دینی ہوگی تو اسی بیوی سے دے گا۔'' خاندان کی ہر بڑی بوڑھی عورت کے اعتراض کے جواب میں ان کے پاس یہی بات ہوتی تھی۔ اور وہ اتنے بدنصیب نکلے کہ اللہ نے جب ان کی ثابت قدمی کو انعام سے نوازنا چاہا تو وہ اس خوشی کو دیکھنے کے لئے موجود نہ تھے۔ منیر احمد کے جانے کے فقط پندرہ روز بعد تو یہ خوش خبری، سراج احمد کو ملی تھی کہ خدیجہ بانو ماں بننے والی ہے۔

اس خبر نے جہاں حویلی کے مکینوں کو حد درجہ نہال کیا تھا، وہیں بے قراری سے منیر احمد کی واپسی یا کسی اطلاع کا انتظار ہونے لگا تھا۔ پھر یہ انتظار محض انتظار ہی رہا۔

روشن سلطانہ نے بیٹے کو جنم دیا تو خدیجہ بانو نے اس خوشی کے تین ماہ بعد ایک پھول سی بیٹی پیدا کی۔ ایک زمانے بعد حویلی میں خوشی کی لہر دوڑی تھی۔ کیا ہوا جو حویلی بدل گئی تھی۔ زمینیں جاگیریں سکڑ کر دو باغات میں سمٹ گئی تھیں، مکینوں کے دل تو وہی تھے اور ان میں موجزن جذبے بھی جو مدتوں سے حویلی میں کسی بچے کی آواز کو ترس رہے تھے۔ اللہ نے ان کی حسرتوں کو خوشیوں میں بدل دیا گیا۔

وقار احمد اور عفت منیر احمد حویلی کے دو پھول تھے، جن کی ہر کلکاری پر حویلی میں زندگی کی نئی لہر دوڑ جاتی۔ منیر احمد سے جدائی کا غم اپنی جگہ، مگر ان دو ننھے فرشتوں نے سب ہی کو زندگی کی مہربانی و محبت کا بھرپور احساس دلایا تھا۔ خدیجہ بانو شوہر کی جدائی کو کوشش کے باوجود نہ بھول پا رہی تھیں۔ ان کے دل کا روگ بالآخر ان کے جسم کا روگ بن گیا۔

اس زمانے میں جب سرطان جیسا موذی مرض بیماری کی حیثیت سے میڈیکل سائنس میں ایک تحقیقی مرض کی صورت اختیار کر رہا تھا، کسی کو علم بھی نہ ہو سکا اور خدیجہ بانو کے جسم میں دوڑتے سرخ لہو کا ایک ایک ذرّہ آہستہ آہستہ بہت خاموشی سے زہر آلود ہوتا چلا گیا۔

عفت بانو ابھی پندرہ برس کی تھی، جب دو جان لیوا قیامتیں حویلی پر ایک ساتھ ٹوٹی تھیں۔

خدیجہ بانو کی بیماری کا انکشاف، وہ بھی آخری مرحلے پر۔ اور منیر احمد کے بارے میں ملنے والی متضاد خبروں نے بالآخر ایک صبح حقیقت کا روپ دھار لیا۔

وطنِ عزیز کو آزاد ہوئے پندرہ برس بیتے تھے کہ منیر احمد جیسے ناقدر شناس مہربانوں کی بدولت یہ وسیع و عریض اسلامی سلطنت دولخت بھی ہوگئی اور وہ سازش اپنے منطقی انجام کو پہنچ کر چار دانگ عالم میں ہمیں ایک ناشکری اور غافل قوم کے طور پر متعارف بھی کرا گئی۔

کوئی بھی نہ سمجھ سکا کہ اندر ہی اندر اس سرزمین کے خلاف پنپنے والی سازش نے بہت خاموشی کے ساتھ اس کے ایک حصے کو زہر آلود کرنا شروع کیا، اور جب خبر ہوئی تو مرض آخری مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔

مشرقی پاکستان بن گیا۔

منیر احمد زندہ ہیں۔

مرتی ہوئی خدیجہ بانو کی سانسیں جیسے سینے میں اٹک کر رہ گئیں، سراج احمد کے سیاسی اثر و رسوخ، پرانے دوستانہ مراسم اور کچھ پیسے کی چمک نے کام دکھایا اور جنگی قیدیوں کی پہلی کھیپ کی واپسی کے ساتھ نہ جانے کس طرح ایک پاگل، دیوانہ، حال سے بے حال، شکل سے بے شکل، بوڑھا ''میری حویلی، میری زمینیں، میری جاگیر، میرا پاکستان'' کا راگ الاپتے شامل ہوگیا۔

سر جھکائے شکست خوردہ فوجی جوانوں کے عقب سے نمودار ہوتا یہ نیم پاگل بوڑھا لمحہ بھر کو تو مشتاق و منتظر سراج احمد کو اپنی جگہ مبہوت کر گیا۔

''کیا یہ منیر احمد ہیں؟'' ان کا یقین متزلزل ہونے لگا۔

اور چند منٹوں بعد انکوائری آفیسر کی پیش کردہ ثبوت و شواہد کی لسٹ نے انہیں یک ٹک اس مجذوب بوڑھے کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا، جو لمبی سینے تک آتی سیاہ و سفید کھچڑی داڑھی، مٹیالے سے زرد رو چہرے اور پیروں میں پہنی سال خوردہ ہوائی چپل میں ان کے سامنے کھڑا تھا۔

اس کے جھریوں بھرے چہرے پر سجی خوب صورت، جوان آنکھیں اندر کو دھنس چکی تھیں جن میں نہ کوئی اُمید تھی نہ کوئی خوشی، نہ جذبہ۔ بالکل خالی، ویران اور ماتھے کے بائیں طرف کونے میں زخم کا تین انچ لمبا زخم کا نشان انہیں منیر احمد ثابت کر رہا تھا

یہی وہ زخم تھا، جو سات سالہ منیر احمد کو حویلی کے سنگی زینے سے گرنے پر لگا تھا۔ تو پانچ سالہ سراج احمد نے رو رو کر بخار چڑھا لیا تھا۔ انہوں نے بے اختیار آگے بڑھ کر اس مجذوب بوڑھے کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

''مت مارو مجھے..... یہ میری حویلی ہے، میری..... میری زمین..... مجھے نہیں

جانتے تم، میں..... منیر احمد ہوں..... نواب شمس الدین کا بیٹا، نواب محی الدین کا پوتا..... مجھے بھول گئے؟..... راجندر سنگھ، ارون لال! تم..... تمہاری یہ جرأت..... کیا کر رہے ہو؟..... مجھے نہ مارو..... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ اپنا آپ سراج احمد سے چھڑاتے ہوئے پہلے آہستہ پھر اونچی آواز میں چیختے ہوئے رونے لگے۔

سارا ہجوم مڑ مڑ کر انہیں دیکھ رہا تھا۔ بے آواز آنسو تو سب ہی کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے، سراج احمد خفت اور تاسف کے قطروں سے عرق عرق ہوتی پیشانی کے ساتھ بمشکل منیر احمد کو گھسیٹتے ہوئے اپنی گاڑی تک لائے تھے۔

اور خدیجہ بانو کو جیسے شوہر کو ایک نظر دیکھنے کا ہی انتظار تھا۔ انہیں تو یقین تھا کہ اگر وہ زندہ ہیں تو وہیں انہوں نے اپنا گھر بسا لیا ہوگا۔ بال بچے ہوں گے۔ اسی لئے تو شرم کے مارے دوبارہ رابطہ نہیں کیا۔ مگر اپنے سامنے ایک نیم پاگل، بیمار بوڑھے منیر احمد کو دیکھ کر ان کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں عجیب سی وحشت آسمائی اور اگلا دن طلوع ہونے سے پہلے خدیجہ بانو نے جیسے تھک کر رخت سفر باندھ لیا۔ شوہر سے کوئی بھی گلہ، کوئی بھی شکایت کئے بغیر آنکھیں موند لیں۔ اور منیر احمد کو کب ان کے کسی شکوے شکایت کی پروا تھی۔ وہ تو خود سے بھی بے خبر تھے۔

''پہلے سال تو انہیں کسی متعصب ہندو نے اپنے کسی ذاتی عقوبت خانے میں رکھا تھا اور خوب جسمانی و ذہنی اذیتیں دی تھیں، جس کی وجہ سے پہلے پانچ سالوں میں ہی ان کا دماغ تکلیف دہ مراحل سے گزرتے ہوئے اپنی یادداشت کھونے لگا تھا۔ پھر نہ جانے کیسے انہیں پاگل خانے پہنچا دیا گیا، جہاں ان کی اپنی دماغی صلاحیتیں بھی آہستہ آہستہ مُردہ ہوتی چلی گئیں۔ یہ تو کوئی معجزہ ہی ہوا جو یہ جنگی قیدیوں کے کیمپ میں پہنچ گئے۔ بہرحال، اللہ تعالیٰ نے ان کی پندرہ سالوں کی مسلسل پریشانی و بے قراری کا تدارک اسی صورت میں کرنا تھا کہ زندہ سلامت آپ تک پہنچ جاتے، سو یہ پہنچ گئے۔ مبارک ہو۔'' انکوائری آفیسر نے سراج احمد کو تفصیل بتاتے ہوئے کہا تو انہیں واقعی اللہ کے اس کرشمے کا یقین ہو گیا۔

''مسلسل پندرہ سال قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے ان کا جسم باہر ہی سے نہیں بلکہ اندر سے بھی ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ ان کا دل جگر اور پھیپھڑے بے حد خستہ حالت میں کام کر رہے ہیں۔ آپ انہیں کچھ بھی یاد دلانے کی یا کسی بھی قسم کا دباؤ ڈالنے کی کوشش نہ کریں۔ اگر انہیں خود سے کچھ یاد آ جائے تو اچھی بات ہے، مگر خود سے ایسی کوئی بھی

کوشش ان کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگی۔'' مکمل طبی معائنے کے بعد تین ڈاکٹرز کے پینل نے اپنی حتمی رپورٹ میں لکھا تھا۔

منیر احمد اپنی واپسی کے بعد صرف دس ماہ زندہ رہے اور ایک صبح چپکے سے بنا ہوش و خرد کی دنیا میں آئے اس بے مائیگی کی کیفیت میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

''میرے اللہ! اگر اسے مجھ سے اتنے برس بعد ملوا ہی دیا تھا تو چند لمحوں کے لئے، آخری چند لمحوں میں اسے میری پہچان، آنکھ میں ذرا سی شناسائی عطا کر دیتے، ایک بار مجھے سراج کہہ کر پکار لیتا تو میرے پندرہ برس سے اس کے فراق میں جلتے سلگتے دل کو قرار ہی آ جاتا۔ کیسی تشنگی دے گئے ہو منیر احمد! چاہوں بھی تو کسی کے سامنے کھل کر رو نہیں سکتا۔'' وہ بھائی کی موت پر پندرہ سال پہلے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے۔

❖❖○❖❖

''رانیہ! تم نے میرا سوٹ پریس کر دیا ہے، وہ پنک والا جو میں تمہیں صبح دے گئی تھی۔'' علیزہ نے ہل ہل کر کتاب کھولے کوئی فارمولا رٹتی رانیہ سے پوچھا۔

''نہیں جی، آپ کو تو پتہ ہے، چند دنوں میں میرے امتحان ہونے والے ہیں۔ مجھے پڑھنے کی وجہ سے ٹائم نہیں مل سکا۔ آپ ماسی دولتاں سے کہہ دیں، وہ کر دے گی۔'' رانیہ نے مسکین شکل بنا کر کہا۔

''کیا مصیبت ہے؟ بھلا ماسی دولتاں کو کیا پتہ، کلف والا سوٹ کیسے پریس کرتے ہیں؟ مجھے ابھی اپنی دوست کے گھر جانا ہے وہ سوٹ پہن کر۔ بھلا تم نے یہ کیا فضول پنگا لے لیا ہے پڑھنے کا۔ تم کرو گی کیا پڑھ کر؟'' علیزہ جھنجلا کر بولی۔

''میں جی آپ کی طرح اور احد لالہ کی طرح ڈاکٹر بنوں گی۔'' وہ جھٹ سے بولی۔

''تم ڈاکٹر بنو گی؟'' علیزہ نے کچھ تمسخرانہ نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ''اچھا ڈاکٹر بن کر کیا کرو گی؟'' وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف گھومی۔

''کسی ڈاکٹر سے شادی کرے گی، اور دونوں مل کر قوم کو دونوں ہاتھوں سے لوٹیں گے۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔'' احد جو فون پر کسی سے بات کر رہا تھا، فون بند کر کے دونوں کی طرف آتے ہوئے بولا۔

''ایسا کون بے وقوف ڈاکٹر ہوگا جو اس سے شادی کرے گا؟''

''وہ بے وقوف ڈاکٹر میں بھی ہو سکتا ہوں۔ کیونکہ شادی کے لئے عقل کی سند رکھنا

کچھ ضروری نہیں، بس رضامندی ضروری ہے۔ رانیہ! تم راضی ہو نا؟'' وہ رانیہ کے سامنے والی ایزی چیئر پر آ بیٹھا تھا اور بڑے مزے سے جھولتے ہوئے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''ہائے اللہ جی!'' رانیہ نے بے ساختہ کتاب سرخ چہرے کے آگے کر لی۔

''واقعی وہ تم جیسا احمق ہی ہو سکتا ہے جو اس رانیہ احمق سے شادی کرے گا۔ اب مجھے یقین آ گیا ہے رانیہ! تم پڑھو پڑھو۔ شاباش!'' وہ مطمئن لہجے میں رانیہ کا کندھا تھپک کر بولی تو وہ اچھی خاصی گڑبڑا گئی۔ علیزہ جی کا اطمینان اور احد لالہ کی شوخ مسکراتی نظریں اسے اچھا خاصا کنفیوز کر گئیں۔ ہاتھوں میں پسینہ آ گیا، کانوں سے سینک سا نکلنے لگا۔

''نہیں..... میں ابھی آپ کے کپڑے پریس کرتی ہوں، پھر پڑھ لوں گی۔'' وہ تیزی سے بوکھلاہٹ میں ننگے پاؤں کمرے سے نکل گئی۔

''یہ کیا بکواس کر رہے تھے؟'' علیزہ نے آگے بڑھ کر احد کا کان زور سے کھینچا۔

''اُوئی، میں مر گیا۔ ظالم حسینہ! چھوڑو میرا کان۔ ایک کان والے شوہر کے ساتھ پھرو گی تو لوگ تم پر ہی ترس کھائیں گے۔'' وہ جھٹکے سے اپنا کان چھڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور شرارتی نظروں سے علیزہ کے حسین غصیلے چہرے کو تکنے لگا۔

''اور جو تم رانیہ سے فرما رہے تھے، وہ.....''

''تمہیں معلوم تو ہے، رانیہ جیسی لڑکیوں کو بے وقوف بنانا کیا مشکل ہے؟'' وہ اس کی طرف ذرا سا جھک کر بولا۔

''بائی داوے اور کتنی رانیہ جیسی لڑکیوں کو بے وقوف بنا چکے ہو؟''

''تم سمیت بتاؤں یا تمہیں نکال کر؟'' وہ جلدی سے بولا۔

''واٹ.....؟'' وہ چیخی۔ ''تمہارا مطلب ہے، میں بے وقوف ہوں؟'' اس کی سیاہ آنکھوں سے شرارے سے نکلنے لگے۔

''محبت کرنا بھی تو سراسر بے وقوفی ہے نا، ڈاکٹر علیزہ!'' وہ سرشار لہجے میں بولا۔

''تو کیا یہ بے وقوفی مجھ اکیلی سے سرزد ہو رہی ہے؟'' بچپن سے ایک دوسرے کے لئے محسوس کی جانے والی اُنسیت کب اس نرم میٹھی آگ میں ڈھلی تھی، اس کی گواہی دونوں ہی زبان سے دینے سے کتراتے تھے۔

''کیا تمہیں ایسا لگتا ہے؟''

''لگنے کا کیا ہے؟ آج کل تو پورے کالج میں صوفیہ حبیب کے حُسن کا پوسٹر لگا ہے۔ اور سب لڑکے بلا ٹکٹ اس پوسٹر کو پڑھنے کے لئے قطار بنائے کھڑے ہوتے ہیں۔ اتنا بے خبر نہ سمجھنا مجھے۔'' وہ غرائی۔

''یہ تم کالج پڑھنے جاتی ہو یا اوٹ پٹانگ خبریں سمیٹنے؟'' احد نے اس کے کانوں کے پیچھے اڑسی لٹ کو کھینچا۔

''تم میری بات کا جواب دو۔ کل بھری دوپہر میں کیفے میں تم اور صوفیہ تھرٹی فور منٹس..... آخر کون سی پیچیدہ گفتگو تھی جو سلجھائے نہ سلجھ رہی تھی؟'' وہ اس کے چہرے پر ناراض نظریں جما کر بولی۔

''پیچیدہ گفتگو..... اوہ! وہ کوئی تمہاری اُلجھی لٹ تو نہ تھی جو سلجھ نہ پا رہی تھی۔''

''احد! میں کیا پوچھ رہی ہوں؟''

''تم جو پوچھنا چاہ رہی ہو، وہی نہیں پوچھ پا رہیں۔ حالانکہ تم جانتی ہو، میں صوفیہ ٹائپ لڑکیوں کو نہ پسند کرتا ہوں نہ ان کے ساتھ ٹائم پاس کرتا ہوں۔ کیونکہ مجھے اپنی زندگی کے ایک ایک منٹ کے قیمتی ہونے کا احساس ہے۔ میں اسے فضول اسکینڈلز کی نذر نہیں کر سکتا۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''تو پھر؟'' وہ ہنوز اکھڑ لہجے میں بولی۔

''تو پھر یہ کہ..... میری جان!..... آئی لو یُو ریئلی اینڈ اونلی یُو آر مائی لو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو۔'' وہ اچانک اس کے بے حد قریب ہو کر بولا تھا۔ علیزہ نے اپنے دھڑکتے دل کو بمشکل سنبھال کر احد کو زور سے پرے دھکیلا۔

''یہ میری بات کا جواب نہیں، بلیک میلنگ ہے، سنا تم نے۔'' وہ کہتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔

''ارے، ابھی تو میں نے بات شروع کی ہے۔'' احد کی پکار اور بلند قہقہے نے اس کا کمرے تک پیچھا کیا تھا۔

'اتنا کھلا، بے ساختہ اظہار پہلے تو کبھی اس احد کے بچے نے نہیں کیا تھا، اور آج.... توبہ! اماں بی آ جاتیں تو؟' وہ کمرے میں آ کر آئینے کے سامنے اپنا گلابی چہرہ دیکھ رہی تھی۔

اور دل تو ابھی تک رانیہ کا بھی قابو میں نہ آیا تھا۔ علیزہ کا سوٹ پریس ہو چلا تھا مگر رانیہ سے اپنی کیفیت نہ سنبھل پا رہی تھی۔

'توبہ..... کیسے ہیں یہ احد لالہ بھی۔ علیزہ کے سامنے ہی کہہ بیٹھے۔ بھلا انہیں کیسے پتہ چلا میرے دل کے راز کا..... ہائے، ان کی محبت کا راز تو میرے دل میں اندر کہیں چھپا ہے۔ کسی سے کہا بھی نہیں۔ انہوں نے کیسے جان لیا؟' دو بار تو علیزہ کی شرٹ جلتے جلتے بچی تھی۔

'دل کو دل سے راہ ہوتی ہے پگلی! بی اماں کہتی ہیں نا، جو جذبات تمہارے دل میں دوسرے کے لئے ہیں، وہی جذبات اس کے دل میں تمہارے لئے خود بخود پیدا کر دیتا ہے۔ تو یہی بات ہو گی نا۔ اور میں جو احد لالہ کو نہ جانے کب سے..... کچھ یاد نہیں آ رہا کتنے دنوں، کتنے مہینوں سے اپنے دل کے بے حد قریب، بے حد پاس محسوس کر رہی ہوں، اس کا پتہ بالآخر ان کو بھی چل ہی گیا۔ تب ہی تو آج اس طرح کھلے عام.....'

اس نے استری سائیڈ پر رکھ کر بھیگتی ہتھیلیوں کو اپنے پہلو سے رگڑا۔

'اللہ توبہ! کتنی شرم آ رہی ہے۔ انہیں پتہ چل گیا ہے کہ اسی لئے تو میں پڑھ رہی ہوں کہ ڈاکٹر بن کر ان کے برابر کی تعلیم حاصل کر سکوں۔ مجھے پہلے یہ خیال کیوں نہ آ گیا۔ یونہی دو سال ضائع کئے۔ اب تو میں نے بھی علیزہ جی کی طرح میڈیکل کالج کے پہلے سال میں ہونا ہی تھا، ان سے دو سال پیچھے۔' اسے پہلی بار اتنا افسوس ہوا دو سال ضائع ہونے کا۔

'پہلے مجھے کب یقین تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ پہلے بی اماں نے یقین دلایا اور آج..... احد لالہ نے خود اپنی زبان سے۔ ہائے اللہ!' وہ پھر استری چھوڑ بیٹھی۔

''وہ بے وقوف میں بھی ہو سکتا ہوں۔ کیوں رانیہ! ضروری تو نہیں صرف رضامندی.....'' احد کی شوخ آواز اور معنی خیز نظریں اسے پھر سے شرم سے دہرا کرنے لگیں۔ نظریں اٹھا کر دیکھا، علیزہ کی شرٹ کے گلے پر رکھی استری کے نیچے سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔

''رانیہ کی بچی! جلا دی میری قمیض۔ بی اماں! بی اماں! دیکھیں آ کر..... اس کو میں چھوڑوں گی نہیں۔ ندیدی، بدنظری۔ میری چیز پر ہی نظر رکھتی ہے۔ میرا نیا سوٹ.....''

علیزہ کی چیخ و پکار پر اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ اسی وقت استری قمیض پر رکھی چھوڑ کر زینے کی طرف بھاگ گئی۔

❖❖○❖❖

جس طرح سراج احمد کے دل میں بھائی کی جدائی کا پھوڑا ایک تکلیف دہ احساس

کی طرح پیدا ہوا تھا، پھر پندرہ سال اس پھوڑے میں سے قطرہ قطرہ دُکھن کا مواد بہہ کر انہیں دُکھی کرتا رہا تھا۔ اور بالآخر منیر احمد کے یوں مخبوط الحواس مل جانے اور پھر ان کی آنکھوں کے سامنے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منوں مٹی تلے دفن ہو جانے کے بعد اس پھوڑے کا وجود تو رفتہ رفتہ ناپید ہو گیا، مگر ایک تکلیف دہ خیال کی صورت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کے دل کی دنیا میں امر ہو گیا تھا۔

یہی دُکھن جس پر روشن سلطانہ اکثر و بیشتر رنجیدہ سراج احمد کی دلجوئی کیا کرتی تھیں، اسی دُکھن کی صورت ایک تکلیف دہ خیال رِستے ہوئے پھوڑے کے مانند ان کے دل میں بھی موجود تھا۔

ان کی اکلوتی بہن ناہید سلطانہ..... سراج احمد کی ٹھیکرے کی مانگ۔ سراج احمد ان کی خالہ کے بیٹے تھے۔ ناہید سلطانہ کے دل کی دھڑکن کی ہر لے جو سراج احمد کا نام لے کر ایک تال سا بناتی تھی، اس سے پھوٹنے والی نغمگی سے روشن سلطانہ کیسے بے خبر ہو سکتی تھیں جب کہ دونوں بہنوں کی عمروں میں فقط ڈیڑھ سال کا تو فرق تھا۔

ناہید کا ہر راز روشن کو ازبر تھا تو روشن کے ہر خیال کی خبر ناہید کو تھی۔ سراج احمد تعلیمی سلسلے میں دو سال گورداسپور اُن کے گھر آ کر رہے تو دونوں کو اپنے مابین تعلق کی خبر تھی۔ خاموش جذبوں کو نظروں کی زبان ملی تو پھر کوئی راز، کوئی پردہ نہ رہا۔ ناہید کو سراج کی ہر پسند و ناپسند کی خبر ہوتی چلی گئی۔ ساون کی پہلی پھوار پڑتی تو وہ جھٹ سے میٹھے پُوڑے بنانے کی تیاری میں لگ جاتی اور سراج احمد بہانے بہانے سے آنگن کے چکر کاٹنے لگتے۔

روشن سلطانہ ان کو دیکھ کر شرارت سے ہنستی، چٹکلے چھوڑتی رہتی۔ ناہید سترہویں سن میں تھی اور روشن پندرھویں سن میں۔ سراج احمد کے واپس جاتے ہی ناہید کے چہرے کی اُداسی روشن کو بھی اُداس کر دیتی۔

انہی دنوں ملک بھر میں آزادی کی تحریک نے بھی زور پکڑا۔ دونوں سکول میں پڑھتی تھیں۔ سکولوں، کالجوں میں تو اس تحریک کو خوب پذیرائی مل رہی تھی۔ دونوں بہنیں سکول سے نکلنے والے ہر چھوٹے بڑے جلسے جلوس میں بڑھ چڑھ کر شامل ہوتیں۔ کچھ عمر کے جوش کا تقاضا اور کچھ اپنے حق کے حصول کی لگن۔ دونوں آزادی کی سرگرمیوں میں خوب مگن تھیں، ابا کے منع کرنے کے باوجود کہ وہ لڑکیوں کی اس طرح کی سرگرمیوں میں شمولیت کو پسند نہیں کر رہے تھے۔ اماں تو روشن کے بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھیں، ابا نے کبھی

باپ والا رعب ڈالا ہی نہیں تھا۔ اس لئے دونوں کے لئے ابا کم اور دوست زیادہ تھے۔

''ابا! آپ کو نہیں پتہ، یہ ہندو تنگ نظر بنیے کیسے ہمارا حق دبا کر بیٹھے ہیں۔ ہر اونچی کرسی پر، ہر اونچے منصب پر یہ قابض ہیں، انگریز کے چمچے۔ اور ہمارے حصے میں کیا آتا ہے، کلرکوں کی ملازمتیں، افسر شاہی کی خدمت اور بس۔ جب انگریز ادھر سے چلے جائیں گے تو ان بنیوں نے جو ہمارا حال کرنا ہے، وہ کسی سے بھی ڈھکا چھپا نہیں۔'' ناہید خوب جوش میں آ کر اپنی استانی جی کی زبان اور لہجے میں ابا کو سمجھانے کی کوشش کرتی۔

''او بے وقوف! بھلا مجھے خبر نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ پر یہ معاملہ جتنا گرم ہے، اتنا ہی نازک بھی۔ پھر خاص طور پر.....'' وہ لڑکیوں کے لئے کہتے کہتے رک گئے۔ دونوں کو ایک بھرپور نظر سے دیکھا۔ سلائی مشین کے آگے جتی سبز گوٹے کناری والے پرچم سیتی دونوں خود سے بھی بے خبر تھیں۔

نوجوان چھریرے بدن میں جوانی کیا پھول کھلا رہی تھی، ان معصوموں کو اس کا علم بھی نہیں تھا۔ وہ دونوں اس سے بے خبر ہوں تو ہوں، وہ باپ ہو کر تو آنکھیں بند نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی حویلی کو چھوڑ کر باہر تین گلیوں تک ایک بھی مسلمان گھرانہ ادھر نہیں رہتا تھا۔ وہ تو کٹر ہندوؤں کی آبادی میں رہ رہے تھے، شروع سے آبائی حویلی میں۔ آج سے کئی برس پہلے یہ ہندو ان کے آباء کے خادم تھے، بعد میں ہم مرتبہ ہو گئے اور اب اچھی ہمسائیگی چلی آ رہی تھی۔ لیکن تحریک آزادی کا نعرہ بلند ہوتے ہی انہیں فوراً احساس ہوا کہ اچھے دوستوں کی آنکھیں بدل رہی ہیں۔

'میں آج ہی سراج احمد اور منیر احمد کو خط لکھتا ہوں، آ کر اپنی امانت لے جائیں۔ نہ جانے کب حالات کیا رخ اختیار کر لیں۔'

انہوں نے اسی وقت فیصلہ کیا اور رات کو ہی خط لکھ ڈالا۔ وہ اس خاندان کے بڑے تھے۔ پھر جس تیزی سے حالات بدل رہے تھے، انہوں نے دونوں گھرانوں کو بہت سوچنے کی مہلت ہی نہ دی۔

ایک ہفتے بعد ہی چاند کی سات تاریخ رکھ دی گئی، ناہید کے چیخنے چلانے کے باوجود۔

''ابا! یہ ظلم ہے، زیادتی ہے۔ مجھے دُلہن بننے کا شوق نہیں۔ مجھے اپنے پاکستان میں جانے کا شوق ہے۔ اسے سجانے، اسے دُلہن بنانے کا شوق ہے۔ ابا! دیکھیں جا کر پچھلی کوٹھڑی میں، ہم دونوں نے راتیں جاگ جاگ کر کتنے پرچم، جھنڈیاں تیار کی ہیں۔ وہ سارے جا کر میں نے، روشن نے اپنے ہاتھوں سے اپنے وطن کی ہر ہر منڈیر پر لگانے

ہیں۔ ابا! مجھے کہیں نہیں جانا۔'' وہ بچوں کی طرح سسک سسک کر رو رہی تھی۔

''ارے میری جھلی بیٹی!.....اچھا میری بات سن۔ آنسو صاف کر۔'' ابا اسے گلے سے لگائے ہوئے ہنستے ہوئے بولے۔ ''دیکھ، تیرا قد ابھی صرف پانچ فٹ، تین انچ ہے۔ اور سراج احمد کا قد پتہ ہے، پورا چھ فٹ ہے۔''

''تو.....؟'' ناہید حیرانی سے بولی۔

''اب اگر پاکستان میں کوئی ایسی چھت، ایسی منڈیر آ گئی جس پر جانے کے لئے کوئی سیڑھیاں ہی نہ ہوئیں تو سراج احمد دو چار اینٹیں رکھ کر یا تیرے ساتھ مل کر بڑے آرام سے جھنڈا لگا لے گا۔ کیا یہ اچھا نہیں ہو گا، جب پاکستان بنے گا تو ہم سب اکٹھے سراج، منیر، میں، روشن، خدیجہ سب ایک ساتھ اپنے آزاد وطن کی سرزمین پر قدم رکھیں۔ بول تجھے یہ منظر اچھا نہیں لگے گا، بجائے اکیلے اکیلے جانے کے؟'' ابا نے ایسی اچھی تصویر کشی کی کہ ایک پل کو تو ناہید بھی سارا رونا دھونا بھول گئی۔

اور تیسری شام اسے مایوں بٹھا دیا گیا۔

''کل ہی نکاح اور رخصتی ہو جائے گی۔ بس اچھا سا نکاح کا جوڑا لے آتے ہیں۔ میرا خیال ہے، اسی ہفتے علیحدگی کا اعلان ہو جائے گا۔ اور گورداسپور تو ضرور ہی پاکستان میں شامل ہو گا۔ بالکل فطری علاقہ ہے، پاکستان کی تقسیم کے ساتھ۔ اس لئے میرے خیال میں ہمیں جانا تو کہیں نہیں پڑے گا۔ سراج اور منیر بھی ادھر ہی آ جائیں گے۔ آزادی کے بعد جو صورت بنے گی، دیکھ لیں گے۔'' ابا پورے اعتماد سے کہہ رہے تھے۔

سر جھکائے دیے میں بتیاں لگاتی ناہید کچھ نہ بولی۔ ہرے پیلے رنگ کے مایوں کے لباس میں اس کا کم سنی کا روپ اور نکھر آیا تھا۔

''روشن! تم میرے اور ماسی فاطمہ کے ساتھ ابھی بازار چلو۔ شادی کے کپڑے خرید لاتے ہیں۔ کل نکاح ہو جائے گا تو مجھے بھی کچھ اطمینان ہو جائے گا۔ چلو تم جلدی سے باہر آ جاؤ۔''

ابا کہہ کر باہر نکل گئے۔

''کیسے رنگ کا سوٹ لاؤں ناہید! لال، گلابی، سندوری کہ مالٹا؟ سراج بھائی کو کیسا رنگ پسند ہے؟'' وہ ناہید کے پاس آ کر بولی۔

''مجھے کیا پتہ؟ اور مجھے نہیں پہننے یہ لال گلابی۔ میں انہی کپڑوں میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے بے رخی سے کہا تھا۔

"اوہو، پہلی بار سن رہے ہیں، دُلہن مایوں کے جوڑے میں رخصت ہوگی۔ چلو یہی سہی۔ میں اپنے کپڑے خرید لاتی ہوں۔ تم انہی کپڑوں میں چلی جانا۔ اور ماسی فاطمہ کہہ رہی ہیں، ناہید سے کہنا باہر نکلے نہ منڈیر پر دیے جلانے پہنچے۔ نور نہیں آئے گا۔ میں نے کہہ دیا ماسی! ناہید کو بیاہنے نور نے نہیں، سراج بھائی نے آنا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟" روشن ہنستے ہوئے کہہ کر باہر نکل گئی۔

"لے کے رہیں گے پاکستان، بن کے رہے گا پاکستان۔" گلی میں تیرہ چودہ سال کے لڑکوں کا مشعل بردار جلوس پورے جوش میں گزر رہا تھا۔

❖❖○❖❖

انہیں خریداری میں کوشش کے باوجود چار پانچ گھنٹے لگ گئے۔ اور انہیں کیا خبر تھی، کیسی ہولی ان کے گھر میں کھیلی جا رہی ہے۔ رات کے اندھیرے میں وہ جیسے ہی عروسی لباس اور دوسرے سامان کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے، ناہید کی اپنے ہی خون میں نہائی، نیم برہنہ لاش، گوٹے کناری والے پرچم اور مٹی کے دیوں کے پاس پڑی تھی۔ خون اس کے اردگرد یوں جمع تھا جیسے وہ کسی خون کے تالاب میں پڑی ہو۔ اس کی ہری پیلی کانچ کی چوڑیوں کے ٹکڑے بجا بجا اس تالاب میں بکھرے پڑے تھے۔

ماسی فاطمہ اور روشن کی چیخوں سے حویلی کے در و دیوار لرز اُٹھے تھے۔ مگر ابا کے منہ سے ایک سسکی نہ نکل سکی تھی ناہید کے معصوم چہرے پر ناخنوں کی کھرونچوں کے نشان گردن سے سینے تک لمبے تھے، جیسے کسی خونی نے اسے کھرچ ڈالا ہو۔ اس کی کھلی آنکھوں میں انتظار کے دیے روشن تھے۔ حویلی کے پچھلے حصے میں آگ بھڑک رہی تھی۔ سب زیور، پیسہ، قیمتی سامان بھی لوٹ لیا گیا تھا۔ مگر جو لوٹ ان کی زندگیوں میں مچی تھی، اس کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا۔ ناہید مایوں کے جوڑے میں ہی رخصت ہوگئی۔

اسی رات سراج احمد اور منیر احمد اپنے قریبی عزیزوں کے ساتھ پہنچ گئے تھے۔ سراج احمد کا متورم چہرہ اور ان کی آنکھوں میں مرتی محبت کی آخری کرنیں کیسے ڈوب رہی تھیں، جب انہوں نے کفن میں لپٹی معصوم پریوں کی سی صورت لئے بے خبر سوئی ناہید کو دیکھا تھا۔

ناہید کو منوں مٹی کے سپرد کرنے کے ٹھیک دو گھنٹے بعد روشن سلطانہ کا نکاح سراج احمد سے کر دیا گیا، دونوں کی رائے مرضی جانے بغیر، صرف حالات کا رخ دیکھ کر۔ اسی رات گورداس پور کو پاکستان میں شامل نہ کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ پھر جو ہندوؤں نے

مسلمانوں کے ساتھ سلوک کیا، جو زندہ بچے وہ مرنے تک وہ کڑی رات نہ بھول پائے۔ روشن، ابا، سراج احمد، منیر احمد، خدیجہ بانو اور چند دوسرے رشتہ داروں کے ہمراہ عیسائی خاکروبوں کے لباس میں ہاتھوں میں تسلے اور جھاڑو لئے ایک ٹرک میں چھپ کر ادھر سے بمشکل نکلے تھے۔ خالی ہاتھ، خالی دامن لئے۔ صرف روشن سلطانہ نے ایک پوٹلی کو سینے سے لگا رکھا تھا، جس میں ناہید کی خون آلود سبز پیلی اوڑھنی تھی، کانچ کی ٹوٹی چوڑیوں کے چند ٹکڑے اور مٹی کے خون آلود دیے کے ٹکڑے۔ یہ متاع آج بھی ان کی یادوں کا سب سے بڑا خزانہ تھا۔

ابا کے تو جیسے سارے بوجھ اُتر گئے تھے۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھنے کے صرف تین گھنٹے بعد وہ چپ چاپ ہمیشہ کے لئے سو گئے تھے۔ ان کے چہرے پر اتنا سکون، اتنا اطمینان تھا کہ روشن سلطانہ چاہنے کے باوجود چیخ کر رو بھی نہ سکیں۔ ایک عمر کی مسافت کے بعد تو انہیں یہ نیند نصیب ہوئی تھی۔

"کیا کرو گی ان زخمی یادوں کو بار بار کرید کر؟ پھینک دو ان تکلیف دہ کھلونوں کو، جو ہر لمحہ تمہارے سکون کو برباد کرتے ہیں۔"

روشن سلطانہ خون آلود اوڑھنی اور کانچ کی چوڑیاں ہاتھ میں لئے بیٹھی آنسوؤں کے دیے جلا رہی تھیں، جب سراج احمد نے ان کے پاس آ کر دُکھی لہجے میں کہا۔ آج بارہ اگست کی شام تھی، ناہید کی اذیت ناک رخصتی کی خونیں شام۔ وہ کبھی اس شام کو، اپنی دوست، اپنی بہن کی اس قربانی کو یاد کرنا نہ بھولتیں جو اُس نے اس سرزمین کے لئے دی تھی۔

"ان ہی زخموں میں تو زندگی کی نوید ہے۔ یہی تو جینے کی آس دلاتے ہیں۔ جس دن ان کو خود سے علیحدہ کر لیا، اس دن سمجھیں میں بھی مر گئی۔ یہ وقت کی امانت ہے، جو مجھے وقت کے ہی حوالے کر کے جانا ہے۔" روشن سلطانہ نے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے مخملیں تھیلی میں سب کچھ سمیٹ لیا۔

"اور اب تو لوگ یہ بھی بھولتے جا رہے ہیں کہ انہوں نے یہ الگ وطن حاصل کیوں کیا تھا۔ قائد کی انتھک محنت، اس کے جسم و جان کی تمام تر توانائیاں کس مقصد کے حصول کے لئے صرف ہوئیں۔ نئی نسلوں کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ پاکستان کیوں بنایا گیا۔ ہم نے اپنی نسلوں کو کچھ بھی منتقل نہیں کیا تو حاصل کیا کریں گے؟ روپے، پیسے، اسٹیٹس کی اندھی دوڑ میں سب کچھ پس پردہ چلا گیا ہے۔ وقت کی دھول ماضی پر پڑا ہی

کرتی ہے، مگر ہم خود اپنے ہاتھوں سے مٹی اٹھا اٹھا کر خون سے لکھی اس روشن تاریخ پر ڈالتے جا رہے ہیں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے، جیسے ہم اپنے مقصد کو حاصل کر کے شرمندہ سے ہیں۔ پتہ نہیں، آنے والی نسلوں کو ہمارے اس قربانیوں بھرے سفر کی خبر بھی ہو گی کہ نہیں۔''

اُن کے اردگرد کی دنیا بہت تیزی سے بدل رہی تھی۔ یورپی ممالک اور مڈل ایسٹ سے کما کر لایا گیا ڈھیروں ڈھیر پیسہ، ڈالر، ریال اور دینار سے ان کے گرد بلند عمارتیں کھڑی ہو رہی تھیں۔ سڑکوں پر ایک سے ایک عالیشان نیو برانڈ کی گاڑیاں دوڑنے لگی تھیں، جن کے شیشے کسی بھکاری کو اپنی طرف دیکھ کر فوراً اوپر چڑھ جاتے تھے۔ رشوت، لوٹ کھسوٹ، جائز ناجائز ہر طریقے سے دولت کا حصول عام ہوتا جا رہا تھا۔

ساری رات جن گھروں میں روشنیوں اور خوشبوؤں کا جشن منایا جاتا تھا، اس گھر کے پہلو میں یا اس سے چند گھر چھوڑ کر غریب ہمسایوں کے بچے بھوک سے بلک رہے ہوتے۔ آہستہ آہستہ لوگوں کی آنکھوں پر دولت ہوس اور خودغرضی کی پٹی بندھتی چلی جا رہی تھی۔ ایسی پٹی جس سے سب کچھ نظر آتا ہے مگر کچھ نظر نہیں آتا۔ رہی سہی قومی حمیت کا خاتمہ پے در پے آنے والی فوجی حکومتوں کی آمد نے کر دیا۔

''آپ اس قدر مایوس کیوں ہو رہے ہیں؟ خدانخواستہ ایسا کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ پھر ہمارے بچے، آپ دیکھیں کس قدر حساس اور دردِ دل رکھنے والے ہیں۔ آپ نے یا میں نے تو وقار کو مجبور نہیں کیا کہ وہ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرے۔ اسے خود ہی شوق ہے کہ وہ اپنے لوگوں کی خدمت کرے گا۔ یہی حال طاہرہ کا ہے۔ دونوں بہن بھائی ادھر ہی احمد نگر میں ہسپتال کھول کر اپنے لوگوں کے کام آنا چاہتے ہیں۔'' روشن سلطانہ نے گویا ان کا حوصلہ بڑھایا۔

''چلو، زندہ رہے تو یہ بھی دیکھ لیں گے۔'' وہ کچھ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولے۔

''تم نے وقار احمد سے بات کی ہے؟ دیکھو، میں اب اور انتظار نہیں کر سکتا، عفت کے سلسلے میں۔ خاندان بھر میں باتیں ہو رہی ہیں کہ چچا نے بیٹے کے نام پر بٹھا رکھی ہے۔ وقار کی ضد کی وجہ سے کہ وہ ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کر لے، مجھے صبر آزما انتظار سے گزرنا پڑ رہا ہے۔''

''وقار کب منکر ہے اس بات سے؟ وہ تو خود عفت کا..... آپ کو معلوم تو ہے، اب اس کا ہاؤس جاب مکمل ہو چکا ہے۔ شہر کے سرکاری ہاسپٹل میں بھی فی الحال اس کی

نوکری لگ گئی ہے۔''

''تو بس پھر اب انتظار کس بات کا ہے؟ اگلے مہینے کی کوئی سی بھی تاریخ رکھ لیتے ہیں۔ دونوں کی عمریں پچیس برس سے تجاوز تو کر رہی ہیں۔ ہمارے ہاں ورنہ اتنی دیر سے کب کرتے ہیں، خصوصاً بیٹیوں کی شادیوں کے سلسلے میں۔ عفت تو چار سال سے گریجویشن کر کے گھر بیٹھی ہے۔ تم وقار احمد سے بات کر لو گی کہ میں کروں؟'' وہ اُٹھتے ہوئے بولے۔

''میں رات ہی بات کر چکی ہوں۔ اس کی مرضی ہوئی ہے تو آپ سے کہہ رہی ہوں۔ بس اُس کی ایک خواہش ہے.....'' وہ کچھ جھجک کر رہ گئیں۔

''اب کون سی خواہش رہ گئی ہے؟'' وہ کچھ تنگ آ کر بولے۔

''باہر اعلیٰ تعلیم کے لئے جانا چاہ رہا تھا۔''

''ابھی نہیں شادی کے دو چار سال بعد دیکھا جائے گا۔ تم آج ہی سے شادی کی تیاریاں شروع کر دو۔ طاہرہ نے میڈیکل میں داخلہ نہ لیا ہوتا تو میں اس کا بھی کہیں نہ کہیں رشتہ طے کر کے ساتھ ہی رخصتی بھی کر دیتا۔ ابھی تو اس کے ڈاکٹر بننے میں دو سال کا عرصہ سمجھو۔ چلو، جو اللہ کو منظور۔'' وہ کہتے ہوئے اُٹھ کر باہر نکل گئے تو روشن سلطانہ کوشش کے باوجود ان سے طاہرہ کی ضد کا ذکر نہ کر سکیں۔

'میں طاہرہ کی ضد کبھی سراج احمد سے بیان بھی کر سکوں گی یا نہیں؟' وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

❖❖○❖❖

''بی اماں! بمباسٹک نیوز۔ آپ کی رانیہ بیگم نے ایف ایس سی شاندار نمبروں سے پاس کر لیا ہے۔ مبارکاں، گھر میں ایک اور ڈاکٹر کی پیدائش۔'' احد باہر ہی سے اخبار ہاتھ میں لئے اونچی آواز میں کہتا چلا آ رہا تھا۔

''ہائے، واقعی، سچی؟'' رانیہ جو بیٹھی بی اماں کے پاؤں دبا رہی تھی، خوشی سے اچھل پڑی اور احد کے ہاتھ سے اخبار چھیننے لگی۔

''دھیرج لڑکی! تمہارے ہارٹ فیل ہو جانے کا ڈر نہ ہوتا تو میں تمہیں فیل ہونے کی خبر ایک بار تو ضرور سناتا۔'' وہ اسے اخبار تھماتے ہوئے بولا۔

'آپ کو کیا خبر، میرا ہارٹ فیل ناکام ہونے کی خبر سے نہیں آپ کے عشق میں ناکام ہونے کے اعلان سے واقعی ہو سکتا ہے۔' وہ اپنا رول نمبر ڈھونڈتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

''مبارک رانیہ بیٹی! تم نے بہت کمال کیا۔ محنت بھی تو بہت کی تھی۔ دن رات کتابوں سے آنکھیں جوڑ رکھی تھیں۔ اللہ نے صلہ تو دینا ہی تھا۔'' بی اماں نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔

''بی اماں! دو گھنٹے میرا بھی تو بھیجا کھاتی تھی۔ علیزہ جی! یہ پڑھا دو، یہ سمجھا دو۔ اور میں تو کہتی ہوں بی اماں! بے شک اس نے ایف ایس سی تو کلیئر کر لیا ہے، مگر اس کی عقل میں تولہ بھر کا بھی اضافہ نہیں ہوا ہوگا۔ کہو کچھ، کرتی کچھ ہے۔ بولو کچھ، سمجھتی کچھ اور ہے۔ بی اماں! اس کی عادت کتنی عجیب ہے۔ آدھے راستے میں جا کر اسے یاد آتا ہے کہ پوچھ تو لے کرنا کیا ہے۔'' رول نمبر ڈھونڈنے میں محو رانیہ نے علیزے کے کمنٹس جیسے سنے ہی نہیں۔

اسے واقعی بات دیر سے سمجھ میں آتی تھی۔ سامنے پڑی چیزیں بھی اکثر نظروں سے اوجھل رہتیں۔ نتیجتاً بی اماں سے تھوک کے حساب سے ڈانٹ کھاتی۔

''ارے، آج کل کسی بھی پروفیشن میں قابلیت کے لئے عقل کی ضرورت کب ہوتی ہے؟ بس ڈگری چلتی ہے۔'' احمد وہیں کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''مل گیا۔'' رانیہ نے جوش بھرا نعرہ مارا۔ ''احد لالہ! میرے مارکس تو خاصے کم آئے ہیں۔ مجھے فاطمہ میں تو داخلہ نہیں ملے گا۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''رانیہ کی بچی! شکر نہیں کرتی کہ اتنے مارکس آئے ہیں۔ اور کہیں نہیں تو نشتر کالج میں داخلہ تو ہو ہی جائے گا۔ چلو اسی خوشی میں زبردست سی چائے مٹھائی کے ساتھ پیش کرو۔''

''ہاں، سب کے لئے چائے لے آؤ اور ساتھ میں باداموں کا حلوہ پڑا ہے، وہ لے آؤ۔ پہلے ذرا ادھر آؤ۔'' وہ اخبار ہاتھ میں لئے جانے لگی تو بی اماں نے اسے پاس بلایا۔

''مبارک ہو بہت۔ ماں باپ ہوتے تو خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ بے وقوف کہتی تھی، بی اماں! خاندانی ملازم، کمی کمین کب پڑھ سکتے ہیں؟ دیکھا میرے مولا نے عقل اور علم حاصل کرنے کی استطاعت سب میں رکھی ہے۔ اس کو پہچاننے اور کام میں لانے کی ضرورت ہے۔ مبارک ہو۔'' بی اماں نے اس کا ماتھا چوم کر گلے سے لگایا اور پیار کرتے ہوئے کہا تو اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے۔

''دیکھا بی اماں! اس کی عقل کو۔ پیار کیا، مبارکباد دی تو رونا شروع کر دیا۔'' احد نے اسے چھیڑا۔

''اسی لئے تو کہتی ہوں، رانیہ کا ایف ایس سی کرنا بے فائدہ ہے۔ یہ ڈاکٹر نہیں بنے گی تو قوم اس احسانِ عظیم کو کبھی فراموش نہ کرے گی۔'' علیزہ لحاف سے ذرا سا نکل کر بولی۔

''بری بات۔ یوں نہیں کہتے۔ جاؤ، تم جا کر چائے لے کر آؤ۔ پھر دیکھتے ہیں، رانیہ کو آگے کہاں داخلہ لے کر دینا ہے۔'' بی اماں بولیں تو وہ خوشی خوشی باہر چلی گئی۔

''بی اماں! ایک خوشخبری میری جانب سے بھی ہے۔'' اس کے جاتے ہی احد بولا۔

''وہ کیا؟''

''مجھے اسکالرشپ مل رہا ہے، اسپیشلائزیشن کے لئے۔ بہت خوش ہوں میں۔ آج ہی لیٹر ملا ہے۔ میری زندگی کی یہ بڑی خواہش تھی۔'' وہ خوشی خوشی بتا رہا تھا۔

''رئیلی.....؟ مبارک ہو۔'' علیزہ نے بی اماں کے پیچھے سے سر نکال کر اسے کہا۔

وہ بی اماں کو دیکھ رہا تھا، جو بالکل چپ تھیں۔

''بی اماں! آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟'' چند لمحوں بعد اس نے ڈر کر پوچھا۔

''نہیں۔'' انہوں نے گہرا سانس لیا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ تم باہر جاؤ۔ تمہیں ڈاکٹر بننے کا شوق تھا، اللہ نے پورا کر دیا۔ اب مزید تعلیم کے لئے باہر جانا، میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گی۔'' بی اماں کا خشک لہجہ سن کر علیزہ بھی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''مگر کیوں بی اماں! آپ کو معلوم تو ہے، اس پروفیشن میں اسپیشلائزیشن کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔'' علیزہ آہستہ آواز میں بولی۔

''تاکہ چار پانچ سال تم باہر لگاؤ، پھر وہاں کی فضا تمہیں اس قدر بھا جائے کہ تم چاہو بھی تو قدم موڑ نہ سکو۔''

''نہیں بی اماں! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میں ضرور واپس آؤں گا۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''اگر آ بھی گئے تو اپنی ان مہنگی ترین ڈگریوں کے بدلے شہر میں مہنگا ترین ہسپتال بناؤ گے، اس میں باہر کے ملکوں سے درآمد کردہ مہنگی و اعلیٰ درجے کی مشینیں لگاؤ گے جن سے ہونے والے ٹیسٹوں کی فیس ادا کرنا مجھ جیسے یا میرے ملک کے کسی بھی عام آدمی کی استطاعت سے باہر ہوگا۔ نہیں احد! میں تمہیں اس گورکھ دھندے میں اُلجھنے کی اجازت

نہیں دوں گی۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولیں۔

''کیا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں؟'' وہ دکھی سا ہو کر بولا۔ ''اپنے خون پر؟''

''خون پر اعتبار ہے۔ اس کی تاثیر پر بھی۔ مگر کچھ ایسا وقت چلا ہے کہ کوئی بھی دعویٰ کرنا محض خود کو فریب دینا ہے۔''

''تمہیں معلوم ہے نا، چچا فیض چشتیاں والے کا بیٹا ڈاکٹر وہاب پچھلے تیس برسوں سے انگلینڈ میں ہے۔ ہارٹ سرجن۔ بڑے بڑے انگریز ڈاکٹر اُس کی قابلیت کے آگے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔ اس دن بی بی سی میں بھی اس کا انٹرویو آ رہا تھا۔ میزبان اس کا تعارف کراتے ہوئے بتا رہا تھا کہ قدرت نے اس کے ہاتھوں میں انگلیاں نہیں، زندگی کے سوتے رکھے ہیں۔ مُردوں میں جان ڈال دیتے ہیں اس کے ہاتھ۔ اور اُس کی بیوی مبشرہ کتنی ماہر گائنا کالوجسٹ ہے، لندن ہسپتال میں۔ اخباروں میں اس کے انٹرویو اور تصویریں چھپتی رہتی ہیں۔ اور چچا فیض کے اپنے علاقے میں پچھلے سال چار عورتیں زچگی کے دوران مر گئیں۔ کیونکہ ہاسپٹل میں ڈاکٹر تو موجود تھی مگر نہ تو وہ ماہر اور قابل تھی، نہ ہسپتال میں اچھی مشینری تھی۔ جو لوگ دل کی تکالیف سے آئے دن مرتے ہیں، ان کا تو کوئی شمار نہیں۔ بے شک، ہر شخص نے اپنی مقرر کردہ عمر ہی جینی ہے، مگر علمِ طب کو میرے اللہ نے بڑی فضیلت بخشی ہے اب یہی دونوں میاں بیوی ادھر ہوتے۔ میں سوچتی ہوں، ہم نے کیا یہ ملک اس لئے حاصل کیا تھا کہ ہم اپنے بچوں کو پالیں پوسیں، پڑھائیں لکھائیں اور پھر فیض اٹھانے کو، پھل کھانے کو دوسروں کے حوالے کر دیں اور ہم ترستی نگاہوں اور ناکافی وسائل کے ساتھ ان ہی گوروں کے غلام بنے رہیں۔''

''بی اماں!..... بی اماں! ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ سب آپ کا وہم ہے۔ اور جو لوگ باہر جا کر سیٹل ہو گئے ہیں، وہ اس لئے کہ یہاں کے لوگ، حکومتیں ان کی قدر نہیں کرتیں۔ انہیں ان کی ذہانت و قابلیت کے مطابق عزت و مقام اور تحفظ نہیں دیتیں۔ جس خصلت اور قماش کی حکومتیں اس ملک کو مل رہی ہیں، لگتا نہیں کہ یہ اسے باعزت طور پر سلامت رہنے دیں گی۔''

''اللہ نہ کرے اس ملک کی سلامتی پر کوئی حرف آئے۔ میرے بچے! یاد رکھنا، مایوسی کفر ہے اور کفر اللہ کی ناراضی۔ میں پڑھتی ہوں، اخباروں میں کالم نویس اچھے اچھے دماغوں والے آج کل کیا لکھ رہے ہیں۔ ہمسایہ ملک کی ترقی، خوشحالی، نیک خصلتوں

کے چرچے اور اپنے بگاڑ، خرابی کے رونے۔ کیا سب طرف برائی ہے تو مجھے بتاؤ، پھر یہ ملک کس طرح چل رہا ہے؟ یہ ملک..... یہ پاک سرزمین، حکومت کرنے والے ان چند سو یا چند ہزار لوگوں نے حاصل نہیں کی۔ ارے یہ تو اللہ کا معجزہ ہے۔ اور معجزہ خدانخواستہ کوئی حرفِ غلط نہیں ہوتا، جسے آرام سے کسی بھی ریموور سے مٹایا جا سکے۔ اس ملک کو بنانے والے اللہ کے بعد اس کے عوام تھے۔ وہی اس کو قائم رکھیں گے اور اس کی بقا کے لئے آخر دم تک لڑیں گے۔''

پاکستان..... پاکستان ایک ایسا موضوع تھا، جس پر بی اماں تھکے بغیر گھنٹوں بول سکتی تھیں۔ وہ ایک دم سے ستر سے سترہ سال کی لگنے لگ جاتی تھیں۔ ان کی باتیں پُرجوش تو ہوتی تھیں مگر شاید وہ ان باتوں کے جوش میں موجودہ حالات اور لوگوں کی بدلتی ہوئی سوچوں کو ذہن میں نہیں رکھتی تھیں۔

امن و امان کی دگرگوں حالت، کرپشن ناانصافی اور حکومت اور عوام کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج نے ان کو اپنے ہی محبوب وطن سے کس درجہ مایوس و بددل کر دیا ہے کہ وہ ادھر رہنے کے بجائے باہر کہیں بھی جانے کو تیار ہیں۔

''بی اماں! اس وقت بات ہو رہی ہے، میرے باہر جانے کی۔ اور آپ یقین رکھیں، وہ آدمی جو اپنے خون کا آخری قطرہ تک اس ملک کی عزت، آن بان کے لئے پیش کرے گا، وہ میں ہی ہوں گا۔ مگر اس ملک کی سربلندی کے لئے دنیا میں علم کے جھنڈے بھی تو گاڑنے ہیں، اپنی ذہانت اور قابلیت کے بل بوتے پر۔ اور بی اماں! کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا تو پڑتا ہے نا۔ مگر آپ یقین رکھیں، میں سورج نہیں جو مغرب میں جا کر گم ہو جاؤں گا۔ پرامس، مجھے واپس ادھر ہی آنا ہے۔'' وہ ان کے ہاتھ دبا رہا تھا۔

''بی اماں! دے دیں نا اجازت۔'' علیزہ جلدی سے بولی۔ اسے اپنے لئے بھی تو راہ ہموار کرنی تھی۔ باہر جانا اس کا بھی تو خواب تھا۔

''اچھا، تو اس کے لئے میری ایک شرط ہے۔''

''دس شرطیں منوائیں جی۔'' وہ خوش ہو کر بولا۔

''علیزہ کا ہاؤس جاب مکمل ہونے میں کتنا عرصہ ہے؟''

''تقریباً آٹھ دس ماہ بی اماں!'' علیزہ جلدی سے بولی۔

''بس تو پھر تم دونوں کو شادی کرنا ہو گی۔ وہ بھی اگلے ماہ۔''

"کیا.....؟" علیزہ زور سے اُچھلی تھی جبکہ احد پُرسکون بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

"ہاں، یہی میری شرط ہے۔ ورنہ احد باہر نہیں جائے گا۔"

"تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟" علیزہ روہانسی ہو کر بولی۔

"دیکھو بچے! شادی تو تم دونوں کو کرنا ہی ہے۔"

"بی اماں! مجھے اس سے کب انکار ہے؟ مگر میرا ہاؤس جاب تو مکمل ہونے دیں۔"

"تمہارا ہاؤس جاب مکمل ہوگا تو احد باہر جا چکا ہوگا۔"

"پھر میری بھی ایک شرط ہے۔" علیزہ کچھ سوچ کر بولی۔

"چلو، یہ تو شرط بمقابلہ شرط شروع ہوگئی۔ شرطوں کا نیٹ ورک۔"

"پھر میں بھی اسپیشلائزیشن کرنے احد کے ساتھ ہی باہر جاؤں گی۔" اُس کی شرط پر چند لمحے کے لئے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

"مجھے منظور ہے۔" بی اماں نے اس خاموشی کو توڑا۔

"یس....." علیزہ خوشی سے چلائی۔

"وہاٹ.....؟" احد ہکا بکا رہ گیا۔ "بی اماں! یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"کیوں، یہ کیوں نہیں ہوسکتا؟ تم ہائر اسٹڈیز کے لئے جاسکتے ہو تو میں کیوں نہیں؟"

"تو بی اماں کے پاس کون رہے گا؟"

"میرے پاس رانیہ جو ہے۔"

رانیہ ٹرالی دھکیلتی کاریڈور میں داخل ہوئی تھی۔

"مگر بی اماں.....!" احد نے کچھ کہنا چاہا۔

"اگر مگر کچھ نہیں۔ اگلے ماہ تم دونوں کی شادی۔ اس کے بعد تم اپنے ساتھ علیزہ کے بھی کاغذات تیار کراؤ اور ساتھ میرے پیپرز بھی۔"

"آپ کے پیپرز؟"

"چار ماہ بعد تو حج ہے۔ تم لوگوں کے باہر جانے سے پہلے میں یہ آخری فرض ادا کر آؤں، پھر سکون سے زندگی کے دن پورے کروں گی۔"

"بی اماں! اکٹھے اتنے سارے کام؟" احد کچھ اُلجھ سا گیا۔

"اکٹھے کیوں؟ اگلے ماہ شادی ہو جائے گی تو....."

"کس کی شادی بی اماں؟ میں بھی جاؤں گی۔ میں تو اب ایڈمیشن تک بالکل فری ہوں۔" رانیہ اندر آ کر ٹرالی سیٹ کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"احد اور علیزہ کی۔ وہ بھی اگلے ماہ۔ تم جی بھر کر خوشیاں منانا۔ خوب تیاری کرو۔"

رانیہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بی اماں کو دیکھ رہی تھی۔ پس منظر میں علیزہ کا سرخ گلابی جھلملاتا، شرمایا شرمایا سا روپ ہلکورے لے رہا تھا۔

رانیہ کو لگا، اس کا دل اندر ہی اندر کسی گہری کھائی میں اُترتا جا رہا ہے اور کانوں میں کوئی گرم گرم مائع انڈیل رہا ہے۔ اسے اپنا سر گول گول گھومتا محسوس ہو رہا تھا۔ ٹرالی میں پڑے برتن جیسے اپنی جگہ بدلنے لگے تھے۔ بھاپ اُڑاتی چائے کی چینک خود بخود اوندھی ہوگئی تھی اور کھولتی ہوئی چائے اس کے گھٹنوں پر آ گری۔ وہ بلبلا کر اُٹھی۔ متوحش نظروں سے کمرے میں بیٹھے تینوں نفوس کو دیکھا۔

"ذات کی کوڑ کلی چھتیراں نوں جھے۔" (نیچ ذات کی اتنی اُونچی اُڑان) اماں میراثن تالی مار کر نذیر چاچا سے بولی تھی۔ وہ اُلٹے قدموں بھاگ گئی۔

"اسے کیا ہوا بی اماں؟" احد نے رانیہ کو یوں پاگلوں کی طرح بھاگتے دیکھا تو کچھ پریشان سا ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"فون کی گھنٹی سن کر گئی ہے۔ اُس کی اکلوتی دوست، ندا کا فون آیا ہوگا۔ رزلٹ کے بارے میں ڈسکشن کرنا ہوگی۔" علیزہ نے اچک کر بی اماں کے پیچھے سے چھلانگ لگاتے ہوئے کہا۔ "میں چائے بناتی ہوں۔"

علیزہ کے جواب پر احد بھی مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔

❖❖○❖❖

تنویر یوسف۔ یہ وہ نام تھا، جو آگے چل کر روشن سلطانہ اور سراج احمد کے دلوں کا ناسور بن گیا۔

وقار احمد اور عفت بانو کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ ایک زمانے کے بعد تو اس حویلی میں خوشیاں مہمان بن کر آئی تھیں۔ شادی سے کئی دن پہلے تو روشن سلطانہ نے حویلی میں ڈھولک رکھ دی تھی۔ سرِ شام گاؤں کی لڑکیاں بالیاں اور حویلی کی ملازمائیں ڈھولک بجانے جمع ہو جاتیں۔ گیت گاتیں اور روشن سلطانہ کو تو سہرے کے گیت بے حد پسند تھے۔ بار بار گاؤں کی میراثن ثریا سے فرمائش کر کے "جیوے بنڑا" کے گیت سنتیں اور ایک مدت سے غموں سے نڈھال دل کو اس سچی انہونی خوشی کا یقین دلاتیں۔

شادی بہت دھوم دھڑکے سے بخیر و خوبی انجام پائی۔ مگر ولیمے کے اختتام پر روشن

سلطانہ کا سارا اطمینان، سکون اور خوشی بھی رخصت کے لئے ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے، جب طاہرہ سلطانہ نے تنویر یوسف کو ان کے سامنے لا کھڑا کیا۔

''یہ تنویر یوسف ہیں۔ میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔ میرے ساتھ میڈیکل کالج میں پڑھتے ہیں، مجھ سے ایک سال سینئر۔ بھائی بھی جانتے ہیں انہیں۔ آپ ابا جان سے ذکر کریں یا ان سے ملوا دیں، یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔'' روشن سلطانہ کو لگا، ان کے سامنے ان کی بیٹی طاہرہ نہیں، کوئی اور اجنبی لڑکی کھڑی بڑے دھڑلے سے اپنی پسند کا تعارف کروا رہی ہے۔

اور تنویر یوسف، چہرے پر مسکین سی مسکراہٹ سجائے، ادب سے نظریں جھکاتا اُٹھاتا ان کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا نہ جانے پہلی نظر میں انہیں کیوں اچھا نہیں لگا۔ کم از کم بطور داماد وہ انہیں اس طرح پسند نہیں آیا، جس طرح آنا چاہئے تھا۔ وہ گم صم سی محض اس کے سلام کا جواب ہی دے سکیں۔

حالانکہ تنویر یوسف کا چہرہ یا نام ان کے لئے اجنبی تو نہیں تھا۔ اگر طاہرہ اس کا تعارف اپنے ہم مکتب کے حوالے سے نہ بھی کرواتی تو بھی روشن اسے پہچانتی تھیں۔

کوئی چار پانچ سال پہلے کی تو بات ہے یا شاید اس سے بھی کم عرصے کی۔ گرمیوں کی آمد کے دن تھے۔ حویلی کی بان کی چارپائیاں جن کو سال کے آٹھ نو مہینے کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا، پچھلی برساتی میں کھڑی رہتیں یا اوندھی ایک دوسرے کے اوپر پڑی رہتیں۔ مگر گرمیوں کے شدید دو مہینوں میں ان کی ضرورت سب کو ہوتی۔ روشن سلطانہ نے یوسف ترکھان کو بلوا بھیجا تھا۔ وہ صبح سے ان چارپائیوں کے ٹوٹے پائے جوڑنے میں مصروف تھا۔ دوسری طرف اس کا بیٹا ایک دوسرے ملازم کے ساتھ ٹھیک کی گئی چارپائیوں میں بان ڈال رہا تھا۔

''میرا بچہ ہے جی تنویر۔ ترکھان کے ہنر سے شرماتا ہے۔ اپنے باپ دادا کے فن پر شرمندہ ہے۔ پتہ نہیں جی یہ کتابیں انسان کو ہاتھ کے ہنر سے شرمندگی کیوں سکھاتی ہیں۔ میں نے کہا، چلو خیر ہے، نہ سیکھے، پڑھنے کا شوق ہے، میرے مولا نے دماغ بھی اچھا دیا ہے۔ سائنس پڑھ رہا ہے۔ کہتا ہے، ڈاکٹر بنوں گا۔ سمجھایا، بہتیرا دماغ کھپایا کہ تیری اتنی مہنگی تعلیم کا کھرچا (خرچا) کہاں سے پورا کروں گا؟ اسے موٹی موٹی کتابوں کے سوال تو سمجھ میں آ جاتے ہیں، میری سیدھی بات پلے نہیں پڑتی۔'' یوسف ترکھان پسینے میں نہایا، پائے ٹھونکتا روشن سلطانہ کو بتا رہا تھا۔

روشن سلطانہ نے نظریں اُٹھا کر سولہ سترہ سال کے پتلے دُبلے، سانولی رنگت اور لمبے قد والے اُس کے بیٹے کو نظر بھر کر دیکھا۔ اُس کا چہرہ انہیں اس وقت بھی کچھ پرکشش نظر نہ آیا تھا، سوائے اُس کی آنکھوں کے جو بہت چھوٹی چھوٹی، اندر کو دھنسی ہوئی اور بے حد چمکیلی تھیں۔ لمبے سے چہرے کے اختتام پر بہت مختصر سی پیشانی۔ دونوں ہی چیزیں اُس کے ذہن کی غماز تھیں۔

''اچھی بات ہے یوسف! آج کل تعلیم کا بول بالا ہے۔ آنے والے دنوں میں قدر و قیمت کا یہی سکہ چلے گا۔'' وہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

انہیں کیا معلوم تھا کہ چند سال بعد یہی لڑکا، جسے دیکھ کر ان کے دل میں معمولی سا بھی خوشگوار تاثر نہیں اُبھرا تھا، اُن کی بیٹی کے بالمقابل کھڑا ہوگا۔

زندگی کا اتنا اہم، نازک فیصلہ کرتے وقت بیٹیاں ایک پل کو یہ کیوں نہیں سوچتیں، قدم قدم پر اُن کی بہتری، خوشی چاہنے والے والدین کیا ان کی زندگی کو یونہی کسی غلط فیصلے کی نذر کر دیں گے؟ منہ زور جوانی کے آتے ہی سب سے بڑے خیر خواہ ہی سب سے بدترین دشمن کیوں لگنے لگتے ہیں؟

یوسف ترکھان کا تو تین سال پہلے انتقال ہو چکا تھا، اُس کا بیٹا شہر چلا گیا تھا۔ دوبارہ اُس کے بارے میں انہوں نے کسی سے کچھ نہیں سنا تھا۔

''مجھے اب اجازت دو طاہرہ! مجھے واپس ہاسٹل بھی جانا ہے۔'' وہ بہت لگاوٹ اور بے تکلفی سے طاہرہ سے مخاطب تھا۔

''چلے جانا، پہلے ابا جان سے تو مل لو۔'' طاہرہ اصرار سے بولی۔

''پہلے تم اپنی مدر کی رائے میرے بارے میں ہموار کر لو، پھر اگلا مرحلہ طے کرنا۔ اوکے، میں اب چلتا ہوں۔'' دونوں روشن سلطانہ کو وہیں ساکت کھڑا چھوڑ کر باتیں کرتے آگے نکل گئے۔

حویلی کا ماحول بہت تنگ نظر نہیں تھا، مگر اس قدر کھلا بھی نہیں تھا کہ طاہرہ یوں آزادانہ گلے میں دوپٹہ لئے، ایک اجنبی سے سرعام باتیں کرتی اُن کے سامنے سے گزر جائے۔

''کہتی تھی میں سراج احمد سے کہ بیٹی کو اس قدر آزادی مت دو، علم حاصل کرنا چاہتی ہے تو اسے پردہ بھی کراؤ۔ تھوڑی سی سختی بیٹیوں کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ مخلوط تعلیمی اداروں میں بچوں کو تعلیم دلوانے کے بعد والدین کو ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے

لئے خود کو تیار رکھنا چاہئے۔'' وہ ٹھنڈا سانس لے کر اپنی جگہ سے مڑ گئیں۔

''یہ نہیں ہوسکتا۔ کبھی بھی نہیں ہوسکتا۔ تم چاہو تو طاہرہ کو اپنی زبان میں سمجھا لو، نہیں تو میں خود بات کرلوں گا اس سے۔'' سراج احمد حسبِ توقع بھڑک اُٹھے تھے۔

''مجھے نہیں لگتا کہ وہ بات کی نوعیت یا اس کی نزاکت کو سمجھے گی۔'' وہ ہولے سے بولیں۔

''روشن سلطانہ! ہم نے اسے تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی تھی، اپنے لئے دولہا پسند کرنے کی نہیں۔ یہ سب کچھ میرے جیتے جی نہیں ہوسکتا۔ اُسے سمجھا لینا۔'' وہ مغموم بیوی کی اگلی بات سنے بغیر ہی چلے گئے۔

روشن سلطانہ نے بیٹی کو کیا سمجھانا تھا، بات رفتہ رفتہ ان کے ہاتھوں سے نکلتی جا رہی تھی۔ سراج احمد کا مؤقف یہ تھا کہ وہ اس خاندان میں بیٹی نہیں دیں گے۔ اُنہیں تنویر یوسف کے باپ کے پیشے پر اعتراض نہیں تھا۔

''تمہیں نہیں پتہ، ان بے جوڑ رشتوں میں کیا کیا قباحتیں نکل آتی ہیں۔ جس طرح درخت اپنی جڑوں پر کھڑا ہوتا ہے، اسی طرح انسان اپنی بنیادوں، اپنے بچپن کی نفسیات پر تعمیر ہوتا ہے۔ اس کی فطرت انہی زاویوں پر پرورش پاتی ہے جو وہ آنکھ کھلنے کے بعد اپنے اردگرد دیکھتا آرہا ہے۔ تم مجھ سے لکھوا لو، وہ طاہرہ کی محبت میں نہیں، اس حویلی کی مستقبل قریب میں لگنے والی قیمت میں دلچسپی لے رہا ہے۔ یہ اُس کی بنیادوں میں شامل ہے۔'' سراج احمد اپنے نوابی انداز میں اُسے تول رہے تھے۔

''آپ کا واہمہ بھی ہوسکتا ہے۔ دونوں پڑھے لکھے ہیں۔ مل کر کمائیں گے، کام کریں گے تو اس حویلی سے دوگنا کما لیں گے۔ ضد میں آگئی ہے، خوامخواہ کوئی اور مصیبت نہ کھڑی کردے۔'' روشن سلطانہ جو بیٹی کی آنکھوں کے بدلتے رنگ اور چہرے کے تناؤ میں بہت کچھ دیکھ رہی تھیں، ڈھیلی پڑ کر بولیں۔

''ہرگز نہیں۔ اور یہ میرا واہمہ بھی نہیں، بالکل یقینی بات ہے۔'' وہ اپنی ضد پر اڑ کر بولے۔

''آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' وہ تنگ آکر بولیں۔ ''بے سہارا لڑکا ہے، اکیلا، محبتوں کا متلاشی۔ آج کل تو لوگ اس طرح کے داماد ڈھونڈتے ہیں۔ آپ، ہم محبت دیں گے تو دل سے ہمارا ہو جائے گا۔ بیٹی بھی خوش ہو جائے.....''

''نہیں روشن سلطانہ! اس سے آگے کچھ نہیں۔ ایسی بیٹی، جسے ماں باپ کی خوشی کا

خیال نہیں، مجھے اس کی خوشی کی پروا نہیں۔ سمجھ لو اس بات کو اور سمجھا لو اسے۔'' وہ تو کسی طور نہیں مان رہے تھے۔

دن پر دن گزرتے رہے۔ طاہرہ کا رویہ ماں کے ساتھ گھر میں بھی سب سے بد سے بدتر ہوتا چلا گیا۔ اُس کے سر پر تنویر یوسف کی محبت کا بھوت سوار تھا۔

وقار احمد اور عفت بانو اپنی نئی زندگی کی خوشیوں میں مگن تھے۔ ماں باپ کے سُتے ہوئے چہرے دیکھ کر وقار نے دو ایک بار پوچھا بھی، مگر وہ ٹال گئے۔

ڈیڑھ سال بعد حویلی میں نئے احد کی قلقاریاں گونجنے لگیں۔ اُس کا گلگداتا وجود نہ جانے کیسے طاہرہ کو اپنے فیصلے کی مضبوطی میں حائل ہوتا محسوس ہونے لگا۔ حالانکہ وہ چھ ماہ سے تنویر سے کورٹ میرج کا فیصلہ کر چکی تھی، مگر حویلی کو چھوڑنے کا سوچ کر ہی دل کسی آہنی پنجے میں جکڑا محسوس ہونے لگتا اور اب یہ ننھا وجود.....

''بھابی جان! آپ بھائی سے کہیں، وہ ابا جان سے آخری بار بات کرلیں، ورنہ پھر مجھے ملامت مت کریں۔ میں کسی بھی طور آپ لوگوں کی اس حویلی کی عزت کو خراب نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے ان رشتوں سے بہت پیار ہے، مجھے ان سے جڑا رہنے دیں۔ محبت کرنے کی مجھے اتنی کڑی سزا مت دیں۔'' وہ روتی ہوئی اپنے کمرے میں بھاگ گئی تو عفت بانو کو حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ اس رات دونوں میاں بیوی نے روشن سلطانہ کی موجودگی میں کھل کر سراج احمد سے بات کی۔

''ابا جان! کسی بڑے نقصان سے بہتر نہیں کہ چھوٹا نقصان برداشت کرلیا جائے؟ آپ اُس کی ضد کو کیوں ضد دلا رہے ہیں؟ وہ ماشاء اللہ اب بڑی ہو چکی ہے، سمجھ دار ہے، پڑھی لکھی ہے، اپنے پیروں پر کھڑی ہے، دونوں کا ہاؤس جاب مکمل ہو چکا ہے بلکہ تنویر کو تو جاب بھی مل چکی ہے۔ پھر آپ اس طرح کیوں اسے مجبور کر رہے ہیں کہ وہ آپ کی بات مانے جبکہ.....'' وقار احمد، باپ کو قائل کرتے ہوئے بولے۔

''تو ٹھیک ہے، تم سب کا یہی خیال، ارادہ ہے تو ٹھیک ہے۔ میں کون ہوتا ہوں حائل ہونے والا۔ وہ میری بلا سے کنوئیں میں گرے یا کھائی میں، میری طرف سے آج سے مرگئی۔'' وہ دُکھ میں کہتے اُٹھنے لگے۔

''نہیں ابا جان! ایسے نہیں۔ کوئی جیتے جی کیسے مرسکتا ہے؟ آپ اسے اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی دے رہے ہیں، ساتھ ہی اسے مُردہ بھی قرار دے رہے ہیں تو یہ خوشی تو نہ ہوئی۔ آپ اپنے ہاتھوں سے اسے حویلی سے رخصت کریں۔'' وقار احمد نے

آگے بڑھ کر باپ کے ہاتھ تھام کر محبت سے کہا۔

وہ چند لمحے کھڑے کچھ سوچتے رہے۔

''پھر میری ایک شرط ہوگی۔''

''وہ کیا؟'' روشن سلطانہ کچھ پریشانی سے بولیں۔ کیونکہ اُنہیں پتہ تھا، سراج احمد کی شرط بھی کوئی ہلکی پھلکی نہ ہوگی۔

''طاہرہ کو اس حویلی، جائیداد میں سے ایک پھوٹی کوڑی نہ ملے گی۔ معمولی جہیز اور تھوڑا بہت کپڑا لتا، زیور جو اس کی ماں نے اس کے لئے تیار کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ میں اسے ایک پائی نہ دوں گا، نہ مجھ سے چوری چھپے کوئی دے گا۔ کل شام کو میں اُسے اس شرط کے تحت رخصت کرنے پر تیار ہوں۔ صرف کل شام کو۔ پرسوں صبح کا سورج اُسے اس حویلی میں نہ دیکھے۔''

''پر ابا جان.....!'' وقار احمد تذبذب میں پڑ گئے۔

''میں کہہ چکا ہوں، کل شام کو۔ اس کے ایک دن بعد بھی نہیں۔'' وہ انتہائی سرد لہجے میں بولے۔

''ٹھیک ہے، میں طاہرہ سے بات کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔'' وقار احمد تھکے تھکے لہجے میں کہہ کر نکل گئے۔

اور اگلی شام طاہرہ کی ڈولی حویلی سے یوں اُٹھی، جیسے کسی کا جنازہ اُٹھتا ہے۔ کپڑوں کا ایک سوٹ کیس اور تھوڑا سا سامان جو گاڑی کی ڈگی میں آ سکتا تھا۔ سُتے ہوئے چہروں کے ساتھ ماں باپ، بھائی بھابی اور چند بے حد قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں اُسے گویا حویلی سے دھکا دے دیا گیا۔

''اس سے کہہ دینا، اب جب تک میں جیتا ہوں، ادھر کا رخ نہ کرے۔'' اس نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے باپ کی نفرت بھری آواز سنی تھی۔ وہ باپ، جس کی بانہوں نے بچپن میں اسے جھولا جھلایا تھا، راتوں کو سینے پر لٹایا تھا، ہر فرمائش لمحہ بھر میں پوری کی تھی۔ اسی شام انہوں نے اپنے قانونی مشیر کو بلوا کر وصیت لکھوائی، جس میں طاہرہ کے نام خالی دعائیں بھی نہ تھیں۔

اور کسی کو کیا معلوم تھا کہ سراج احمد کو تو بیٹی جان سے بھی بڑھ کر پیاری ہے کہ اس کو رخصت کر کے وہ رات بھر بھی نہ جی پائیں گے۔

اس رات بہت زور کا طوفان آیا تھا، حویلی کے سال خوردہ دروازے، کھڑکیاں

چوکھٹوں سمیت ہل گئے تھے۔ نوید تو گرمیوں کا زور ٹوٹنے کی تھی، مگر ساون کی اس پہلی بارش نے بہت سے مضبوط چھتوں والے گھروں اور بظاہر بہت مضبوط نظر آنے والے جسموں کو بھربھری مٹی کی طرح بکھیر کر رکھ دیا تھا۔

رات بھر سراج احمد مضطرب و بے چین، طوفانی ہواؤں کا مقابلہ کرتی حویلی کی کھڑکیوں اور دروازوں کو کھولتے بند کرتے رہے، سر اُٹھا اُٹھا کر برہم آسمان کو دیکھتے رہے، جس کا غصہ صبح دم کہیں جا کر ٹھنڈا ہوا تھا اور اس نے شبنمیں بوندوں کا مراسلہ بھیجا تھا۔ اس مراسلے کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہی جیسے سراج احمد کے اندر گہرا سکون اُتر گیا۔ وہ بہت پُرسکون ہو کر اپنے بستر پر آ بیٹھے تو پھر کوئی آواز، کوئی طوفان اُنہیں دوبارہ اُٹھنے پر مجبور نہ کر سکا۔

روشن سلطانہ اُن کے سوئے ہوئے پتھریلے چہرے کو روتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھیں کہ کیوں لوگ بیٹی کے پیدا ہونے پر مغموم ہوتے ہیں۔ آج انہیں اس سوال کا جواب مل گیا تھا۔

اور ایک رات کی اُجڑی پجڑی، دُلہن بنی طاہرہ، باپ کے سرہانے بیٹھی اُنہیں تکے جا رہی تھی۔

''ابا جان! آپ تو مجھ سے ایسے کبھی ناراض نہ ہوئے تھے کہ منانے کا کوئی رستہ ہی نہیں چھوڑا۔ میں کس سے معافی مانگوں گی اب؟'' وہ اُن کے سرہانے سر پٹخ رہی تھی۔

❖❖○❖❖

''کیا بات ہے رانیہ پتر! تم نے داخلہ لینے سے انکار کیوں کر دیا ہے؟'' بی اماں سرخ دوپٹے پر چمپا لگاتی رانیہ سے بولیں۔

''یونہی بی اماں!'' سُوئی کی نوک پر نظریں جما کر اُس نے رٹا ہوا جواب دیا۔

''یہ کیا بات ہوئی؟ اتنی محنت پھر بھلا کس لئے کی تھی؟ ساری ساری رات پڑھتی رہی۔ نہ کھانے کا ہوش، نہ پہننے اوڑھنے کا۔ اب اتنے اچھے نمبر آ گئے ہیں تو کیوں آگے نہیں پڑھتیں؟'' اُنہیں اُس کے انکار کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

''بی اماں! شوق تھا، سو ختم ہو گیا۔ اور مجھے پڑھ لکھ کر کرنا بھی کیا ہے؟ رہوں گی تو وہی ملازمہ رانیہ۔'' وہ سُوئی دانتوں میں دبا کر افسردگی سے بولی۔

''یہ تم سے کس نے کہا کہ تم ملازمہ ہو؟'' بی اماں برا مان کر بولیں۔

''مجھے پتہ تھا، آپ برا مان جائیں گی۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تو پھر تم نے ایسی بات کیوں کی؟"

"دیکھیں نا اماں! ابھی احد لالہ اور علیزہ جی کی شادی ہے، اس کے بیس دنوں بعد آپ کو حج پر چلے جانا ہے وہاں سے آپ لوٹیں گی تو ان دونوں نے ولایت چلے جانا ہے، وہ بھی اکٹھے پانچ سالوں کے لئے۔ اب اگر میں بھی پڑھنے میں جت جاتی ہوں تو پھر آپ کے پاس کون رہے گا؟"

"ہے کہ نہیں جھلی، بھلا تُو نے سدا میرے پاس بیٹھے رہنا ہے؟ پڑھ لکھ کر اپنی قسمت سنوار لے گی تو اچھی جگہ دیکھ بھال کر تیری شادی کر دوں گی۔ پھر بھی تُو مجھے چھوڑ کر جائے گی نا۔"

"نہیں بی اماں!" وہ یوں تڑپ کر بولی جیسے بی اماں نے اُسے چوٹ لگائی ہو۔

"کیا نہیں؟" وہ حیرانی سے بولیں۔

"مجھے کہیں نہیں جانا آپ کو چھوڑ کر۔ کبھی نہیں۔" وہ سر جھکا کر آہستگی سے بولی۔

"بے وقوفوں والی بات۔" بی اماں سر ہلا کر بولیں۔ "بیٹیاں تو ہوتی ہی پرایا دھن ہیں۔"

"بی اماں! کس پتھر سے سر پھوڑ رہی ہیں؟" اسی وقت احد اور علیزہ آگے پیچھے بڑے بڑے شاپنگ بیگ اٹھائے اندر داخل ہوئے۔ "اسے تو میں سمجھا سمجھا کر تھک گیا ہوں کہ لوگ ترستے ہیں، اتنے مارکس ہی آ جائیں اور یہ گھر آئی نعمت کو لات مار رہی ہے۔ علیزہ صحیح کہتی ہے، رانیہ میں عقل کم ہے۔" احد نے شاپنگ بیگ، بی اماں کے آگے رکھے اور خود صوفے پر گر گیا۔

"بی اماں! اب اس موضوع پر مٹی ڈالیں۔ یہ بہت ضدی اور ہٹ دھرم ہے۔ میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ مجھے اس قدر الا بلا نہیں چاہئے۔ پھر بھی آپ نے نہ جانے لسٹ میں کیا کیا لکھوا دیا۔ اور یہ احد لکیر کا فقیر، لسٹ میں لکھے ایک ایک آئٹم کے پیچھے اس نے مجھے خوار کیا ہے۔" علیزہ تھکی تھکی سی، بی اماں کے تخت پر ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھ گئی۔

"میں خود جاتی ایک ایک چیز چاؤ سے خریدنے، یہ تو شگنوں کے کام ہوتے ہیں۔ خوشی خوشی بندہ پورے کرتا ہے۔ تم دونوں کے باپ ہوتے..... اور میرے یہ گھٹنے مجھے کہیں آنے جانے کے قابل نہیں چھوڑتے۔ اور تم نے تو آج ہی جانا تھا۔ اب میں رانیہ کے ساتھ چلی جایا کروں گی، تم اب گھر بیٹھنا۔ بلکہ احد سے بھی پردہ کرو۔" وہ شاپنگ بیگز کھولتے ہوئے بولیں۔

"پردہ..... کس سے بی اماں؟ ہاسپٹل سے تو مجھے صرف تین چار دن پہلے چھٹی ملے گی اور ہاسپٹل میں ڈاکٹر احد سے دس بار ٹکراؤ ہوتا ہے، پھر یہ ڈرائیور بھی تو ہیں۔"

"بس چھٹی لو تم اس ہفتے۔ بھلا یہ کوئی طریقہ ہے؟ چلو رانیہ! دکھاؤ یہ کیا لے کر آئے ہیں؟ بارات اور ولیمے کا جوڑا لے لیا ہے نا؟"

"جی۔" علیزہ اپنے نازک پیروں کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے بولی۔

"ان ہی دو ملبوسات کی خریداری میں تو صبح سے شام ہو گئی۔" احد بھی اب شاپرز کی طرف دیکھ رہا تھا، جنہیں رانیہ سست ہاتھوں سے کھول رہی تھی۔ ٹی پنک اور لائٹ پرپل کلر کا خوب صورت کامدانی پشواز اور چوڑی دار پاجامہ پہلے ڈبے سے نکلے تھے۔

"جیولر کی طرف سے ہو آئے تھے؟ میں نے جو آرڈر اُسے فون پر لکھوایا تھا، وہ دیکھا تم نے علیزہ؟" بی اماں کام سے بھرا دوپٹہ کھول کر دیکھنے لگیں۔ دمکتا ہوا کام نظروں کو خیرہ کر رہا تھا۔

"ماشاء اللہ..... ماشاء اللہ..... بہت اعلیٰ ہے۔ بہت زبردست۔ اللہ پہننا نصیب کرے۔ سدا ان تارے موتیوں کی طرح میرے بچوں کی خوشیاں چمکتی رہیں۔" بی اماں ہاتھوں سے پھسلتے دوپٹے کو تھام کر محبت سے بولیں۔ دوسرے ڈبے سے جھلمل کرتا گولڈن عروسی لہنگا نکلا تھا۔ تیسرے میں فیروزی نیوی بلیو شرٹ اور ٹراؤزر، جن پر بڑا خوب صورت نگوں اور تلور تلے کا کام ہوا تھا۔ باقی کے شاپرز میں دونوں عروسی لباسوں کے ساتھ میچنگ شوز تھے۔ رانیہ کا دل ایک ایک چیز کو دیکھتے ہوئے پتھر ہوا جا رہا تھا۔ وہ گولڈن لہنگا ہاتھ میں لئے بے خودی کے عالم میں تکے جا رہی تھی۔

"رانیہ! سو گئی ہو؟ باقی بھی تو دکھاؤ۔" بی اماں کو اُس کی محویت اچھی نہ لگی تھی۔ نظر لگ جانے کا اندیشہ اُنہیں ستا رہا تھا، ان کے بھڑکنے کے باوجود اُس کے استغراق میں کمی نہ آئی تھی۔ نہ جانے لہنگے کو ہاتھ میں لئے وہ کن جہانوں کی سیر کر رہی تھی۔ پتلی پتلی سانولی انگلیاں بہت آہستگی سے لہنگے کے کام پر پھر رہی تھیں اور نظریں تارے، موتیوں اور دبکے میں اُلجھی ہوئی تھیں۔

"بی اماں! باقی بعد میں دیکھ لیں گے۔ پہلے اچھی سی چائے تو پلوائیں۔ بہت تھکاوٹ ہو رہی ہے۔" احد کی آواز پر وہ بے اختیار چونکی تھی۔ بی اماں اسے خشمگیں نگاہوں سے گھور رہی تھیں۔ علیزہ نے جلدی سے لہنگا اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر بی اماں کے آگے پھیلایا۔

''بی اماں! یہ والا سوٹ آپ کے خیال میں بھلا کتنے کا آیا ہوگا؟ اور رانیہ! جاؤ، تم جا کر چائے بناؤ۔'' بی اماں سے بات کرتے ہوئے اس نے بڑے حکمیہ انداز میں کہا تھا مگر احد کو اُس کا انداز کچھ اچھا نہیں لگا تھا۔

مگر رانیہ نے شاید غور نہیں کیا تھا، وہ ''جی اچھا'' کہہ کر آہستگی سے اُٹھ کر باہر چلی گئی۔ دروازے پر رک کر اس نے دونوں ہاتھوں کی پشت سے پلکوں پر اٹکے موتی چنے، آنکھوں کو زور سے مسلا اور روتے ارمانوں کو نظر انداز کر کے کچن کی طرف آ گئی۔

بھرپوری شادی میں وہ جسمانی طور پر تو حاضر رہی، مگر دماغی طور پر بالکل غیر حاضر۔ کہا کچھ جاتا، کرتی کچھ۔

بی اماں اُسے مہندی گھولنے کو کہتیں، وہ اُبٹن بنانے لگتی اور گھنٹوں اسی میں لگی رہتی، جب تک اُسے ٹوکا یا جھڑکا نہ جاتا۔

''جاؤ، میرا یہ سوٹ استری کر لاؤ۔ مہمان آنا شروع ہو گئے ہیں۔'' بی اماں نے مایوں کے روز اسے اپنا پیچ کلر کا ریشمی قیمتی سوٹ دیتے ہوئے کہا۔

''بی اماں! اس سے نہ کہیں، اتنا قیمتی سوٹ جلا ڈالے گی۔ یہ آج کل اپنے حواسوں میں ہے کب؟'' یہ احد تھا جو اچانک اُس کے پیچھے آ کر بولا تھا۔ وہ وہیں سوٹ پھینک کر اپنے کمرے میں بھاگ گئی اور پھر مایوں کی رسم تک اسے کسی نے نہ دیکھا۔ کمرے سے نکلی تو سوجی آنکھیں، متورم چہرہ، غم زدہ کیفیت۔ باقی کے دنوں میں بھی وہ یونہی رہی۔

''علیزہ پر تو بی اماں! ٹوٹ کر روپ آیا ہے۔ کبھی تو اُسے بنا سنورا نہیں دیکھا، تب ہی تو اتنا روپ آیا ہے، ماں ہوتی تو دیکھ کر پھولے نہ سماتی۔'' کوئی خاتون رشتہ دار بارات والے دن بی اماں سے کہہ رہی تھیں، جب رانیہ انہیں ان کا چشمہ صاف کر کے دے رہی تھی۔ اُس نے چونک کر اسٹیج کی طرف دیکھا۔ گولڈن، لشکارے مارتے لہنگے کے ساتھ ڈھیروں ڈھیر خوب صورت زیور میں میک اپ سے لدی پھندی نازک سی علیزہ واقعی پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ اور ساتھ بیٹھا وہ آف وہائٹ گولڈن شیروانی اور کلاہ میں بار بار علیزہ کی طرف جھکا جا رہا تھا۔

'تو یہ تھی رانیہ بی بی! تمہارے اندھے سپنوں کی تعبیر' وہ وہیں پیچھے کی طرف کھجور کے اونچے تنے سے ٹیک لگا کر احد کو دیکھنے لگی۔ بار بار احد کا چہرہ دھندلاتا جا رہا تھا۔ وہ بار بار آنکھوں میں اُترتے پانیوں کو صاف کرتی اور ہر بار اُس کا دل دھاڑیں مار کر روتا۔

'چاند کی تمنا کرنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔' اس نے اپنے ہرے آنچل سے

منہ رگڑا اور چپکے سے پچھلی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر ٹیرس پر آ گئی۔ اب یہ تنہا گوشے اُس کے ہمراز ساتھی تھے۔

ولیمہ بھی گزر گیا اور اس کے بعد کئی دن تک دعوتوں کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ رانیہ کو پورا ایک ہفتہ ٹوٹ کر بخار چڑھا۔ حویلی میں نوکروں کی کمی نہیں تھی، اس کے باوجود دن میں دو چار بار اس کے نام کی پکار ضرور پڑتی۔ پھر وہ بی اماں کی پیاری تھی تو احد اور علیزہ کو بھی عزیز تھی۔ آتے جاتے اُس کی خیریت پوچھنا نہ بھولتے۔ اور وہ چوڑیوں کی کھنک اور حنا کی خوشبو، اُس کی پیار بھری ہنسی کی آواز سنتے ہی آنکھیں بند کر کے سوتی بن جاتی۔

اور کب تک سوتی بنی رہتی، ایک دن آنکھیں کھول کر حالات کا سامنا کرنا ہی تھا۔ سو دسویں دن وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی، جب بی اماں نے اسے دم کیا ہوا پانی پلاتے ہوئے بڑی محبت سے اس کے بال سنوار کر کہا۔

''رانیہ پُتر! اُٹھ۔ کیا دل کو روگ لگا لیا ہے؟ میرے حج پر جانے کی تاریخ نزدیک آتی جا رہی ہے اور تجھے اس حال میں چھوڑ کر جانے کو میرا دل نہیں مان رہا۔ خدانخواستہ تُو ٹھیک نہ ہوئی تو میں حج پر بھی نہ جا سکوں گی۔'' بی اماں کا پیار بھرا لہجہ اور اپنائیت بھرا احساس اُس کے ہجر و فراق کے شعلوں میں جلتے دل پر ٹھنڈی سکون آور پھوار برسا گیا۔

وہ اُن کی پھیلی ہوئی بانہوں میں چھپ کر اُن کے محبت بھرے وجود سے اُٹھتی بھینی بھینی خوشبو کو اپنے اندر جذب کرنے لگی۔ اُس کے اردگرد کی دنیا معمول پر آ چکی تھی۔

علیزہ اور احد پہلے کی طرح صبح آٹھ بجے سے پہلے ہاسپٹل کے لئے گھر سے نکل جاتے اور شام ڈھلے اکٹھے ہنستے کھیلتے، باتیں کرتے ایک دوسرے میں مگن واپس آتے۔ واپس آنے کے بعد بھی دونوں اکثر تھوڑی دیر آرام کے بعد تیار ہو کر آؤٹنگ کے لئے چلے جاتے۔ اکثر باہر ہی کھانا کھا لیتے۔ رانیہ سے ان کا سامنا یوں بھی کم ہی ہوتا تھا۔ کچھ اس نے اپنے زخمی دل کو بھی سمجھا لیا تھا۔ قصور اُس کے دل کا تھا، سو سمجھنا بھی اُسے ہی تھا۔

بی اماں حج پر چلی گئیں تو اچھی خاصی بارونق حویلی میں جیسے ویرانیاں ناچنے لگیں۔ ساری رونقیں اُن کے بوڑھے وجود سے ہی تھیں۔ رانیہ دن گن گن کر اُن کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ وہ کوشش کرتی، احد سے اُس کا سامنا کم ہی ہو۔ وہ یوں بھی آج کل گھر دیر سے آنے لگا تھا۔

دونوں کے باہر جانے کے دن بھی نزدیک آتے جا رہے تھے، اس لئے کاغذات کی

تیاری، ویزہ، پاسپورٹ اور باہر جانے کے دوسرے انتظامات میں مصروف ہونے کی وجہ سے وہ اکثر علیزہ کو گھر ڈراپ کر کے باہر ہی سے چلا جاتا۔

'علیزہ کتنی خوب صورت ہو گئی ہے، پہلے بھی بہت تھی، مگر اب تو جیسے نظر نہیں ٹھہرتی۔ اُس کے چہرے پر کتنی چمک ہے۔ اتنے مہنگے کاسمیٹکس سے اُس کی خوبصورت ڈریسنگ ٹیبل بھری ہوئی ہے۔' شام کو علیزہ کو کافی کا مگ تھماتے ہوئے رانیہ اُس کے روشن چمک دار چہرے کو دیکھ کر سوچ رہی تھی۔ وہ میگزین پڑھنے میں مگن تھی۔

'یہ مہنگے کاسمیٹکس کا کمال نہیں، یہ تو محبت کو پا لینے کا خمار ہے۔ اپنے دل کی مراد کے مل جانے کا حُسن۔ یہ حُسن، یہ نکھار میک اپ کی بوتلوں میں کہاں ملتا ہے؟' وہ اُسے یک ٹک دیکھتے ہوئے خود ہی ہنسی۔

''کیا پہلی بار دیکھا ہے مجھے؟'' علیزہ نے رانیہ کی چوری پکڑ لی تھی۔

''پہلی بار تو نہیں، مگر کئی دنوں بعد۔ اب آپ گھر میں ہوتی ہی کب ہیں؟'' وہ سنبھل کر بولی اور سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ کر اُس کی ہتھی پر ناخن سے نقش و نگار بنانے لگی۔

''ہماری روٹین ہی ایسی ہے، گھر میں بیٹھے رہے تو کسی کام کے نہ رہیں گے۔ مگر تم مجھے ایک بات تو بتاؤ۔'' وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ''یہ تمہیں کیا ہوا ہے؟ کس قدر کمزور، لاغر اور چپ چپ سی رہنے لگی ہو؟ کوئی دل کا روگ ووگ تو نہیں لگا بیٹھیں؟'' وہ پیلے سوٹ میں اُس کے مرجھائے ہوئے رنگ و روپ کو دیکھ کر بولی۔

''آپ کو پتہ ہے نا علیزہ جی! ہمارے طبقے میں یہ دل کا روگ ووگ کچھ نہیں ہوتا۔ اس میں تو صرف ایک ہی روگ، ایک ہی بیماری ہوتی ہے۔ پیٹ کا روگ، بھوک کی بیماری۔ ساری زندگی اس روگ سے، بیماری سے لڑتے رہتے ہیں۔ اور کسی مرض کی گنجائش ہی کہاں نکلتی ہے؟'' وہ ان ہی نقش و نگار میں مصروف بولی۔

''معلوم ہے، مجھے تمہاری کلاس کا یہ روگ بھی اور بیماری بھی۔ پر یار! تمہارا اس سے کیا واسطہ؟ تم تو ادھر کھانے پینے، بھوک کی فکر سے آزاد ہو، مزے میں۔''

''ہونہہ! کوا چلا ہنس کی چال، اپنی بھی بھول گیا۔ یہ مثل تو آپ نے سن ہی رکھی ہو گی۔ سمجھیں، میرے ساتھ بھی یہی ہاتھ ہو گیا ہے۔'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''مطلب؟'' علیزہ اُس کے انداز سے اُلجھی۔ ''بہت مشکل گفتگو کرنے لگی ہو۔''

''مشکلیں اتنی پڑیں کہ آسان ہو گئیں۔'' وہ پھر ہنسی۔ ''اوہ، کچن سے جلنے کی بُو آ

رہی ہے۔'' وہ صاف علیزہ کو ٹال کر وہاں سے بھاگ گئی۔

'عجیب ہو گئی ہے یہ بھی۔ ابسٹریکٹ آرٹ کے کسی شاہکار جیسی۔' علیزہ نے سر ہلاتے ہوئے کافی کا مگ منہ سے لگایا۔

❖❖○❖❖

چند دنوں بعد بی اماں کی بھی واپسی ہو گئی، تحائف سے لدی پھندی، چہرہ اور وجود عجیب سے تقدس کے حصار میں لپٹے ہوئے۔ ایک ایک فرد سے ملازموں سمیت گلے لگ کر ملیں۔ سب کا حال احوال پوچھتیں، سب کو الگ الگ تحائف اور تبرکات دیتیں بہت مشفق اور مہربان لگ رہی تھیں۔

''بی اماں! آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں، یوکے کی سیر کے لئے۔ کچھ ماہ ہمارے ساتھ رہ آئیں۔'' احد لاڈ سے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولا۔

''بیٹا! جب سے پیدا ہوئے، ایک ہی ارمان تھا کہ ان بصارتوں کا حق ادا ہو جائے۔ خانۂ خدا اور روضۂ رسول ﷺ کا دیدار ہو جائے اور بس۔ اب کچھ اور دیکھنے کی تمنا نہیں رہی۔ بس اس بچی رانیہ کا فرض ادا کر لوں، پھر سمجھو، موت کے لئے ہم بالکل تیار ہیں۔'' وہ پُرنور چہرہ لئے کہہ رہی تھیں۔

''اللہ نہ کرے بی اماں! آپ جئیں گی اور اس خواب کا سنگ بنیاد اپنے ہاتھوں سے رکھیں گی۔ سراج میموریل ہسپتال۔ جسے میری آنکھوں میں آپ نے سجایا ہے۔ اس گاؤں میں، اس کے اردگرد کے علاقوں میں صحت مندی اور خوشحالی کے دن آئیں گے، آپ خود دیکھیں گی۔'' وہ عزم سے بولا۔

''اِن شاء اللہ۔ احد! مجھ سے ایک وعدہ کرو۔''

''وہ کیا بی اماں؟''

''تم واپس آؤ گے ضرور۔ بھلے میری موت پر نہ آنا مجھے کاندھا دینے۔ اور مجھے معلوم ہے، تم جس دیس جا رہے ہو، وہاں جا کر انسان، انسان نہیں رہتا، مشین بن جاتا ہے۔ اس لئے چاہو بھی تو شاید نہ آ سکو۔ لیکن میرے مرنے کے بعد بیٹا! لوٹ کر ضرور آنا۔ میرے وطن کو تم جیسے قابل، محبت کرنے والے تازہ خون کی بہت ضرورت ہے۔ احد! میرے بچے! تمہاری نمو میں نے یا تمہاری رگوں میں دوڑنے والے خون نے نہیں کی، میرے وطن کی زمین سے اُگنے والی توانائیوں نے، اس کی حیات بخش فضاؤں، مہربان ہواؤں اور پاکیزہ مٹی کی خوشبو نے کی ہے۔ اس مٹی کے تم پر بڑے احسان ہیں۔

اور جو احسان کو نہ مانے، وہ راندۂ خدا بھی ہوتا ہے۔ میرے بچے! تم کبھی احسان فراموش نہ بننا۔" وہ کہتے کہتے آبدیدہ ہوگئیں۔ "میری، تمہارے دادا، تمہارے باپ اور تمہاری ماں کی قبریں تمہارے لوٹنے اور اپنی مسیحائی غریبوں میں تقسیم کرنے کی منتظر رہیں گی۔" وہ سچ مچ رو پڑیں۔

"جی بی اماں!..... اماں! آپ دیکھئے گا، آپ کے سامنے میں واپس آؤں گا۔ صرف پانچ سال کی تو بات ہے۔ یہاں اس حویلی کے سامنے اتنی بڑی، خوب صورت سراج میموریل کی تختی جگمگ کر رہی ہوگی۔" وہ ان کو اپنی جوان توانا بانہوں میں سمیٹتے ہوئے ایک عزم سے کہہ رہا تھا۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ اب تھوڑے دن رہ گئے ہیں، تم تیاری کرلو۔ اور بیٹا! علیزہ کا بہت خیال رکھنا، تھوڑی ضدی اور اپنی بات منوانے والی ہے مگر دل کی بہت اچھی ہے۔ سب سے بڑھ کر تم سے محبت کرتی ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔"

"علیزہ آپ کو پیاری ہے تو مجھے بھی عزیز ہے، آپ کو معلوم ہے۔" وہ دھیرے سے بولا تو پیچھے سے زینہ اُتر کر نیچے آتی رانیہ کے قدم وہیں پتھر کے ہوگئے۔

'کاش! ان ہونٹوں سے کبھی اس کا نام بھی اس حوالے سے ادا ہو۔' اُس کا ہجر زدہ دل خوامخواہ ہمکا۔

سولہ اگست کی شام پانچ بجے اُن کی فلائٹ تھی۔ بی اماں نے ڈھیروں ڈھیر دعاؤں کے حصار میں انہیں رخصت کیا۔

لندن میں انہوں نے ایک اپارٹمنٹ پہلے سے لے لیا تھا، اس میں ضرورت کا سامان بھی کافی حد تک موجود تھا، اس لئے وہاں دونوں کو کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ پہلے چند ہفتے دونوں کے اپنے اپنے ڈیپارٹمنٹ میں ایڈمیشن کی مصروفیات میں گزرے۔ کلاسز شروع ہونے میں ایک ہفتہ باقی تھا، جب باہر جاتے ہوئے سیڑھیاں اُترنے کے دوران علیزہ کو اچانک چکر آ گیا۔

پھر جو انکشاف ہوا، وہ احد کے لئے تو بے حد خوشگوار تھا مگر علیزہ.....؟

❖❖❖○❖❖❖

تنویر یوسف، مرحوم سراج احمد کے گمان کے عین مطابق بالکل ویسا ہی نکلا، جیسا وہ اُسے سمجھے تھے۔ لالچی، حریص، سفاک اور بے حد خود غرض۔

"دیکھو، اب یہ تمہارے باپ کی فوتگی اور چالیسویں کا ڈرامہ تمام ہوا۔ میں نے تم

سے شادی تمہاری یہ ماتمی صورت دیکھنے کے لئے نہیں کی تھی۔ جاؤ اور جا کر اپنی ماں اور بھائی سے اپنا حصہ طلب کرو۔"

جیسے ہی چالیسویں کا ختم ہوا، تنویر یوسف نے اپنے چہرے سے تمام نقاب نوچ کر پرے پھینکے۔

طاہرہ تو یک ٹک اُسے دیکھے جا رہی تھی۔ یہ اندازہ تو اُسے محض شادی کے چند گھنٹوں بعد ہی ہوگیا تھا کہ تنویر یوسف حقیقتاً وہ نہیں، جس سے اس نے شادی کی ہے۔ مگر وہ تو اس سے بھی کئی گنا گھٹیا اور گرا ہوا ثابت ہو رہا تھا، جتنا وہ اس کے متعلق اندازہ لگا پائی تھی۔

اب وہ اُسے کیسے بتاتی کہ اُس کا باپ اُس کی خودسری کے نتیجے میں اُسے اپنی جائیداد سے عاق کر گیا ہے، ورنہ وہ شاید رات کے اسی پہر اُس ٹھوکریں مار کر گھر سے نکال دیتا۔

"یہ تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟" چند لمحوں بعد طاہرہ نے کہا۔

"جس لہجے میں تم کراؤ گی مہارانی جی! میں اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔"

"ابھی میرے گھر والوں کا صدمہ نیا ہے۔ پھر کم از کم ہمارے بچے کے ہونے تک بہتر ہے، تم ایسا کوئی بھی ایشو کھڑا نہ کرو۔ ڈاکٹر ہو میری حالت اور نزاکت کو مجھ سے بہتر جانتے ہو۔" وہ کچھ بے نیازی سے کہہ کر لیٹ گئی۔ وہ دانت پیس کر رہ گیا۔

پھر سات ماہ اُسے انتظار کرنا ہی پڑا۔ علیزہ کی پیدائش بھی اُس کے لئے ایک دھچکا تھا، وہ بیٹے کا خواہش مند تھا۔

"مجھے معلوم تھا، تم جیسی رونی صورتیں صرف بیٹیاں ہی پیدا کر سکتی ہیں۔" بچی کو ایک نظر دیکھتے ہوئے وہ طاہرہ کے پاس ایک پل کو رُکا اور جھٹکے سے باہر نکل گیا۔

وقار احمد اور عفت بانو، طاہرہ کو حویلی لے آئیں۔ دو ماہ طاہرہ کے سکون سے گزرے کیونکہ اس دوران تنویر صرف ایک بار اس سے اور بچی سے ملنے آیا تھا۔ پھر اسلام آباد جانے کا کہہ کر گیا تو ڈیڑھ ماہ بعد لوٹا۔

"چلو گھر یا یہیں ڈیرے جمانے کے ارادے ہیں؟" اس کا اجنبی رویہ اور گردن کا تناؤ اُسے ایک بد دماغ اور اکھڑ دماغ ثابت کر رہے تھے۔ روشن سلطانہ اور وقار کے اصرار کے باوجود وہ رُکا نہیں۔

گھر جانے کے بعد اُس کا تقاضا زور پکڑتا گیا۔ طاہرہ کب تک ٹالتی، وہ اب گالی

گلوچ پر اُتر آیا تھا۔

اُسے ماں سے بات کرنے کا کہہ کر حویلی آتی اور ماں کے سامنے اُس کی زبان پر تالے لگ جاتے۔ باپ کی زندگی اس کی سرکشی کی وجہ سے اتنی جلدی اختتام پذیر ہوگئی، اُسے تو یہی ندامت مار ڈالنے کو کم نہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود ماں اور بھائی نے کبھی اُسے نہ جتایا۔ مگر طاہرہ کے چہرے پر کھنڈتی زردیاں، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور کمزور پڑتا جسم روشن سلطانہ کو بہت کچھ غلط ہو جانے کا مسلسل اشارہ دے رہا تھا۔

''کیا بات ہے طاہرہ! کس سوچ میں گم ہو؟ کیوں اتنی پریشان سی رہتی ہو؟'' کچے آموں کی کیریوں کا اچار ڈلوانے کے لئے وہ کیریاں کٹوا کٹوا کر تخت پر بچھی ململ کی چادر پر حاجراں سے نمک اور ہلدی لگوا کر رکھ رہی تھیں۔ وہ کل شام سے آئی تھی اور اسی طرح گم صم تھی۔

''کچھ نہیں بی اماں!'' وہ گہرا سانس لے کر بولی۔

''کچھ تو ہے، بہت چپ چپ رہنے لگی ہو۔'' وہ اُٹھ کر اُس کے پاس آ بیٹھیں تو وہ ماں کی گود میں سر رکھ کر سسکنے لگی۔

''طاہرہ! بتا مجھے کیا پریشانی ہے؟ بچی بھی اتنی کمزور ہو رہی ہے۔ میں نے دیکھا ہے، تم اس کا بھی خیال نہیں رکھتیں۔'' وہ اُس کے بال سنوار رہی تھیں۔

''بی اماں! میری ضد نے ابا جان کی جان لے لی، مجھے یہ ندامت مارے ڈال رہی ہے۔'' وہ اسی طرح ماں کی گود میں سر رکھے بولی۔

''حکمِ الٰہی بیٹا!..... اس سے مفر نہیں، اُن کی زندگی اتنی تھی۔ تم اپنی کہو، کیا مسئلہ ہے؟''

''کچھ نہیں، میں دیکھوں۔ علیزہ رو رہی ہے۔'' وہ ماں کو جھٹلا کر ایک جھٹکے سے اُٹھی اور دالان میں چلی گئی۔

مگر تنویر یوسف کو اُس کی یہ جھجک اور بھی برافروختہ کر گئی اور ایک رات ڈیڑھ بجے شدید کہرے اور سردی میں وہ اسے گاڑی سے دھکیل کر حویلی کے باہر اُتار گیا۔

''تم اب تب ہی واپس آنے کی سوچنا، جب تمہارے ہاتھوں میں اس حویلی اور جائیداد میں اپنے حصے کے کاغذات ہوں گے، ورنہ میں تمہیں طلاق کے کاغذات بھیج دوں گا، سن لو کان کھول کر۔ میں نے شادی تم جیسی عام صورت لڑکی سے اس لئے نہیں کی تھی کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی تھی یا تم ڈاکٹر تھیں۔ میں نے صرف تمہاری دولت کی وجہ

سے تم سے شادی کی تھی۔ اور اب میں مزید یہ سات آٹھ ہزار کی نوکری کے پیچھے خوار نہیں ہو سکتا۔ تمہارے پاس ایک ماہ کا وقت ہے، یاد رکھنا۔'' اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گہری دُھند میں غائب ہوگیا۔

طاہرہ کی آدھی رات کو بیٹی کے ہمراہ آمد ہی کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ ہراساں و پریشان۔ ماں، بھائی کی صورتیں دیکھ کر وہ بھی اپنا ضبط کھو بیٹھی اور ماں کی بانہوں میں بکھرتے ہوئے اس نے اپنے اوپر اس نیچ ذات کے ہاتھوں ہونے والے ایک ایک ستم کی داستان سنا ڈالی۔ کئی دنوں سے وہ اس کی لاتیں، گھونسے، تھپڑ سہہ رہی تھی۔ جسے کبھی کسی نے پھول کی چھڑی سے نہ چھوا تھا، اس نے روتے ہوئے بتایا تو چند لمحوں کے لئے وسیع و عریض حویلی میں موت سے گہرا سناٹا چھا گیا۔

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟ کیوں جاہل عورتوں کی طرح اس سے پٹتی رہیں؟ ہم کیا اتنے غیر ہو گئے تھے؟'' بی اماں کبھی اپنے اشک پونچھتیں اور کبھی زخم زخم بیٹی کے۔

''میں نے تو پہلے ہی آپ کو بہت دکھ دیئے ہیں۔ میری وجہ سے ابا جان.....''

''بس طاہرہ! آئندہ یہ بات نہیں کرنا۔ ابا جان کی زندگی اتنی تھی اور تم خدانخواستہ کوئی لاوارث نہیں ہو۔ ابا جان وقتی طور پر تم سے ناراض ہو گئے تھے۔ اللہ اُنہیں زندگی دیتا، تمہیں اس حال میں دیکھتے تو تڑپ اُٹھتے، تمہیں تمہارے حصے سے کبھی محروم نہ رکھتے۔ اب میں ہوں نا، ابا جان کی جگہ، تمہارے ہر دکھ کو سہنے کے لئے موجود۔ تم ذرا فکر نہ کرو۔'' وقار احمد کو یوں سسکتی بہن بہت دکھ دے رہی تھی۔ ''ایک ہی تو تم میری بہن ہو، کون سے ہمارے دو چار اور بہن بھائی ہیں۔'' وہ اسے اپنے ساتھ لگا کر پیار سے بولے۔

اگرچہ روشن سلطانہ تو اس بات کے حق میں نہ تھیں کہ ایسے شخص کے ہاتھ جائیداد کے کاغذات تو کیا، دس بیس ہزار بھی دیئے جائیں۔ مگر وقار آڑے آ گئے۔

''بی اماں! وہ اس وقت ضد میں آیا ہوا ہے اور اس کی ضد ہمارے حق میں اچھی نہ ہوگی۔ خدانخواستہ کوئی انتہائی قدم اُٹھا بیٹھا تو طاہرہ کی کیا زندگی رہ جائے گی۔''

تنویر یوسف، وقار احمد کو کبھی نہ بھائے تھے مگر محض جائیداد کے عوض اُنہیں بہن کا یوں اُجڑ کر بیٹھنا بھی گوارا نہ تھا۔

''اب کون سی وہ زندگی بتا رہی ہے؟'' وہ دُکھی لہجے میں بولیں۔

وقار احمد نے سب کاغذات تیار کروائے، اسی میں ایک ماہ لگ گیا۔ اس دوران اس

خودغرض انسان کا صرف ایک بار فون آیا، وہ بھی سرسری سا۔

''کچھ انتظام کر رہی ہو کہ ماں بھائی کے غم میں دل تھامے بیٹھی ہو یا پھر میں کچھ انتظام کروں؟ ایک ماہ ہونے میں ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔ بدھ کی رات بارہ بجے تمہیں دی گئی مہلت ختم ہو جائے گی، پھر مجھ سے گلہ نہ کرنا۔ اگلی صبح ہمارے درمیان کوئی تعلق باقی نہ رہے گا۔'' فون بند کر کے اس نے واضح دھمکی دی تھی۔ بدھ کی شام وہ بولائی بولائی پھر رہی تھی۔

''کاغذات تو تیار ہو گئے ہیں، کل صبح صبح خود تمہیں چھوڑ آئیں گے۔'' رات کے نو بجے تھے، جب وقار احمد کاغذات کا خاکی لفافہ اُٹھائے اندر آئے تھے۔

''ہاں، آج تو توبہ بہت سردی ہے بی اماں! اس قدر دھند ہے باہر کہ ایک جگہ سے آگے کی چیز سجھائی نہیں دے رہی۔ پتہ نہیں، یہ دُھند کب جان چھوڑے گی۔ بارش ہو تو کچھ آسمان کھلے۔'' وہ کاغذات ٹیبل پر رکھ کر آتش دان کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولے۔

''کال کی نشانیاں ہیں یہ سب۔ پالے سے اچھی بھلی فصلوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔''

''وقار! میرا خیال ہے ابھی چلتے ہیں۔ ابھی تو صرف نو بجے ہیں۔'' عفت کو تنویر کی دھمکی کی خبر تھی اور طاہرہ کے اُڑے اُڑے حواس بھی اُنہیں بہت کچھ سمجھا رہے تھے۔

''ہیں..... تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟ اس وقت تو کوئی دشمن ہی گھر سے نکلے۔ ایسی کیا آفت آئی ہے؟ صبح چلی جائے گی۔'' بی اماں تڑپ کر بولیں۔

''بی اماں! جب ایک کام کرنا جو ٹھہرا تو صبح کیا، شام کیا۔ چلیں آپ وقار!..... طاہرہ! تم شال لے لو۔'' عفت نے آنکھوں میں شوہر کو اشارہ کیا تو وہ سمجھ گئے۔

''ٹھیک ہے بی اماں! صبح تو دُھند چھٹتے چھٹتے بارہ بج جاتے ہیں۔ اور صبح میرا آپریشن ڈے بھی ہے۔ بات پھر کل رات پر چلی جائے گی۔ ابھی میں فارغ ہوں، دو گھنٹے میں ہم لوٹ بھی آئیں گے۔'' وہ بھی فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر بی اماں روکتی رہ گئیں مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔

''اچھا علیزہ کو میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ صبح گلزار کے ساتھ بھجوا دوں گی۔ باہر بہت سردی ہے۔'' علیزہ، بی اماں کی گود میں سو رہی تھی۔

''نہیں بی اماں! رات کو مجھے پاس نہیں دیکھے گی تو روئے گی۔'' وہ سیاہ شال، جس پر گولڈن تارکشی کی خوب صورت کڑھائی کی تھی، اوڑھتے ہوئے علیزہ کو گود میں لے کر بولی۔

''طاہرہ بیٹی! اس کا خیال رکھا کرو۔ بہت کمزور ہے۔ خود ڈاکٹر ہو، ماں تو اَن پڑھ بھی ہو تو بچہ اسے آدھا ڈاکٹر بنا دیتا ہے۔ اور تمہیں جیسے اس کی کچھ خبر ہی نہیں۔'' وہ علیزہ کے لئے اُس کی بے توجہی پر اکثر ہی کڑھتی رہتی تھیں۔

''آپ کو دے جاؤں گی۔ پھر آپ ہی خیال رکھ لیجئے گا، میرا تو کسی چیز میں دل نہیں لگتا۔'' کہہ کر وہ بھائی، بھاوج کے پیچھے باہر نکل گئی۔

''بی اماں! احد سو رہا ہے۔ اس کا خیال رکھئے گا۔'' عفت نے جاتے جاتے آواز لگائی۔ ''توبہ، کس قدر دُھند ہے۔ کہا بھی تھا، صبح چلے جاتے۔'' بی اماں باہر تک تو نہ آئیں، کاریڈور میں ہی رُک کر باہر جھانکتے ہوئے بولیں۔

''بس بی اماں! یوں گئے، یوں آئے۔ آپ دعا کیجئے گا۔ خدا حافظ!'' وقار احمد نے الوداعی ہاتھ ہلا کر گاڑی کا شیشہ چڑھا لیا۔ بی اماں دل ہی دل میں ان کی سلامتی کی دعائیں مانگتی پلٹ آئیں۔

پھر وقار احمد کا کہا بالکل درست ثابت ہوا۔ یوں گئے اور یوں آئے۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد رات کے پھیلتے اندھیروں، سردی اور کہر کی چادر کو چیرتی ہوئی ایمبولینس کی تیز روشنیوں اور دل دہلا دینے والے سائرن نے حویلی تو کیا، سارے علاقے کو جیسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

وہ تینوں ڈیڑھ دو گھنٹے پیشتر ہنستے کھیلتے اُن کی نظروں کے سامنے گئے تھے اور اب خون میں لتھڑے، بے جان چہرے اور مُردہ جسم لئے تین لاشے حویلی کے صحن میں باری باری اُن کی آنکھوں کے سامنے رکھے جا رہے تھے۔ علیزہ کو کسی معجزاتی طاقت نے اُٹھا کر گاڑی سے دُور سرکنڈوں کی جھاڑیوں کے پاس پھینک دیا تھا۔ دُھند کے باعث ٹرک ٹرالی والا ڈرائیور تو اُنہیں نیم مُردہ چھوڑ کر اسی وقت بھاگ گیا تھا، علیزہ کی معصوم چیخوں نے پاس سے گزرتی ٹریفک کو متوجہ کیا تھا۔

بی اماں پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب دیکھ رہی تھیں۔ اُنہیں لگا، اُنتیس سال بعد وہ پھر اسی مقام پر کھڑی ہیں، جہاں آزادی کی راہ میں شہید ہونے والوں کی بے کفن لاشیں اُن کے سامنے پڑی تھیں۔

اتنا بڑا سانحہ، اتنا بڑا المیہ شاید بی اماں کو بھی ان تینوں کے ساتھ قبر میں اُتار دیتا اگر ننھے احد اور علیزہ کی معصوم چیخیں اور بی اماں کے کُرتے کے دامن کو کھینچتے ننھے ہاتھ اُنہیں اپنی طرف متوجہ نہ کر لیتے۔ انہوں نے ایک بار پھر موت کے آگے ہاتھ باندھ کر زندگی کی مہلت مانگ لی۔

ان دو امانتوں کو پروان چڑھانے کے لئے۔

ڈیڑھ ماہ بعد تنویر یوسف اُن کے سامنے جارحانہ تیور لئے آ کھڑا ہوا تھا۔

"علیزہ میری بیٹی ہے۔ مجھے اُس کا حق چاہئے۔ ورنہ بڑھیا! یاد رکھنا، میں اُسے جیتے جی چیل کوؤں کے آگے ڈال دوں گا۔ پھر تجھے اس کی ایک بوٹی نہیں ملے گی۔"

ایسا شقی القلب باپ انہوں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ انہوں نے کمزور جان علیزہ کو اپنے سینے سے بھینچ لیا۔

"کیا چاہتے ہو؟"

"اپنا حصہ۔"

"کون سا تمہارا حصہ؟" وہ اُس کے تیوروں سے خائف ہوئے بغیر بولیں۔

"میری بچی میرے حوالے کر دو، میں خود وصول کر لوں گا۔"

"بیٹی کی قیمت لگانے آئے ہو تو بولو۔"

"کم از کم تیس لاکھ اور زیادہ سے زیادہ..... چند دن بعد۔"

"تم شاید نیند میں ہو۔ اس حویلی اور باغات کی کل مالیت ملا کر بیس یا پچیس لاکھ ہو گی، تیس لاکھ کہاں سے لو گے؟"

"بڑھیا! مجھ سے زیادہ مکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ کل شام کو آؤں گا۔ بیس لاکھ تیار رکھنا۔ ورنہ اس چوہیا کو چھین کر لے جاؤں گا۔" اُس کی اندر کو دھنسی چمکیلی آنکھیں اُس کے ارادوں کی خبر دے رہی تھیں۔

اگلے روز انہوں نے بارہ لاکھ اُس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

"اس سے زیادہ میرے پاس نہیں اور نہ ہوں گے۔ علیزہ کا نام تم اب زندگی بھر اپنی زبان پر نہیں لاؤ گے۔ ادھر آ کر سائن کروائیں وکیل صاحب!" انہوں نے بارعب آواز میں کہا۔ پیچھے بیٹھے وکیل کے ساتھ دو ہتھیار بند ہٹے کٹے خونخوار آنکھوں والے نوجوان اُٹھ کر آئے تھے۔ اُسے مجبوراً سائن کرنا پڑے اور دانت بھینچ کر باہر جانے لگا۔

"یہ مت سمجھنا، میں ڈر گیا ہوں اور دوبارہ نہیں آؤں گا۔" وہ جاتے جاتے غرا کر بولا۔

"ابھی تو جا کر اپنے زندہ بچ آنے کا جشن مناؤ۔ میں نے تمہیں [illegible] جان مرے ہوئے بچوں کے صدقے معاف کیا ہے اور کبھی مجھے تنہا جان کر ادھر آنے کی کوشش نہ کرنا۔ دونوں محافظ اور اس جیسے چار تمہیں بیرونی دروازے پر ملیں گے۔ جاتے ہوئے

ان سے سلام لینا نہ بھولنا۔"

اُن کے بوڑھے وجود میں نہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی، اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولیں۔ وہ دھپ دھپ کرتا باہر نکل گیا۔

"کاش! اب میں زندگی بھر اس ملعون کی کبھی دوبارہ صورت نہ دیکھوں۔" انہوں نے اس کے جانے کے بعد دل میں دعا مانگی تھی اور اللہ نے ان کی دعا سن بھی لی تھی۔

دوبارہ تنویر یوسف حویلی نہ آیا۔

مگر یہ دعا تو انہوں نے صرف اپنے لئے مانگی تھی۔ علیزہ کو اس قبولیت کی گھڑی میں وہ یکسر بھول گئی تھیں۔

❖❖○❖❖

"میں ہرگز یہ بچہ پیدا نہیں کروں گی۔ میں یہاں بچے پیدا کرنے نہیں آئی، میں یہاں برائٹ فیوچر اچیو (حاصل) کرنے آئی ہوں۔ جاہل عورتوں کی طرح نو ماہ کے لئے یہ پھندا اپنے گلے میں ڈال کر بیٹھ جاؤ۔ ہرگز نہیں۔" وہ چیخ رہی تھی۔

"تو کیا کرو گی؟" احد ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

"آئی وانٹ ٹو مس کیری۔"

"شٹ اپ.....!" احد کا ہاتھ اُٹھتے اُٹھتے رہ گیا۔ "یہ ہماری جائز اولاد ہے علیزہ! ایسی فضول بات کبھی منہ سے نہ نکالنا" وہ سمجھانے کے لئے اُس کے پاس آ بیٹھا۔

"صرف ایک سال کی تو بات ہے، تم نے اسپیشلائزیشن ہی کرنی ہے نا۔ ہم ایک سال ادھر مزید رک جائیں گے، آئی پرامس۔" وہ اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"ہرگز نہیں۔" وہ تڑپ کر اس کے حلقے سے نکلی تھی۔ "مرد ہو نا۔ تمہیں حق حاصل ہے، اپنی مرضی کا ہر کام وقت پر کرتے پھرو۔ اور میں عورت ہوں، تمہاری اس حماقت کا تاوان بھرتی پھروں۔"

"یہ حماقت تمہاری بھی تو ہے۔" وہ شرارت سے بولا۔ "چلو، میں بھی ایڈمیشن نہیں لیتا، دونوں واپس چلتے ہیں۔ اگلے سال بچے کو بی اماں کے حوالے کر کے آ جائیں گے۔" اس نے ایک اور تجویز پیش کی۔

"اتنی بھونڈی تجویز اپنے پاس رکھو۔ مجھے اتنا تردد کرنے کی ضرورت کیا ہے، جب مجھے اس کا حل سیدھا اور صاف نظر آ رہا ہے۔" وہ بے خوفی سے بولی۔

"تم ایسا ہرگز نہیں کرو گی۔" وہ بھی غصے میں آ گیا۔

"مجھے ایسا کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔" وہ پیر پٹختے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

اب احد کی سمجھ میں آیا، بی اماں نے یہ کیوں کہا تھا، اس کا خیال رکھنا، تھوڑی ضدی ہے۔

وہ تھوڑی ضدی نہیں، اچھی خاصی ہٹ دھرم تھی۔ تین دن سے دونوں میں بات چیت بالکل بند تھی۔ وہ ناراض تھی اور احد کی کوشش کے باوجود راضی نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے صلح کی ایک ہی شرط رکھی تھی، جو احد کو نامنظور تھی۔ کچھ دیر پہلے احد اُسے منت و سماجت کر کے دودھ کا ایک کپ ہی ناشتے کے طور پر پلا سکا تھا۔

"میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔" کہہ کر وہ چلا گیا تو علیزہ بھی کچھ دیر پڑی یونہی سوچتی رہی، پھر اُٹھ کر تیار ہوئی اور باہر نکل آئی۔ ہیکل اسٹریٹ میں اُس کی دوست فرح رہتی تھی۔ علیزہ کے پاس اُس کا ایڈریس موجود تھا۔ وہ سر جھکائے فٹ پاتھ پر چل رہی تھی، جب بے اختیار اس کے کندھے کسی سخت وجود سے ٹکرائے۔ وہ جنگلے کو تھام نہ لیتی تو یقیناً گر جاتی۔ اس نے غصے سے سامنے دیکھا تو ٹکرانے والا ایک ادھیڑ عمر ایشیائی شخص تھا۔

"دکھائی نہیں دیتا آپ کو؟" غصے کی انتہا کو پی کر وہ کچھ سخت لہجے میں بولی۔

"پاکستانی ہو؟" وہ شخص اُس کے سخت لہجے کا برا مانے بغیر بولا۔

"یس۔" وہ کوفت زدہ لہجے میں بولی۔

"لاہور سے؟" وہ اشتیاق بھرے لہجے میں بولا۔

"لاہور کے مضافاتی علاقے سے۔" وہ اُس کی سائیڈ سے نکل جانا چاہتی تھی۔

"احمد نگر سے.....؟" انتہائی بے قراری سے پوچھا گیا تو وہ چونکی اور اُس کی شکل دیکھنے لگی۔ ایک دم اُسے چہرہ کچھ مانوس سا لگا۔

"ہاں۔" وہ اُسے دیکھتے ہوئے ہولے سے بولی۔

"تم علیزہ ہو..... علیزہ تنویر؟" وہ بے قراری سے اس کے مزید قریب ہو کر بولا۔

"ہاں..... ہوں۔" وہ کچھ گڑبڑا کر بولی۔

"میری بچی..... میری بیٹی..... تمہاری صورت دیکھنے کو تو میری آنکھیں ترس گئی تھیں۔" وہ ایک دم سے اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے جذباتی پن سے بولا۔

"کون..... کون ہیں آپ.....؟" اس نے پیچھے ہٹنا چاہا مگر تنویر یوسف کی گرفت مضبوط تھی۔

"تمہارا بدنصیب باپ۔ تمہیں پہلی نظر میں پہچان گیا تھا۔ گھڑی گھڑائی طاہرہ ہو۔

میری محبوب بیوی، تمہاری نیک دل ماں۔ اُس کی دائیں آنکھ کے اوپر بھی اسی طرح کا دمکتا ہوا تل تھا۔ یہی رنگ روپ، یہی قد و قامت۔ دُور سے تو میں ایک دم ٹھٹک کر رہ گیا تھا کہ طاہرہ زندہ چلی آ رہی ہے۔" وہ اب رو رہا تھا۔

"پاپا.....!" اُس کے لب ہولے سے کسمسائے۔

"تیرا مجبور باپ۔ بیٹا! تیری نانی نے بڑا ظلم کیا۔ میرے کم ذات ہونے کا خوب بدلہ لیا مجھ سے۔ طاہرہ جتنی نیک دل اور محبت کرنے والی تھی، اس کے گھر والے اتنے ہی تنگ دل اور ظالم۔ طاہرہ قدرت نے مجھ سے چھین لی اور تمہیں ظالموں نے۔ بتاؤ، تمہارا باپ اُس دیس سے کیوں نہ بددل ہو کر، در در کے دھکے کھاتا؟ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میرے سامنے میری بیٹی کھڑی ہے۔ میری علیزہ۔" وہ وفورِ شوق سے اُسے تک رہا تھا۔

علیزہ کو بھی یاد آ گیا کہ یہ ادھیڑ عمر چہرہ وہی تھا، جو مما کی البم میں مما کی شادی کی تصویروں میں ان کے ساتھ تھا۔ صرف سر کے بالوں میں سفید بال زیادہ نظر آ رہے تھے ورنہ جسم کی مضبوطی اور تناؤ ویسے ہی تھا۔

"آؤ ادھر پارک میں بیٹھتے ہیں۔" وہ اسے لئے پاس کے پارک میں چلا آیا۔

دونوں بیٹھے تو علیزہ آہستہ آہستہ اُسے اپنی زندگی کی کہانی سنانے لگی۔

"تمہاری نانی نے تمہیں مجھ سے چھین کر، مجھے حویلی سے دھکے دے کر نکال دیا۔ کتنے برس وکیلوں کے پاس تمہاری کسٹڈی کے لئے دھکے کھاتا رہا، مگر اپنے جائز حق کو ثابت کرنے کے لئے بہت پیسے کی ضرورت تھی اور تمہارا غریب باپ اس جگہ آ کر مارا گیا۔ پھر ایک کمپنی میں مجھے میڈیکل ایڈوائزر کی جاب مل گئی۔ اس کمپنی کے توسط سے گزشتہ بیس سالوں سے ادھر ہوں۔ واپس جانے کو بہت دل چاہا، مگر پھر اپنی توہین کا احساس راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں، میں نے قدم قدم پر تمہیں کتنا مس کیا۔ آئی ریئلی لو یو مائی چائلڈ!" وہ ایک بار پھر جذباتی پن سے بولا تو علیزہ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

ماں قدرت نے چھین لی، باپ کی گمشدگی کا ساری زندگی کوئی بھی تسلی بخش جواب نہ دے سکا اور وہ یہ تشنگی دل میں لئے جوان ہو گئی کہ باپ کی محبت کیا ہوتی ہے۔ تین گھنٹے دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے میں کھوئے باتیں کرتے رہے۔

"یہ میرا ایڈریس ہے۔ جس وقت چاہو، بلا جھجک چلی آنا۔ میں بھی آؤں گا احد سے

ملنے۔ یہ لوگ تو شاید مجھے ابھی بھی قبول نہ کریں مگر تمہارے ناتے سے مجھے ان کے پیروں پر بھی جھکنا پڑا تو جھکوں گا۔" وہ دل سوزی سے کہہ رہا تھا۔

"ہرگز نہیں پاپا! آپ میرے باپ کی حیثیت سے بہت عزت و احترام کے لائق ہیں۔ میں آؤں گی۔ بلکہ آپ کو دعوت دوں گی۔ آپ ضرور آیئے گا۔" وہ پورے اعتماد سے کہہ رہی تھی۔

مگر احد تو اُس کی بات سنتے ہی بھڑک اُٹھا۔

"وہ لالچی، فراڈیا، دھوکے باز، تمہیں کہاں سے ٹکرا گیا؟ تم لندن اس لئے میرے ساتھ آئی ہو کہ میرے لئے یہاں مشکلات کے پہاڑ کھڑے کر دو؟" وہ طیش میں آ کر بولا۔

"تم دراصل مجھے یہاں لانا ہی نہیں چاہ رہے تھے۔ میرا باپ کم حیثیت ضرور ہے، ذات برادری میں تمہارا ہم پلہ نہیں، مگر یہ مت بھولو کہ وہ میرا باپ ہے۔" وہ انگلی اُٹھا کر بولی۔ "اور اگر اب تم میری بات نہیں مانو گے تو....."

"تو کیا کر لو گی تم؟"

"بہت کچھ کر سکتی ہوں، یاد رکھنا، مجھے یہ بچہ نہیں چاہئے۔"

"اُف میرے خدا!" وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ "تم بالکل پاگل ہو گئی ہو علیزہ! یہ کوئی زندگی موت کا مسئلہ نہیں اگر تم اس سال اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکیں۔ مگر ایک زندگی کو قتل کرنا، وہ بھی بلا جواز....."

"یہ بلا جواز ہے؟" وہ چلائی۔

"تمہارا دماغ اُس شخص سے مل کر زیادہ خراب ہو گیا ہے۔ معلوم ہے، وہ بارہ لاکھ کے عوض تمہیں بی اماں کے ہاتھوں سیل کر گیا۔"

"احد.....!" وہ اتنی زور سے چلائی کہ احد کو لگا، اپارٹمنٹ کی ہر چیز اپنی جگہ سے ہل گئی ہے۔ "اتنا مت گرو، اور مجھے اپنی نظروں میں اتنا نہ پست کرو کہ میں آئینے میں اپنی صورت بھی نہ دیکھ سکوں۔"

وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر روتی ہوئی وہاں سے بھاگ گئی اور کمرے کا دروازہ لاک کر لیا تو احد کو احساس ہوا کہ حقیقت بتانے کے چکر میں وہ واقعی بہت غلط لفظ استعمال کر گیا ہے۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اور ان غلط الفاظ کا تاوان اُسے اگلے چند گھنٹوں میں ہی بھرنا پڑ گیا۔ علیزہ نے خواب آور گولیوں کی آدھی بوتل حلق میں انڈیل لی تھی۔ موت اس سے محض چند قدموں

کے فاصلے پر کھڑی تھی، اگر احد کو بروقت علم نہ ہو جاتا اور بند کھڑکی کی اٹکی ہوئی چٹخنی دو چار جھٹکوں سے کھل نہ جاتی۔

"جان تو بچ گئی ہے مگر شاید اس کے اثرات بچے کی برین ہیلتھ کو متاثر کر دیں۔" ڈاکٹر اس سے کہہ رہی تھی۔

وہ جذباتی پن میں اس حد تک آگے چلی جائے گی، اس کا اندازہ تو احد کو بھی نہیں تھا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ یوں لگتا تھا، بی اماں کے شجر سایہ دار سے نکل کر دونوں مشکلات کی دھوپ میں آ کھڑے ہوئے ہیں۔

پھر وہ ٹھیک ہو کر گھر بھی آ گئی۔ موت کو چھو کر آنا کوئی آسان بات نہیں ہوتی۔ بہت خاموش سی ہو گئی تھی وہ۔ ابارشن کی ضد بھی چھوڑ دی تھی۔ اور ایڈمیشن اگلے سال کروانے پر راضی ہو گئی تھی۔ احد کی معذرت پر بھی اس نے خاموشی سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ احد نے دل میں شکر کیا۔

کچھ دنوں بعد علیزہ کی طبیعت سنبھل گئی تو احد نے باقاعدہ کلاسز اٹینڈ کرنا شروع کر دیں۔ اس نے بی اماں کو بھی خوشخبری سنا ڈالی تھی، جس کے نتیجے میں ان کا اصرار تھا کہ کم از کم علیزہ کو ان کے پاس بھیج دے۔

❖❖○❖❖

اُس روز دھوپ بہت دنوں بعد کھل کر نکلی تھی۔ اپارٹمنٹ میں پڑے پڑے وہ تنگ آ گئی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب وہ اُٹھی اور تیار ہونے لگی۔ تنویر یوسف چند دن پہلے ایک شام ان کے گھر آئے تھے، بہت سا فروٹ اور تحائف لئے۔ احد گھر پر نہیں تھا اور علیزہ نے اپنی طبیعت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ تو باپ کو اپنے سامنے دیکھ کر ہی خوش تھی۔

"تم آئیں نہیں، انتظار کرتا رہا۔" اُن کا پیار بھرا گلہ اُسے اچھا لگا اور آج وہ تیار ہو کر ان سے ملنے چل دی۔

سیکنڈ فلور میں فلیٹ نمبر نائن اُسے سامنے ہی نظر آ گیا تھا۔ کافی پرانی بلڈنگ تھی۔ فلیٹ بہت پرانے بنے ہوئے تھے، لفٹ بھی خراب تھی۔ اُسے مجبوراً سیڑھیاں چڑھ کر آنا پڑا۔ دروازہ کھلا تھا۔ وہ اپنا سانس درست کرنے کے لئے وہیں رک گئی۔

"جانِ من! کیوں فکر کرتی ہو؟ سونے کی چڑیا میں نے پھانس لی ہے۔ بیس سال پہلے بارہ لاکھ وصول کیا تھا۔ اس زمانے میں وہ بارہ لاکھ بھی ایک کروڑ کے برابر تھا۔ اب

تو میں نے اس چڑیا کو ہاتھ سے نکلنے ہی نہیں دینا۔ دو چار کروڑ تو کیا، ایک ایک اینٹ بکوا دوں گا۔ بس چند دن اور یہ فاقے کاٹ لو۔ بہت بڑا جیک لگ رہا ہے قسمت کا۔"

یہ تنویر یوسف کی آواز تھی، جو نیچے کارپٹ پر کشن سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ سامنے بیٹھی ادھیڑ عمر انگریز عورت کرخت تاثرات لئے اسے سن رہی تھی۔

"بہت دنوں سے تمہاری یہ باتیں سن رہی ہوں۔ اگر ایک دو دن میں انتظام نہ ہوا تو یہ فلیٹ بھی خالی کرنا پڑے گا، سامان اور کپڑوں سمیت۔" وہ حلق پھاڑ کر بولی تھی۔

"چند دن بس۔ میری جان! دیکھنا، وہ سونے کی چڑیا خود چل کر آئے گی۔ ارے وہ بڑھیا تو ابھی تک زندہ ہے۔ حویلی پر سانپ بن کر بیٹھی ہے۔ بڑی عیار ہے۔ اپنا پوتا گلے باندھ دیا ہے لڑکی کے۔ گھر کی دولت گھر میں رہے۔ نہ دونوں میں طلاق کروائی، ان اونچے خاندان والوں کی عزت کی دھجیاں نہ اُڑائیں تو تنویر یوسف نہ کہنا مجھے۔"

واپسی کا سفر دشوار ضرور تھا، مگر علیزہ نے طے کر ہی لیا۔

❖❖❖○❖❖❖

اُس کی جذباتی حرکت کا نتیجہ سامنے آیا تو وہ رو پڑی۔ بچہ بے حد کمزور تھا۔ یہ تو ڈاکٹرز نے پریگنینسی کے دوران ہی ظاہر کر دیا تھا کہ بچہ نہ صرف جسمانی طور پر بلکہ دماغی طور پر بھی کمزور یا خدانخواستہ ایب نارمل ہو سکتا ہے۔

کاش وہ اتنے پاگل پن کا مظاہرہ نہ کرتی۔ اگر بچے کو کچھ ہو گیا، ٹھیک نہ ہوا تو.....

اس سے آگے اسے اپنی ساری زندگی برباد ہوتی محسوس ہوئی۔ پھر یہ واہمے آہستہ آہستہ حقیقت کا رُوپ دھارنے لگے۔

آٹھ ماہ کی عمر تک نہ تو وہ بیٹھ سکتا تھا، نہ اُس کی حرکتیں اس عمر کے بچوں جیسی تھیں۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک بھی مفقود تھی۔

"احد! میں کیا کروں؟ مجھے بہت ٹینشن ہو رہی ہے۔ میرا ایک اور سال ضائع ہو رہا ہے۔ میں واپس چلی جاتی ہوں۔ کتنا شوق تھا مجھے اسپیشلائزیشن کا۔ کاش! میں نہ آتی، کم از کم اس کا دُکھ تو نہ دیکھنا پڑتا۔" وہ بچے کو دیکھ کر رو پڑی۔ انہوں نے بچے کے لئے گورنس رکھ لی تھی۔

"اس کا ایک ہی حل ہے۔" احد بھی پریشان تھا، اُس کی پڑھائی متاثر ہو رہی تھی۔ شام کو وہ ایک ہاسپٹل میں پریکٹس بھی کر رہا تھا۔ علیزہ کا ایڈمیشن دوبارہ ہو چکا تھا، چند دنوں تک اُس کی کلاسز شروع ہونے والی تھیں۔

"وہ کیا؟" علیزہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ باپ کی دھوکا دہی کا صدمہ اور بچے کی پریشانی۔"

"ہم اسے بی اماں کے پاس بھیج دیتے ہیں، وہ بہت اصرار کر رہی ہیں۔ پھر ادھر رانیہ بھی ہے، دس ملازم اور ہیں۔ اس کو توجہ ملے گی تو آہستہ آہستہ ٹھیک ہوتا جائے گا۔ ڈاکٹرز یہی کہہ رہے ہیں نا، اسے عام بچوں کی نسبت دس گنا زیادہ توجہ اور محبت کی ضرورت ہے۔ کیا خیال ہے؟"

"ہوں، ٹھیک ہے۔"

"چار سالوں کی تو بات ہے، پھر تو ہم کو چلے ہی جانا ہے۔"

"احد! ابھی جانے کی بات نہ کرو۔ مجھے تو لگتا ہے، میں تو ابھی ادھر آئی بھی نہیں۔"

"تم نے بی اماں کا خط پڑھا جو پرسوں آیا تھا؟"

"ہاں، پڑھا تھا۔"

"یہ رانیہ کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ بی اماں بے چاری بہت پریشان ہیں کہ وہ ہر پروپوزل کو ٹھکرائے جا رہی ہے۔ کسی وکیل کا رشتہ ہے، نہیں مان رہی۔"

"وہ تو کچھ عجیب سی ہو گئی ہے۔ موڈی سی۔ دیکھا نہیں، ہماری شادی کے دوران کیسی ماحول سے کٹی کٹی پھر رہی تھی۔ کہتی ہے، بی اماں کو چھوڑ کر نہیں جائے گی۔"

"اسے بی اماں سے پیار بہت ہے اور....."

"پلیز احد! اب رانیہ کا ٹاپک کھول کر نہ بیٹھ جانا۔ تم بی اماں کو فون کرو، شایان کے بھیجنے کی بات کرو۔ وہ کیا کہتی ہیں۔"

بی اماں نے کیا کہنا تھا، وہ ہنسی خوشی راضی تھیں۔

اور تیسرے ہفتے شایان کو اُس کی گورنس اور ایک دوست فیملی کے ساتھ پاکستان بھیج دیا گیا۔ جیسے ہی گورنس شایان کو لے کر جہاز کے اندر گئی، علیزہ کو اپنے اندر خلا سا محسوس ہونے لگا۔ جی چاہا دوڑ کر جائے اور شایان کو لے آئے یا خود چلی جائے۔

"ماشاء اللہ! بہت پیارا ہے، یہ کون سے موئے انگریز کہتے ہیں کہ کمزور ہے، دماغی طور پر بھی نکما لگتا ہے۔ دیکھنا، تم دونوں پاکستان آؤ گے تو دوڑ کر تمہیں ماما، بابا کہتا گود میں آ جائے گا۔ میں تو اس وقت سے اپنے کلیجے سے لگا کر بیٹھی ہوں، ایک پل کو بھی خود سے الگ نہیں کیا۔ رانیہ الگ اسے لینے کو بے قرار میرے اِدھر اُدھر منڈلا رہی ہے۔"

جیسے ہی شایان، بی اماں کے پاس پہنچا، ان کا فون اسی وقت آ گیا اور وہ دونوں جو

شایان کو بھیج کر چور سے بنے بیٹھے تھے، ایک دم سے ہلکے پھلکے ہو گئے۔

اب آگے کی راہیں اُنہیں بہت سیدھی اور آسان نظر آ رہی تھیں۔

❖❖○❖❖

''احد بیٹا! چار سال گزر گئے، تمہاری بی اماں اور انتظار کے دیے نہیں جلا سکتیں۔ آ جاؤ اب۔'' احد کو رات بی اماں کا تھکا تھکا سا فون آیا۔

''بی اماں! میری تعلیم مکمل ہو گئی ہے، آپ کے بیٹے نے یہاں کی سب سے اعلیٰ ڈگری حاصل کر لی ہے۔ مگر علیزہ کا ابھی ایک سال باقی ہے۔ پھر مجھے ادھر بہت اچھی آفرز ہو رہی ہیں۔ میں چاہتا ہوں، ایک آدھ سال ادھر پریکٹس کر لوں، کچھ پونڈز کما کر اپنے ملک کو زرِ مبادلہ بھیجوں۔''

''میرے بیٹے! اس مظلوم مٹی کو زرِ مبادلہ کے ڈھیروں کی ضرورت نہیں۔ اسے سُود نہیں، اپنا اصل زر چاہئے۔ اپنے قابل، ہنر مند سپوت۔''

''بی اماں! میں کہہ رہا ہوں نا، صرف ایک سال بعد۔ آئی پرامس۔'' وہ کچھ اُکتا کر بولا۔ یوں بھی اب واپس جانے کا خیال دل کو کچھ بھاتا نہیں تھا۔

''شایان ٹھیک ہے؟''

''ہاں۔ ماشاء اللہ اب تو بھاگتا دوڑتا ہے، لڑکھڑا کر ایک دو لفظ بھی بول لیتا ہے۔ رانیہ نے اس کے ساتھ اپنی جان لڑا دی ہے۔ دن رات تج دیا۔''

''رانیہ ٹھیک ہے؟''

چند لمحے خاموشی رہی۔

''سوچتی ہوں، ہم لوگوں نے اتنی جانیں قربان کر کے تم لوگوں کو اتنا بڑا، نعمتوں اور وسائل سے مالا مال ملک دیا اور تم لوگ ہمیں آنے والے کل کی اُمید بھی نہیں دے رہے۔ چلو، ہمارا فرض تو ادا ہوا۔ تمہاری گردنوں پر جو قرض ہے اس مٹی کا، اس کا خیال رکھنا۔ اپنا اور علیزہ کا خیال رکھنا۔ وہ آئے تو اس سے کہنا، مجھ سے ضرور بات کرے۔ اور آخری بات۔'' وہ رُکیں۔ ''اپنے وعدے پر قائم رہنا۔ میرے وطن نے امانتاً تمہیں ادھر بھیجا تھا، امانت میں خیانت نہ کرنا۔ اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے۔ اللہ حافظ!'' اُنہوں نے احد کو جواب سنے بغیر فون رکھ دیا۔

احد کے دل کو عجیب سا احساس ہوا۔ جیسے بی اماں کے فون کے بعد وہ کسی خلا میں، زمین یا آسمان کے درمیان کہیں معلق ہو کر رہ گیا ہے۔

علیزہ کے آنے تک وہ اسی طرح بے سکون سا بیٹھا رہا۔ علیزہ کے آنے کے بعد اسے بی اماں کے فون کا بتانے کے باوجود اس کی یہ کیفیت ختم نہ ہوئی۔

بالآخر رات دو بجے وہ گھنٹی بج ہی گئی، جس کے لاشعوری طور پر اُس کے حواس منتظر تھے۔

''بی اماں ہم میں نہیں۔'' نذیر چاچا روتے ہوئے بتا رہے تھے۔ باہر زوروں کی برف باری ہو رہی تھی۔ دُھند نے تین دن سے شہر بھر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

دونوں رات بھر برف باری کے سنگ جاگتے رہے اور روتے رہے۔ دھند کی وجہ سے کوئی فلائٹ نہیں جا رہی تھی۔ بی اماں کا کہنا پورا ہو گیا۔

''مجھے معلوم ہے، مجھے کاندھا دینے بھی نہ آ سکو گے۔''

''ابھی کوئی فلائٹ نہیں جا رہی۔'' دن دس بجے بھی جب اُسے یہی جواب ملا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

❖❖○❖❖

جب وہ دونوں صدیوں کی تھکن کندھوں پر لئے حویلی میں داخل ہوئے تو بی اماں کو رخصت ہوئے پانچواں دن تھا۔ اتنی بڑی ڈھنڈار حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ دروازے، کھڑکیاں، پلستر اُکھڑی پرانی دیواریں، اونچی چھتوں، سرخ کالے پتھروں والے فرش..... سب نے انہیں دیکھ کر ایک بار تو غصے سے منہ پھیر لیا تھا۔

''اب آئے ہو؟ اب کیا لینے آئے ہو؟ کیا بچا ہے؟'' احد کو لگا، سب طرف سے یہی آوازیں آ رہی ہیں۔

گول کمرے میں رانیہ گاؤں کی عورتوں کے درمیان چاندنی پر بیٹھی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی چیخیں مار کر رونے لگی۔ اور دونوں کو پہلے تو لگا، وہ رانیہ نہیں، اُس کا بھوت ہے۔ زرد رنگ کے ڈھیلے ڈھالے کاٹن کے سوٹ میں سیاہ ہڈیوں کا پنجر علیزہ سے لپٹا چیخیں مار رہا تھا۔

اب وہاں رہ ہی کیا گیا تھا۔ چیخیں، آہیں، آنسو اور بس۔ احد سر جھکائے قبرستان کی طرف چل پڑا۔

❖❖○❖❖

''رانیہ! بی اماں کی الماری کی چابی کدھر ہے؟''

نذیر چاچا نے بتایا تھا کہ باغات کا ٹھیکہ اس سال ختم ہونے کو ہے۔ نیا کنٹریکٹ

کرنا ہے یا اسی ٹھیکے کو جاری رکھنا ہے۔ کچھ اور بھی قانونی امور تھے، جن کے لئے اسے جائیداد کے کاغذات کی ضرورت تھی۔

''یہ لیں چابی۔'' وہ جھکی نظروں سے اسے چابی دے رہی تھی۔ برسوں کی بیمار۔ اس کے تو سینے سے سانسوں کے اُتار چڑھاؤ کی آوازیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''تمہیں ہوا کیا ہے؟'' وہ چابی بھول کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''کچھ نہیں۔'' وہ صاف نظریں چرا گئی۔ تیزی سے جانے لگی کہ اُسے زور کا چکر آیا، قریب سہارا لینے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ احد نے اُسے تھامنا چاہا، وہ ہاتھوں سے پھسلتی زمین پر گرتی چلی گئی۔

''علیزہ! ادھر آؤ۔ دیکھو، رانیہ بے ہوش ہوگئی ہے۔'' احد اُس پر جھکا چلایا۔

''رانیہ کو بلڈ کینسر ہے، وہ بھی آخری اسٹیج پر۔'' چار دن بعد اُس کے ٹیسٹوں کی رپورٹس علیزہ ابھی لیبارٹری سے لے کر آئی تھی اور افسردہ چہرے کے ساتھ پڑھتے ہوئے بتا رہی تھی۔

''او مائی گاڈ!'' وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔ رانیہ چار دنوں سے بستر پر تھی۔

''ایک اور سانحہ منتظر ہے گویا۔'' وہ تاسف بھری نظروں سے اُس کے نیم مُردہ جسم کو دیکھتے ہوئے باہر نکل گیا۔

اس شام وہ بی اماں کی الماری کھولے کاغذات کا جائزہ لے رہا تھا۔ نچلے خانے میں سیاہ مخملیں تھیلی پڑی تھی۔ احد نے دُکھی دل کے ساتھ تھیلی کو کھولا، اس میں ناہید کی خون آلود اوڑھنی، چوڑیوں کے ٹکڑے اور مٹی کے دیے کا ایک ٹکڑا تھا۔

احد کو یاد تھا۔ بچپن سے آج تک بی اماں بارہ اگست کی شام اپنے کمرے میں بند ان تین چیزوں کے ساتھ گزارتی تھیں اور جب رات گئے باہر نکلتیں تو صدیوں کی بیمار محسوس ہوتی تھیں۔ اور تیرہ اگست کی صبح سے حویلی میں نئی چہل پہل شروع ہو چکی ہوتی۔ وہ چودہ اگست کے لئے جھنڈے، جھنڈیاں اور چراغاں کا اہتمام کرواتیں۔ حویلی میں جشن کا سا سماں ہوتا تھا۔ اس روز سارے علاقے میں بی اماں کھانا تقسیم کرواتیں، بچوں میں مٹھائی اور کھلونے بانٹتیں۔ وہ کہتی تھیں، میں اپنی پوری زندگی میں اس دن سے زیادہ کبھی خوش نہیں ہوتی۔ اور یہ سچ بھی تھا۔

''آہ..... بی اماں.....'' اس نے آنکھ میں آئے آنسو پونچھ کر تھیلی میں سامان سمیٹا۔ تھیلی کے ساتھ ایک سیاہ شاپر پڑا تھا۔ اس نے آہستہ سے شاپر کی گرہ کھولی۔

''ارے یہ کیا.....؟'' وہ حیران رہ گیا۔ اُس کی نیلی قمیض جو اُس روز کہنی سے پھٹ گئی تھی، اُسی خوشبو میں بسی (جو وہ استعمال کرتا تھا) استری شدہ، صاف ستھری پڑی تھی۔

''رانیہ! یہ..... یہ بی اماں نے سنبھال کر.....'' وہ شرٹ لئے اُس کی طرف پلٹا تو وہ بے اختیار نفی میں سر ہلا گئی۔

''تو.....؟'' وہ حیرانی سے اس سے پوچھ رہا تھا۔ رانیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آنسوؤں کی قطاریں اُس کی آنکھوں کے کناروں سے نکل کر کانوں کے پیچھے گم ہونے لگیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے پاس آیا۔

''رانیہ! یہ تم نے..... تم نے سنبھال رکھی تھی؟'' وہ سحر زدہ سا پوچھ رہا تھا۔ رانیہ اب بھی کچھ نہ بول سکی۔

''تم..... کیا تم..... رانیہ! کیا میں ٹھیک سمجھ رہا ہوں، تم مجھ سے.....''

بہت سے منظر اُس کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ رانیہ کا جوش و خروش سے پڑھنا، پھر داخلے سے انکار کرنا۔ اور پھر ان کی شادی کے دوران اُس کی ماتمی صورت۔

''اوہ میرے خدا..... احمق لڑکی! تم مجھ سے.....'' وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ''تم نے کبھی مجھ سے کہا کیوں نہیں؟'' چند لمحوں بعد وہ سر اٹھا کر اس کے سانولے چہرے پر نظریں جما کر بولا۔

''کیسے کہتی؟ میں کمی کمین ذات کی نیچ خاندانی ملازمہ اور آپ چودھویں کا چاند، گگن کے تارے۔ میں راہ میں اُڑتی دھول..... کیسے کہتی؟''

''تم کہہ کر تو دیکھتیں پگلی!'' اُس کا دل یکایک اُس کی محبت پر تڑپ اُٹھا تھا۔ اُسے لگا جیسے اُس کے دل میں بہت سی جگہ رانیہ کی اس محبت کے لئے خالی تھی۔

''کیا آپ مجھے پسند کرتے؟'' وہ حیران بھیگی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''تم میں کیا کمی تھی رانیہ! ایک بار تم کہتیں تو۔'' وہ اُنگلیوں کی پوروں سے اُس کی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولا۔

''آپ..... آپ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں، واقعی؟..... آپ جھوٹ تو نہیں بول رہے؟'' وہ بے یقینی سے کہہ رہی تھی۔

''نہیں، بالکل سچ۔ تمہاری جان کی قسم! مگر تم نے دیر کر دی۔ کیوں اتنی دیر کر دی؟ رانیہ! محبت میں تو دل دیکھے جاتے ہیں۔ ذات، قبیلے، رنگ روپ کون دیکھتا ہے؟'' وہ بڑے پیار سے اُس کی ٹھوڑی کو چھو کر بولا۔

''نہیں احد لالہ! دیر نہیں ہوئی۔ میری محبت آج سرخرو ہو گئی ہے۔ اسے پذیرائی جو مل گئی تو دیر کیسی؟'' وہ بہت خوش تھی۔ اُس کی آنکھوں میں زندگی کی جوت جگنے لگی تھی۔

''دیر یوں پگلی! کہ آج رات تین بجے تو ہماری فلائٹ ہے اور مجھے ابھی جانا ہے، واپس لوٹ آنے کے لئے۔ میرا انتظار کرو گی؟'' وہ اُس کا استخوانی ہاتھ اپنے مضبوط گرم ہاتھوں میں لے کر محبت سے بولا۔

''وعدہ نہیں کرتی۔ آپ کی محبت پا لی، مجھے سب کچھ مل گیا۔ اب کس بات کا انتظار؟'' اس نے سکون سے آنکھیں موند لیں۔ احد چند لمحے اسی طرح بیٹھا رہا، پھر اُٹھ کر باہر آ گیا۔

''کیا ڈرامہ تھا؟ یہ کیا بکواس کر رہے تھے تم رانیہ سے؟'' علیزہ نے پیچھے سے اس کا کان مروڑا تھا۔

''علیزہ! تمہیں معلوم ہے نا، وہ آخری دم پر ہے۔ اس لمحے میرا ذرا سا جھوٹ اُس کی زندگی کی چند گھڑیاں اور بڑھا گیا ہے۔ اُس نے ہم پر احسان کیا ہے۔ شایان کو دیکھا ہے تم نے۔ لگتا ہی نہیں وہ کمزور بچہ ہے۔ یہ سب رانیہ کی وجہ سے تو ہوا ہے۔'' وہ کہتے ہوئے چپکے سے وہاں سے نکل گیا۔

اب وہ کیسے بتاتا؟ اُسے خود پتہ نہیں چل رہا تھا کہ جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا ہے۔ اُس کا دل اُلجھ کر رہ گیا تھا۔

❖❖○❖❖

یادوں کے دریچے سے جھانکوں
تو آج بھی وہ لمحے یاد آتے ہیں
اُس رات جب چاند نہیں نکلا تھا اور بادل
سبک رفتاری سے ستاروں کو اپنی اوٹ میں لئے جا رہے تھے
سڑک کنارے دورویہ درخت سر جھکائے
کسی گہری سوچ میں گم تھے
لگتا تھا، رو رہے ہیں یا ابھی رو پڑیں گے
ان کی خاموشی سے میرا دل بے کل
اور میرے ہم سفر نے دوبارہ مجھ سے پوچھا
تم چپ کیوں ہو؟

اور مجھے یوں لگا جیسے
بین کرتی ہوائیں اور روتے شجر دم سادھے
میرے جواب کے منتظر ہیں
اور میرے ''کچھ نہیں'' پر وہ پھر سے سانس لینے لگے
موت سے سنسان سفر کے اختتام پر ہم گھر پہنچے
فون کی گھنٹی بج اُٹھی
اور پیامبر نے بتایا
کروڑوں کی آبادی کے اس زندہ شہر میں
اس کی سانسیں شامل نہیں ہیں
ماتمی ہواؤں نے کھڑکیوں کے شیشوں سے سر پٹخا
اور بارش ٹپ ٹپ کرتی
دھواں دھار رونے لگی
اور میں!
میرے پاس تو رونے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا

❖❖○❖❖

اُس کے سیل فون کی بیل بج رہی تھی۔

''احد بیٹا! رانیہ مر گئی۔'' ہزاروں میل کی بلندی پر اُڑتے جہاز میں نذیر چاچا کی روتی آواز نے جیسے اُس کے گرد بنا ان لفظوں کا حصار توڑ ڈالا۔ اُس نے خاموشی سے موبائل آف کر دیا۔

''چچ چچ..... بے چاری..... حالت ہی اتنی خراب تھی اُس کی۔ کہاں بچنا تھا اُس نے۔'' علیزہ سنتے ہی افسوس سے بولی۔ ''اتنے بے وقوف ہوتے ہیں یہ لوگ، اپنا علاج تک بروقت نہیں کرواتے۔ شکر ہے، ہم شایان کو ساتھ ہی لے آئے۔ ورنہ ہمیں راستے میں رک کر دوبارہ جانا پڑتا۔'' علیزہ نے جھک کر سوئے ہوئے شایان کا ماتھا چوما اور احد سے کچھ بھی نہیں بولا گیا۔

''اب تم بھی جا کر اپنا کنٹریکٹ کر لینا ہیلتھ ویزا والوں سے۔ میرا تو ابھی ایک سال رہتا ہے۔ اب ہم دو چار سال وہاں آرام سے پریکٹس کریں گے۔ یہاں بی اماں کی فکر تھی، سو وہ بھی نہ رہی۔ حویلی کی دیکھ بھال کے لئے نذیر چاچا ہیں۔''

احد کو لگا، علیزہ کے لہجے میں تمسخر بول رہا ہے۔

''لوگ ایسے کیریئر کے لئے تڑپتے ہیں۔ اور ہم گھر آئی نعمت کو ٹھوکر مار کر واپس آ جائیں۔ ہے نا۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

'اور اسے نہیں معلوم، میرے بریف کیس کی اندرونی پاکٹ میں انتہائی محبت اور عقیدت سے رکھا گیا ایک لفافہ موجود ہے، جو مجھے کسی بھی قیمت پر اگلے سال واپس لے آئے گا۔ اس لفافے میں بی اماں کی مخملیں تھیلی، جس میں آزادی کی وہ نشانیاں موجود ہیں اور میری محبت کی نشانی وہ نیلی قمیض جو مجھے یاد دلاتی رہے گی کہ مجھے واپس جانا ہے اور اپنی مٹی کا بہت سا قرض بہت جانفشانی اور محبت سے اُتارنا ہے۔ ہاں، مجھے لوٹنا ہے۔ اپنے وطن، اپنی سرزمین کی طرف۔ اور میں ادھر آنے والے ہر شخص، ہر اسپیشلسٹ سے کہوں گا، وہ اپنے بریف کیس میں ایسی ایک نیلی قمیض اور محبتوں کی کوئی نشانی ضرور رکھ کر لایا کریں، جو انہیں واپس جانے پر مجبور کر دے کہ ان محبتوں کا قرض اگر ادا نہ کرو تو زندگی بھی ایک تاوان بن جاتی ہے۔ اور مجھے اپنی زندگی کو تاوان نہیں، قابل تقلید بنانا ہے۔'

احد نے سوچتے ہوئے جہاز کی سیٹ سے سر ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔

اُسے واپس آنا تھا، بی اماں سے کیا گیا وعدہ نبھانے۔ یہ اُس کا خود سے عہد تھا اور خود سے کئے عہد توڑے نہیں جاتے۔

❖❖○❖❖

گلابی موسموں کو انعام کرنا ہے

مئی کے آخری دنوں کا تپتا ہوا سورج اور پگھلی ہوئی تارکول کی سڑک پر بیس بائیس مسافروں کی ویگن میں دُگنے لوگ بھرے ہوئے تھے۔

جلتے ہوئے سورج کی تپش اور اتنے انسانوں کے تنفس نے ویگن کو عملاً جہنم کا نمونہ بنا رکھا تھا۔ کھلی کھڑکیوں سے آگ کے تھپیڑے آ رہے تھے۔ پسینے سے بھیگے ہوئے جسموں سے ناقابل برداشت بدبوئیں پھوٹ رہی تھیں، مگر اس کے باوجود سب یہ برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

اگرچہ بھری دوپہر تھی، مگر سڑکوں پر رش کا عجب عالم تھا۔ ہر طرف ویگنوں اور گاڑیوں کا سیلاب گویا اُمڈ پڑا تھا دفاتر اور اسکولوں میں چھٹی کا ٹائم تھا۔ ہر بندہ جلدی کے موڈ میں تھا کہ کسی طرح منزل پر پہنچ کر سکون کا سانس لے۔ سب کی جلدی کی کوششیں سب کی تاخیر کا باعث بن رہی تھیں۔ جیسے ہی سرخ بتی جلتی، وہ لمحے عذاب ہو جاتے۔ دل ہی دل میں گرمی سے بل کھاتے لوگ سگنل کو ہزاروں کوسنے سناتے۔ پیچھے سے گاڑیوں کے ہارن سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔

وہ کتنی دیر اسٹاپ پر کھڑی رہی تھی اور اس نے کتنی ویگنیں ایسے ہی جانیں دیں کہ کسی میں بیٹھنے کی جگہ مل جائے۔ کم از کم اتنے رش میں لٹکنے کی کوفت سے نجات مل جائے گی۔ مگر جب ایسی کوئی ویگن نہ مل سکی تو اسے مجبوراً اسی ویگن میں بیٹھنا پڑا۔ اس کی ساتھ کی سیٹ پر ایک عورت آٹھ نو ماہ کے بچے کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ بچہ شاید بیمار تھا۔ گرمی سے گھبرا کر تھوڑی تھوڑی دیر بعد ریں ریں کرنے لگتا اور کبھی گود سے نکلنے کے لئے زور زور سے مچل جاتا کہ بے چاری ماں کے لئے سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ بچے کے شور سے لوگ بے زاری سے مڑ مڑ کر اس عورت کو دیکھتے، جیسے وہ بچے کو رونے پر اُکسا رہی

ہو۔ وہ عورت تو پھر بھی مزے میں تھی کہ کھڑکی کے ساتھ بیٹھی تھی، مگر نیہاں کی جان عذاب میں آئی ہوئی تھی۔ اس کی سیٹ کے ساتھ کھڑے مسافر، جیسے ہی ویگن جھٹکے سے کسی مسافر کو اُتارنے کے لئے رُکتی، اس کے اوپر گرنے لگتے۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ گرمی کی پروا کئے بغیر ویگن سے اُتر کر بھاگ جائے۔

آخر خدا خدا کر کے اسے اپنی روڈ کی شکل دکھائی دی تو اس نے یک دم ایک اسٹاپ پہلے اُترنے کا فیصلہ کر لیا۔ بڑی مشکل سے فائل سنبھالتے ہوئے کھڑی ہوئی۔ اتنے سارے مسافروں میں راستہ بنانا گویا پل صراط سے گزرنا تھا۔ سیٹ بھی تو آخری ملی تھی۔ دو ایک نے شرافت سے راستہ دے دیا، اور چند ایک ڈھیٹ بن کر اپنی جگہ پر جمے رہے۔

''بی بی! جلدی کرو۔'' کنڈیکٹر بے صبری سے بولا۔

دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے کسی پرندے کی طرح لمبی جست بھری اور چھلانگ مار کر اس عقوبت خانے سے باہر آ گئی۔ مگر یہ چھلانگ اُسے مہنگی پڑی، کسی کے پاؤں کے نیچے اُس کے سینڈل کا اسٹرائپ آ کر ٹوٹ گیا۔ اُس کے اُترتے ہی کنڈیکٹر نے ویگن پر زور سے ہاتھ مارا۔ ''چلو جی۔'' اور ویگن لمحے میں فراٹے بھرتی آگے چلی گئی۔

اس نے سڑک سے ذرا ہٹ کر جوتے کا جائزہ لیا کہ وہ چلنے کے قابل بھی رہا تھا یا نہیں۔ اس میں بے چارے سینڈل کا بھی قصور نہیں تھا۔ گزشتہ چار پانچ ماہ سے جتنی اس نے خواری جھیلی تھی، اگر کسی کے پاؤں کے نیچے آ کر نہ ٹوٹتا تو بھی اسے ایک دو روز میں جواب دے ہی دینا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خود کو کوسنے لگی کہ آخر کیا مصیبت پڑی تھی جو ایک اسٹاپ پہلے اُتر گئی۔

اس نے سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانے شروع کئے۔ سورج تو سوا نیزے پر تھا ہی، اس نئی مصیبت نے اور بھی بے حال کر دیا۔

اس نئی مصیبت کا ایک فائدہ یہ ہوا، اُسے گرمی کی شدت کا اتنا احساس نہ رہا۔ سارا دھیان جوتے اور راستے کی طوالت پر اٹک گیا۔ جلتی ہوئی سڑک کسی دشت کا منظر پیش کر رہی تھی۔

خدا خدا کر کے اندرون شہر کی پہلی گلی میں قدم رکھا۔ یہ علاقے کتنے ہی پسماندہ سہی، مگر چھ چھ سات سات منزلہ خستہ حال عمارتوں نے گلیوں پر سایہ کر رکھا ہے، جس کی

وجہ سے ان کے اندر داخل ہوتے ہی ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔ گلیاں اگرچہ سنسان تھیں مگر دکانیں کھلی تھیں۔ اِکا دُکا گاہک بھی نظر آ رہے تھے۔ اکثر دکان دار یا تو سو رہے تھے یا اونگھ رہے تھے۔ پرانے پنکھے سست رفتار اور بے ڈھنگی آوازوں کے ساتھ چل رہے تھے۔ وہ رکاوٹوں سے ذرا ہٹ کر چلنے لگی۔ اگر یہ اتنی دوپہر کا ٹائم نہ ہوتا تو یقیناً لوگوں کی نظروں سے بچ کر چلنا بہت مشکل ہو جاتا۔ آتے جاتے راہگیروں میں سے ایک آدھ منچلے نے آوازے کسے مگر وہ خاموشی اور صبر کے ساتھ چلتی رہی۔

میڈیکل اسٹور کے ساتھ ہی اُس کی گلی کا موڑ تھا۔ تیسرا گھر ماموں کا تھا۔ پکی سرخ اینٹوں والا حویلی نما یہ گھر پرانی طرز کا بنا ہوا تھا۔ ان کی گلی میں اتنی ٹھنڈک نہیں تھی، کیونکہ ماموں کے کمرے میں چلنے والے ایئر کنڈیشنر کا رُخ گلی کی جانب تھا جو اس وقت گرم گیسیں پوری تندہی سے گلی میں اُگل رہا تھا۔

گھسٹ گھسٹ کر چلتے ہوئے اس کا پاؤں زخمی ہو گیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ سیدھی اندر جا کر اے سی میں بیٹھ جائے، بغیر ممانی کی تیوریوں کی پروا کئے جیسے رائمہ کرتی تھی۔ ممانی جتنا مرضی ماتھے پر بل ڈالتیں، وہ ڈھیٹ بنی وہیں جمی رہتی۔ اور اتنا حوصلہ کم از کم نیہاں میں نہیں تھا۔ اس کی یہی خود داری اور انا پسندی ممانی کی مغرور طبیعت کو بے حد ناگوار لگتی تھی کہ اتنے برے ماحول میں بھی اس کا دماغ عرشِ معلیٰ سے نیچے آنے پر راضی ہی نہیں ہوتا۔ وہ کہتیں۔

''اسی لئے تو اللہ گنجے کو ناخن نہیں دیتا۔ اگر جو ذرا شان مل جائے تو نیہاں کو یہ کیڑے مکوڑوں سے انسان تو شاید نظر بھی نہ آئیں۔''

اور اس نے بھی ممانی کے خیالات کی کبھی تردید نہیں کی تھی۔ اُس کی شانِ بے نیازی انہیں آگ لگا جاتی اور وہ باقاعدہ طعنوں پر اُتر آتیں۔ شروع شروع میں تو وہ تھوڑا پریشان ہو جاتی تھی۔ خود کو بدلنے کے بارے میں سوچتی، ممانی کے خیالات کے مطابق۔ مگر اُس کی ایسی ہر کوشش بے کار ثابت ہوتی۔ اس لئے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے ایسی کسی بھی کوشش کو عملی جامہ پہنانے کا خیال ترک کر دیا اور نتیجتاً وہ ہر اس شخص کے نزدیک جو اسے کسی بھی حوالے سے جانتا تھا، انتہائی مغرور اور خود پسند لڑکی تھی۔

گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ دستک کی زحمت سے بچ گئی۔ کچن سے کھٹر پٹر کی آوازیں آ رہی تھیں جو کہ خلافِ معمول تھا۔ کیونکہ گرمی میں ممانی کا کچن میں ہونا بالکل

ناممکن تھا۔

'ہوگا کوئی۔' اُس نے سر جھٹکا۔ صحن میں کوئی نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ سیڑھیوں پر پہلا قدم رکھتے ہی اس نے جوتے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لئے۔ تیسری منزل اُس کی منزل مقصود تھی۔ اوپر کے دونوں کمرے کسی بھٹی کی طرح تپ رہے تھے۔ امی ظہر کی نماز پڑھ کر ابھی تک جائے نماز پر ہی بیٹھی تھیں۔ سعیدہ امی کی گود میں سر رکھے جائے نماز پر ہی آڑی ہو کر لیٹی تھی، رائمہ کان سے ریڈیو لگائے کرسی پر جھول رہی تھی اور واثق آنکھوں پر بازو رکھے پلنگ پر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔

''السلام علیکم!'' اس نے مدھم آواز میں سلام کیا۔ پلنگ کے پاس پڑے میز پر فائل پھینکی۔ جوتے وہ پہلے ہی دہلیز کے پاس پھینک چکی تھی۔ چادر سر سے اُتار کر وہ رائمہ کے پاس پڑی کرسی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔ پنکھے کی گھر گھر میں فقط ردھم تھا اور اس کی کوئی خوبی ہوا جیسی قابل ذکر نہ تھی اور بقول واثق اگر اس پنکھے کا بغور مشاہدہ کیا جائے تو اس کے ہلتے ہوئے پَر گواہی دیں گے کہ وہ چل رہا ہے اور ہوا دینا اس کا کام نہیں، اس کا کام فقط چلنا ہے اور اس وقت بھی وہ یہی کام کر رہا تھا۔

''آ گئیں بٹیا! کچھ کام بنا؟'' امی کا آس بھرا سوال۔ وہ کوشش کے باوجود کوئی جواب نہ دے سکی۔ کچھ دیر خاموش رہی۔ رائمہ کے ریڈیو کی مدھم آواز اسی خاموشی کا حصہ لگ رہی تھی۔

''رائمہ! چلو اُٹھ کر بہن کے لئے کھانا گرم کرو۔'' امی کچھ دیر بعد بولیں۔

''تم ابھی تک سو رہے ہو؟'' نیہاں، واثق سے مخاطب ہوئی۔

''اگر تم اس کو سونا کہتی ہو تو تمہاری مرضی۔ ویسے میں ابھی تک سنک رہا ہوں، کسی کباب کی طرح۔'' اس نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹائے بغیر رکھائی سے جواب دیا۔

''صحیح کہا بھائی! کباب مگر چیونٹیوں بھرا۔'' رائمہ نے ریڈیو بند کیا اور دوپٹہ سنبھالتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے آپی! جوتی ٹوٹ گئی۔'' رائمہ کا لہجہ حیرت بھرا تھا۔ پہلے تو اُس کے جی میں آئی کہ ساری کتھا سنائے کہ اس جوتے کی وجہ سے وہ ابھی کتنی اذیت جھیل کر آئی ہے۔ پھر سوچا وہ جتنے چاہے رنگ بھر لے، اپنی تکلیف میں وہ ان لمحوں کی اذیت بیان نہیں کر سکے گی۔ اسی لئے چپ رہی۔ جو لمحہ گزر جائے، وہ ماضی کا حصہ بن جاتا ہے۔

''تم تھکتے نہیں سو سو کر؟'' نیہاں نے پھر پوچھا۔

''جب تھم جاتا ہوں تو پھر سو جاتا ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔

''بیٹا! وہ آج میں گئی تھی راجہ مختار کی طرف۔'' امی نے سعیدہ کو پرے ہٹاتے ہوئے جائے نماز سمیٹی اور اس کے ساتھ والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئیں۔

''کون راجہ مختار؟''

''ہمارے علاقے کا کونسلر۔ اُس کی بیوی نے دو چادروں کی کروشیے کی بیل بنوائی تھی وہ دینے گئی تھی۔ راجہ صاحب بھی موجود تھے۔ میں نے تمہاری نوکری کا ذکر کیا۔ کہنے لگے اس سے کہنا، کل میرے دفتر آ جائے۔ اُس کا کام ہو جائے گا۔'' امی پُر جوش تھیں۔

''ہاں!'' واثق ہلکے سے ہنسا۔ ''اے میری بھولی ماں! اگر یہ چوہدری اور راجوں جیسے لوگ ہم جیسوں کا کام کرنے لگیں تو پھر انہیں راجہ کون کہے گا؟ کیوں نیہاں؟'' اس نے تائید طلب نظروں سے دیکھا۔

''تم جا کر تو دیکھنا بیٹا!'' وہ ملتجی لہجے میں بولیں۔

''امی! مجھے نہیں اچھا لگتا۔ اور پھر یہ سیاسی لوگ، اللہ کی پناہ ان لوگوں سے۔ مجھے ان کا بڑا تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔'' وہ کہتی ہوئی کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''نہیں بیٹا! بڑے بھلے لوگ ہیں راجہ صاحب۔ ان کے والد نے ہمیشہ علاقے کی خدمت کی ہے، لوگوں کے کام آئے ہیں۔'' ان کا لہجہ یقین بھرا تھا۔ پتہ نہیں صبح سے اب تک انہوں نے کتنی اُمیدیں باندھ لی ہوں گی، ان کی ایک یقین دہانی سے۔

''اچھا امی! چلی جاؤں گی۔'' وہ کچھ بیزاری سے کہتی ہوئی آگے بڑھی۔

''ہاں چلی جانا۔ ہو سکتا ہے میونسپل کارپوریشن کے دفتر میں خاکروبوں کے اندراج و اخراج وغیرہ کا کام وہ تمہارے حوالے کر دیں۔ نیہاں عثمان۔ فرسٹ کلاس ماسٹر اِن اکنامکس۔'' وہ پیچھے سے ہنسا۔

''مگر تمہیں شرم نہیں آئے گی۔ بہن نوکری کے لئے دھکے کھاتی ہے اور تم پلنگ توڑتے ہو۔'' امی غصے سے بولیں۔

''کیونکہ میں دھکے کھا چکا ہوں اور کوئی مانتا نہیں تھا۔ اب پتہ چلا ہوگا نیہاں بی بی کو، کتنے آنوں کے سیر ہوتے ہیں۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔

''آپی! کھانا یہیں لے آؤں؟'' رائمہ کچن سے بولی۔

''نہیں۔ ابھی رہنے دو۔ میں پہلے نہاؤں گی۔'' وہ دوسرے کمرے میں کپڑے

نکالتے ہوئے بولی۔

''نہاؤ گی یا بوائل ہو گی؟ جراثیم سے پاک پانی پک رہا ہے۔'' واثق نے ہانک لگائی۔

''امی! نیلم کہاں ہے؟'' اس نے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر پوچھا۔

''وہ رفعت کے سسرال والوں کو آنا ہے شام کو۔ تمہاری ممانی نے بلایا ہے اسے، نیچے کچن میں ہاتھ بٹانے کو۔''

''اچھا!'' وہ چپ ہو گئی۔

''ہاتھ بٹانے کو، اونہہ!'' رائمہ اندر سے بڑبڑائی۔ نیہاں نے ایک نظر اسے دیکھا اور کپڑے اٹھا کر غسل خانے کی طرف چل پڑی۔

❖❖○❖❖

اگلا دن پھر وہی مفت کی بیگار لئے طلوع ہوا۔ پی ٹی سی ایل میں کوئی ویکنسی تھی۔ وہ وہاں انٹرویو دینے گئی۔ وہاں کا منظر حسب معمول تھا۔ بے روزگاروں سے بھرا ہال کمرہ۔ کچھ کے چہرے اُس کی طرح تھے، یاس بھرے۔ کچھ ابھی بھی تازہ دم تھے، لیکن کمرے سے نکل کر ان تازہ دم چہروں پر بھی پژمردگی کی جھلک نمایاں ہوتی۔ اس کا انٹرویو تو اچھا ہوا تھا، جیسے پہلے ہوئے تھے۔ مگر نتیجے کا اندازہ بھی اسے پہلے سے مختلف نہ لگا۔ باہر نکل کر وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اب کیا کروں؟..... گھر جاؤں؟..... اس نے خود سے سوال کیا۔ دھوپ کی شدت اب اس پر اثر نہیں کرتی تھی۔ اس کا مسئلہ دھوپ سے زیادہ شدید تھا۔ روٹی کا مسئلہ! بڑے بڑے ملکوں کے اقتصادی بحرانوں کے اسباب تو پتہ نہیں کیا ہوتے ہیں، ہاں عام آدمی کے بحران کا باعث گندم ہی ہوتا ہے۔

پہلے تو اس کا ارادہ نہیں تھا، راجہ صاحب کے پاس جانے کا، پھر سوچا کہ قریب ہی دفتر ہے، ٹرائی کرنے میں کیا حرج ہے۔ دفتر سیکنڈ فلور پر تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچی۔ گلاس ڈور سے آگے بڑا سا کمرہ تھا۔ کرسیوں اور میزوں سے بھرا، جیسے عام دفاتر کے کمرے ہوتے ہیں۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ تقریباً ساری ہی میزوں کے گرد لوگ کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ وہ دروازے کے ساتھ کرسی پر بیٹھے شخص کی طرف بڑھی۔

''السلام علیکم!'' اس نے سلام کیا اور ٹشو سے چہرہ صاف کیا۔

''وعلیکم السلام! جی فرمائیے، کس سے ملنا ہے آپ کو؟'' آدمی اسے مہذب لگا۔

''وہ، راجہ مختار صاحب سے۔''

''کوئی کام ہے ان سے آپ کو؟'' اس دفعہ اس نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ وہ سمٹ سی گئی۔

''جی، وہ میں ان کے علاقے سے آئی ہوں۔ ضروری کام ہے۔''

''نام کیا ہے آپ کا؟''

اس نے اپنا نام بتایا۔

''اچھا، آپ تشریف رکھیں۔ میں ان سے کہتا ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے اٹھا۔

وہ کرسی پر بیٹھ کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ دفتروں میں یہ وقت مصروفیت کا ہوتا ہے، اس لئے ہر کوئی مصروف تھا۔ سامنے کی رو میں ایک ٹیبل کے پیچھے فائل پر جھکے شخص پر اس کی نظر رُک گئی۔

'ارے، یہ تو فراز ہے۔' اُسے خیال گزرا۔ عین اسی وقت اس نے بھی سر اٹھا کر ادھر ہی دیکھا تو نیہاں سے نظریں مل گئیں۔ وہ شاید اسے یہاں دیکھ کر حیران ہوا تھا، تب ہی فوراً کھڑا ہو گیا اور اس کی طرف آیا۔

''ہیلو نیہاں! تم یہاں؟'' وہ اس کے قریب آ کر گویا ہوا۔

''ہاں، بس۔'' وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

''کوئی کام ہے کیا ادھر؟ اور تم ٹھیک ہو نا؟'' اس کی نظریں ٹٹولتی ہوئی تھیں۔

''ہاں، میں ٹھیک ہوں۔'' وہ کوشش کے باوجود یونیورسٹی والی رُکھائی نہیں برت سکی۔

''کیا کر رہی ہو آج کل؟'' وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کچھ نہیں۔ بس نوکری کی تلاش۔'' اس نے کچھ متردد ہو کر بتایا۔

''ادھر بھی اسی لئے آئی ہو؟''

''ہاں!''

''اچھا!'' وہ چپ ہو گیا۔

''ویسے اگر میں تمہیں مشورہ دوں کہ تم یہاں جاب نہ کرو تو؟''

''کیوں؟'' اس نے ابرو اچکائے۔

''میں جانتا ہوں، ہمارے درمیان دوستی نام کی کوئی چیز کبھی نہیں رہی، بلکہ اسے ہم کلاس فیلو شپ بھی نہیں کہہ سکتے، مگر اس کے باوجود ہم سب جانتے ہیں کہ تم ایک اچھی لڑکی ہو، اسی لئے تم سے کہہ رہا ہوں۔''

"تو کیا اچھی لڑکیاں جاب نہیں کرتیں؟" اس نے طنز سے کہا۔

"کرتی ہیں۔ مگر ہر جگہ ان کے لئے مناسب نہیں ہوتی۔ یہ تم مجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہو، جس نے یونیورسٹی لائف بھی یوں گزاری ہو، جیسے کوئی انسان مریخ یا مشتری پر زندگی گزارے، کسی اجنبی کی طرح۔"

"وہ ہمارے علاقے کے کونسلر ہیں اور یہ تو ان کا ذاتی دفتر ہے۔" اس نے لنگڑا سا جواب دیا۔

"مگر میں انہیں جانتا ہوں، اسی لئے کہہ رہا ہوں۔ اور میں تمہیں بھی جانتا ہوں۔" اس نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

"پھر؟" اُس نے سوالیہ نظروں سے فراز کو دیکھا۔

"پھر آگے تمہاری مرضی۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"آئیں بی بی! آپ کو راجہ صاحب بلا رہے ہیں۔" پہلے والے صاحب اس کے قریب آ کر بولے۔

اس نے فراز کی طرف دیکھا۔ وہ کندھے اچکا کر اپنی سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ایک لمحے کو سوچا، پھر اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس آدمی کے پیچھے چل پڑی۔ دائیں ہاتھ کی طرف کسی دوسرے کمرے کا دروازہ تھا۔ وہ اس آدمی کے پیچھے اندر داخل ہوئی۔ اندر کا ماحول خواب ناک سا تھا۔ کمرہ ایئر کنڈیشن تھا۔ میرون کلر کے پردے اور ہم رنگ قالین مالک کے شوخ مزاج کی غمازی کر رہے تھے۔ شیشے کی میز کے دوسری طرف بیٹھا شخص واقعی کوئی راجہ تھا۔ ضلع کونسلر کے ممبر اور یہ شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ۔ گندمی رنگت اور بڑی بڑی مونچھیں، اندر کو دھنستی ہوئی آنکھیں، اوپر سے بھاری بھرکم وجود پر کلف شدہ سفید لٹھے کا سوٹ۔ پاؤں میں کیا تھا، یہ وہ نہ دیکھ سکی۔ لیکن اسے اندازہ تھا کہ سلیم شاہی کھسہ تو ضرور ہوگا۔

اس نے سلام کیا۔ راجہ صاحب نے سر ہلا کر جواب دیا، ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا۔ جائزہ صرف اس نے راجہ صاحب کا نہیں لیا تھا، وہ بھی اسے بغور دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظریں اسے کسی ایکسرے مشین کی طرح لگ رہی تھیں۔ اب اسے سمجھ میں آیا کہ فراز اسے کیوں منع کر رہا تھا۔

"جی بی بی! کیا نام ہے آپ کا؟" ہاتھ میں تکلفاً پکڑا گولڈن پین انہوں نے ہولڈر میں لگایا۔

"نیہاں عثمان۔"

"اور کوالیفیکیشن؟"

اس نے اپنی فائل ان کی طرف بڑھا دی فائل کھول کر انہوں نے سرسری سی نظر اس پر دوڑائی اور بند کر دی۔

"آپ قمر صاحب کی بھانجی ہیں۔ ویسے تو ہمارے پاس کوئی ویکنسی نہیں ہے، لیکن آپ چونکہ میرے علاقے سے آئی ہیں، اس لئے آپ کو رکھ لیتے ہیں۔ آج کل میری پی اے چھٹی پر ہے۔ آپ کو ان کی جگہ رکھ لیتے ہیں۔ پھر کچھ اور سوچ لیں گے۔"

خبر تو یقیناً خوشی کی تھی، مگر اب وہ بھاگنا چاہ رہی تھی۔

"مجھے ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ وغیرہ نہیں آتی۔" اس نے عذر تراشا۔

"وہ ہم سکھا دیں گے۔" وہ دلچسپی سے اس کے بدلتے رنگ کو دیکھ رہے تھے۔ "مگر اس کے لئے ہماری ایک شرط ہوگی۔" انہوں نے فائل میز کے درمیان میں رکھ دی۔

"وہ کیا؟"

"آپ کو اپنے اوریجنل ڈاکومینٹس ہمارے پاس جمع کروانے ہوں گے۔"

"جی؟" وہ حقیقتاً پریشان ہوگئی۔

"دیکھیں نا، ہم آپ پر محنت کریں، آپ کو کام سکھائیں۔ آپ کو کوئی اور اچھی جاب مل جائے تو آپ آرام سے چھوڑ کر چل پڑیں۔"

"مگر یہ تو بلیک میلنگ ہوگی۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"مجبوری ہے۔ آج کل نوکریاں مل کہاں رہی ہیں؟ آپ کو تو شکر کرنا چاہئے۔"

مگر اُسے یہ شکر ہضم ہونا مشکل لگ رہا تھا۔ کمرے میں اگرچہ ٹھنڈک تھی، مگر اسے یکایک گھٹن کا احساس ہونے لگا۔

"اور وہ ڈاکومینٹس آپ کب تک اپنے پاس رکھیں گے؟"

"اصل میں آپ کو ایک بانڈ بھرنا پڑے گا، پھر جتنی اس بانڈ کی میعاد ہوگی، اس وقت تک کاغذات ہمارے پاس رہیں گے۔"

"سوری سر! مجھے یہ جاب منظور نہیں۔" وہ فائل اٹھا کر جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔

"آپ کے فائدے کی بات ہے۔ تنخواہ بھی آپ کی توقع سے زیادہ ہوگی۔" وہ اسے دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"سوری اگین، خدا حافظ۔" وہ کہتے ہوئے تیزی سے باہر نکل آئی۔ فراز دروازے

کے سامنے ہی اپنی کرسی پر بیٹھا اسی طرف نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔

'دیکھا، میں نے کہا تھا نا؟' اُس کی بولتی نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

❖❖❖○❖❖❖

''نیہاں! اُٹھ کر نماز پڑھ لو، وقت تنگ ہو رہا ہے۔''

اگلی صبح امی کی آواز پر اس کی آنکھ کھلی۔ آسمان پر پھیلا سرمئی اندھیرا ہلکی ہلکی روشنی میں بدل رہا تھا۔ ٹمٹماتے ہوئے ستارے اپنی تھکن کا اظہار کرتے ہوئے روشنی میں گم ہو رہے تھے۔ وہ جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی۔ نیلم جائے نماز پر بیٹھی تسبیح کر رہی تھی۔

امی نے اپنے سامنے تکیے پر کلامِ پاک رکھا ہوا تھا۔ اسے اُٹھتے دیکھا تو جیسے ان کی تسلی ہو گئی، وہ قرآن پاک کھول کر پڑھنے لگیں۔ ان کی ساتھ والی چارپائی پر رائمہ اور سعیہ سو رہی تھیں اور امی کے بستر کے دوسری طرف واثق بے خبر سو رہا تھا۔ اسے کبھی کبھی حیرت ہوتی کہ وہ آخر کیسے دن رات اتنا سو لیتا ہے۔

اس نے اُٹھ کر وضو کیا، نماز پڑھی اور قرآن مجید کھول کر بیٹھ گئی۔ اسے شروع ہی سے قرآن کو با ترجمہ پڑھنے کی عادت تھی۔ آج بھی پڑھتے ہوئے جب وہ سورۃ البقرہ کے آخری رکوع پر پہنچی تو اُس کی انگلی اس آیت پر جیسے ٹھہر سی گئی۔

''اللہ کسی کو اس کی برداشت سے بڑھ کر نہیں آزماتا۔''

اسے لگا کہ یہ آیت ابھی ابھی آسمان سے اس کے لئے اتری ہے۔ اگرچہ پہلے بھی اس نے بارہا اسے پڑھا تھا، مگر آج کے احساسات بالکل نئے تھے۔ اس میں برداشت ہے تو اللہ اسے آزما رہا ہے اور وہ یقیناً اپنے بندوں سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔ ہم دکھی ہوتے ہیں تو کیا وہ خوش ہوتا ہے؟ یقیناً نہیں۔ وہ ہماری ضرورتوں سے ہم سے زیادہ آگاہ ہے۔ جو پتھر کے نیچے کیڑے کو بھی رزق فراہم کرتا ہے تو کیا ہمیں بھول سکتا ہے؟ یقیناً نہیں۔ وہ سوچتی چلی گئی۔ جب وہ سوچنے کو ہے تو مجھے فکر کی کیا ضرورت ہے؟ محنت کی، سعی کی ضرورت ہے اور اس میں، میں نے کبھی کمی نہیں کی تو وہ ضرور میری مدد کرے گا۔ خود کو اس یقین دہانی سے جیسے تازہ دم ہو اُٹھی۔ اس کے دل کو یقین ہو گیا کہ آج ضرور کچھ نہ کچھ ہو گا جو اس کے حق میں بہت اچھا ہو گا۔

سورج نکل آیا تھا، مگر ابھی تک ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی، جس کی وجہ سے خوشگواریت کا احساس ہو رہا تھا۔ سب اُٹھ کر اندر کمروں میں چلے گئے تھے۔ صرف واثق اپنے بستر

پر پڑا مکھیوں سے جنگ لڑ رہا تھا۔ اس کی چارپائی پر سب سے آخر میں دھوپ آتی تھی۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی، قرآن مجید کو اندر الماری میں رکھا اور کچن میں آ گئی۔ نیلم ناشتے کی تیاری کر رہی تھی۔

''تمہارے ایگزامز کب تک ہیں؟'' اس نے چولہا جلاتے ہوئے برتن دھوتی نیلم سے پوچھا۔

''جون کے اینڈ میں۔'' اس نے مڑے بغیر جواب دیا۔

''پھر تو تمہیں زیادہ پڑھنا چاہئے۔ ابھی پڑھ لیتیں، دن میں تو اس قدر گرمی ہوتی ہے۔'' اس نے دودھ کی پتیلی چولہے پر رکھی۔

''ابھی کام ختم کر کے پڑھ لوں گی۔'' اس نے اسی مصروفیت سے جواب دیا۔

''رضا بھائی کے سسرال والے کس لئے آئے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''یوں ہی۔ ویسے شاید وہ شادی کا کہنے آئے تھے۔ ممانی نے کہہ دیا کہ اتنی گرمی میں تو اپنے گھر والے زہر لگتے ہیں۔ میں ابھی شادی کا کھڑاگ نہیں کھڑا کر سکتی۔'' وہ برتن دھو کر کھڑی ہو گئی۔

''صحیح کہتی ہیں وہ۔ ان سے تو اُٹھنا بیٹھنا دشوار ہو رہا ہے موٹاپے کی وجہ سے، شادی تو بہت بڑی حرکت ہے ان کے لئے۔'' رائمہ اندر آتے ہوئے بولی۔ اس نے شاید نیلم کی بات سن لی تھی۔

''بری بات۔ بڑوں کو یوں نہیں کہتے۔'' نیلم نے ٹوکا۔

''وہ بڑی نہیں۔ بہت بڑی ہیں۔ اور پتہ ہے، وہ رات ماموں سے کیا کہہ رہی تھیں؟'' اس نے کولر سے پانی کا گلاس بھرا اور ایک ہی سانس میں چڑھا گئی۔

''بیٹھ کر پیا کرو۔'' نیلم نے عادتاً اسے ٹوکا جس کا اس پر کبھی اثر نہیں ہوا تھا۔

''وہ کہہ رہی تھیں کہ اوپر والا پورشن خالی کرائیں۔ یہ والی بہو ان کی لکھ پتی گھرانے سے آ رہی ہے۔ دوسری منزل میں اس کا سامان نہیں سمائے گا۔ وہ تو شاید خود بھی اس گھر میں نہ سمائے۔ کیوں آپی؟'' اس نے نیہاں کی طرف دیکھا۔

''نیچے پورشن میں ممانی کسی کی شراکت برداشت نہیں کر سکتیں۔ ماموں کو پتہ نہیں کیسے سہہ جاتی ہیں۔ دوسرے پورشن کے دو کمروں میں نثار بھائی اور ان کی بیگم قابض ہیں۔ باقی ایک کمرے میں تو مشکل سے نئی دُلہن کا بیڈ اور ڈریسنگ آئے گا۔ باقی سامان کے لئے اوپر کا پورشن خالی کرانا ناگزیر ہے۔ بڑی اچھی پلاننگ سوچی ہے ممانی نے ہمیں

نکالنے کے لئے۔"

پتہ نہیں یہ رائمہ کا اپنا اندازہ تھا، یا واقعی ممانی ایسا ٹھان چکی تھیں۔ اگر ایسا ہوا تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ ماموں تو ممانی کے آگے چوں نہیں کر سکتے، ہمارے لئے کیسے ان کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ نیہاں پریشان ہو گئی۔

"کیا بات ہے؟ تم لوگوں نے ناشتہ نہیں بنایا ابھی تک؟" امی کی آواز آئی۔

"پہلے سارے زمانے کی چغلیاں تو کر لیں، پھر بن جائے گا ناشتہ بھی۔" واثق شاید امی کے قریب ہی بیٹھا تھا۔

وہ جب تیار ہو کر نیچے اُتر رہی تھی تو عادل اوپر آ رہا تھا۔

"سلام آپی! کیا حال ہے آپ کا؟" اس نے مسکراتے ہوئے سلام کیا۔

"ٹھیک ہوں، تم آج یونیورسٹی نہیں گئے؟" اس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

"میں جا ہی رہا تھا۔ امی کہنے لگیں، پھپھو سے کہو نیچے آ کر میری ایک ضروری بات سن لیں۔ بس وہی کہنے آیا ہوں۔" وہ کہتے ہوئے اوپر چڑھ گیا۔

"ضروری بات؟" اس کا ماتھا ٹھنک گیا۔ ضروری تو کیا، غیر ضروری بات کے لئے بھی ممانی اپنی اس بے آسرا نند کو منہ لگانا گوارا نہیں کرتی تھیں۔ کہیں رائمہ والی بات ہی نہ ہو۔ وہ سوچتے ہوئے نیچے اُترنے لگی۔

بارہ بجے کے قریب پھر وہ اسٹاپ پر کھڑی ویگن کا انتظار کر رہی تھی۔ آج جہاں اس نے انٹرویو دیا تھا، پرائیویٹ فرم تھی۔ انہوں نے یہ کہہ کر ریجیکٹ کر دیا۔ "آپ ہمارے میرٹ کی ایک شق کو پورا کرتی ہیں، مگر ہمارے ادارے کا ٹوٹل کام کمپیوٹر پر ڈپینڈ کرتا ہے۔ اگر آپ نے بی ایس سی یا کم از کم کمپیوٹر کا کوئی بھی شارٹ کورس کیا ہوتا تو یقیناً ہم آپ کو ترجیح دیتے۔"

وہ خون کے گھونٹ پی کر اُٹھ آئی۔ صبح سے ویٹنگ روم میں بیٹھے بیٹھے اکڑ گئی تھی۔ انہوں نے آرام سے کورا جواب دے دیا۔

'آخر کب تک.....؟' اُس کی برداشت کی حد ختم ہونے لگی۔ صبح جس اُمید نو سے اس نے دن کا آغاز کیا تھا، وہ پھر سے نا اُمیدی کے اندھیروں میں ڈوبنے لگی تھی۔ 'آخر میں ہی کیوں؟ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ واثق کو کیوں خیال نہیں آتا؟ اور میرے یوں خوار ہونے سے کون سے مسئلے حل ہو رہے ہیں؟ بجائے کوئی سرا ہاتھ آنے

کے اُلجھنیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ میری ڈگری، میری محنت سب بیکار ہے۔ کسی چھوٹے سے انگلش میڈیم سکول میں نوکری کر لوں۔ جہاں مزدوری کولہو کے بیل جیسی اور تنخواہ چند سو۔ اور کیا میں نے اسی دن کے لئے اتنی محنت کی تھی؟ فرسٹ ڈویژن لی تھی؟ میں نے سوچا کہ جس ادارے کے سامنے اپنی ڈگری لے کر جاؤں گی، وہ میری خدمات کسی اعزاز کی طرح قبول کرے گا۔' دھوپ اُس کی آنکھوں میں چبھنے لگی۔

اگر دربدری بھی مل گئی تو کیا ہو گا؟ ابھی تو کچھ ماموں چھپ چھپا کر مدد کر دیتے ہیں اور کچھ نیلم کی ٹیوشنز سے دال روٹی چل رہی ہے۔ اگر چھت بھی نہ رہی تو کیا کریں گے؟ اور کیا میں نے ان ہی دکھوں کے لئے ماحول سے، اپنے خاندان اور روایات سے بغاوت کی تھی، جہاں آج بھی عورت کا گھر سے نکلنا اتنا ہی معیوب سمجھا جاتا ہے، جتنا آج سے سو سال پہلے۔ اسی لئے تو امی نے ماموں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے باہر نکلنے کو ترجیح دی۔

اُس کا سر درد سے پھٹنے لگا۔ دو ایک ویگنیں گزریں، مگر وہ اُس کے روٹ کی نہ تھیں۔ اُس کے قریب سے وائٹ کرولا گزری۔ ذرا آگے جا کر رُک گئی اور پھر ریورس ہو کر اس کے پاس آ کر ٹھہر گئی۔

"ہیلو نیہاں عثمان!" ایمن وقار کا فریش چہرہ شیشے سے باہر نکلا۔ دھوپ کی شدت سے ہر چیز اجنبی لگ رہی تھی، اسے پہچاننے میں کچھ وقت لگا۔

ایمن نے سن گلاسز اتار کر ہاتھ میں پکڑے۔

"کہاں گم ہو بھئی؟" اس نے بے تکلفی سے پکارا۔

"بس تم سناؤ۔" اس نے بھیگے ہوئے ٹشو سے چہرہ خشک کرنے کی کوشش کی۔

"آؤ بیٹھو۔ کہاں جانا ہے؟ میں چھوڑ دیتی ہوں۔"

"نہیں شکریہ۔" وہ تکلف سے بولی۔

"اُفوہ! یہ تمہاری عادت ذرا نہیں بدلی۔ وہی پُرتکلف انداز۔ آؤ بیٹھو۔" اس نے فرنٹ ڈور کھولا۔ وہ کچھ متذبذب سی کھڑی رہی۔ ایمن کے مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھا اور پھر ایک گہری سانس لے کر بیٹھ گئی۔

"کہاں جانا ہے تمہیں؟" اس نے اسپیڈ بڑھائی۔

"گھر ہی جانا ہے۔" اس کا لہجہ اس کی اندرونی تھکن کا مظہر تھا۔

"کہیں انٹرویو وغیرہ دینے گئی تھیں؟" اس نے نیہاں کی گود میں پڑی فائل دیکھ کر

پوچھا۔

''ہاں!'' وہ شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ پھر نہ ایمن نے کچھ پوچھا نہ اس نے۔ اور دونوں کے درمیان کبھی کوئی ایسا معاملہ بھی تو نہیں رہا تھا جس کے بارے میں بات کی جا سکتی۔ کافی دیر بعد اسے خیال آیا تو اس نے دیکھا کہ گاڑی تو اجنبی رستوں پر دوڑ رہی ہے۔

''یہ کہاں جا رہی ہو تم؟''

''گھر۔'' اس نے زور دے کر کہا۔

''مگر میرا راستہ تو مختلف ہے۔''

''ہو سکتا ہے، مگر میرے گھر کا راستہ یہی ہے۔ بلکہ یہ گھر آ گیا۔'' اس نے ہلکی سی بریک لگائی۔ گاڑی بوگن ویلیا سے ڈھکے وائٹ گیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔

''مگر.....''

''چھوڑو۔ اتنے عرصے بعد ملی ہیں، کچھ دیر بیٹھیں گے۔ پھر میں تمہیں چھوڑ آؤں گی۔ ڈونٹ وری۔''

اس نے زور سے ہارن دیتے ہوئے کہا۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ وہ گاڑی اندر لے گئی۔ وہ نیچے اُتر گئی مگر نیہاں یونہی بیٹھی رہی۔ ایمن نے اُس کی طرف کا دروازہ کھولا۔

''پلیز!'' اس نے مسکرا کر کہا تو اسے مجبوراً اُترنا پڑا۔

''یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔'' وہ جھجک کر بولی۔

''تمہارے نزدیک ہو گی، میرے نزدیک یہ کوئی بری بات نہیں۔ آؤ اب چلیں۔ یہاں تو بڑی گرمی لگ رہی ہے۔'' ایئر کنڈیشنڈ گاڑی سے نکلتے ہی اسے گرمی لگنے لگی تھی۔ وہ اندر کی طرف بڑھی۔ نیہاں کو بھی اس کی پیروی کرنا پڑی۔

''ہاں، اب بیٹھو۔ آرام سے بات کرتے ہیں۔ بلکہ تم بیٹھو میں کچھ پینے کے لئے منگواتی ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

یہ کمرہ شاید ایمن کا تھا۔ بلکہ اسی کا تھا۔ سامنے ریک میں اُس کی فریم شدہ جمبو سائز تصویر رکھی تھی۔ کمرے کی سیٹنگ بہت باذوق انداز میں کی گئی تھی۔ بے بی پنک کلر کے پردے اور ان ہی کی ہم رنگ بیڈ شیٹ۔ قالین کا رنگ البتہ کچھ تیز تھا۔ وہ بیڈ کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''اوہو! میں اے سی آن کرنا تو بھول ہی گئی۔'' وہ اندر آتے ہوئے بولی۔ اے سی آن کر کے وہ اس کے پاس پڑی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔

''ہاں اب بتاؤ، کیا حال چال ہے؟ کیا مصروفیت وغیرہ ہے؟ کہیں جاب کر رہی ہو؟''

ایمن خوب صورت تو پہلے بھی بہت تھی، مگر اب تو اور بھی نکھر گئی تھی۔ اس کے انداز، اس کی ذہنی آسودگی اور بے فکری کو ظاہر کر رہے تھے۔ فکرمند، پژمردہ اور بد دل تو وہ پہلے بھی کبھی نہ تھی، اس کے چہرے کی دلکشی کا راز اُس کی ہمہ وقت جگمگاتی مسکراہٹ تھی جو کسی خاص شخص کے لئے مخصوص نہ تھی۔ وہ اس سے یونہی خوش دلی سے مسکراتے ہوئے ہیلو کرتی تھی۔ اس مسکراہٹ نے شروع شروع میں لوگوں میں کافی خوش فہمیاں پیدا کی تھیں۔ وہ سب کی دوست تھی۔ وہ سب سے ایک رویہ رکھتی تھی، جیسے مظاہرِ فطرت سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتے ہیں۔ جس طرح بادل، ہوائیں، سورج کسی کے لئے مخصوص نہیں ہوتے، اسی طرح ایمن کی مسکراہٹ کسی ایک کے لئے نہیں تھی۔ وہ سب سے ہنس کر ملا کرتی تھی۔ یہی حال نیہاں کا تھا۔ وہ سب سے رکھائی سے پیش آتی تھی۔ اس کا کوئی بھی دوست نہ تھا۔ نہ لڑکوں میں، نہ لڑکیوں میں۔ اُس کا رویہ اتنا خشک ہوتا کہ کوئی اس کے قریب آنے کی کوشش ہی نہ کرتا۔ وہ اپنے ماحول سے بغاوت کر کے یونیورسٹی آئی تھی۔ ممانی کا خیال تھا کہ لڑکیوں کو میٹرک سے آگے نہیں پڑھنا چاہئے، ان کے دماغ خراب ہو جاتے ہیں اور ماموں نے کبھی زندگی میں ممانی کی رائے سے اختلاف نہیں کیا تھا اور امی، ماموں کی دست نگر، کبھی خواب میں بھی ان سے مختلف رائے نہیں رکھ سکتی تھیں۔ چچا تایا کوئی تھے نہیں۔ یوں اس کا خاندان ماموں سے شروع ہو کر ماموں ہی پر ختم ہو جاتا۔ اسپئیر پارٹس کا بزنس کرتے کرتے وہ انسانوں کو بھی اسپئیر پارٹس ہی تصور کرنے لگے تھے۔

گریجویشن تو اس نے جیسے تیسے کر لی مگر یونیورسٹی میں داخلے کی خواہش پر ایک طوفان اُمڈ آیا تھا لیکن وہ اپنی ضد پر اڑ گئی تھی۔ امی کی منتیں، ان کے ڈراوے، اگر وہ یونیورسٹی چلی جائے گی تو زمین اپنے محور کے گرد گھومنے کے بجائے شاید یونیورسٹی کے گرد گھومنا شروع کر دے یا اس کے یونیورسٹی جانے سے ان کا خاندان پورے ملک کی نظروں میں آ جائے گا۔ کسی اعزاز کے طور پر نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے اور ممانی کی ناک جو اس کی شرمناک حرکات کی وجہ

سے خاندان میں پہلے ہی بہت دفعہ کٹ چکی ہے، ایک بار پھر سے کٹ جائے گی۔ اور اس نے جب تصور میں سوچا کہ ممانی ناک کے بغیر کیسی لگیں گی تو وہ دل ہی دل میں کتنی دیر تک ہنستی رہی تھی۔ اسی وجہ سے یونیورسٹی میں اس نے کسی کو اپنے قریب نہ آنے دیا۔

وہ بہت سے کامپلکسز کا شکار تھی۔ پسماندہ علاقہ، پسماندہ بیک گراؤنڈ اور بہت سے خدشوں نے مل کر اسے کمزور بنا دیا تھا۔ اور کمزور انسان یا تو دب جاتا ہے یا اکڑ جاتا ہے۔ اور وہ دوسری قسم کے انسانوں میں سے تھی جو اکڑ جاتے ہیں۔

''کدھر ہو بھئی؟'' ایمن نے اس کی آنکھوں کے آگے اپنی خوب صورت مخروطی انگلیوں والا ہاتھ لہرایا تو وہ گہرا سانس لے کر، اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''میں کیا پوچھ رہی ہوں؟'' ایمن مسکرائی۔

''کیا؟''

''یہی کہ کہیں جاب وغیرہ کر رہی ہو؟''

''نہیں۔ جاب ملے گی تو کروں گی نا۔'' اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکایا۔

''یعنی اتنے عرصے سے تم فارغ ہو بالکل۔ کہیں جاب نہیں کی؟'' ایمن نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

''بس کوئی خاص نہیں۔ ایک ہفت روزہ میں پندرہ دن نہیں، چودہ دن جاب کی تھی۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''چودہ دن..... کیا مطلب؟''

''بھئی اس ہفت روزہ کے ایڈیٹر نے ایک سلسلہ شروع کیا تھا، جس میں ہمارے ملک کے مشہور و معروف سیاست دانوں کی زندگی کے سات دنوں کا ایک سروے پیش کرنا ہوتا تھا۔ انہوں نے میرے ذمے یہ کام لگایا۔ اور جب آٹھویں دن میں نے ایک اسمبلی ممبر صاحب کا ہفت روزہ مصروفیات کا خاکہ پیش کیا تو ایڈیٹر صاحب ناراض ہو گئے۔ چونکہ وقت کم تھا اور پرچہ پریس میں جانے کے لئے تیار تھا، اس لئے انہوں نے کچھ تبدیلیاں کیں اور سروے شائع ہو گیا۔ پھر جو اُن ایڈیٹر صاحب کی شامت آئی کہ اگلی سروے رپورٹ دیکھتے ہی انہوں نے مجھے دو ہفتوں کی سیلری ہاتھ میں تھمائی اور چھٹی کر دی بس۔''

''پھر اس کے بعد؟''

''پھر اس کے بعد دھکے۔'' وہ تلخی سے ہنسی۔

''ہوں!'' ایمن نے اسے ذرا غور سے دیکھ کر ہولے سے کہا اور چپ ہوگئی۔

''اور یہ دھکے یوں بھی ضروری ہیں کہ جاب میری ضرورت ہی نہیں، اشد ضرورت ہے۔'' ایمن اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''اور تم سناؤ، کیا کر رہی ہو آج کل؟'' اس نے موضوع بدلا۔

''سمن آباد کالج میں فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر کی کلاسز کو پڑھا رہی ہوں اور ایم فل کے لئے تھیسز تیار کر رہی ہوں اور بس۔''

''یہ بس تو نہیں، یہ تو بہت کچھ ہے۔ کم از کم مصروف تو ہونا۔'' نیہاں بولی۔

''ہاں یہ تو ہے۔ تم آج کہاں گئی تھیں انٹرویو دینے؟''

''ایک پرائیویٹ فرم میں۔ اتنے لوگ تھے وہاں کہ بس اور سیٹ ایک۔ کتنا بڑا مذاق ہے یہ۔'' اس نے گہری سانس لی۔

''جاب ایسے کہاں ملتی ہے، محض ڈگریوں اور قابلیت کی بنا پر۔'' ایمن کچھ دیر بعد بولی۔

''تو پھر اتنا عرصہ ان کے حصول کے لئے ہم یونہی خوار ہوتے ہیں، فیسیں بھرتے ہیں؟ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں آدھے آدھے دن کی بیگار کرتے ہیں، کس لئے؟ اگر نوکری ان کاغذی پلندوں کی بنیاد پر نہیں ملتی۔'' وہ سلگی۔

''خیر یہ سب بیکار تو نہیں۔ ان کے بغیر بھی جاب ممکن نہیں۔ لیکن یہاں کچھ ایسے رجحان فروغ پا گئے ہیں کہ اچھی جاب کے حصول کے لئے کچھ ناجائز ذرائع کو لوازمات میں شامل کر لیا گیا ہے۔ خیر تم اپنے ڈاکومینٹس کی فوٹو کاپی مجھے دے جاؤ۔ میں بابا سے بات کروں گی اور میرے خیال میں یہ سفارش یا ناجائز طریقہ نہیں ہوگا کیونکہ حق دار کو اس کا حق دلانا کسی طرح بھی سفارش کے زمرے میں نہیں آتا۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی فائل ٹیبل سے اٹھالی اور کھول کر پڑھنے لگی۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔

''یس!''

اس کے جواب پر ملازمہ ٹرالی گھسیٹتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ ٹرالی کولڈ ڈرنکس اور اسنیکس سے بھری تھی۔

''تم جاؤ، ہم خود لے لیں گے۔'' ایمن نے ملازمہ کو اشارہ کیا تو وہ سر ہلا کر باہر نکل گئی۔

"چلو پہلے یہ کولڈ ڈرنک لو، پھر دیکھتے ہیں تمہارے مسئلے کو۔" اس نے کولڈ ڈرنک کا گلاس نیہاں کی طرف بڑھایا۔ اس نے خاموشی سے گلاس تھام لیا۔

❖❖○❖❖

"آج تمہاری ممانی نے بلایا تھا نیچے مجھے۔"

رات جب وہ سونے کے لئے چھت پر امی کے برابر لیٹی تو انہوں نے ذرا مدھم آواز میں اس سے کہا تو وہ چونک اُٹھی۔

تھوڑا تھوڑا سمجھ تو وہ دوپہر کو ہی گئی تھی۔ جب وہ واپس آئی تو امی کے اُترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اسے کچھ اندازہ ہو چلا تھا کہ وہ نیچے ممانی کے پاس ضرور گئی ہوں گی۔ وہ اُن کے بولنے کی منتظر تھی۔ رات تک ویسے ہی گم صم رہیں اور اب جیسے وہ سونے کے لئے لیٹی، انہوں نے بات شروع کر دی۔

"کیوں بلوایا تھا انہوں نے؟" اس نے تاریک آسمان پر خوب روشن روشن ستاروں پر نظریں جما کر پوچھا۔

"رضا کی شادی ہے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد۔ ابھی تاریخ نہیں رکھی، مگر بات کل شام کو طے ہو گئی ہے۔ اوپر والا پورشن خالی کرنے کو کہہ رہی تھیں کہ جتنے سال مجبوری کے تھے سو انہوں نے بڑا سہارا دیا ورنہ آج کل کے زمانے میں کون پورے پورے کنبے کو پناہ دیتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ نرم دل تھیں، اس لئے۔" امی نے ٹھنڈا سانس لیا۔

"لیکن اب تو واثق جوان ہے۔ ہاتھ پیر ہلا سکتا ہے۔ اور نیہاں بھی بہتیری کوششوں میں لگی ہوئی ہے، کچھ نہ کچھ کر ہی لے گی۔ بہر حال، اب وقت آ گیا ہے کہ آپ لوگ اپنا انتظام کر لیں۔ آٹھ نو سال بہت ہوتے ہیں مروّت برتنے کے لئے۔" وہ ممانی کے الفاظ دہرا رہی تھیں اور اس کی تو جیسے سماعتیں ہی بیکار ہو گئی تھیں۔

"اگلے ہفتے انہیں اوپر نیچے کے دونوں پورشنز میں کچھ کام کروانا ہے۔ اس لئے اگر ہم لوگ اگلے ہفتے تک انتظام کر لیں تو زیادہ بہتر ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں۔" اس نے بے ساختہ حیرت سے امی کو دیکھا، وہ بھی اس کو دیکھ رہی تھیں۔

"یہ تو زیادتی ہے امی! آخر ایک ہفتے میں ہم کہاں سے انتظام کر سکتے ہیں؟ آپ نے کہا نہیں؟" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کہا تھا۔ کہنے لگیں، آپ کو پہلے سے پتہ تو تھا کہ میں نے سال بھر سے رضا کی منگنی کر رکھی ہے، اور میں نے کہہ رکھا تھا کہ اس کو میں اوپر ہی سیٹ کروں گی تو آپ

لوگوں کو اس دوران سوچنا چاہئے تھا۔ اب میں کتنا لڑکی والوں کو لٹکاؤں رشتہ داریاں نبھانے کے چکر میں۔ بس آپا! بہت ہو گئی میرا اتنا کہنا ہی کافی ہونا چاہئے آپ کے لئے۔ انہوں نے بے مروّتی کی انتہا کر دی تو پھر میں آگے کیا کہتی؟" وہ بے بسی سے بولیں۔

"اور ماموں؟ وہ کیا کہہ رہے تھے؟" وہ جانتی بھی تھی کہ ماموں کیا کہہ رہے ہوں گے پھر بھی دل کی تسلی کے لئے پوچھ بیٹھی۔

"قمر تو صبح گھر پر ہی نہیں تھا۔ میں کتنی دیر بیٹھی رہی تو تمہاری ممانی بولیں کہ وہ تو آج صبح ہی سیالکوٹ چلے گئے ہیں کام کے سلسلے میں۔ دو تین دنوں کے بعد آئیں گے۔ اور میں نے جو کچھ کہا ہے، ان کے مشورے ہی سے کہا تھا۔ میں پھر اُٹھ کر اوپر آ گئی۔" امی کی آواز بھرا گئی۔

"ٹھیک کہتی ہیں وہ بھی۔ آخر کوئی کب تک کسی کو پناہ دے سکتا ہے؟ لیکن اتنی جلدی ہم کہاں انتظام کر سکتے ہیں؟ ایک دو ماہ ہوتے تو کوئی بات بھی تھی۔" وہ حقیقتاً پریشان ہو گئی تھی۔

"کہا تھا میں نے بہت۔ پر انہوں نے میری ایک نہ سنی۔" وہ اب باقاعدہ رونے لگیں۔

"امی پلیز! آپ خود کو سنبھالیں۔ اللہ مالک ہے۔" وہ اُٹھ کر ان کے بستر پر آ بیٹھی۔ "ہو جائے گا کچھ نہ کچھ۔ واثق کو بتایا آپ نے؟"

"ہاں بتایا تھا۔ کہنے لگا، ممانی نے کافی دیر کر دی۔ ورنہ انہیں تو یہ سب نثار بھائی کی شادی پر ہی کہہ دینا چاہئے تھا۔ نیہاں! وہ بالکل بے حس ہو چکا ہے۔ ایک ہی بیٹا اور وہ بھی اس درجہ لاپروا اور نکھٹو۔ میرا تو جیتے جی اس کے ہاتھوں مرن ہو چلا ہے۔" وہ آنسو پونچھتے پونچھتے پھر رونے لگیں۔

"ہوں!" اُسے واثق سے یہی اُمید تھی۔ "اچھا، آپ تو حوصلہ کریں۔ کیا ہوا؟ اس دنیا میں صرف یہی گھر تو نہیں ہے۔ خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔ کہیں نہ کہیں تو ہمارے نصیب کی زمین بھی ہو گی۔ آپ اس پر بھروسہ رکھیں۔ صبح دیکھیں گے۔ اب آپ سو جائیں ورنہ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔" اس نے محبت سے ان کے آنسو صاف کرتے ہوئے انہیں دلاسا دیا۔

"میری بچی! کہاں سے حوصلہ کروں؟ پہلے ہی زندگی کون سا سکون سے گزر رہی تھی

جواب یہ افتاد آن پڑی ہے۔ ساری مصیبتیں خدا نے ہمارے لئے لکھ دی ہیں۔ میں نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے؟" وہ تلخی سے بولیں۔ بہت سالوں سے آسودگی اور طمانیت کی صورت تو اس نے بھی نہیں دیکھی تھی، مگر اس طرح بات بات پر خدا سے خفا ہو جانا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ امی کی اس شکوہ کناں طبیعت نے آٹھ نو سال پہلے انہیں ان حالات سے دوچار کیا تھا۔ شاید وہ اسی ناشکرے پن کی سزا ابھی تک جھیل رہی تھیں۔

"امی پلیز! حوصلہ کریں۔ کچھ نہیں ہوتا۔ آزمائشیں انسانوں کے لئے ہی ہوتی ہے۔ وقت کب ٹھہرا ہے؟ یہ دن بھی گزر جائیں گے۔" اس نے انہیں چمکارا۔

"تمہاری یہی خوش فہمیاں ہیں۔ کچھ دن مشکل کے، مجھے تو لگتا ہے ساری زندگی ان ہی کچھ دنوں پر محیط ہے۔ پھر ان کے گزرنے کی آس کیسے لگاؤں؟"

"اچھا تو اس طرح رونے دھونے سے، شکوے شکایتیں کرنے سے کیا یہ دن ٹل جائیں گے یا مشکل ختم ہو جائے گی؟ ہونا تو وہی ہے جو لکھا ہے۔ اگر ہم خاموشی سے، حوصلے سے، صبر سے یہ وقت گزاریں تو کم از کم یہ فرسٹریشن تو نہیں ہو گی۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتیں؟ دنیا میں لاکھوں لوگ ہم سے بھی بدتر حالات میں زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ بھی تو جی رہے ہیں۔ ہو جائے گا کچھ نہ کچھ۔ آپ دعا کریں بس۔"

"دعائیں..... اب تو دعائیں بھی لگتا ہے بے اثر ہو گئی ہیں۔ تین سالوں سے ڈھیٹ لڑکا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے۔ سال بھر سے تم دھکے کھا رہی ہو۔ نہ نوکری ملتی ہے نہ کوئی راستہ ملتا ہے۔ پھر دعاؤں پر کیا یقین رکھیں؟" وہ کسی طرح بھی بہل نہیں رہی تھی۔

"ہم ایسا کریں گے، اسی علاقے میں کوئی ایک دو کمروں کا گھر دیکھ لیتے ہیں کرائے پر۔ بینک میں جو پیسے پڑے ہیں۔ فی الحال ان سے کام چلا لیتے ہیں۔ اس دوران اللہ نے چاہا تو کوئی نہ کوئی انتظام ہو ہی جائے گا۔"

"ہاں بینک میں جو چند ہزار رکھے ہیں، وہ اب ادھر نکل گئے تو جو یہ چار سلیں دھری ہیں میرے سینے پر وہ کیسے اُتریں گی؟ سوچا تھا، کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر تمہارے یا نیلم کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں گی مگر یہاں اور ہی سلسلے نکل آئے ہیں۔" پہلی باتوں کی طرح انہیں اس کی یہ بات بھی پسند نہیں آئی تھی۔

"ان چند ہزار سے بھلا آپ کیا کر سکیں گی؟ چھوڑیں ان باتوں کو۔ میرے خیال میں یہ پیسے اتنے عرصے سے پڑے ہی اسی مقصد کے لئے تھے اور ان کا مصرف اس سے

زیادہ مناسب نہیں ہو سکتا۔ صبح آپ واثق کو لے کر، وہ قمر ماموں کے دوست نہیں ہیں پراپرٹی ڈیلر اکبر، ان کے پاس جائیں۔ آج کل ان ڈیلرز کی بدولت یہ کون سا مشکل کام ہے۔ پھر بعد کی بعد میں دیکھیں گے۔ اب آپ آرام سے سو جائیں۔" اس نے ہاتھ پکڑ کر انہیں منانا چاہا۔

"ظاہر ہے، اب یہی کچھ کرنا پڑے گا۔ واہ رے نصیب۔ کوئی نہیں ہوتا دنیا میں۔ نہ بہن نہ بھائی۔ مشکل وقت کا کوئی ساتھی نہیں ہوتا۔" وہ آہ بھرتے ہوئے لیٹ گئیں تو وہ بھی آہستہ سے اُتر کر اپنے بستر پر آ گئی۔

امی کو تو اس نے دلاسا دے دیا، مگر اب خود کو بہلانا تھا۔ سیاہ رات میں سے روشن دن ڈھونڈنا کوئی آسان کام ہے؟ پُر اُمید دل اس دنیا کا سب سے دولت مند دل ہوتا ہے۔ اور اس کی فطرت کا پلس پوائنٹ یہی دولت مند دل تھا۔ اچھی امید کو سوچتے سوچتے اُسے نیند آنے لگی۔

❖❖○❖❖

پھر صبح ہوتے ہی ناشتے کے فوراً بعد اس نے واثق کو امی کے ساتھ جانے کے لئے تیار کیا۔ وہ تو دس بجے سے پہلے بستر سے نہیں ہلتا تھا۔ مگر آج نیہاں کی منت سماجت اور حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے بادل نخواستہ اُٹھ ہی بیٹھا۔ دو سال پہلے بی اے کرنے کے بعد اس نے ایک بک شاپ پر سیلز مین کی حیثیت سے نوکری کی تھی، اچھی جاب کے انتظار میں۔ وہاں شاپ پر کام بہت زیادہ تھا اور اس کے حساب سے اس کی تنخواہ بہت کم تھی۔ دوسرے ہی مہینے دکان کے مالک سے لڑ بیٹھا۔ اس نے منٹوں میں فارغ کر دیا۔ اس کے بعد اس نے صرف اچھی نوکری ڈھونڈی۔ کی کہیں نہیں۔

ویسے بھی اسے آج کہیں نہیں جانا تھا۔ رائمہ کے ساتھ مل کر اس نے گھر کا سارا کام کیا۔ نیلم اسے کام کرتے دیکھ کر خود پڑھنے بیٹھ گئی۔ رائمہ میٹرک کے پیپرز دے کر فارغ تھی اور سعیہ تو ابھی آٹھویں میں تھی۔

اس نے جلدی جلدی دوپہر کے لئے کھانا بھی بنا لیا۔ امی اور واثق ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ وہ بے چینی سے ان کا انتظار کر رہی تھی۔ رائمہ کام کرتے ہی نظر بچا کر نیچے ممانی کے پاس چلی گئی تھی۔ نیچے جا کر اس نے ان کا سارا کام بھی کیا۔ ان کے ٹھنڈے ٹھنڈے طنز بھی سنے ہوں گے اور پھر ان کے ساتھ اے سی میں بیٹھ کر کوئی مووی لگا لی ہو گی۔ کاش! وہ بھی اتنی ڈھیٹ ہوتی۔

آخر دو بجے کے قریب امی اور واثق آئے۔ دونوں کے چہرے دھوپ کی تمازت سے سرخ ہو رہے تھے اور امی کا سانس بھی بری طرح پھولا ہوا تھا۔ دونوں اندر کمرے میں جا کر پنکھے میں بیٹھ گئے۔ اس نے جلدی سے امی کی پسینے سے بھیگی ہوئی چادر اُتار کر انہیں دوپٹہ دیا۔

''امی! شربت لے آؤں؟'' اس نے جاتے جاتے پوچھا۔

''شربت تو کل کا ختم ہو چکا ہے، تم ٹھنڈا پانی پلاؤ۔ پھر کھانا کھائیں گے۔'' ان کے کہنے پر وہ پانی لینے باہر آ گئی۔

نیلم بھی اس کے پیچھے پیچھے کچن میں آ گئی۔

''نیلم! تم کھانا لگا لو۔ میں دسترخوان بچھاتی ہوں۔ یہ رائمہ کی بچی نیچے جا کر بیٹھ ہی گئی ہے۔'' وہ پانی کا جگ اور گلاس اندر لے جاتے ہوئے بولی۔

پھر انہیں پانی دے کر اس نے دیوار کی طرف ہو کر رائمہ کو آوازیں دیں اور خلافِ توقع اس نے سن بھی لیں اور تھوڑی دیر میں اوپر آ گئی۔ نیلم نے کھانا لگایا۔ سب نے خاموشی سے کھانا کھایا۔

واثق تو کھانا کھاتے ہی دوسرے کمرے میں جا کر لیٹ گیا، وہ امی کے پاس آ بیٹھی۔ نیلم اور رائمہ نے برتن سمیٹے۔ ○

''کیا بنا امی پھر؟'' دل میں مچلتا ہوا سوال بالآخر کر ہی دیا۔

''توبہ، بڑی خجل خواری ہے۔ یہ مکان ڈھونڈنا کوئی آسان کام ہے آج کل۔ حشر ہو گیا گلی گلی پھر کر۔'' انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''اور کرائے سنو تو آسمان سے باتیں کر رہے ہیں اور مکان دیکھو تو جیسے چوہوں کے بل۔ میرا تو دماغ ہل گیا۔ اور واثق کا تو بس نہیں چل رہا تھا، وہیں طیش میں آ جاتا۔ اتنا دشوار ہو گیا ہے اس لڑکے کو ذرا سا کام کرنا۔ اس کے تیور دیکھ کر میں بھی دل میں پچھتائی کہ اس کو نہ ہی ساتھ لاتی تو اچھا تھا۔

''پھر کوئی پسند آیا؟'' وہ بے صبری سے بولی۔

''ہاں! بس کیا بتاؤں، ہماری تو پہنچ سے باہر کا کام ہے یہ۔ ایک پسند آیا۔ پسند کیا آیا بس سر چھپانے والی بات ہے۔ دو چھوٹے چھوٹے سے کمرے ہیں۔ بیچ میں تین فٹ کا برآمدہ سا۔ اس میں کچن ہے اور دوسری طرف باتھ روم۔ چار منزلہ ہے۔ اوپر کی تینوں منزلیں پہلے ہی کرائے پر چڑھی ہوئی ہیں۔ اس کا کرایہ دو ہزار روپے ہے اور

سکیورٹی بھی میرا خیال ہے پندرہ یا شاید دس ہزار۔ واثق کو پتہ ہے۔ بس اسی لحاظ سے کچھ کچھ مناسب لگا ہے۔ اب تم واثق کے ساتھ جا کر دیکھ آنا۔'' وہ زمین پر لیٹتے ہوئے بولیں۔ ''اُف، بلا کی گرمی تھی باہر۔ اور یہاں کون سا سکون ہے۔'' انہوں نے دوپٹے سے چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''امی! کرایہ زیادہ نہیں؟'' وہ کچھ دیر بعد بولی۔

''اس سے کم تو اکبر نے دکھایا ہی نہیں۔ ایک تھا، اٹھارہ سو روپے پر ایک کمرہ تو پھر یہ دو ہزار میں دو کمرے صحیح نہیں؟'' وہ بولیں۔

''اچھا چلیں، اگر آپ کو مناسب لگا ہے تو ٹھیک ہے۔ کب تک کا کہا ہے آپ نے قبضہ لینے کے لئے؟''

''وہ تو کہہ رہا تھا، آج شام کو ایڈوانس دے دیں، آج ہی چابی لئے دیتا ہوں۔''

''چلیں، پھر ٹھیک ہے، چار پانچ دن تو رہ گئے ہیں۔ ہم کل بینک سے پیسے نکلوا لیں تو تین دن میں شفٹ ہو جائیں گے۔ اب آپ کچھ دیر آرام کریں۔ سر دبا دوں آپ کا؟'' اس نے باہر چھت والا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا اور دروازہ بند کرنے سے کمرے میں کچھ اندھیرا ہو گیا۔

''نہیں، میں آرام کروں گی۔ تم لوگ بھی سو جاؤ تھوڑی دیر۔'' انہوں نے کروٹ بدل لی تو وہ بھی ان کے پاس ہی آ کر لیٹ گئی۔

❖❖○❖❖

اگلی صبح بھی ویسی ہی تھی۔ مایوس اور پژمردہ سی۔ اُس کی آنکھ امی کی آواز پر ہی کھلی۔ مٹیالا سا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ستارے صبح سے رخصت ہو رہے تھے، ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی، رات بھر حبس ہی رہا تھا، رات کے آخری حصے میں ہوا چل پڑی تھی، جس کی وجہ سے اس کو گہری نیند آ گئی۔

اُس نے اُٹھ کر نماز پڑھی۔ رائمہ اور سعیدہ بے سدھ سو رہی تھیں۔ یہی حال واثق کا تھا۔ نیلم البتہ اس سے پہلے اُٹھ چکی تھی اور اب نماز پڑھ کر اپنی کتابیں لے کر بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ وہ نماز پڑھ کر پھر اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ دن کا اُجالا پھیل رہا تھا، مکھیوں نے حملہ کر دیا تھا لیکن وہ بھی ڈھیٹ بنی لیٹی رہی۔ رائمہ اور سعیدہ اُٹھ کر اندر چلی گئیں۔ امی کے کہنے پر نیلم نے کتابیں سمیٹیں اور اُٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ اس کا کچھ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

'جیسا امی گھر کا نقشہ بتا رہی ہیں، وہاں سے تو اتنا کشادہ آسمان بھی نظر نہیں آئے گا۔ نہ تاروں بھرا، نہ بادلوں سے اٹا۔ وہ گھر کسی ڈربے سے کیا کم ہوگا، جہاں سے آسمان ہی نظر نہ آتا ہو۔' اُسے ایک دم خیال آیا تو اس کا دل افسردہ ہو گیا۔ کھلی ہوا، کھلا آسمان خدا کی نعمتوں میں سے کتنی بڑی نعمتیں ہیں۔ اس کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں، جنہیں چند روز بھی اس نعمت کے بغیر جینا پڑے۔ کاش ماموں آج آ جائیں۔ وہ ابھی کچھ عرصہ کم از کم گرمیاں یا پھر میری نوکری ملنے تک یہیں رہنے کی اجازت دے دیں۔' اس کے دل نے دعا کی۔ لیکن اسے پتہ تھا کہ دعا کا ایک حصہ ضرور قبول ہوگا۔ ماموں تو آج آ جائیں گے لیکن ان کے یہاں رہنے پر کبھی نہیں مانیں گے۔ ان کی صلاح کبھی ممانی سے علیحدہ نہیں ہوتی۔

مکھیوں کے مسلسل حملوں سے وہ جھنجلا کر اُٹھ ہی کھڑی ہوئی اور ساری چارپائیوں سے بستر سمیٹنے لگی۔

ناشتہ کر کے وہ تیار ہو رہی تھی۔

''آج کہیں انٹرویو ہے تمہارا؟'' امی نے چائے پیتے ہوئے پوچھا۔

''وہ گرین لینڈ اسکول ہے نا، جن کے پاس میں پچھلے ہفتے گئی تھی، انہوں نے آج بلوایا تھا۔ نوکری تو اس روز دینے کو تیار تھے۔ پرائمری اسکول کے دوسری تیسرے کے بچوں کو پڑھانا ہوگا۔ ماسٹرز کر کے بھی یہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ سات آٹھ سو تنخواہ دیں گے۔ اب کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے، اسی لئے آج ادھر جا رہی ہوں۔''

''اچھی بات ہے۔ مہینے کا راشن بھی بالکل ختم ہو چکا ہے۔ آج تو پکانے کے لئے کوئی دال بھی نہیں۔ کیا پکے گا؟'' امی کا لہجہ پُر ملال تھا۔

''آلو ہیں، وہ پکا لیں۔''

''آلو کہاں سے آئے؟ پھر گھی بالکل نہیں ہے۔ صرف تھوڑا سا آٹا پڑا ہے۔'' یہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والی بحث تھی۔

''واثق تو سویا ہوا ہے۔ اس کو جانا نہیں بینک اور پراپرٹی ڈیلر کے پاس؟''

''اُٹھے گا تو جائے گا نا۔ اللہ کرے آج قمر آ جائے، میں اس سے بات کر لوں۔ کچھ دن کی مہلت مانگ لوں۔ یوں جوان بیٹیوں کے ساتھ کہاں دھکے کھاتی پھروں گی؟ اللہ کو بھی پتہ نہیں کیا منظور ہے۔ سارے امتحانوں کے لئے ہم ہی رہ گئے ہیں۔ کب یہ ختم ہوں گے۔'' وہ چائے کا کپ رکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرنے لگیں۔

''ایسی باتیں نہ سوچا کریں، پریشانی بڑھ جاتی ہے۔ اچھا میں چلتی ہوں۔'' اس نے مڑ کر پلنگ سے چادر اور بیگ اٹھایا اور باہر نکل گئی۔

ڈیڑھ دو بجے وہ واپس آئی۔ سکول والوں نے اسے رکھ لیا تھا فوراً اور ففتھ کلاس اور آٹھ سو روپے تنخواہ۔ موجودہ حالات میں بہت غنیمت تھی۔

لگتا ہے ماموں آ گئے ہیں۔ ماموں کے بیڈروم کا اے سی سپر پر چل رہا تھا۔ گرمی کا احساس مزید بڑھ گیا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

اوپر حالات جوں کے توں تھے۔ امی ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد جائے نماز لپیٹ کر وہیں زمین پر لیٹی ہوئی تھیں نیلم شاید کچن میں تھی۔ کھٹر پٹر کی آوازیں آ رہی تھیں۔ رائمہ کا ریڈیو دوسرے کمرے میں فل والیوم سے بج رہا تھا۔

''او کہندی اے سیاں میں تیری آں۔'' جواد احمد حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔

اس نے امی کو سلام کیا اور بیٹھ کر جوتے اتارنے لگی۔

''اتنی دیر لگائی؟''

''کلاس دے دی انہوں نے، آج ہی سے جوائن کر لیا تھا، اس لئے۔ ماموں آ گئے امی؟''

''ہاں، صبح دس بجے آ گیا تھا۔''

''واثق کہاں ہے؟''

''یہیں تھا ابھی۔ وہ کہاں جائے گا۔'' وہ ناگواری سے بولیں۔

''بینک نہیں بھیجا آپ نے اسے؟''

''نہیں۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ''میں نے کہا، قمر سے پہلے بات کر لیتی ہوں۔ اس لئے۔''

''پھر کی بات؟''

''ہاں، نہ کرتی تو اچھا تھا۔ بھرم ہی رہ جاتا۔'' ان کے لہجے میں افسوس تھا۔ ''وہی بیوی والی زبان۔ ہماری مجبوری ہے۔ ایک ماہ بعد بھی تو خالی کرنا پڑے گا۔ میں مجبور ہوں، تاریخ دے دی ہے رضا کے سسرال والوں کو، تم تو سمجھتی ہو نا سب۔ پھر آگے سے کیا کہتی۔ وہ مجبور ہے بیوی کے آگے۔ اُٹھ کر آ گئی خاموشی سے۔''

''مجھے پہلے ہی پتہ تھا۔ کہا بھی تھا آپ سے، نہ کریں بات۔ فائدہ کوئی نہیں ہوگا۔'' وہ جلے دل کے ساتھ اُٹھ کر جوتے رکھنے لگی۔

اگلے دن وہ اسکول جانے سے پہلے تاکید کر گئی کہ آج واثق کو بینک بھجوا کر فوراً پیسے نکلوالیں۔

اس روز پرنسپل صاحب نے میٹنگ بلوالی۔ اگلے ماہ چھٹیاں جو ہونے والی تھیں۔ اسے واپسی پر تین بج گئے۔

دوپہر کا کھانا کھا کر تھکاوٹ کی وجہ سے اسے فوراً نیند آ گئی۔ شام ڈھلے اس کی آنکھ کھلی۔ نیلم کو اس نے چائے کے لئے کہا اور خود منہ ہاتھ دھونے چل دی۔ پانی ابھی بھی تپ رہا تھا۔ گرمی کی شدت کم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

''امی! واثق کہاں ہے؟'' چائے کے دوران اس نے پوچھا۔

''صبح وہی چیک لے کر گیا تھا، ابھی تک نہیں لوٹا اب نیچے اس کا فون آ گیا ہے کہ اس کے کسی دوست کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ رات وہ اس کے پاس ہاسپٹل ہی رہے گا۔ کہہ رہا تھا، کل آتے ہوئے چیک کیش کروالوں گا۔''

''جتنے دنیا میں نکمے اور بے کار لوگ ہیں، انہیں ہی رفاہی اور فلاحی کاموں کا شوق ہوتا ہے۔ گھر کی کچھ فکر نہیں اور سارے زمانے کا درد سینے میں ہے۔ ہونہہ!'' رائمہ بولی۔

''کتنے کا چیک لکھ کر دیا تھا آپ نے؟'' اس نے کچھ دیر بعد امی سے پوچھا۔

''رقم نہیں لکھنے دی تھی۔ ظاہر ہے، بارہ ہزار کا ہی لکھنا تھا۔ دو ہزار کرایہ، دس ہزار سیکورٹی۔ بینک میں بھی تو اٹھائیس تیس ہزار ہو گا۔ آڑے وقت کے لئے رکھا تھا، اب دنوں میں اُڑ جائے گا۔ کہنے لگا، امی! میں پراپرٹی ڈیلر سے بات کروں گا۔ کیا پتہ وہ پانچ ہزار سکیورٹی پر مان جائے تو کم رقم کیش کرالوں گا۔ آپ صرف سائن کر دیں، رقم میں خود لکھ لوں گا۔''

''ہوں۔'' وہ چپ کر گئی۔ حالانکہ اسے یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔

اسی وقت محلے کے بچے ٹیوشن پڑھنے آ گئے۔ رات کو کھانا کھا کر سب جلدی سو گئے۔ اگلے روز وہ اسکول سے آ گئی۔ واثق ابھی نہیں آیا تھا۔ اس کا فون آیا تھا کہ وہ رات تک آ جائے گا۔ امی کو بڑی فکر تھی کہ رات خدا جانے سویا بھی ہے یا نہیں۔ رات کو سب نے کھانا بھی کھالیا، واثق پھر بھی نہیں آیا تھا۔

سعیدہ اور رائمہ نے باہر بستر لگائے۔ نیلم پڑھ رہی تھی۔ امی اور وہ بیٹھی واثق کا انتظار کرتی رہیں۔

''امی! نیچے جا کر عادل سے کہوں، وہ اس کے دوستوں کو فون کر کے پتہ کرے۔ آخر اس نے رات اور دن کہاں گزارے؟'' وہ امی سے کہہ کر نیچے آ گئی۔

'اللہ کرے ماموں اور ممانی سو چکے ہوں۔' اُس نے سیڑھیاں اُترتے ہوئے دعا کی۔ اُس کی دعا قبول ہوئی۔ وہ دونوں سو چکے تھے۔ عادل باہر سے آ رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی اسے ساری بات بتائی۔ وہ بھی پریشان ہو گیا۔

''آپی! میرے پاس تو واثق بھائی کے ایک دو دوستوں کے ہی نمبر ہیں، میں کرتا ہوں فون۔'' وہ اس کے ساتھ کمرے میں آ کر انڈیکس میں سے واثق کے دوستوں کے نمبر ڈھونڈنے لگا۔

تین چار جگہ اس نے فون کیا۔

''آپی! ان کے دوست کہہ رہے ہیں کہ ہمارے کسی دوست کا ایکسیڈنٹ نہیں ہوا اور واثق بھائی تو انہیں کئی دن سے نہیں ملے۔'' عادل کی اطلاع ہوش اُڑا دینے والی تھی۔

''اب.....اب کیا کریں؟'' وہ پریشانی سے بولی۔

''وہ خود ہی آ جائیں گے رات کو۔ جانا کہاں ہے؟ آپ فکر نہ کریں۔'' اُس کی تسلی سے بھی اُس کی پریشانی دُور نہ ہوئی۔

وہ مُردہ قدموں سے اوپر آ گئی۔ امی کو گول مول بات بتائی کہ وہ ابھی آ جائے گا، آپ سو جائیں۔ انہیں لٹا کر وہ خود ساری رات جاگتی رہی۔ اسے نیند نہیں آئی۔ رات بھیگتی رہی۔ اس کا انتظار بے چینی میں بدل گیا۔

اگلا دن طلوع ہو گیا۔

امی درمیان میں ایک دو دفعہ اُٹھیں۔ اس نے انہیں مطمئن کر کے سلا دیا۔ صبح اُٹھتے ہی ان کی نظر واثق کے خالی بے شکن بستر پر پڑی تو وہ جیسے تڑپ ہی اُٹھیں۔

''کہاں چلا گیا میرا بچہ؟ دو راتوں سے گھر نہیں آیا۔ نیہاں! پتہ کراؤ۔ تیسرا دن ہو گیا آج۔'' وہ رونے لگیں۔

''امی! حوصلہ کریں۔ میں نیچے جا کر عادل سے کہتی ہوں کہ جا کر پتہ کرے۔'' وہ خود گھبرائی ہوئی تھیں۔ نیچے آ کر اس نے عادل کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ آنکھیں ملتا باہر آ گیا۔

''کیا بات ہے آپی! خیریت تو ہے؟'' اس کے ہراساں چہرے کو دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

"عادل! واثق رات کو بھی گھر نہیں آیا۔ جاؤ کہیں اس کا پتہ کرو، پلیز۔ امی بہت پریشان ہیں۔" وہ خود رو دینے کو تھی۔

"اچھا میں جاتا ہوں، آپ گھبرائیں نہیں۔" وہ اندر کی طرف پلٹ گیا۔

تھوڑی دیر میں وہ منہ ہاتھ دھو کر بائیک کی چابی لے کر نکل گیا۔

دو گھنٹے بعد وہ پژمردہ واپس آیا۔

"پھپھو! واثق بھائی کسی ایجنٹ کے ذریعے مسقط چلے گئے ہیں، آج صبح پانچ بجے کی فلائٹ سے۔ ان کے ایک دوست نے بتایا ہے۔ یہ ان کا خط بھی دیا ہے۔" اس نے خط نیہاں کے ہاتھ میں دے دیا۔

"پیاری امی جان! السلام علیکم۔

میں آپ سے اجازت لئے بغیر یہاں سے دور جا رہا ہوں۔ میری نیت نیک اور صاف ہے۔ میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں مجھے کوئی نوکری نہیں دے رہا اور گھر کے حالات مجھ سے دیکھے نہیں جا رہے۔ دل میں نیک مقصد لے کر جا رہا ہوں، میرے لئے دعا کیجئے گا۔ میں نے بینک سے سارے پیسے نکلوا لئے ہیں۔ یہ آپ کا مجھ پر قرض ہے، جو میں جلد ہی آپ کو لوٹا دوں گا۔ اِن شاء اللہ میں بہت جلد نوکری ڈھونڈ کر آپ کو پیسے بھیجنا شروع کر دوں گا۔ میرے لئے دعا کیجئے گا۔ بہنوں کو پیار۔ اپنا خیال رکھئے گا۔

اللہ حافظ، آپ کا بیٹا واثق۔"

خط کیا تھا، ایٹم بم تھا جس کے پھٹتے ہی ہر طرف جیسے تباہی کا احساس ہونے لگا۔ امی تو سینے پر دوہتڑ مار کر رونے لگیں اور وہ گم صم خط ہاتھ میں لئے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

'اب کیا ہوگا؟' اتنا بڑا سوالیہ نشان اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہا تھا۔

"ہائے ری قسمت! دُکھوں نے ہمارا ہی گھر دیکھ لیا ہے؟ دنیا میں لوگوں کے گھر پریشانیاں آتی ہیں، کڑے دن آتے ہیں، دو چار سالوں میں گزر جاتے ہیں۔ پر ادھر تو جیسے مدتوں سے ایک ہی موسم ٹھہر گیا ہے۔ غم کا، نحوست کا موسم۔" اب وہ اپنی بے بسی پر رو رہی تھیں۔ "ہائے اس دن کے لئے لوگ بیٹوں کی دعائیں کرتے ہیں کہ عین منجدھار میں دغا دے جائیں۔ واثق! تجھے کیا مل گیا ہمیں یوں ستا کر۔" امی روتے روتے زور زور سے بولنے لگیں۔ وہ انہیں ایک نظر دیکھ کر اٹھ کر باہر آ گئی۔ باہر چھت سفید دھوپ سے بھر گئی تھی۔ سورج اپنی تلخی سمیت آنکھیں کھولے دنیا پر برس رہا تھا۔ وہ کمرے میں جا کر بے دلی سے تیار ہونے لگی۔

وہ جب ناشتہ کئے بغیر نیچے اُتری تو ماموں صحن میں ناشتہ کر رہے تھے۔ اوپر سے امی کے رونے دھونے اور بولنے کی آوازیں صاف آ رہی تھیں۔ جن سے بے نیاز کان بند کے وہ ناشتہ کرنے میں مگن تھے۔ گیٹ تک جاتے جاتے اس نے صاف سنا۔ ممانی کچن سے نکلتے ہوئے بولی تھیں۔

"اب یہ ان لوگوں کا نیا ڈرامہ ہے۔ میں تو عاجز آ گئی ہوں ان کے ڈھکوسلوں سے۔"

ان کی آواز خاصی بلند تھی اور وہ نیہاں ہی کو سنانا چاہ رہی تھیں۔ اس نے پلٹ کر جواب دینا چاہا۔ ان کی آنکھیں حقارت لئے ہوئے تھیں۔ پتہ نہیں، نفرت کا یہ زہر کب سے ان کے دل میں پل رہا تھا۔ یہ ایک آدھ ماہ کی کاوش نہیں تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی گیٹ عبور کر آئی۔ باہر ویسے ہی دنیا رواں دواں تھی۔ سائیکلیں، موٹر سائیکلیں، تانگے، ریڑھے ان تنگ گلیوں میں ایک دوسرے سے ٹکراتے بھاگے جا رہے تھے۔ اس کے قدم من من کے ہو رہے تھے اور دل غم سے بوجھل۔

"واثق نے یہ کیا، کیا؟" اس نے تھک کر ایک نظر اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ "بھلا اس میں اللہ کی کیا بہتری ہو سکتی ہے؟" اب پیسوں کا انتظام کہیں سے نہیں ہو سکتا تھا، نہ امی کے پاس کوئی زیور تھا اور نہ کوئی جمع پونجی۔

اس بات کا علم ماموں کو بھی تھا۔ دو تین دن کے خاموش انتظار کے بعد انہوں نے خود ہی پراپرٹی ڈیلر سے مل کر سارا کچھ طے کر لیا، ساری رقم ادا کر دی۔ اس مہینے کا کرایہ بھی اور عادل کے ہاتھ امی کو پیغام بھیج دیا اور ساتھ ہی گھر کی چابی بھی۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ اب یہاں سے کوچ کر لو۔ امی کی رات روتے کٹ گئی۔

اگلی صبح ماموں کی دکان سے دو ملازم آ گئے۔ سامان نیچے اُتروانے اور گھر میں پہنچانے کے لئے۔ وہ نیلم اور رائمہ کو ہدایت دے کر سکول آ گئی کیونکہ چھٹی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سامان تھا ہی کتنا۔ دوپہر تک شفٹنگ مکمل ہو گئی۔ ماموں جان تو صبح دکان پر جانے سے پہلے ہی مل گئے تھے۔ ممانی سے جاتے ہوئے سرسری سا خدا حافظ ہو گیا۔

اور وہ پہلی رات قیامت سے بھی بھاری تھی۔ نیچی چھتوں والے گھٹے ہوئے کمرے اور بغیر آسمان کی چھت کا برآمدہ۔ کہیں سے ذرا سی بھی ہوا کی آمدورفت ممکن نہیں تھی۔ اور گلی کی طرف کھلی اکلوتی کھڑکی سے ہوا تو نہیں آ رہی تھی، ہاں بدبو کے بھبکے ضرور آ

رہے تھے۔ آخر ہار کر نیلم نے وہ کھڑکی بھی بند کر دی۔ اردگرد بکھرا ہوا سامان گھٹن کے احساس کو بڑھا رہا تھا۔ انہیں ماموں کے گھر کی چھت کا کھلا آسمان یاد آ رہا تھا، جہاں رات تو کم از کم بے حد سکون سے گزرتی تھی۔ اور اب یہاں رات کا سکون بھی رخصت ہوا۔ کوئی کہاں تک جاگ سکتا تھا۔ بالآخر سب کو نیند آ ہی گئی۔

پھر آہستہ آہستہ وہ عادی ہوتی چلی گئیں۔ اب رہنا تو یہیں تھا۔ انہیں یہاں آئے ہفتہ ہو چلا تھا ٹیوشن کے بچے کچھ کم ہو گئے تھے کہ یہ گھر ماموں کے گھر سے کچھ فاصلے پر تھا۔

❖❖○❖❖

ایک روز وہ سکول سے آئی تو بیٹھک میں ایمن کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وائٹ کاٹن کے بے داغ سوٹ میں اس کا روپ اسی طرح سے کھلا کھلا سا تھا۔ اسے اپنی اور گھر کی حالت پر بے حد شرمندگی سی ہوئی مگر ایمن کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ اسی طرح ملی۔

''یار! ایک تو تم لوگوں نے گھر اللہ میاں کے پچھواڑے لیا ہوا ہے۔ تمہارے ڈاکومینٹس پر جو ایڈریس تھا، وہاں تو میں پہنچ گئی تھی مگر وہاں جا کر پتہ چلا کہ تم وہاں سے ہجرت کر آئی ہو۔ یہاں تمہارے ماموں کا ملازم مجھے چھوڑ گیا ہے۔ تمہارا انتظار کرتے ہوئے مجھے آدھ گھنٹہ ہو چلا ہے۔'' وہ اس سے گلے ملتے ہوئے نان اسٹاپ بولے گئی۔

''ہاں بس ایک ہفتے پہلے ہی ادھر آئے ہیں۔'' وہ شرمندگی میں بھیگی جا رہی تھی۔

''اصل میں آنا تو مجھے شام کو ہی تھا مگر شام کو مجھے بابا کے ساتھ جانا ہے اسلام آباد۔ اسی لئے اتنی کڑکتی دھوپ میں بھاگم بھاگ آئی ہوں۔''

''تم نے کچھ پیا؟ میں منگواتی ہوں۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

''نہیں بھئی، آتے ہی کولڈ ڈرنک پی لی تھی، اس لئے تو فریش ہوں۔ اچھا تم یہ پکڑو۔'' اس نے لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ ''یہ بابا کا لیٹر ہے، انکل عظیم کے نام۔ بیرسٹر ہیں ہائی کورٹ میں۔ انہیں چند ماہ کے لئے ایک ہیلپر کی ضرورت ہے۔ اصل میں ان کی پی اے چھٹی پر گئی ہے۔ بابا نے ان سے تمہاری بات کر لی۔ ان چند ماہ کے دوران انشاء اللہ تمہیں کہیں نہ کہیں جاب مل جائے گی۔ انکل کوشش کریں گے۔ اب تم کل صبح ٹھیک نو بجے ان کے چیمبر پہنچ جانا۔ بہت اچھے ہیں وہ، بہت نائس۔'' وہ عجلت میں تھی۔

''مگر ایسی جاب کا تو مجھے کچھ تجربہ نہیں۔'' وہ پریشانی سے بولی۔

''یار! کچھ بھی نہیں کرنا۔ وہ تمہیں بتا دیں گے۔ بہرحال، اب تم یہ سکول کی نکمی جاب پر دو حرف بھیجو اور کل ان کے پاس جانا۔ وہ سیلری بھی اچھی دیں گے اور تمہاری ہیلپ بھی کریں گے۔ میں اب چلتی ہوں، گاڑی بہت دُور کھڑی کی ہوئی ہے۔ مگر یار! اب مجھے راستہ کون بتائے گا؟'' وہ پریشانی سے اُٹھتے ہوئے بولی۔

''ایمن! کھانا کھا کر جانا۔'' نیہاں نے پست لہجے میں کہا۔

''نہیں یار! ضرور کھاتی۔ مجھے جا کر شام کے سفر کے لئے تیاری بھی کرنا ہے۔ بابا نے اچانک ہی تو پروگرام بنایا ہے۔ پلیز اب تم مجھے ان گلیوں کی بھول بھلیوں سے نکالنے کا کوئی انتظام کرو۔'' وہ عجلت میں باہر نکلتے ہوئے بولی۔

''بیٹا! کھانا کھا کر جاتیں۔ کھانا تیار تھا۔'' امی برآمدے میں بیٹھی تھیں۔

''نہیں آنٹی! شکریہ۔ میں ضرور کھاتی مگر جلدی ہے۔ پھر کسی دن آؤں گی، فرصت کے ساتھ۔''

''رائمہ! ساتھ والے جگنو کو بلوا لو، وہ ایمن کو باہر تک چھوڑ آئے گا۔'' اس نے رائمہ سے کہا تو وہ سر ہلا کر باہر نکل گئی۔

ایمن کے جانے کے بعد وہ لفافے میں سے عظیم صاحب کا ایڈرس نکال کر پڑھنے لگی۔ 'پتہ نہیں کیسے ہوں اور جاب کیسی ہو؟' وہ سوچنے لگی۔

❖❖○❖❖

اگلے روز اُس کی آنکھ امی کے اٹھانے پر ہی کھلی، کیونکہ اب کھلا آسمان تو تھا نہیں، جس کی روشنی سے آنکھ کھل جاتی۔ اب تو وہ گھڑی دیکھ کر صبح کی نماز پڑھتی تھیں۔

نماز کے بعد اس نے رات کے برتن دھوئے۔ نیلم تو نماز پڑھتے ہی کتابیں لے کر بیٹھ گئی تھی۔ اگلے ہفتے سے اس کے ایگزام شروع تھے۔ رائمہ سو رہی تھی۔ اس نے اپنے جانے کے لئے کپڑے پریس کئے، ناشتہ بنا کر امی کو دیا، پھر سنیعہ اور نیلم کو دیا۔ ناشتہ کرتے ہی وہ سنیعہ کے ساتھ ہی باہر نکل آئی۔

پورے نو بجے وہ عظیم صاحب کے سامنے ان کے آفس میں بیٹھی تھی۔ گرے سوٹ پہنے وہ ایک درمیانی عمر کے صاحب تھے، چالیس پینتالیس کے درمیان۔ ٹھہر ٹھہر کر بولنے والے۔

اس نے ایمن کے بابا کا خط نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔ وہ خاموشی سے خط پڑھنے

لگے۔ گولڈن عینک کے فریم کے پیچھے ان کی کشادہ آنکھیں خط کے لفظوں کو بے تاثر انداز میں پڑھ رہی تھیں۔

''گڈ۔ خط سے زیادہ مجھے تمہارا پنکچوئل ہونا پسند آیا کہ ٹھیک نو بجے تم میرے آفس میں موجود ہو۔ ویری گڈ!'' اب ان کے سپاٹ چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ تھی، جس سے اس کا حوصلہ بڑھا۔

''دراصل میری پی اے چار ماہ کی رخصت پر ہیں، اس لئے مجھے عارضی طور پر ایک ہیلپر کی ضرورت تھی۔ وقار نے تمہارا ذکر کیا اور ایمن نے بھی خوب بڑھ چڑھ کر تمہاری تعریفیں کیں۔ میں نے تمہارے ڈاکومینٹس دیکھ کر تمہیں اوکے کر دیا۔ اس لئے چار ماہ کے لئے تم یہاں پکی ہو۔'' وہ ذرا سا ہنس کر بولے۔

''لیکن سر! مجھے کام کیا کرنا ہوگا؟'' وہ کچھ اُلجھ کر بولی۔

''کام میں سمجھا دوں گا۔ میرا اسسٹنٹ ہے جاوید۔ وہ تمہاری مدد کرے گا۔ کمپیوٹر تو آتا ہے نا تمہیں؟''

''نو سر!'' وہ شرمندگی سے بولی۔

''کوئی بات نہیں، جاوید سمجھا دے گا تمہیں سب۔ آؤ میں تمہیں اس سے ملواتا ہوں اور تمہیں تمہاری سیٹ دکھاتا ہوں۔'' وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ بھی کھڑی ہوگئی۔

کام واقعی مشکل نہیں تھا۔ صرف عظیم صاحب کے کیسز کو فائل کرنا، ان کی ڈیٹس لکھنا، ان کی یاد دہانی کروانا اور ڈکٹیشن اور فارغ وقت میں جاوید صاحب سے کمپیوٹر سیکھنا۔ جاب بھی اچھی تھی اور تنخواہ بھی۔ مگر یہ سب تو چار ماہ کے لئے تھا، اس کے بعد وہ کیا کرے گی؟ اور ایمن نے کہا تھا کہ عظیم صاحب اس کی جاب کے لئے کچھ کریں گے، مگر انہوں نے تو ایسا کوئی اشارہ بھی نہیں دیا تھا، وہ ان سے کیا ذکر کرتی۔

اس روز شہر میں ویگنوں کی ہڑتال تھی۔ صبح تو وہ رکشہ پر آگئی تھی، مگر اب کام کرتے کرتے رات کے آٹھ بج گئے تھے۔ عظیم صاحب بے حد مصروف تھے۔ ان کا ایک دیوانی مقدمہ کئی سالوں سے عدالت میں چل رہا تھا۔ آج کل اس کی فائنل ڈیٹس چل رہی تھیں، صبح بھی اس کی ڈیٹ تھی۔ کیس کی تفصیلات ڈکٹیٹ کرتے کرتے اس کے ہاتھ سن ہو گئے تھے۔ جب اس نے فائل بند کی تو باہر مکمل طور پر اندھیرا چھا چکا تھا۔ گھڑی ساڑھے آٹھ بجا رہی تھی۔ اس کا ایک دم سے رنگ اُڑ گیا۔ عظیم صاحب ابھی بھی اپنے آگے رکھی ہوئی کسی کتاب میں گم تھے۔

''سر! ساڑھے آٹھ بج گئے ہیں۔'' اس نے انہیں احساس دلایا۔

''یس، آئی نو۔'' انہوں نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ وہ پریشانی سے انہیں دیکھنے لگی۔

''سر! مجھے دیر ہوگئی ہے کافی۔'' آخر اس سے رہا نہ گیا۔

''اچھا چلو ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔'' انہوں نے ایک سرسری سی نگاہ اس پر بڑی بے نیازی سے ڈالی اور پھر صفحے پر نگاہیں جما دیں۔

''سر! آج ٹرانسپورٹ کی ہڑتال تھی۔'' چند منٹ کی خاموشی کے بعد اس نے پھر کہا۔

''ہاں مجھے معلوم ہے۔'' انہوں نے کرسی گھما کر پیچھے ریک سے دوسری کتاب پکڑی۔ وہ جھنجلا کر رہ گئی۔

''السلام علیکم سر!'' ایک دم سے کوئی آفس کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور بڑے پُرجوش انداز میں سلام کیا۔

''ارے وعلیکم السلام، عمر دراز! ہاؤ آر یو؟ یو لکی مین، کانگریچولیشنز۔'' عظیم صاحب ایک دم اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور ہنستے ہوئے اسے مبارک دینے لگے۔ اس نے آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا۔

''بیٹھو، میں انتظار کر رہا تھا کہ دیکھو یہ نالائق لڑکا ادھر آتا ہے یا نہیں۔''

''نو سر! ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ میں مٹھائی لے کر نہ حاضر ہوتا؟ یہ لیں، منہ میٹھا کریں۔'' وہ نیہاں کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ کر مٹھائی کا ڈبہ کھولنے لگا۔

''خوش ہو بہت۔'' عظیم صاحب نے مسکرا کر کہا۔

اس نے ڈبہ کھول کر آگے کیا۔

''تھینک یو۔'' عظیم صاحب نے تھوڑی سی برفی لی۔ ''یہ لو بھئی نیہاں! تم بھی لو۔ اوسوری، میں تعارف کرانا بھول گیا۔ بھئی عمر دراز میرا بڑا ہونہار شاگرد رہ چکا ہے۔ ایل ایل بی کرنے کے باوجود یہ وکالت کی طرف نہیں آیا۔ سی ایس ایس کا ایگزام دیا تھا، دوسری پوزیشن لے کر کامیاب ہوا ہے۔ اور عمر دراز! یہ آج کل میرے ساتھ کام کر رہی ہیں، مس نیہاں عثمان۔'' انہوں نے تعارف کرایا۔

''سر! انہوں نے بھی لاء کیا ہے؟''

''نہیں بھئی، یہ تو ماسٹرز ہیں، اکنامکس میں۔''

''تو ادھر کدھر آگئیں؟''

''ایسے ہی۔'' ان کا لہجہ سرسری سا تھا۔ ''یہ لو بھئی نیہاں! منہ میٹھا کرو۔'' انہوں نے

رنگ برنگی مٹھائیوں کا ڈبہ اس کے آگے کیا۔ اس نے تھوڑا سا گلاب جامن لے لیا، مگر اس کا ذائقہ بھی اس وقت اسے کڑوا لگ رہا تھا۔ باہر اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

''والدہ تو تمہاری بہت خوش ہوں گی۔'' عظیم صاحب بولے۔

''نو سر! کہاں۔ ان کی تو خواہش تھی کہ میں زمینیں سنبھال لوں اور سال بہ سال گندم چاول کا حساب لگاتا رہوں۔''

''اب آگے کیا ارادے ہیں؟''

اسے دونوں کی گفتگو زہر لگ رہی تھی۔

''پولیس ڈیپارٹمنٹ ہی سر! ادھر بڑا کام ہونے والا ہے۔'' وہ ہنس کر بولا۔

''ہوں، ملے نہیں تم۔ ارادہ مضبوط ہے۔'' وہ سر ہلا کر بولے۔

''بالکل سر!'' وہ بھی جوش سے بولا۔

''سر! مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' وہ اُکتا کر کھڑی ہو گئی۔

عمر دراز نے ایک نظر اُسے دیکھا۔

''او ہاں عمر! اپنی گاڑی میں آئے ہو؟''

''یس سر!''

''تو بس پھر مسئلہ حل ہو گیا۔ آج ٹرانسپورٹ کی ہڑتال ہے۔ تم نیہاں کو ڈراپ کر دو ذرا۔ میں بہت بزی ہوں۔''

اُن کی بات پر وہ گھبرا اُٹھی۔

''نو سر! تھینک یو، میں چلی جاؤں گی۔'' اس نے چیئر کی بیک سے اپنا بیگ گھسیٹا۔

''بھئی نیہاں! جس طرح تم مجھ پر بھروسہ کر سکتی ہو، اسی طرح عمر دراز پر میں ٹرسٹ کرتا ہوں۔ تم بے فکر ہو کر عمر دراز کے ساتھ جاؤ۔ میری ذمہ داری پر۔'' وہ اُس کے خدشے کو جان کر بولے۔ وہ بے بس سی ہو گئی۔ تذبذب میں کھڑی رہی۔

''سر! اگر یہ نہیں جانا چاہتیں تو رہنے دیں۔'' وہ کچھ نخوت سے بولا۔

''ارے نہیں بھئی۔ چلو بھئی نیہاں! فٹافٹ چلو۔ تمہیں واقعی آج دیر ہو گئی ہے۔''

گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہی وہ گھبرا گئی۔

''او کے سر!'' اُس نے قدم بڑھایا۔

''او کے سر! مجھے بھی پھر اجازت۔'' وہ کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، وہ اس کے آگے بونی لگ رہی تھی۔ کھڑے کھڑے دیہاتیوں جیسے نقوش، گندمی

رنگت، سیاہ آنکھیں اور خوب چوڑی پیشانی پتہ نہیں اسے کیوں یہ شخص دیکھا دیکھا سا لگ رہا تھا۔

''اور عمر دراز! اُس نالائق کی سناؤ، آج کل کدھر ہے؟'' سر مصافحہ کرتے ہوئے بولے۔

''ادھر ہی ہے سر!'' وہ ہاتھ ملا کر مڑا اور نیہاں کے لئے دروازہ کھولنے لگا۔

''کسی دن اسے میرے پاس لانا۔ اس کے کان کھینچنا ہیں مجھے۔'' وہ کرسی پر گھوم رہے تھے۔

''یس سر! میں کہہ دوں گا جا کر اسے۔ اب اجازت، پھر کسی دن حاضر ہوں گا۔''

''ضرور۔ میں انتظار کروں گا۔ او کے، خدا حافظ!''

خدا حافظ کہہ کر وہ اس کے پیچھے نکل آیا۔

نیچے اس کی سوزوکی کے پاس کوئی کھڑا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے اور کچھ اپنی عجلت کی وجہ سے وہ قطعاً اس اجنبی کی طرف متوجہ نہ ہوئی۔ عمر دراز نے اس کے لئے پچھلا دروازہ کھول دیا۔ وہ جلدی سے بیٹھ گئی۔

''سر کہہ رہے تھے، تمہیں کسی روز لے کر آؤں۔ تمہارے کان کھینچنے ہیں۔'' گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی عمر دراز اس شخص سے بولا۔

''اچھا ان سے کہنا کہ میرے کان پہلے ہی خاصے لمبے ہو چکے ہیں، کھینچ کھینچ کر۔'' وہ لاپروائی سے بولا۔ نیہاں کو آواز کچھ سنی سنی لگی۔

''مس عثمان! مجھے راستہ بتائیں پلیز۔'' احتیاط سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے عمر نے اس سے پوچھا۔

اس نے راستہ بتایا۔ اسی وقت اس کے موبائل کی بپ بجنے لگی۔

''ہیلو، ہاں بول رہا ہوں۔'' عمر نے موبائل آن کرتے ہوئے کہا۔

''اوہ، اچھا.... بس میں آ رہا ہوں، پندرہ منٹ تک..... آپ اماں کے پاس ہی رہئے گا۔'' کہہ کر اس نے موبائل آف کر دیا۔

''اماں کا بی پی لو ہو گیا ہے۔'' اس نے ساتھ والے کو بتایا۔ اس کی آواز میں فکرمندی تھی۔

''اوہ!''

''پلیز عمر صاحب! مجھے یہیں اسٹاپ کے پاس اتار دیں، آگے میں چلی جاؤں

گی۔'' اس کا اسٹاپ آ گیا تھا۔

''نو مس عثمان! میں سر سے کہہ کر آیا ہوں کہ آپ کو گھر تک پہنچا کر آؤں گا۔ دائیں طرف موڑوں؟''

''عمر صاحب پلیز! میں چلی جاؤں گی۔ آپ کی والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ پلیز مجھے یہیں ڈراپ کر دیں۔'' اس نے بیگ اٹھایا۔

''نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ اتنا ٹائم نہیں لگے گا۔ میرے خیال سے آگے راستہ بھی تنگ ہے اور رش بھی زیادہ ہے، اس لئے گاڑی نہیں جائے گی۔'' اس نے کہتے ہوئے گاڑی روک دی۔ وہ نیچے اُتر آئی۔ پھر نیہاں کے منع کرنے کے باوجود وہ اس کے ہمراہ آیا۔ طویل اور تنگ گلیوں کے شروع ہوتے ہی وہ گھبرا گئی۔ یہاں سب جاننے لگے تھے۔ اس طرح کسی اجنبی کے ساتھ چلنا؟ کیسی کیسی کہانیاں نہ بنیں گی۔ اسے پسینہ آ گیا۔ وہ شاید اس کی جھجک کو سمجھ گیا اور اس سے کچھ فاصلے پر چلنے لگا۔ پھر جیسے ہی وہ گھر تک پہنچی، عمر نے دور سے سر ہلایا اور واپس مڑ گیا۔ وہ اسے اندر آنے کی دعوت دیتی، باوجود اس کے کہ وہ اس پسماندہ علاقے اور پسماندہ گھر پر دل ہی دل میں بے تحاشا شرمندہ ہو رہی تھی۔ وہ اُس کی دعوت سے پہلے ہی پلٹ گیا۔

گھر کا دروازہ کھلا تھا، وہ خاموشی سے اندر داخل ہو گئی۔

❖❖○❖❖

''نیہاں! پیپر میں پی سی ایس کا ایڈ آیا ہے۔ آپ نے اپلائی کیا ہے؟'' وہ ایک فائل پر نوٹ لگا رہی تھی، جب اچانک عظیم صاحب نے پوچھا۔

''نو سر! میں سی ایس ایس کی تیاری کر رہی ہوں۔ اس سال دینے کا ارادہ بھی ہے اور لیکچرر شپ ہو یا کوئی اور جاب، اس میں میرٹ سے زیادہ مضبوط بیک کا ہونا ضروری ہے۔ پورے ایک سال کی خواری نے مجھے یہ سمجھایا ہے۔''

''خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ بہر حال، اپلائی ضرور کرنا چاہئے۔ دوسرے معاشرے میں مضبوط اور اونچا مقام حاصل کرنے کے لئے ہمارے نوجوانوں کو سی ایس ایس شارٹ کٹ لگتا ہے۔ حالانکہ پہلی بات تو اس کا حصول ہی جان جوکھوں کا کام ہے۔ ایگزام دینا اور پھر کامیاب ہونا۔ دوسرے اگر ایمانداری سے اس کے ذریعے حاصل کردہ جاب کرنا چاہو تو بھی یہ کانٹوں بھرا راستہ ہے اور بے ایمانی سے ڈھیروں ڈھیر دولت کمانا چاہو تو بھی۔ لیکن خیر میں تمہیں ڈس ہارٹ نہیں کرنا چاہتا۔ بیورو کریسی میں

جہاں کرپشن بہت ہے، وہیں بہت فرض شناس اور محبِ وطن آفیسرز بھی ہیں، جن کے دم سے سارے ملک اور اس محکمے کا بھرم قائم ہے۔'' وہ ایک لمحے کو رکے۔ ''لیکن تم پی سی ایس کے ذریعے بھی اپنی صلاحیتیں آزماؤ۔ ہمیں اچھے اساتذہ بھی تو چاہئے ہیں، اچھی لیڈر شپ ہر محکمے کو دینے کے لئے۔ ایم آئی رائٹ؟''

''یس سر!''

''گڈ! قسمت آزمانے میں کوئی حرج نہیں۔ ضرور اپلائی کرو۔''

وہ چپ کر گئی۔

پھر اگلے ہی روز اس نے فارم فِل کر کے بھیج دیا۔ عظیم صاحب کے پاس کام کرنے کا یہ فائدہ ہوا کہ دال روٹی کی فکر کم ہو گئی۔ کام اگرچہ زیادہ تھا اور اکثر رات ہو جاتی، مگر معاوضہ بھی اچھا تھا۔ نیلم کے ایگزام ختم ہو چکے تھے۔ وہ اب ٹیوشنز پڑھا رہی تھی۔ رائمہ کی فرسٹ ایئر کی کلاسز شروع ہو چکی تھیں اور اس ڈربے میں بھی رات کو کچھ سکون ہونے لگا تھا۔ موسم بدل رہا تھا۔ امی کے شکوے خدا سے، اپنے خون سے اور دنیا سے اور دنیا والوں سے بہت بڑھ گئے تھے۔ حالانکہ اس کا کچھ فائدہ نہیں تھا۔ ان کی اپنی صحت ہی گرتی جا رہی تھی۔ واثق کا کچھ پتہ نہ تھا، خدا جانے وہ کس حال میں تھا۔ اچھے حال میں ہوتا تو یقیناً خبر کرتا۔ وہ دن رات اس کے خیریت سے ہونے کی دعا مانگتی۔ جبکہ امی اور رائمہ اُس کی لاپروائی پر بولتی رہتیں۔ رات کو امی کی فکر کا اور ہی عالم ہوتا۔

''پتہ نہیں میرا بچہ کس حال میں ہو گا۔'' اور چھما چھم آنسو ان کی آنکھوں سے رواں ہو جاتے۔ ان کی نیند بہت کم ہو گئی تھی۔ بس انتظار کی کیفیت میں رات بھر کروٹیں بدلتی رہتیں۔ اس کا سمجھانا بھی ان کی کیفیت کو کم نہ کرتا۔

❖❖○❖❖

میرے من کو ہے بھائی اِک لڑکی
وہی تو میرا دل لے گئی

ایف ایم ہنڈرڈ پر رائمہ کا ریڈیو فل والیوم سے چیخ رہا تھا۔

نیہاں نہا کر نکلی۔ وہ تیار ہونے کے لئے اندر کمرے میں داخل ہوئی۔ رائمہ کالج یونیفارم میں شیشے کے سامنے کھڑی ایک آنکھ بند کئے دوسری آنکھ کے پپوٹے پر بڑی احتیاط سے آئی لائنر لگا رہی تھی۔

''ہائیں، یہ تم کالج میک اپ کر کے جاتی ہو؟'' نیہاں حیرت سے دنگ رہ گئی۔ اس

کی بلند آواز پر رائمہ نے سٹپٹا کر دونوں آنکھیں کھول دیں۔ گیلا لائنر آنکھ کے اوپر جا لگا۔ رائمہ نے جلدی سے لائنر کو بند کیا اور مڑ کر کالج بیگ میں ٹھونسنے لگی۔

''اب کیا کتابوں کی جگہ میک اپ کٹ لے کر جاؤ گی؟ رکھو اس کو باہر۔'' نیہاں نے قریب آ کر ذرا ڈپٹ کر کہا تو اس نے خاموشی سے لائنر میز پر رکھ دیا۔

''اور منہ دھو کر آؤ۔ دیکھو کتنی عجیب لگ رہی ہو۔ حد ہو گئی۔'' اس نے پھر ڈانٹا۔

''بھلا تمہیں کس نے یہ بتایا ہے کہ کالج میں اب پڑھائی کی جگہ مقابلۂ حُسن منعقد ہونے لگے ہیں۔ ابھی تمہیں کالج جاتے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں اور تم نے پَر پُرزے نکالنے شروع کر دیئے ہیں۔'' اب اسے غصہ آنے لگا تھا۔ رائمہ خاموشی سے باہر جا کر برآمدے میں لگے نلکے پر جھک کر چہرہ دھونے لگی۔

''ناشتہ کر لو تم دونوں آ کر۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' امی نے آواز لگائی تو وہ جلدی جلدی بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔

''امی! آج آپ ناشتہ بنا رہی ہیں۔ نیلم کہاں ہے؟'' وہ ان کے پاس پڑی پیڑھی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''اسے آج کسی انٹرویو کے لئے جانا ہے دس بجے تک۔ اپنے کپڑے پریس کر رہی ہے۔'' انہوں نے چائے کا کپ اس کے پاس رکھتے ہوئے کہا۔

''انٹرویو، وہ کس لئے؟'' نوالہ اس کے ہاتھ میں رہ گیا۔

''نوکری کے لئے۔'' امی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''مگر کیوں؟ میں جو کر رہی ہوں۔ پھر اسے خوامخواہ خوار ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ گھر میں کون رہے گا اور.....؟''

''تم جو بھی کرو، وہ خوب بلکہ بہت خوب۔ میں نے یا امی نے یا کسی اور نے کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا کہ تم نوکری کیوں کرتی ہو۔ اصل میں تمہیں ہمیشہ ہی سے میڈل پہننے کا شوق رہا ہے۔ اس میں کوئی اور حصے دار بنے، یہ تمہیں گوارا نہیں۔'' کتنے ماہ کی چپ اس کی زبان سے زہر بن کر اُگلنے لگی۔ نیہاں حیرت سے غصے میں بولتی نیلم کو دیکھے گئی۔ نوالہ اس کے ہاتھ ہی میں رہ گیا۔

''نیلم! دماغ خراب ہو گیا ہے تیرا، جو بڑی بہن سے اول فول بک رہی ہے۔'' امی نے پیڑا بناتے ہوئے اسے جھاڑا۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا مطلب تو.....'' نیہاں نے کھنکھار کر گلا صاف

کرتے ہوئے وضاحت کرنا چاہی۔

''میرے ساتھ ہمیشہ ہی۔ ہمیشہ میرے ساتھ کیوں غلط فہمی ہوتی ہے؟'' وہ تیز لہجے میں چیخی۔

''ابا کو میں نے مارا، تم نے سارے جگ میں اس کا ڈھنڈورا پیٹا اور جب میں صفائیاں دے دے کر تھک گئی سب کو کہ میں نے ایسا نہیں کیا تو تم نے آرام سے کہہ دیا کہ غلط فہمی ہوئی ہے مجھے۔ تمہارے کہنے کا وہ مطلب نہیں تھا جو میں نے سمجھا۔'' اُس کی آنکھوں میں نیہاں کے لئے مروّت، احساس کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ جیسے سارے حساب چکا دینا چاہتی تھی آج ہی۔

''نیلم! تم خوامخواہ بات کو بڑھا رہی ہو۔'' نیہاں نے لہجے کو پست ہی رکھا۔

''میں بڑھا رہی ہوں بات کو۔ ہاں میں ہی بڑھاتی ہوں۔'' وہ پھر سے دھاڑی۔

''اس سارے مسئلے میں گڑے مُردے اُکھاڑنے کی کیا تک ہے بھلا؟ چلو جاؤ، اندر جا کر تیار ہو جاؤ۔ تم بھی شوق پورا کر لو۔ نوکری جتنی بڑی کو مل گئی ہے اور اُس نکمے کو مل گئی ہے۔'' امی نے روٹی بیل کر پلیٹ میں پٹختے ہوئے اسے جھڑکا۔

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں امی! جبکہ اس کا بی اے کا رزلٹ بھی آؤٹ نہیں ہوا، اس طرح جاب کہاں ملے گی؟'' نیہاں نے کہا۔

''معلوم ہے مجھے، تم میری فکر میں دُبلی نہ ہو۔ تمہارے پاس تو ڈگری ہے، پھر تمہیں جاب کیوں نہیں مل رہی؟'' وہ اسی ترش لہجے میں بولی۔

''اچھا بابا جاؤ۔ کوئی نہیں روکتا تمہیں۔ جب شہر کی کوتوالی مل جائے گی تو ہمیں بھی خبر کر دینا۔'' امی نے اُکتا کر کہا۔

''اچھا امی! میں جا رہی ہوں۔ مجھے دیر ہو گئی ہے۔'' نیہاں کی نظر ایک دم سے گھڑی پر پڑی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے چائے تو پی جاؤ۔ روٹی بھی پوری نہیں کھائی۔''

''نہیں امی! دیر ہو گئی ہے۔ ادھر جا کر چائے پی لوں گی۔'' اس نے اندر جا کر جوتی پہنی، بیگ لیا اور دوپٹہ اوڑھتے ہوئے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئی۔

''بس سکون آ گیا؟ وہ خالی پیٹ چلی گئی۔ اب تالیاں پیٹو۔'' امی نے تیز نظروں سے نیلم کو گھورا۔

''بس اسی کا خیال ہے۔ اسی کا احساس۔ یا واثق پیارا ہے یا نیہاں۔ ہمیں تو جیسے

کوڑے سے اٹھایا تھا، ہونہہ!'' وہ بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی۔

''واثق؟'' امی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''میرا بچہ، میرا لعل پتہ نہیں کہاں ہوگا۔ کچھ خبر ہی مل جائے۔ ہائے میرے بے قرار دل کو قرار آ جائے۔ واثق!'' وہ گھڑی گھڑائی روٹی کو ہاتھ میں بھینچ کر رونے لگیں۔

❖❖○❖❖

کام کے دوران بھی اس کا جی اُلجھا سا رہا۔ پتہ نہیں یہ نیلم ایسا کیوں کرتی ہے؟ آخر وہ اس بات کو بھول کیوں نہیں جاتی؟ ہزار بار کی سوچی ہوئی بات کو اس نے سوچا، مگر نیلم کو کون سمجھا سکتا تھا؟ اس نے تو جیسے نیہاں کی بات کو نہ سمجھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

واثق کس قدر غیر ذمہ دار نکلا ہے۔ اسے امی کا بھی خیال نہیں آیا۔ کم از کم وہ اس سے تو غیر مشروط پیار کرتی تھیں۔ اب تو چار ماہ ہونے کو آئے ہیں۔ والدین کے جانب دار رویے اولادوں کے درمیان کس طرح ذہنی دُوریاں پیدا کرتے ہیں، اس کا خیال نہ ابا کو تھا، نہ امی کو۔ میں ابا کی لاڈلی اور واثق امی کا۔ نیلم کی ضدی اور چڑچڑی طبیعت کی وجہ سے اسے دونوں سے اکثر ڈانٹ پڑتی، اسی چیز نے اسے مجھ سے اور واثق سے دور کر دیا۔ اور پھر وہ واقعہ..... اُس نے گہرا سانس لے کر فائل کھولی۔

ان ہی اُلٹی سیدھی سوچوں نے اسے سارا دن پریشان رکھا۔ دو بار عظیم صاحب نے اسے ٹوکا کہ اس کا دھیان کام کی طرف کیوں نہیں ہے۔ وہ ہر بار سوری کہہ کر سر جھکا لیتی۔ دوپہر لنچ کرنے کو بھی دل نہ چاہا۔ دو تین بار چائے منگوا کر پی۔

'آخر ہماری پریشانیاں ختم کیوں نہیں ہوتیں؟ لوگ کتنی سہولت سے زندگی گزارتے ہیں۔ ایک ہم ہیں۔'

اس نے تیسرا چائے کا کپ ختم کرتے ہوئے سوچا۔ اس کا ذہن اس وقت بالکل یاسیت زدہ ہو رہا تھا۔ تھکا دینے والی سوچیں۔ خود ہی سوال، خود ہی جواب والی کیفیت تھی۔

''نیہاں! آج آپ مینٹلی بالکل پریزنٹ نہیں ہیں، اس لئے آج آپ گھر جا کر کچھ ریسٹ کریں۔'' عظیم صاحب جانے کب سائیڈ آفس سے نکل آئے تھے، اسے دیکھ کر بولے۔

''نو سر! ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ یکدم گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔

''نہیں، ایسی ہی بات ہے۔ پلیز، آپ آف کریں۔ اب میں بھی جا رہا ہوں۔ کچھ

خاص کام بھی نہیں ہے۔ آج مجھے اپنی فیملی کے ایک فنکشن کو ہر صورت اٹینڈ کرنا ہے۔ کل ویسے ہالی ڈے ہے، اس لئے دو دن ریسٹ ہو جائے گا، اوکے!'' انہوں نے اپنی ٹیبل کی درازوں کو لاک لگاتے ہوئے کہا۔

''سر! آپ غصے سے تو نہیں کہہ رہے؟'' وہ ذرا ڈر کر بولی۔

''ارے نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ اور مجھے تو ویسے بھی غصہ بہت کم آتا ہے۔ اتنے دنوں میں آپ کو اندازہ تو ہو ہی گیا ہوگا۔'' وہ کھڑے ہو گئے۔

''جی سر!''

دفاتر آف ہونے کا ٹائم تھا۔ سڑک پر ٹریفک کا رش بہت زیادہ تھا۔ موسم بدلنے کی وجہ سے شام اب کافی سہانی ہونے لگی تھی۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ سورج اُفق کی طرف سمٹ رہا تھا۔ وین سگنل پر رکی۔ وہ کھڑکی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ لمبی لمبی گاڑیاں اور ان میں بیٹھے بے فکرے چہرے۔ یا شاید اسے ہی لگ رہے تھے۔ ورنہ فکر سے آزاد تو کوئی نہیں۔

'آں.....' اُس کی سانس جیسے اٹکنے لگی۔

میرون شیراڈ کے دوسری طرف موٹر بائیک پر کسی کی پشت سے چمٹی وہ رائمہ ہی تھی۔ سڑک پر بھاگتی دوڑتی ٹریفک کا ایک عام سا منظر۔ اسی وقت گرین لائٹ آن ہوئی۔ گاڑیاں پی پاں ہارن بجاتی ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے لگیں۔ لڑکے کو وہ ٹھیک طرح سے نہیں دیکھ سکی تھی، پھر بھی اسے لگا کہ اس کا چہرہ دیکھا ہوا ہے۔ اور جب وہ گھر کی گلی مڑنے لگی، اس کی نظر وینس وڈیو شاپ پر پڑی، اسے یاد آیا کہ وہ لڑکا ادھر ہی بیٹھا کرتا ہے۔ آتے جاتے اُس کی نظر ادھر پڑ جایا کرتی تھی۔

چھ بجنے والے تھے جب وہ گھر میں داخل ہوئی۔ اکتوبر کا دوسرا ہفتہ تھا۔ سرِ شام ہی دھوپ ڈھلنے لگتی اور گہری شام کا احساس ہونے لگتا تھا۔

''امی! رائمہ نہیں آئی بھی؟'' سعیہ کے کُرتے کی سلائی کرتی امی سے اس نے پوچھا۔

''نہیں۔'' انہوں نے ایک لمحے کو مشین روک کر کہا۔

''کیوں؟ اتنی شام تو ہوگئی ہے۔ اس وقت کالج کھلا ہوتا ہے؟''

''کہہ رہی تھی کہ آج پریکٹیکل ہے کوئی اس کا۔ دیر سے آئے گی۔'' روایتی بھولی ماؤں والا جواب تھا امی کا۔ اُسے غصہ آ گیا۔

''اس نے پریکٹیکل والا ایسا کون سا سبجیکٹ رکھ لیا ہے جو شام گئے تک جاری رہتا ہے؟ مر مر کر تو سیکنڈ ڈویژن آئی تھی اُس کی میٹرک میں۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''تم کپڑے تو بدل لو۔ آتی ہی ہو گی۔ پوچھ لینا۔'' وہ لاپروائی سے بولیں۔ ''میں ذرا ہنڈیا تو دیکھ لوں۔ یہ نیلم کی ٹیوشن ابھی ختم نہیں ہوئی۔ یہ پچھلی طرف میاں صاحب ہیں نا، ان کی بیٹی کو پڑھانے جا رہی ہے کل سے۔ پانچ سو روپے دیں گے گھر آ کر پڑھانے کے۔'' یہ اس کے لئے نئی اطلاع تھی۔

''امی! کیا مجھ سے مشورہ کرنا بھی اس نے مناسب نہیں سمجھا؟'' وہ ان کے پیچھے برآمدے میں بنے کچن تک آ گئی۔ ''آپ کو پتہ ہے، ادھر کا ماحول کس قدر خراب ہے۔ اس طرح گھر سے نکلنا.....''

''ساری حیل حجت میرے لئے ہے۔ یہاں کا ماحول بھی خراب میرے لئے ہے۔ تم بھی تو اتنے عرصے سے آ جا رہی ہو تو تمہارے لئے اس ماحول میں کوئی خرابی نہیں۔ آخر میرے ہی کچھ کرنے پر اعتراض کیوں کیا جاتا ہے؟''

نیلم بیرونی دروازے سے اندر آتے ہوئے اسی ازلی کڑوے پن سے بولی۔ اس نے شاید نیہاں کا آخری جملہ سن لیا تھا۔

''نیلم! آخر تم میری ہر بات کا غلط مطلب کیوں اخذ کرتی ہو؟'' وہ عاجز آ کر بولی۔

''یہ سوال تم اپنے آپ سے بھی کر سکتی ہو۔'' وہ اسی لہجے میں کہتی ہوئی اندر چلی گئی۔

امی دونوں کی بحث سے لاتعلق ہنڈیا بھوننے میں مصروف تھیں۔

اسی وقت رائمہ بیرونی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اس نے دونوں کے قریب آ کر سلام کیا اور کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے چہرے پر مٹے مٹے سے میک اپ کے نشان تھے اور انداز میں ایک عجیب سا الہڑ پن۔ وہ اُسے غور سے دیکھنے لگی۔ نیلم کپڑے بدل کر باہر آ گئی۔

''امی! سنیعہ کہاں ہے؟'' وہ امی کے پاس پیڑھی پہ آ کر بیٹھ گئی۔

''اندر بیٹھک میں سو رہی ہے۔ اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ زکام ہو رہا ہے۔''

نیہاں اندر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ رائمہ دوپٹہ اُتار کر آئینے کے سامنے کھڑی اپنی سیاہ زلفوں کو جھلا کر برش کر رہی تھی۔ انداز شوخ سا تھا اور کچھ بے نیاز سا بھی تھا کہ نیہاں کو دیکھ کر بھی نہ جھجکی تھی۔

''آپی! آج جلدی آ گئیں آپ؟'' کہہ کر اس نے الماری کے پٹ کھولے۔

''میں جلدی آ گئی ہوں اور تم؟'' وہ اُس کے سر پر جا کھڑی ہوئی۔ لہجہ بے حد مدھم تھا۔ ''اس وقت کون سا کالج کھلا ہوتا ہے؟'' اس نے رائمہ کو کندھے سے پکڑ کر سختی سے اپنی طرف گھمایا۔

''میرا پریکٹیکل تھا۔'' اس کا لہجہ لڑکھڑا گیا اور نیہاں کے تیور دیکھ کر رنگ اُڑ سا گیا۔

''شٹ اپ یو ایڈیٹ گرل۔'' اس نے زور سے اسے پیچھے الماری کی طرف دھکا دیا۔ ''کون تھا وہ جس کے ساتھ ابھی تم ماں باپ کی عزت کو سڑکوں پر اُچھال کر آئی ہو؟'' اس کی آواز پتھریلی تھی۔

''کک..... کون؟..... مم..... مجھے تو نہیں پتہ..... میں تو کالج سے.....'' اس کے منہ سے بے ربط لفظ نکلنے لگے۔

''کالج۔'' اس نے زناٹے کا تھپڑ اس کے گال پر مارا۔ تھپڑ بے حد کرارا تھا۔ رائمہ کا پورا چہرہ گھوم گیا اور حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ تھپڑ کی آواز شاید باہر بھی گئی تھی۔ ویسے بھی کمرہ کون سا برآمدے سے میلوں دور تھا۔

''کیا ہوا ہے؟'' امی کی آواز آئی۔

''بولو کون تھا وہ؟'' اس کا لہجہ سخت اور آواز ابھی بھی پست تھی۔

''مجھے نہیں پتہ۔ میں تو کالج.....'' وہ سسکی۔

''پھر بکواس۔'' اس نے اسے الماری سے پرے دھکا دیا۔ ''یہاں روٹی کے لالے پڑے ہیں، ہاں مگر ایک عزت باقی ہے اور تم اسی کو بیچنے چلی ہو۔ بولو کون تھا وہ؟'' اب کے اس نے رائمہ کو زور سے جھنجوڑ ڈالا۔

''وہ..... وہ.....'' اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ ''وہ اشعر ہے۔ ادھر گلی میں وڈیو شاپ ہے اس کی۔'' وہ سر جھکا کر بولی۔

''اس کی وڈیو شاپ ہے اور تم اس کے ساتھ ہماری عزت کی وڈیو بنوانے نکل پڑیں۔ تمہاری نظرِ انتخاب اتنی گری ہو گی، یہ مجھے علم نہ تھا۔'' وہ نفرت سے بولی۔

''آخر ہوا کیا ہے؟ کیوں اس بے چاری کو آتے ہی پیٹنے لگی ہو؟'' امی دروازے میں آ کر غصے سے بولیں۔

''یہ اپنی اس لاڈلی سے ہی پوچھیں۔'' وہ جیسے تھک کر بولی۔ ''یہ ساری شام باہر گزار کر آتی ہے اور آپ غافل ہیں۔''

''کیا ہوا ہے؟'' امی، رائمہ کے پاس آ کر بولیں۔

''کچھ نہیں۔'' وہ سر اُٹھا کر جیسے چیخ کر بولی۔

''بدتمیز! بے ہودہ! یہی پڑھنے جاتی ہے کالج۔ ماں سے بات کرنے کی تمیز نہیں۔'' امی کو غصہ آ گیا۔

''یہ تو اور بھی بہت کچھ پڑھنے جاتی ہے، آپ ہی کو خبر نہیں۔'' اس نے سلگ کر نیہاں کو دیکھا۔

''تم تو ابھی فرسٹ ایئر میں ہو اور گھر میں بھی کوئی ایسی سونے کی کان نہیں لگ رہی کہ فوراً تمہیں بیاہ دیں۔ پھر اس اسٹریٹ رومانس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ کچھ تو سوچا ہو گا تم نے اس کے ساتھ سڑکوں سڑکوں گھومنے سے پہلے۔'' نیہاں کرسی پر بیٹھتے ہوئے طنز سے بولی۔ رائمہ چپ رہی۔

''کیا کہہ رہی ہو تم؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔'' امی گھبرا کر بولیں۔

''آپ کی لختِ جگر خیر سے اب جوان ہو گئی ہے اور آپ کو خبر بھی نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' نیلم بھی اندر آ چکی تھی۔

''گلی کے کسی لفنگے کے ساتھ موٹر سائیکل پر سیریں فرما رہی تھیں محترمہ۔''

''لفنگے'' پر رائمہ نے تڑپ کر نیہاں کو دیکھا۔

''ہائے میرے اللہ! یہ سختی آنے کو رہ گئی تھی نامراد! یہ کیا کرنے چلی تھی تو؟ ارے بڑی بہن کی مثال نہیں تیرے سامنے؟ برسوں سے باہر اندر آ جا رہی ہے۔ کوئی شکایت سنی کہیں اس کی؟ محلے والے اس کی شرافت کی گواہی دیتے ہیں۔ اور تو چلی ہے ہماری عزت کو بٹہ لگانے۔'' امی نے اسے دو تھپڑوں سے پیٹ ہی ڈالا۔

''چھوڑیں امی! مجھے اس سے بات کرنے دیں۔ جب یہ شام کے پانچ پانچ بجے گھر آتی تھی، اس وقت تو آپ نے اس سے باز پرس نہیں کی۔ اور اب سب.....'' وہ چپ کر گئی۔

''ہاں بولو، کون سے سبز باغ دکھائے ہیں اُس گلفام نے تمہیں؟'' وہ براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

رائمہ کا سر جھک گیا۔

''کیا پوچھ رہی ہوں میں؟ روز روز سڑک والا تماشا نہیں دیکھ سکتی میں۔ اور کالج جانا تو اپنا تم اب بند سمجھو۔ بہت پڑھائیاں ہو گئیں۔'' اس کا لہجہ حتمی تھا۔

''ہاں بولو، کیا کہتا ہے وہ؟''

''وہ اپنی امی کو بھیجے گا۔'' وہ دیدہ دلیری سے بولی۔

''ہاں، شادی کے لئے۔ چلیں امی ایک فرض سے تو سبکدوش ہوں۔''

''بے حیا! بے شرم! دیدے کی شرم مر گئی تیری۔'' امی نے ایک زوردار مُکا اُس کی کمر میں دے مارا۔

''اچھا اس سے کہو، دو دن کے اندر اپنی ماں کو بھیجے ورنہ پھر میں اسے دیکھ لوں گی اور تمہیں بھی۔'' وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اور اس سے کہنا کہ یہ نہ سمجھے کہ یہاں سر پر باپ بھائی نہیں، ہم کچھ کر نہیں سکتے۔ اتنی ہمت ہے مجھ میں کہ اس کو بھرے بازار میں مزہ چکھا سکوں، اس گھٹیا عشق جھاڑنے پر۔'' اس کا انداز دھمکی آمیز تھا۔

''امی! مجھے ایک کپ چائے کا بنا دیں۔ اور ہاں، کل سے اس کا کالج جانا بند۔ پرائیویٹ امتحان دینے چاہے گی تو کوئی پابندی نہیں۔ اگر چاہے گی تو۔'' وہ جاتے جاتے بولی۔

''ہاں تو صحیح ہے۔ فیسیں اس کے گلچھروں کے لئے ہیں؟ کوئی ضرورت نہیں کالج کا ڈرامہ کھیلنے کی۔'' امی بھی اسے گھورتے ہوئے بولیں۔

❖❖○❖❖

اگلے دن صبح وہ آفس جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی، جب پوسٹ مین اُس کا اپائنٹمنٹ لیٹر لے کر آیا، لیکچرر شپ کے لئے۔ لیکن کالج کا نام پڑھ کر اس کی خوشی پر اوس گر گئی۔ وہ لفافہ بیگ میں رکھ کر آفس کے لئے نکل آئی۔

''سر! یہ دیکھیں، یہ میری تقرری کا لیٹر آیا ہے۔ مگر اتنی دور میں کیسے جا سکتی ہوں؟'' اس نے لفافہ عظیم صاحب کے آگے رکھا۔ وہ کھول کر کاغذ پڑھنے لگے۔

''شاہ پور کون سا پاکستان کے نقشے کے باہر ہے؟ یہاں سے تین سے چار گھنٹوں کا سفر ہے اور بس۔ پھر پنجاب کے اندر ہی ہے نا۔ میں سمجھا، جانے کدھر تمہاری تقرری ہو گئی۔'' وہ اطمینان سے بولے۔

''نو سر! بہت مشکل ہے۔ ایک تو وہاں رہائش کا مسئلہ، دوسرے آج کل گھر کے حالات کچھ اس طرح کے ہیں کہ میں جا نہیں سکتی۔'' کل کا واقعہ اسے پھر سے یاد آ گیا۔

''سر! آپ کسی پراپرٹی ڈیلر سے بات کر کے ہمیں کسی اچھے، میرا مطلب ہے درمیانی علاقے میں گھر تو کرائے پر لے دیں۔ اس علاقے کا ماحول اب بالکل رہنے کے قابل نہیں ہے۔ آپ کا بڑا احسان ہو گا۔'' وہ سوچ سوچ کر بولی۔

"درمیانے علاقے میں گھر۔" وہ جیسے خود سے بولے۔ "آپ کے گھر میں کون کون ہے؟"

"سر! میری والدہ اور تین چھوٹی بہنیں۔"

"پھر تو مسئلہ حل ہو گیا۔"

"کیا مطلب؟"

"ابھی ابھی عمر دراز آیا تھا میرے پاس۔ اصل میں اس کی اکیڈمی سے کال آئی ہے۔ مگر اس کی والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں، ان کی دیکھ بھال کے لئے کسی کو ان کے پاس ہونا چاہئے۔ کوئی اچھی ہمدرد ملازمہ مل نہیں رہی اور وہ بھی اتنی جلدی۔ اور اس طرح ماں کو چھوڑ کر جا نہیں سکتا۔ ان کی کوٹھی کا اوپر والا پورشن خالی ہے۔ دو کمرے تم لوگ لے لو۔ گلبرگ میں ہے ان کا گھر۔" انہوں نے تفصیل سے بتایا۔

"نو سر! میں یہ افورڈ نہیں کر سکتی۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"ارے بھئی کرایہ مناسب ہو گا۔ بلکہ سمجھو، نہ ہونے کے برابر۔ اصل میں گھر میں کسی نگران کی ضرورت ہے جو گھر کی دیکھ بھال بھی کر سکے اور اس کی والدہ کا خیال بھی رکھ سکے۔"

"نو سر! مجھے یہ مناسب نہیں لگتا۔"

"کیا مناسب ہے اور کیا غیر مناسب، یہ میں بہتر جانتا ہوں۔ تم بس آج جا کر شفٹنگ کی تیاری کرو۔ میں ابھی عمر دراز سے بات کرتا ہوں۔ وہ بہت پریشان گیا ہے۔ پرسوں اسے اکیڈمی جانا ہے۔ کل میں اپنے آفس سے ایک، دو بندوں کو بھیج دوں گا، سامان وغیرہ اُٹھوا لیں گے۔" وہ فوراً ہی سارا کچھ طے کر کے بولے۔

"لیکن سر!"

"بس میں نے کہہ دیا۔ اب کوئی تکرار نہیں ہو گی۔ اور شاہ پور جانے کی تیاری کرو۔ ایسے مواقع بار بار نہیں آتے۔"

"لیکن سر! وہاں رہائش کا مسئلہ ہے نا؟"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میرا ایک کزن ہے وہاں فیضان احمد۔ بڑی اچھی فیملی ہے۔ بس ایک بیٹی ہے اور بیٹا تو ادھر لاہور ہی میں ہوتا ہے۔ میں اسے فون بھی کر دوں گا اور خط بھی تمہیں لکھ کر دے دوں گا۔ تم بس اللہ کا نام لے کر تیاری پکڑو۔ اور آج سے

تمہاری ادھر سے چھٹی۔ ویسے بھی رعنا اگلے ہفتے آ جائیں گی۔ تم اب گھر جا کر شفٹنگ کی تیاری کرو۔" وہ ہاتھ اٹھا کر سارا کچھ طے کر کے بولے۔

"لیکن سر!" سارے مسئلے جیسے ایک دم ہی سلجھ گئے اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"پھر وہی لیکن۔ کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے؟"

"وہ تو ہے سر!"

"تو بس پھر سب کچھ اللہ پر چھوڑ دو۔ کوئی فکر نہ کرو۔ سمجھو تمہارے مسائل اختتام پذیر ہونے والے ہیں۔ کچھ عرصہ اُدھر جاب کر لو، پھر اِدھر ٹرانسفر ہو جائے گی۔ میں کوشش کروں گا۔ بس اب اُٹھ جاؤ۔"

وہ خاموشی سے انہیں تکے گئی۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ واقعی ان کی شکل میں خدا نے اس کے مسائل کا حل بھیج دیا تھا۔ صبح تک جو وہ مسائل کے انبار تلے دبی بے حد پریشان تھی، وہ سارے مسئلے ایک ہی پل میں سلجھ گئے تھے اور اچھے وقت کو ہنس کر ویلکم کہنا چاہئے، وہ بھی ہنس پڑی۔

"تھینک یو سر!" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"یو ویلکم۔" مسکرا کر کہتے ہوئے وہ اپنے آگے پڑی فائل کھولنے لگے۔ "اینڈ گڈ لک۔"

"او کے سر! میں چلتی ہوں۔ خدا حافظ۔" کچھ دیر بعد وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔

وہ گھر میں داخل ہوئی۔ نیلم بیٹھک کی جھاڑ پونچھ کر رہی تھی۔ اس کے سرد رویے کی وجہ سے نیہاں نے بھی اس سے بولنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ خاموشی سے اندر جانے لگی۔

"وہ اشعر کی ماں آ رہی ہے ابھی تھوڑی دیر میں۔ امی چائے کا سامان لینے گئی ہیں۔" اس نے پیچھے سے جیسے اسے اطلاع دی تو اسے جھٹکا سا لگا۔ اس نے مڑ کر نیلم کو دیکھا۔ وہ اطلاع نشر کر کے پھر اپنے کام میں مگن ہوئی تھی۔ نیہاں کمرے کی طرف آ گئی۔ باتھ روم میں پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔

"لگتا ہے، رائمہ بی بی غسل فرما رہی ہیں۔" اس نے قیاس کیا۔

اسی وقت امی کے پیچھے ایک اجنبی عورت اندر داخل ہوئی۔ چہرے مہرے سے ہی وہ ایک خرانٹ عورت لگ رہی تھی۔ چہرے پر عمر رفتہ کے نشان مٹانے کے لئے میک اپ کیا نہیں بلکہ تھوپا گیا تھا۔ جھریوں بھرے سانولے چہرے پر تیز سرخ رنگ کی لپ

اسٹک عجیب سی لگ رہی تھی۔ وہ سوالیہ نظروں سے امی کی طرف دیکھنے لگی جو دو تین شاپرز اٹھائے کھڑی تھیں۔ انہوں نے دو قدم آگے بڑھ کر شاپرز بینچ کے دروازے میں کھڑی نیلم کو تھمائے اور خود خوامخواہ ماتھے سے پسینہ صاف کرنے لگیں۔

''میں اشعر کی ماں ہوں۔'' اس عورت کی آواز بھی خاصی بھاری تھی۔

''آیئے آیئے بہن! اندر آیئے۔'' امی خوش دلی سے اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔ وہ دو قدم آگے بینچ کی طرف بڑھی۔

''میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی ہوں۔ بس دو باتیں کرنے آئی ہوں تم ماں بیٹیوں سے۔'' اس کا انداز تنفر لئے ہوئے تھا۔ وہ ایک لمحے کو رُکی۔

''ہم عزت دار اور شریف لوگ ہیں اور تم خدا جانے کہاں سے اُٹھ آئی ہو اور کس ارادے سے اس محلے میں آ کر رہنے لگی ہو۔ تمہاری یہ بیٹی تو غالباً کوئی دھندا کرتی ہے، جو صبح کی گئی کبھی شام اور کبھی رات ڈھلے لوٹتی ہے اور اب تو دوسری بھی میدان میں اُتر آئی ہے۔'' اس نے واضح طور پر نیہاں اور نیلم کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور تیسری کو اس مقصد کے لئے تُو نے کالج میں ڈال دیا ہے کہ جاؤ اور جا کر شریف گھروں کے دولت مند لڑکے پھانسو۔ تو میری بات غور سے سن لو، میں تمہارے اس مقصد کو بڑی اچھی طرح سے سمجھ گئی ہوں۔ ارے کیسی بے حیا ماں ہو تم، بیٹیوں کو کس کام پر لگا دیا ہے؟ پر یہ شریفوں کا محلہ ہے، یہاں یہ سب نہیں چلے گا۔ یہاں سے تھوڑا ہی دُور جائیں تو تمہیں تمہارے مطلب کا علاقہ مل جائے گا اور اپنے جیسی بھنگی ساتھی بھی۔ اس لئے یہاں سے سامان اُٹھواؤ اور اُدھر کوچ کرو شام سے پہلے۔ ورنہ ہم محلے سے تمہارا سامان اٹھا کر باہر پھنکوا دیں گے۔ سن لیا تم لوگوں نے؟''

وہ اپنی پاٹ دار آواز میں گھن گرج کے ساتھ سنگ باری کر رہی تھی۔ امی کا تو جسم کانپنے لگا۔ وہ گرنے کو تھیں۔ نیلم نے آگے بڑھ کر انہیں تھام لیا اور نیہاں کی تو جیسے تمام حسیات سُن ہو کر رہ گئی تھیں۔

''میرا خیال ہے، تھوڑی سی بھی غیرت ہو گی تو یہاں سے دفعان ہو جاؤ گی۔ اور اپنی بیٹی کو بھی پٹہ ڈالو۔ آئندہ جو میرے بچے کو بہکانے کی اس نے کوشش کی تو بھرے بازار میں اس کی چوٹی مروڑ دوں گی۔ سنا تم نے؟'' وہ نفرت سے کہتے ہوئے باہر کی طرف بڑھی۔

''بات سنو میری علاقے کے شریفوں کی ٹھیکے دارنی! جاؤ جا کر پہلے اپنے اس لفنگے

سپوت کو پٹہ ڈالو جو شریفوں کی بیٹیوں کو اپنی گندی ذہنیت کے گند میں اُلجھا رہا ہے۔ اور بدمعاشی کا جو اڈہ وہ اس محلے کی نکڑ پر کھول کر بیٹھا ہے، یہ نہ سمجھنا اس کے کالے کاروبار سے کوئی واقف نہیں۔ وڈیو کیسٹوں کی آڑ میں منشیات فروشی اور عصمت فروشی جیسے گھناؤنے کام کر رہا ہے۔ آج میں ایک فون کر دوں، ساری عمر سلاخوں کے پیچھے سڑتا رہے گا اور تمہارا یہ سرخی پاؤڈر اس کا ضمانتی ڈھونڈنے میں، عدالت کچہریوں کے چکروں میں بہہ جائے گا تو تمہیں پتہ چلے گا کہ ایسی نیک اولاد جس کے کرتوتوں سے تم بے خبر ہو، تمہارے منہ پر ایک طمانچے کی طرح ہے، اگر تم سمجھو تو۔ ورنہ بے غیرتوں کی تو کوئی کمی نہیں۔ ایک تم بھی سہی۔ اور اب تم یہاں سے دفع ہو جاؤ، ورنہ میں دھکے دے کر نکال دوں گی ادھر سے۔'' اس نے آگے بڑھ کر اسے باہر کی طرف دھکیلا۔

''تم اپنے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لئے میرے بیٹے پر الزام تراشی کر رہی ہو۔ میں تمہیں اس کا مزہ چکھاؤں گی۔ میں تمہاری گیدڑ بھبکیوں میں آنے.....''

''دفع ہو جاؤ یہاں سے گھٹیا عورت، ہم تم جیسوں کے منہ نہیں لگنا چاہتے۔ گند میں پتھر پھینکو تو اپنے ہی کپڑے گندے ہوتے ہیں۔''

اس نے اسے باہر دھکیل کر دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔ اس کا سانس پھول رہا تھا، وہ ایک لمحے کے توقف کے بعد بھاری قدموں سے اندر کی طرف بڑھی۔ امی کرسی پر گری نیم بے ہوشی کے عالم میں گہرے گہرے سانس لے رہی تھیں۔ نیلم ان کی ہتھیلیاں مل رہی تھی اور دروازے میں گیلے بال لئے رائمہ سر جھکائے کھڑی تھی۔

❖❖○❖❖

اس واقعہ کے اگلے روز ہی وہ لوگ عمر دراز کی کوٹھی کے اوپر والے پورشن میں شفٹ ہو گئے۔ پورشن دو کمرے اور ایک لاؤنج پر مشتمل تھا۔ عمر دراز کی والدہ اونچے لمبے قد کی ایک دیہاتی عورت تھی۔ نقوش کھڑے کھڑے، گہری آنکھیں، گندمی رنگت اور کھلے کھلے ہاتھ پاؤں والی، جن کے لہجے میں ملائمت مفقود تھی۔ وہ عام سی بات بھی کرخت لہجے میں کرتی تھیں یا شاید محسوس ایسے ہوتا تھا۔ وہ ان کے ادھر آنے سے کچھ زیادہ خوش نہیں لگتی تھیں۔ ہاں، عمر دراز خوش تھا۔ وہ شکل وصورت، لب و لہجے میں کسی بھی طرح ماں سے میل نہیں کھاتا تھا۔ شاید وہ اپنے باپ سے مشابہہ ہو۔ اگلے روز وہ اکیڈمی چلا گیا۔ انہیں گھر کی سیٹنگ میں تین چار دن لگ گئے۔

اگلے ہفتے وہ عظیم صاحب کا خط لے کر شاہ پور اُن کے کزن فیضان احمد کی طرف

روانہ ہوگئی۔ یوں اس طرح اکیلے سفر کرنے کا اس کا پہلا تجربہ تھا۔ لیکن اب تو یہ سب کرنا ہی تھا۔ اس نے سر جھٹک دیا۔

فیضان صاحب، عظیم صاحب کی طرح ہی مہربان اور خوش اخلاق تھے، عظیم صاحب کا خط انہوں نے توجہ سے پڑھا۔

''بیٹا! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ تمہاری ادھر تقرری ہوئی ہے۔ ہم لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ ادھر ہاسٹل کی تعمیر شروع ہو جائے۔ بس اب یہ تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ بہرحال تم جب تک مرضی ہے، ہمارے اس غریب خانے میں رہو۔ میری بیٹی فرسٹ ایئر کی طالبہ ہے۔ رانیہ نام ہے اس کا۔ ابھی کالج سے آتی ہوگی۔ تمہیں اس سے مل کر خوشی ہوگی۔ تم اپنا سامان رکھو، منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ تو میں چائے بنواتا ہوں اور تمہارے لئے رانیہ کے ساتھ والا کمرہ سیٹ کروا دیتا ہوں۔ اپنی آنٹی سے تو تم مل ہی چکی ہوگی۔''

''جی، انہوں نے ہی دروازہ کھولا تھا۔''

شکیلہ آنٹی اچھی تھیں، مگر فیضان صاحب جتنی نہیں۔ بہرحال اسے کیا لینا دینا تھا۔ وہ یہاں پے انگ گیسٹ کے طور پر آئی تھی۔

اگلے دن سے اس نے کالج جوائن کر لیا رانیہ اس کے آنے سے بے حد خوش تھی۔

''میں آپ کو آپی کہہ لیا کروں؟'' وہ الماری میں اپنے کپڑے سیٹ کر رہی تھی۔

''وائے ناٹ۔''

''مجھے بہت شوق تھا کہ میری کوئی بہن ہوتی۔ آپ اب یہیں رہیں گی نا؟'' وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔

''ہاں، ابھی تو فی الحال۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''فی الحال نہیں۔ اللہ کرے ہمیشہ آپ یہیں رہیں۔'' وہ بچپنے سے بولی۔

''یہ تو نہ کہو۔ مجھے واپس بھی جانا ہے رانیہ!'' وہ اس کے پاس آ بیٹھی۔

''آپی! بڑے شہروں میں مقناطیس فٹ ہوتے ہیں۔ وہاں رہنے والے اگر چھوٹے شہروں میں آ بھی جائیں تو فوراً واپس بھاگ جاتے ہیں۔'' وہ کچھ اُداسی سے بولی۔

''ارے نہیں، ایسا تو کچھ نہیں۔ تم کیوں اُداس ہو رہی ہو؟''

''میرے بھائی جان ہیں نا۔ ادھر لاہور میں پڑھنے گئے تھے، پھر واپس ہی نہیں آئے۔ بابا اور امی سے ان کی ضد چل رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں ان دونوں سے کہ آپ بھی

شہر آ جائیں جبکہ بابا اپنا آبائی شہر چھوڑنا نہیں چاہتے۔ بس اسی ضد میں وہ ناراض ہو گئے ہیں۔ میں اور امی اُنہیں بہت مس کرتے ہیں۔''

''اوہ..... یہ تو اچھی بات نہیں ہوئی۔ خیر، تم فکر نہ کرو۔ وہ زیادہ دن ناراض نہیں رہیں گے۔ واپس آ جائیں گے۔ اتنے پیارے رشتوں سے کوئی زیادہ دن ناراض نہیں رہ سکتا۔ ڈونٹ وری۔''

اُسے تسلی دیتے دیتے اس کا اپنا جی بھر آیا۔ واثق کا نوجوان سراپا اس کی آنکھوں کے آگے لہرایا۔ ناراض ہو جانے والے، دُور چلے جانے والے بیٹے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ان کی ماؤں کی، گھر والوں کی راتیں ان کے بعد آنکھوں میں کٹتی ہیں۔

''بابا کا بھی یہی خیال ہے کہ وہ خود ہی آ جائیں گے۔ پھر اب تو انہوں نے لاہور میں جاب بھی کر لی ہے۔ گھر بھی لے لیا ہے اور گاڑی بھی خرید لی ہے یا شاید انہیں آفس کی طرف سے ملی ہے۔ انکل عظیم نے یہ سب ہمیں بتایا ہے اور اب وہ واپس نہیں آئیں گے، مجھے پتہ ہے۔ اور اگر آ بھی جائیں تو یہاں زیادہ دن نہیں رہ پائیں گے، بس جیسے مہمان آتے ہیں۔'' وہ جیسے رو دینے کو تھی۔

''بابا ضد چھوڑ دیں، آپ ان سے کہیں نا۔'' اُس کی اچانک فرمائش پر وہ حیران رہ گئی۔

''میں؟'' اُس نے شہادت کی انگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔

''رانیہ!..... رانیہ! کہاں غائب ہو گھنٹے بھر سے؟ ادھر آ کر میرے ساتھ سبزی بناؤ۔''

آنٹی شکیلہ کی تیز آواز پر وہ ایک دم سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

'عجیب لڑکی ہے۔' نیہاں اسے جاتا دیکھنے لگی۔ 'اور آنٹی شکیلہ، انہیں شاید میرا آنا اچھا نہیں لگا۔ اب میرا ادھر رہنا تو مجبوری ہے نا۔ انہیں چاہے اچھا لگے یا نہ لگے۔' وہ پھر سے الماری میں کپڑے سیٹ کرنے لگی تھی۔

❖❖○❖❖

اور وقت بے آواز قدموں کے سلیپر پہنے چپ چاپ گزرنے لگا۔ اُس کا لاہور جانے کا پروگرام بن رہا تھا۔ ادھر سے آئے اسے تقریباً تین ماہ ہو گئے تھے۔ اس دوران وہ صرف دو بار ایک دن کے لئے لاہور گئی تھی۔ اب اس کا چھٹیاں لینے کا پروگرام تھا۔ رمضان بھی تو آ رہا تھا۔ آخری روزے اور عید وہ لاہور ہی میں گزارنا چاہتی تھی کہ اچانک نیلم کا مختصر خط اُسے موصول ہوا۔

''جلدی پہنچو، ادھر امی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اور بھولی بسری کہانی ایک بار پھر نئے سرے سے اُبھر کر سامنے آئی ہے۔ ہم سب پریشان ہیں۔ جلدی آنا۔''

وہ خط پڑھ کر اُلجھ گئی۔ ''بھولی بسری کہانی'' تو ایک ہی تھی، جو اُن کی زندگی میں آئی تھی اور ان مٹ نقوش دلوں پر چھوڑ گئی تھی۔ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اُس کا دل گھبرانے لگا۔ اس نے اگلے ہی روز ایک ہفتے کی چھٹیاں لیں۔ گھر آ کر اس نے جلدی جلدی تیاری کی اور بیگ اٹھا کر فیضان انکل کے کمرے کی طرف آ گئی۔

''انکل! میں ایک ہفتے کے لئے گھر جا رہی ہوں۔ آپ کو بتانے آئی تھی۔ آنٹی اور رانیہ تو بازار گئی ہیں، اس لئے۔''

''چلو، میں تمہیں اسٹیشن تک چھوڑ آتا ہوں۔''

''نہیں شکریہ انکل! میں چلی جاؤں گا، پیچھے گھر اکیلا ہے۔''

''نواز موجود ہے۔ گھر کہیں نہیں بھاگا جا رہا۔ چلو، میں تمہیں چھوڑ آؤں۔''

وہ اُٹھ کھڑے ہوئے تو ان کی گود میں رکھی کتاب نیچے گر گئی۔ اس نے جلدی سے جھک کر کتاب اٹھائی، کتاب کے نیچے ایک تصویر پڑی تھی، شاید کتاب سے پھسل کر گری تھی۔ اس نے تصویر سیدھی کی۔

''ارے، یہ تو فراز کی تصویر ہے۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''تم جانتی ہو اسے؟'' فیضان صاحب نے تصویر لے کر کتاب میں رکھ دی۔

''جی انکل! ہم دونوں ایم اے میں کلاس فیلو رہ چکے ہیں۔''

انہوں نے ایک عجیب سی نگاہ سے اسے دیکھا۔ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

''چلو تمہیں دیر ہو رہی ہے۔'' وہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ کچھ حیران سی ان کے پیچھے چل پڑی۔

''بیٹا! اپنی امی کو میری طرف سے پوچھنا۔ شاید میرا اور تمہاری آنٹی کا چکر لگے لاہور کا اس دوران۔ ہم ضرور آئیں گے تمہاری طرف۔'' کوچ میں سوار کراتے ہوئے وہ بولے۔

''کیوں نہیں انکل! ضرور۔ اگر مجھے چھٹی بڑھوانی ہوئی تو میں آپ کو فون کر دوں گی۔''

''ہاں ہاں، عظیم کو میرا اسلام دینا اور میرا پیغام بھی۔''

''جی اچھا انکل! خدا حافظ۔'' کوچ چلنے کو تیار تھی۔

''خدا حافظ!''

شام ڈھلے وہ جب گھر پہنچی تو امی بخار میں بے سدھ پڑی تھیں۔ اس کے ایک دو بار پکارنے پر بمشکل آنکھیں کھول کر دیکھا۔

''اچھا کیا تم آ گئیں۔'' ان کی آواز بے حد کمزور تھی۔ وہ خود بھی اسے بہت کمزور لگیں۔

''امی!.....امی! کیا ہوا ہے آپ کو؟'' وہ ان کے پاس بیٹھتے ہوئے جیسے رو ہی پڑی۔

''السلام علیکم امی! کیا حال ہے اب آپ کا؟'' نیلم شاید باہر سے آئی تھی۔ کاٹن کا دوپٹہ اوڑھے، شولڈر بیگ کاندھے پر تھا۔

''وعلیکم السلام۔ کچھ بنا گھر کا؟'' امی بے قراری سے بولیں۔

''جی امی! اِنشاء اللہ ایک دو روز میں ہم یہاں سے شفٹ ہو جائیں گے۔'' وہ ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

''ایک دو روز میں..... میرا یہاں ایک ایک پل بھاری ہے اور تم کہتی ہو، ایک دو روز میں۔ نیلم!..... نیہاں! مجھے یہاں سے لے چلو۔ ادھر سے دُور۔ جلدی۔'' وہ رونے لگیں۔

''امی! ہم چلے جائیں گے ایک آدھ روز میں، آپ فکر نہ کریں۔ آپ اب آرام کریں۔ کچھ نہ سوچیں۔ رائمہ! امی نے دوا لی ہے؟'' اس نے کچن میں آٹا گوندھتی رائمہ کو پکارا۔

''ہاں، میں نے دے دی تھی، مگر کچھ خاص فرق نہیں ہے۔'' وہ بولی۔

''ہو جائیں گی ٹھیک، ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔'' نیلم ان کا سر دباتے ہوئے بولی۔

''نیلم! یہ گھر کا کیا چکر ہے؟'' نیہاں نے پریشانی سے پوچھا۔ اس نے منہ پر انگلی رکھ کر خاموشی کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر بعد امی سو گئیں تو دونوں اٹھ کر دوسرے کمرے میں آئیں۔

''میں کیا پوچھ رہی ہوں؟''

''تمہیں معلوم ہے، عمر دراز ابا کی پہلی بیوی کا بیٹا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں، جن کے بارے میں علم ہونے پر ہی ہمیں پہلی بار گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ اور اب پھر۔'' اس نے انکشاف کیا۔

''یہ..... یہ سب کیسے پتہ چلا؟..... کیا تمہیں یقین ہے؟'' وہ بے چینی سے بولی۔

''رائمہ، عمر دراز کی والدہ کی طبیعت پوچھنے ان کے بیڈ روم میں گئی، جہاں ابا کی

تصویر لگی تھی۔ وہ بے ساختہ کہہ بیٹھی، یہ تو ہمارے ابا کی تصویر ہے۔ بس پھر اس عورت نے جو طوفان اٹھایا۔ وہ تو اسی وقت مُصر تھیں کہ ہم یہ گھر ابھی خالی کر جائیں۔ امی کی منت سماجت پر بمشکل چار دن کی مہلت دی تھی اور وہ بھی پرسوں ختم ہو جائے گی اور گھر مل نہیں رہا ڈھنگ کا۔ آج میں ایک گھر دیکھ کر آئی ہوں، مجھے اچھا لگا ہے۔ مگر کرایہ زیادہ ہے۔ ساڑھے تین ہزار۔ بالکل چھوٹا سا ہے۔ صبح تم میرے ساتھ چلنا۔'' نیلم ایک دم سے اُسے بڑی بڑی سی لگنے لگی۔

''تم اکیلی گئی تھیں؟'' اس نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

''نہیں، عادل کو بلوا لیا تھا۔ اس کے ساتھ۔'' وہ سر جھکا کر بولی۔

''تم نے یہ سب مجھے کل پرسوں فون کر کے کیوں نہ بتایا؟''

''کوشش تو کی تھی، فون ہو نہیں سکا۔ اور پھر اتنی لمبی بات بتانا مشکل تھا۔ آج صبح عمر دراز صاحب بھی آ گئے ہیں اور ان کا رویہ بھی بالکل ماں جیسا ہے۔ اجنبی اور نفرت آمیز۔''

''ہوں تو اسی وجہ سے میں عمر دراز کو دیکھ کر سوچا کرتی تھی کہ اس شخص کو میں نے کہاں دیکھا ہے۔ کہیں بہت قریب سے، وہ ابا سے کس قدر مشابہہ ہے۔ ہے نا نیلم؟''

''اونہہ!'' وہ غصے سے بولی۔ ''بہر حال، امی یہاں ایک پل نہیں رہنا چاہتیں۔''

''میں جاؤں گی صبح عظیم صاحب کے پاس، وہ ضرور کچھ نہ کچھ کریں گے۔ مجھے ان سے اپنی ٹرانسفر کی بات بھی کرنی ہے۔ کھانے میں کیا ہے؟ مجھے تو بہت بھوک لگی ہے۔ میں نے کالج سے آ کر بھی کچھ نہ کھایا تھا۔'' اسے ایک دم سے یاد آیا۔

''تمہیں اس بات پر غصہ نہیں آیا؟'' نیلم کو اس کی بے فکری ذرا نہ بھائی۔

''کس بات پر؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''یہ عمر دراز ہمارا سوتیلا بھائی ہے۔''

''اس میں غصے کی کیا بات ہے؟ ایسا تو ہونا ہی تھا۔ کبھی نہ کبھی تو اس سے ملاقات ہونا ہی تھی۔ مجھے تو غصہ نہیں آتا۔'' وہ صاف گوئی سے بولی۔

''نیہاں! تم..... تم ویسی ہی ہو، نہیں بدل سکتیں۔'' نیلم غصے سے کھڑی ہو گئی۔

''نیلم جی! میں موسم یا زمانہ نہیں کہ بدل جاؤں۔'' وہ اسے چھیڑنے کو بولی۔ ''پلیز، کھانا۔''

''ہونہہ!'' نیلم غصے سے ہنکارا بھر کر باہر نکل گئی۔

❖❖○❖❖

اور ایسا ہی ایک طوفان اس روز بھی آیا تھا، جب امی کو پتہ چلا تھا کہ ابا کی ان کے علاوہ ایک بیوی اور بھی ہے۔

اس روز امی اور نیلم بازار گئی تھیں، شاپنگ کے لئے۔ جہاں امی کو ان کی پرانی پڑوسن مل گئی اور اس نے اس بارے میں انکشاف کیا، جسے سنتے ہی امی آگ بگولا ہو گئیں۔ ابا ابھی آفس سے آ کر بیٹھے ہی تھے۔ نیہاں نے ان کے آگے چائے لا کر رکھی تھی۔ واثق دوسرے کمرے میں اپنے تھرڈ ایئر کے ایگزام کی تیاری کر رہا تھا اور نیہاں کا دو روز پہلے ہی انٹرمیڈیٹ کا رزلٹ آؤٹ ہوا تھا۔ وہ ابا کی بے حد لاڈلی تھی۔ دونوں میں بہت دوستی تھی اور آج کل ان کی گفتگو کا موضوع نیہاں کا نئے کالج میں ایڈمیشن اور سبجیکٹ تھا۔ وہ اپنا اور ان کا چائے کا کپ رکھ کر بات شروع کرنا ہی چاہ رہی تھی کہ امی اور نیلم کسی طوفان کی طرح بیرونی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں۔

امی تیر کی طرح ابا کی طرف بڑھیں۔

''عثمان احمد! میں تو تمہیں بڑا سیدھا، بھلا مانس اور پارسا انسان سمجھتی تھی اور تم اندر سے اتنے ہی دھوکے باز، فراڈیے اور دو نمبر نکلے۔'' امی کی زبان سے نکلے تیر جیسے زہر میں بجھے تھے۔ واثق اٹھ کر اندر آ گیا۔ نیہاں گھبرا کر امی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''کک..... کیا کہہ ہی ہو ثریا؟'' ابا کا رنگ زرد ہو گیا، زبان لڑکھڑانے لگی۔ امی نے کبھی ان سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ جوان اولاد کے سامنے ان کا انہیں اس طرح گھٹیا انداز سے پکارنا۔ ان کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

''کون ہے یہ شہناز؟'' امی گرجیں۔ رائمہ اندر سو رہی تھی، آنکھیں ملتی آ گئی۔

ابا کچھ بول ہی نہ سکے۔ ان کا رنگ اُڑا جا رہا تھا۔

''دیکھو عثمان احمد! ایک لفظ جھوٹ کا اب نہ بولنا۔ بیس سالوں سے اتنے بڑے جھوٹ کے ساتھ انجانے میں نباہ کر رہی تھی۔ معلوم ہوتی تمہاری اصلیت تو ایک پل تم جیسے منافق کے ساتھ نہ گزارتی۔ بولو، کون ہے شہناز؟''

''ثریا! آرام سے بات کرو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ میں سب بتاتا ہوں۔'' کوشش کے باوجود ابا کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ وہ ماتھے سے پسینہ پونچھتے جا رہے تھے۔ حالانکہ گہری گھٹا ٹوپ دھند چھائی ہوئی تھی۔ نومبر کا آخری ہفتہ تھا۔ بادل کئی روز سے برسنے کی تیاری کر رہے تھے۔

''اب تمہاری ان لگی لپٹی باتوں میں نہیں آؤں گی۔ آرام اُڑ گیا اب میرے نصیب سے۔ مجھے بس یہ بتا دو، کیا شہناز تمہاری بیوی ہے؟ بولو..... بولو عثمان احمد! ہاں یا ناں۔ بولو! نہیں تو میں یہیں کھڑے کھڑے اپنی جان دے دوں گی۔'' اس نے امی کو کبھی اتنے غصے میں نہ دیکھا تھا۔ ان کا انداز سب کچھ کر گزر جانے والا تھا۔ اس کا دل سہم گیا۔

''امی! بیٹھ جائیں۔ بیٹھ کر بات کریں۔'' نیہاں نے ہمت کر کے امی کو کندھے سے تھام کر بٹھانا چاہا۔

''بکواس نہ کر تُو باب کی چمچی! آج تم لوگوں کو کچھ حق نہیں بولنے کا۔ آج ہم میاں بیوی کا معاملہ ہے۔ بولو عثمان احمد! ورنہ میں خود کو ختم کر لوں گی۔ کون ہے یہ شہناز؟ تمہاری بیوی نا؟'' وہ چیخیں۔

''ثریا!'' ابا ہکلائے۔

''تمہاری بیوی ہے نا؟'' امی ان کے قریب آ کر زور سے چیخیں۔

''ابا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہاں، مگر تم میری بات تو سن لو۔''

''بس عثمان احمد! بس۔ ساری زندگی تمہاری جھوٹی باتیں ہی تو سنی ہیں، اب نہیں سنوں گی۔ تمہارا میرا ساتھ یہیں تک تھا۔ بس اب اللہ حافظ۔ میرا مرا منہ نہ دیکھنا تم، وصیت کر جاؤں گی۔ ہائے! میں نے کس شخص کی وفا پر بھروسہ کر کے زندگی بتا دی۔ تف ہے ثریا تیری وفاداری پر، کسی جھوٹے کے ساتھ کرتی رہی۔'' وہ اب رونے لگیں۔

''ثریا! خدا کے لئے، میری بات سنو۔'' ابا اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''نہیں، اب کچھ نہیں۔'' امی ہاتھ اٹھا کر گرجیں۔ ''چل واثق! مجھے قمر کے ہاں چھوڑ آ۔

''امی! کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ پلیز بیٹھیں آرام سے۔ ابا کی بات تو سن لیں۔'' نیہاں نے گھبرا کر انہیں تھامنا چاہا۔

''پیچھے ہٹ جا۔ آج کسی کی بات نہیں سنوں گی۔ چل واثق! نہیں تو میں خود چلی جاؤں گی۔ جس کو میرے پیچھے آنا ہو، آ جانا۔'' وہ کہہ کر بیرونی دروازے کی طرف مڑ گئیں اور واثق کتاب ہاتھ میں لئے حیران سا ان کے پیچھے چل پڑا۔

''امی! میں بھی آؤں گی۔'' رائمہ ان کے پیچھے لپکی۔ سعیہ بھی رائمہ کے ساتھ ہو لی۔ نیلم اور نیہاں حیران سی کھڑی رہ گئیں۔

''ابا.....!'' ابا نڈھال سے کرسی پر گرے ہوئے تھے۔ نیہاں نے انہیں پکارا۔

''ہونہہ!'' نیلم نے ایک غصے بھری نگاہ ان کے چھریرے وجود پر ڈالی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

''ابا!'' وہ ان کے پاس پلنگ پر آ بیٹھی۔ انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھوں کے گوشے آنسوؤں سے لبریز تھے۔ باہر بادل گھرے ہو رہے تھے اور گھر میں جیسے طوفان گزر جانے کے بعد کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ چپ چاپ ان کے پاس بیٹھی رہی۔ چائے کے کپ یخ ہو گئے، شاید گھنٹہ گزر گیا انہیں اسی طرح بیٹھے ہوئے۔ شام رات میں ڈھل گئی۔ باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ اتنی خاموشی سے ٹپ ٹپ گرتی بوندوں سے وحشت ہو رہی تھی، جیسے کوئی سنگ باری کر رہا ہو۔ اس بے حسی کو واثق نے آ کر توڑا، وہ امی کی جرسی اور گرم شال لینے آیا تھا۔ ان کا بی پی لو ہو گیا تھا۔ ماموں نے ڈاکٹر کو گھر پر بلوایا تھا۔ نیلم نے اس کے ساتھ جانا چاہا مگر واثق جلدی میں تھا۔

''ابا! کچھ تو بولیں۔ مجھے بتائیں ساری بات۔ ابا! میں آپ کی بات سنوں گی، آپ کا یقین کروں گی۔ ایسے تو آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔'' وہ ان کے گھٹنوں کو تھام کر بولی۔ انہوں نے جھکا ہوا سر اٹھا کر اسے جیسے آس بھری نگاہ سے دیکھا۔ کھڑکی سے باہر تاریک رات کو ایک نظر دیکھ کر گہرا سانس لیا۔

''میرے والدین بہت بچپن میں فوت ہو گئے تھے۔ مجھے میرے چچا حیات خان نے پالا۔ شہناز ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ چچا جان کی بہت سی جائیداد اور زمینیں تھیں۔ شہناز کی والدہ بہت بڑے زمیندار کی اکلوتی اولاد تھی۔ یہ زمین ان کے جہیز میں آئی تھی۔ چچا جان کے زیر سایہ میں نے گریجویشن کیا اور مجھے شہر ہی میں ملازمت مل گئی۔ اسی آفس میں تمہارے نانا ہیڈ کلرک تھے۔ بہت اچھے، نیک، مہربان انسان۔ ان کی کوششوں سے مجھے ان کے گھر سے تھوڑی دور دو کمروں کا گھر کرائے پر مل گیا۔ اس کے علاوہ وہ اکثر اپنے گھر سے کھانا پکوا کر میرے لئے لے آتے، کپڑے دھلوا لاتے، میرے منع کرنے کے باوجود۔ وہ مجھ پر بہت مہربان تھے۔ آخر اس مہربانی کا راز ایک دن کھل گیا۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کرنا چاہ رہے تھے۔ میری مالی حیثیت ان کے سامنے تھی۔ مجھے کچھ خاص اعتراض نہ ہوا، میرے کون سے والدین بیٹھے تھے جو یہ سب کرتے۔ اگرچہ میں ان کی بیٹی سے ملا بھی نہیں تھا اور یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ مزاج کی کیسی ہے۔ میں نے ذکاء صاحب کی شرافت اور محبت کو دیکھتے ہوئے ہاں کر دی۔ دونوں طرف شادی کی

تیاری انہوں نے ہی کرنی تھی۔ میں نے انہیں پس انداز کی ہوئی رقم تھما دی، انہوں نے تیاری شروع کر دی۔ شادی میں ڈیڑھ ہفتہ رہ گیا تھا۔ میں گاؤں جانا چاہ رہا تھا کہ جا کر چچا جان کو لے آؤں کہ اچانک ان کا تار آ گیا، ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں بھاگم بھاگ گاؤں چلا گیا، ذکاء صاحب کو بتا کر۔ چچا جان کی طبیعت واقعی ٹھیک نہیں تھی۔ انہیں خدا جانے کیا تکلیف تھی کہ گزشتہ چار ماہ سے انہیں مسلسل بخار آ رہا تھا، جو اتر ہی نہیں رہا تھا۔ ان کا جگر ختم ہو چکا تھا اور بستر پر جیسے ہڈیوں کا پنجر پڑا تھا۔ میں انہیں اس حال میں دیکھ کر رو پڑا۔ دو دن ایسے ہی گزر گئے، ان کی تیمارداری میں۔ تیسرے دن اس بستر مرگ پر پڑے شخص نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''عثمان! میری شہناز سے شادی کر لو، میری بچی کا میرے بعد اس دنیا میں کوئی نہیں۔'' وہ کہتے ہوئے رونے لگے۔ میں ششدر رہ گیا۔

''چچا جان! یہ کیسے ممکن ہے؟ میں آپ کو خط لکھ کر سب کچھ بتا چکا ہوں اور اب تو میری شادی میں ہفتہ بھی نہیں ہے۔ آپ پلیز مجھے معاف کر دیں۔'' میں نے ان کے ہاتھ تھام کر انہیں سمجھانا چاہا۔

''نہیں عثمان! میری شہناز میرے بعد بے سہارا ہو جائے گی، اسے اپنے نام کا سہارا دو۔ شرع میں تو چار جائز ہیں۔ شہناز گاؤں میں رہے گی۔ وہ زمینوں کی دیکھ بھال بھی خود ہی کرے گی۔ میں نے اسے سب حساب سمجھا دیا ہے۔ تم بس اسے اپنے نام کا آسرا دے دو۔ سال میں ایک آدھ چکر لگا لیا کرنا، بس اسے اور کچھ نہیں چاہئے۔ تم بس اسے اپنے نکاح میں لے لو، میری زندگی ہی میں۔ میں پُرسکون ہو کر مرنا چاہتا ہوں۔'' ان کے سانس کا توازن بگڑ رہا تھا۔

پھر میرے ہزار انکار کے باوجود وہ اصرار کئے گئے اور میں اس مرتے ہوئے شخص کی ضد کے آگے ہار گیا۔ اسی وقت نکاح ہو گیا اور نکاح کے بعد چچا جیسے سنبھل گئے۔ میں تین دن مزید گاؤں میں رہا اور پھر چچا جان سے اجازت لے کر شہر آ گیا کہ دو ہفتوں بعد پھر چکر لگاؤں گا۔

یہاں شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ میں بہت پریشان تھا۔ میں ذکاء صاحب جیسے شریف اور بھلے مانس انسان سے دھوکا نہیں کر سکتا تھا، اس لئے میں نے انہیں جاتے ہی ساری بات بتا دی اور شادی سے معذرت کر لی بلکہ معافی مانگ لی۔ انہوں نے نہایت توجہ سے میری بات سنی اور پھر کہا۔

''عثمان بیٹا! تمہارے چچا نے کہا کہ شرع میں چار جائز ہیں۔ اب جبکہ ادھر بھی سب تیاری مکمل ہے۔ یوں اچانک ہم اس شادی کو ملتوی نہیں کر سکتے۔ ہماری بھی عزت کا مسئلہ ہے۔''

وہ کہہ کر چند لمحوں کے لئے چپ ہوئے۔

''تم سال میں ایک آدھ دفعہ گاؤں چلے جایا کرنا۔ ثریا نباہ کرنے والی لڑکی ہے۔ پھر وہ میری بیٹی ہے۔ اوّل تو اُسے نہ بتانا۔ پھر بھی اگر اسے پتہ چل گیا تو اسے بتا دینا کہ اس کی شادی میری رضا سے ہوئی ہے۔ اِن شاء اللہ وہ تمہارے ساتھ کامیاب زندگی گزارے گی۔''

اور پھر شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد ذکاء صاحب کے رشتہ داروں کے ہاں دعوتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ مہینہ ایسے ہی گزر گیا۔ ہم پشاور ثریا کے ماموں کے ہاں بیس دن گزار کر آئے تو گھر میں تار پڑا تھا، دروازے کے نیچے۔ چچا جان کے انتقال پر میں گم صم ہو گیا۔ شہناز گاؤں چھوڑ کر کہیں اور جا چکی تھی۔ میرے نام خط تھا کہ میں اس کو تلاش نہ کروں اور اپنی دوسری بیوی کے ساتھ زندگی گزاروں، وہ شہر آئی تھی۔ ہمارے پڑوس سے اسے میری دوسری شادی کا علم ہوا۔ وہ دل برداشتہ ہو کر کہیں چلی گئی۔

میں ایک ماہ ہی میں ثریا کا مزاج سمجھ چکا تھا، اس لئے میں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ میں شہناز کو تلاش ہی نہ کروں۔

اور یوں بیس سال گزر گئے، دوبارہ ہماری ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ اب تم ہی کہو، میں کتنا جھوٹا اور کتنا بے وفا ہوں؟'' کہہ کر ابا اپنی چھاتی مسلنے لگے۔ ان کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

''ابا! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟'' وہ گھبرا گئی۔

''ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ تم ماں کے پاس جاؤ، اس کی طبیعت کا پوچھو۔'' ان کی حالت یک دم بگڑنے لگی تھی۔ وہ گھبرا کر ساتھ والے کمرے میں نیلم کے پاس گئی جو پلنگ پر اوندھی پڑی تھی۔

''نیلم! ابا کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ تم ساتھ والے انکل لطیف کو بھیج کر ڈاکٹر کے کلینک سے ڈاکٹر صاحب کو بلوا لو۔''

نیلم تڑپ کر سیدھی ہوئی۔

''ڈاکٹر..... ہونہہ..... ایسے دھوکے باز شخص کے لئے جس نے ہماری ماں کو، ہمیں

بیس سال اندھیرے میں رکھا، ایسے شخص کی جان بچانے کے لئے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ سوری۔'' وہ گستاخ لہجے میں بولی۔

''نیلم!'' نیہاں چیخی۔ ''تمیز سے بات کرو۔ وہ ہمارے ابا ہیں۔''

''ایسے ہوتے ہیں باپ؟ ایک شادی گاؤں میں، ایک شہر میں۔ یہاں بہروپ بھرا معصوم بننے کا اور وہاں جائیداد دیکھ کر پھسل گئے۔ اور ایسے لوگ منہ کی کھاتے ہیں۔ وہ خود ہی انہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ اور اب امی بھی چلی گئیں۔ انہیں اب تنہا رہنا ہے۔ میں بھی جا رہی ہوں۔'' نیلم کی بکواس اس کی برداشت سے باہر ہو گئی۔

''تم انتہائی گھٹیا ہو۔ اگر ابا کو کچھ ہو گیا، میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' وہ کہہ کر ابا کے پاس آ گئی۔ وہ کرسی سے نیچے گرے ہوئے تھے۔ دونوں ہاتھوں سے سینے کو جکڑا ہوا تھا اور چہرہ جیسے تکلیف کی شدت سے ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔

''نیلم!'' وہ چیخی۔

''ابا!'' وہ جھک کر انہیں سیدھا کرنے لگی۔ وہ اس کے ہاتھوں سے لمحوں میں ہمیشہ کے لئے پھسل گئے۔ ان کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں سے ان کے سچے ہونے کی تحریر صاف نظر آئی۔ انہوں نے شاید نیلم کی بکواس سن لی تھی۔ انہیں تو نیلم کی سمجھ داری پر ہمیشہ سے مان رہا تھا۔ وہ کہتے تھے، نیلم میری سب سے سمجھ دار اور عقل مند بیٹی ہے۔ اس کے الفاظ انہیں مارنے کے لئے کافی تھے۔

''نیلم!'' وہ دروازے میں کھڑی نیلم کی طرف پلٹی۔ ''تمہیں سکون آ جانا چاہئے اب۔ تم نے ابا کو مار دیا۔ تم قاتل ہو میرے معصوم باپ کی نیلم! تم نے مارا ہے ابا کو۔''

وہ زور زور سے رونے لگی۔

''میرے پیارے ابا..... نیلم بکواس کرتی ہے۔ ابا! مجھے آپ کا یقین ہے۔ ابا! آپ سچے ہیں۔ اگر ساری دنیا بھی آپ کو جھوٹا کہے گی تو بھی میں آپ کا یقین کروں گی۔ پھر بھی آپ روٹھ گئے۔ ابا! مجھ سے کیوں روٹھ گئے؟ ابا! اب ہم کیا کریں گے؟''

وہ ان سے لپٹ کر رونے لگی۔ باہر بارش تیز ہو گئی تھی۔ نیلم کی بے حسی نہیں ٹوٹی تھی۔ اسے نیلم سے بے حد نفرت محسوس ہوئی۔

اور پھر ابا کا جنازہ اُٹھنے تک اور اس کے بعد بھی نیہاں رونے دھونے میں نیلم ہی کو ان کی موت کا ذمہ دار ٹھہراتی رہی۔ حالانکہ دو چار دنوں بعد ہی اسے اس آفاقی سچائی کا یقین آ گیا تھا کہ ابا کی موت اسی طرح لکھی تھی اور کسی کے لفظ کسی کو نہیں مار سکتے۔ مگر

سب کی ملامت آمیز نظروں اور فضیحتوں سے نیلم جیسے اپنی ہی نظروں میں گر گئی تھی۔ پھر ابا کی ابدی جدائی اور اس کا آخری لمحوں میں یوں ان کے لئے گستاخانہ کلمات کہنا، اُسے تاعمر شرمسار رکھنے کے لئے کافی تھا۔ اسے یہ بھی قلق تھا کہ نیہاں، ابا کے آخری لمحوں میں فرمانبرداری کی بازی جیت گئی اور وہ ہمیشہ کے لئے بے ادب اور گستاخ بن گئی۔

اور یہ سارا شر اس عورت کا پھیلایا ہوا تھا۔ چوبیس سال پہلے ابا کے ساتھ والے گھر میں رہتی تھی، ابا امی جب پشاور گئے ہوئے تھے، شہناز ان سے ملنے آئی تو اس عورت نے نمک مرچ لگا کر ابا کی شادی کی داستان کچھ اس طرح سے سنائی کہ وہ ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گئی۔ اور جب ابا اور امی واپس آئے تو اس عورت کے میاں کا ٹرانسفر کسی دوسرے شہر ہو چکا تھا، ورنہ وہ بیس سال پہلے ہی امی کا گھر اُجاڑ چکی ہوتی۔ اور آج اچانک بازار میں مل گئی، جس کے پھیلائے ہوئے شر نے لمحوں میں ان کے ہنستے بستے آشیانے کو آگ لگا دی۔

ان کا وہ گھر بھی کرائے کا تھا، جسے تیسرے روز ہی وہ خالی کر کے ماموں کے اوپر والے پورشن میں آ گئے تھے اور آج پھر وہ کہانی مجسم ہو کر انہیں بے گھر کرنے چلی آئی تھی۔

❖❖○❖❖

اگلے روز ٹرانسپورٹ کی ہڑتال تھی، مگر اسے عظیم صاحب سے ملنے جانا تھا۔ صبح کو امی کو بخار بہت تیز تھا۔ شام تک ان کی حالت ذرا سنبھلی تو وہ رکشہ کر کے عظیم صاحب کے آفس پہنچی۔ وہ کہیں گئے ہوئے تھے۔ ایمن اور عمر دراز ان کے آفس میں بیٹھے بہت خوشگوار موڈ میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو اور انداز ان کے درمیان خوب صورت تعلق کا پتہ دے رہے تھے۔ ایمن اسے دیکھ کر خوش ہو گئی مگر عمر دراز کا چہرہ سپاٹ تھا۔

''انکل! تو کسی کلائنٹ کے ساتھ گئے ہیں، تھوڑی دیر میں آئیں گے۔ تم بیٹھو۔ اتنے عرصے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ کیسی جا رہی ہے جاب؟ مجھے انکل نے بتایا تھا۔''

اگرچہ وہ ادھر بیٹھنا نہیں چاہ رہی تھی، مگر وہاں سے بھاگنا بھی آسان نہ تھا۔ ان دونوں کے درمیان پھر گفتگو شروع ہو گئی۔ ایمن کبھی کبھار اسے بھی شامل کر لیتی۔ مگر اسے وہاں بیٹھنا بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ آخر وہ معذرت کر کے اُٹھ آئی۔

'اب کیا کروں؟..... عظیم صاحب سے ملنا تو ضروری ہے۔ وہی اس مسئلے کا کچھ حل بتائیں گے۔'

وہ سیڑھیوں میں کھڑی سوچتی رہی۔ نیچے اُتر کر وہ لاؤنج میں ٹہلنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اسے ایمن اور عمر دراز نیچے اُترتے دکھائی دیئے۔

''ارے نیہاں! تم گئی نہیں؟'' ایمن نے اسے دیکھ کر حیرت سے کہا۔

''نہیں، مجھے سر سے ضروری کام ہے اس لئے۔''

''تو وہیں بیٹھی رہتیں نا؟''

''نہیں، میں نیچے ایک فون کرنے آئی تھی۔'' اس نے بہانہ گھڑا۔

''اچھا بھئی، میں تو چلتی ہوں۔ یار! تم کسی روز چکر لگاؤ نا گھر کا۔'' اس نے رسماً کہا۔

''کوشش کروں گی۔ ابھی تو جاب ادھر ہے، اس لئے مشکل ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ اچھا بھئی، اوکے بائے۔'' وہ ہاتھ ملا کر باہر کی طرف بڑھی۔ عمر دراز پہلے ہی جا چکا تھا۔ وہ وہیں کھڑی رہی۔ اسے اوپر سے جاوید آتا دکھائی دیا۔ وہ اس کی طرف بڑھی۔

''وہ سر تو گھر چلے گئے ہیں۔'' وہ خود ہی اسے دیکھ کر کہنے لگا۔

''اوہ!'' وہ یہی کہہ سکی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سست قدموں سے باہر آ گئی۔ باہر اندھیرا پھیل چکا تھا۔

سردیوں کی شاموں میں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ یہ جلدی سر پر سوار ہو جاتی ہیں۔ باہر سڑک پر ٹریفک بھی کم تھی۔ پارکنگ میں تین گاڑیاں کھڑی تھیں اور ایک کے پاس عمر دراز کھڑا لاک کھول رہا تھا۔ ایمن جا چکی تھی۔ وہ پارکنگ سے ہٹ کر سڑک کے کنارے آ کھڑی ہوئی۔ پبلک ٹرانسپورٹ کی ہڑتال کی وجہ سے ٹریفک کم تھی۔ اسٹاپ پر جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ کافی دیر رکشے کے انتظار میں کھڑی رہی۔ وائٹ مہران اس کے پاس آ کر ٹھہر گئی۔

''آؤ بیٹھو۔'' وقت نے انہیں اجنبی سے آشنا اور آشنا سے اجنبی بنا ڈالا تھا۔ عمر دراز کا لہجہ سپاٹ اور انداز اس سے زیادہ نروٹھا تھا۔

''شکریہ۔'' کہہ کر اس نے گردن موڑی۔

''بیٹھو، رات ہو رہی ہے۔ اب کنوینس کا ملنا مشکل ہے۔'' پتہ نہیں وہ گھر کے کڑے حالات کے باوجود اس سے ہمدردی کیوں جتا رہا تھا۔

وہ ڈھیٹ بن کر چپ کھڑی رہی۔ عین اسی وقت ایک رکشہ پھٹ پھٹ کرتا سامنے

سے آیا۔

''بیٹھو!'' اب کے عمر دراز کی آواز جھلائی ہوئی تھی۔

وہ اُس کی درخواست کو نظر انداز کر کے آگے بڑھی اور چھلانگ مار کر رکشے میں بیٹھ گئی۔ رکشے والے نے بھی فوراً اسپیڈ بڑھا دی۔

سڑک پر نکل کر سردی کا احساس ہوا تھا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوئے جا رہے تھے۔ شام کے چھ بج رہے تھے۔ رکشہ انجان رستوں پر چلتا جا رہا تھا۔ اصل میں اس گھر کا ایڈریس تو اسے پتہ تھا مگر راستوں کی کوئی خاص پہچان نہیں تھی۔ ساری زندگی تو اندرونِ شہر کی گلیاں سڑکیں ناپتے گزری تھی۔

''رکشے والے! جلدی کرو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' اس نے ذرا رعب دار آواز میں کہا۔

''اچھا جی۔'' اس نے گرم چادر منہ پر لپیٹی ہوئی تھی۔

سنسان اور تاریک سڑک پر جا کر رکشہ اچانک بند ہو گیا۔ اردگرد گھنے گھنے درخت تھے جن کو دیکھ کر ہی خوف آ رہا تھا۔ پول بہت دُور دُور ایستادہ تھے، جن کی روشنی دھند کی وجہ سے ادھر پہنچ نہیں رہی تھی۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ پہلی بار گھر سے نکلی تھی، مگر اتنی رات گئے انجان راستوں پر پہلی بار ہی نکلی تھی۔

''کیا ہوا رکشے کو؟'' اس نے گردن آگے گھسیڑ کر پوچھا۔

''دیکھتا ہوں جی۔'' وہ ڈرائیونگ سیٹ اٹھا کر دیکھنے لگا۔ وہ دل میں پچھتانے لگی کہ عمر دراز کے ساتھ ہی چلی جاتی۔

''کیا ہوا منیرے؟'' اچانک پیچھے سے ایک اونچا لمبا آدمی آ کر رکشہ ڈرائیور سے بولا۔ وہ اُچھل ہی پڑی۔ وہ ڈرائیور سے بات کرتے کرتے اندر جھانکنے لگا۔

''دیکھتے ہیں یار! کیا ہو گیا۔'' منیرے نے سر انجن میں گھسایا ہوا تھا۔ پھر دونوں کھسر پھسر کرنے لگے۔ سڑک پر ٹریفک بالکل نہیں تھی اور کسی آدمی کا نشان نہیں تھا۔ وہ پریشان ہو کر نیچے اُتر آئی۔

''او بی بی! بیٹھو آپ۔ ابھی رکشہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔'' وہ لمبا آدمی ایک دم اس کے بالکل قریب آ کر بولا۔

''نن..... نہیں، میں کوئی اور سواری دیکھ لیتی ہوں۔'' وہ مڑنے لگی۔ حالانکہ اس سنسان سڑک پر اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔

''او سرکار! بیٹھو، ٹھیک ہو گیا ہے رکشہ۔'' وہ لمبا آدمی اس کے راستے میں آ کر ذرا بے تکلفی سے بولا۔

''مجھے نہیں بیٹھنا۔ پیچھے ہٹو۔'' وہ ذرا سختی سے بولی۔

''آؤ چلو، بیٹھو اندر۔'' وہ ایک دم اسے کندھے سے پکڑ کر رکشے کی طرف دھکیل کر بولا۔ خوف سے اس کا وجود کانپنے لگا۔

''پیچھے ہٹو، مجھے نہیں بیٹھنا۔'' وہ سائیڈ سے نکلنے لگی۔

''او منیرے! آ یار۔ بی بی کو بڑی جلدی ہے۔'' وہ بڑی خباثت سے معنی خیز انداز میں ہنسا۔ منیرے نے سیٹ گرا کر رکشہ اسٹارٹ کیا۔ مگر اب اس نے نہ بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں زبردستی اسے رکشے میں بٹھاتے، اچانک پیچھے سے ایک گاڑی آ گئی۔

''بچاؤ!..... بچاؤ!'' وہ زور زور سے چیخنے لگی۔ وہ دونوں گھبرا گئے۔ گاڑی رکشے کے قریب آ کر رک گئی۔

''کیا بات ہے؟'' ڈرائیور نے کھڑکی سے منہ نکال کر پوچھا۔

''او کچھ نئیں جی۔ رکشہ خراب ہو گیا تھا ذرا۔ بی بی گھبرا گئیں۔ اب ٹھیک ہے۔''

''چلو بی بی! بیٹھو۔'' منیرا بولا۔

''نہیں، مجھے نہیں بیٹھنا۔'' وہ سڑک کے درمیان میں آ گئی۔

''ارے یہ تم ہو نیہاں!'' اچانک کار ڈرائیور نے حیرت سے کہا۔ وہ فراز تھا۔ ہر ایسی سچویشن میں اس کو ضرور ٹکرانا ہوتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں جھلا گئی۔

''فراز!'' وہ بھی کچھ حیران ہوئی۔

''آؤ بیٹھو، میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔'' اس نے فرنٹ ڈور کھولا۔ وہ جھٹ سے بیٹھ گئی۔ اس وقت یہی غنیمت تھا۔

''او بی بی! پیسے تو دے جاؤ آدھے رستے کے۔'' منیرا لپکا۔ لمبا آدمی بے نیاز کھڑا تھا۔

''یہ لو۔'' فراز نے اسے کچھ روپے تھمائے اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

''تم ادھر کدھر نکل آئی تھیں؟''

''ٹرانسپورٹ کی ہڑتال کی وجہ سے۔''

''جاب کے لئے نکلی ہوئی تھیں؟''

''نہیں، جاب تو مجھے مل گئی ہے۔'' اس نے فخر سے کہا۔

''کہاں؟'' اس نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔

''لیکچرر شپ، شاہ پور میں آج کل۔''

فراز نے ہونٹ سکوڑے۔

''اچھا تو وہ تم ہو جس نے میرے گھر والوں پر جادو کر دیا ہے۔ بابا تمہارا کلمہ پڑھ رہے ہیں اور رانیہ، نیہاں آپی کا۔''

''ہیں، انکل تمہیں کہاں ملے؟ میں تو کل ہی آئی ہوں۔''

''میں گھر سے آ رہا ہوں۔ کل شام کو پہنچا تھا، اب واپس آ رہا ہوں۔''

گاڑی میں کچھ دیر خاموشی رہی۔

''فراز! تم ادھر کیوں نہیں رہتے اپنے گھر؟'' اس نے رانیہ کی بات پہنچانے کا موقع مناسب سمجھا۔

''تم نے ایڈریس تو بتایا نہیں۔'' وہ بات پلٹ گیا۔

''فراز! رانیہ اور آنٹی تمہیں بہت مس کرتی ہیں۔'' وہ پھر بولی۔

''میں تو کہتا ہوں ان سے کہ ادھر ہی آ جائیں۔ کیونکہ مجھے تو اب ادھر ہی رہنا ہے۔ جاب جو ادھر ہے۔''

''وہ اپنا گھر چھوڑ کر کیسے آ سکتی ہیں؟''

''ارے، تم عمر دراز کے ہاں رہتی ہو؟'' گاڑی گھر کے آگے آ کر ٹھہر گئی۔

''ہوں، تم عمر دراز کو کیسے جانتے ہو؟''

''ارے جگری یار ہے اپنا، بچپن کا۔'' وہ ہنس کر بولا۔

''تو آ جاؤ اندر۔ ہم تو ادھر کرائے دار ہیں اور آج کل میں ادھر سے شفٹ ہونے والے ہیں۔'' وہ اُترتے ہوئے بولی۔

''تم چلو، میں گاڑی بند کر کے آتا ہوں۔'' وہ بولا۔ گیٹ کھلا ہی ہوا تھا۔ وہ پورچ کے ساتھ بنی سیڑھیاں چڑھنے ہی لگی کہ عمر دراز اندر سے نکل آیا۔ وہ اسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔

''کس کے ساتھ آ رہی ہو؟'' وہ کرخت آواز میں نگاہیں جما کر بولا۔

''آپ سے مطلب؟'' وہ لاپروائی سے بولی۔

وہ غصے میں آگ بگولا ہو کر آگے بڑھا اور اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ وہ حیرت

سے گنگ رہ گئی۔ چٹاخ کی آواز شاید اندر تک گئی۔

''عمر دراز!'' شہناز پورچ کے پاس کھڑی تھیں۔ ان کی تیز آواز پر عمر دراز جیسے شرمندہ ہو گیا۔

''چلو اندر۔'' وہ سرد لہجے میں بولیں۔

''آپ کو کس نے حق دیا کہ مجھ پہ ہاتھ اٹھائیں؟'' وہ دانت پیس کر بولی۔

''مجھے اس بات کا حق ہے کہ میں تم سے اس طرح اکیلے آنے جانے پر باز پرس کر سکوں۔'' وہ روایتی انداز میں اسے جتا کر بولا۔

''سنو مسٹر عمر دراز! میں آج سے نہیں، بہت مہینوں سے اس طرح آ جا رہی ہوں، اپنی ماں کی اجازت سے۔ اور تم جیسے لوگ حقوق کی پہچان بہت رکھتے ہیں، مگر فرائض سے شاید ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ جب میں نوکری کے لئے، ضروریاتِ زندگی کے لئے، سر پر سائبان کے لئے جگہ جگہ دھکے کھا رہی تھی، اس وقت تم اور تمہاری غیرت کہاں سوئی ہوئی تھی؟ ایک وہ واثق جو ہمیں حالات کی کڑی دھوپ میں جلنے سلگنے کے لئے، ہمارے لئے برف کے گولے لینے چلا گیا۔ یہ جانے بغیر کہ اگر دھوپ سر پر شدید ہو تو پھر خوابوں کا یخ گلیشیر بھی پگھل کر پانی بن جاتا ہے۔'' اس کا سانس پھول رہا تھا۔

''تم بھائی لوگ ایسے موقعوں پر محض غیرت جتا کر سمجھتے ہو کہ اس رشتے کے تقاضے پورے ہو گئے تو مجھے نفرت ہے ایسی غیرت اور مردانگی سے اور اس ناتے سے بھی۔'' وہ ایک لمحے کو رکی اور دانت چبا کر بولی۔ ''جس سے تم نے مجھے تھپڑ مارا ہے۔'' کہہ کر سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی اوپر بھاگ گئی۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس کے پیچھے گیٹ بند کر کے آتے فراز کے قدم اُس کی پھٹی ہوئی آواز اور جذباتی جملوں نے جیسے جکڑ لئے ہیں۔

نیہاں کی آنکھیں دُھند کی شدت سے جھلملا رہی تھیں۔

''نیہاں! تم آ گئیں۔ امی کو بہت تیز بخار ہے۔'' نیلم اسے دیکھ کر بولی۔

''نیلم! میں سونے جا رہی ہوں اور پلیز مجھے کوئی نہ جگائے۔'' اس وقت وہ کسی کا بھی سامنا کرنے کو تیار نہ تھی۔ نیلم کی بات ان سنی کر کے وہ اندر کمرے میں بھاگ گئی اور دروازہ لاک کر کے بستر پر گر کے دھواں دھار رونے لگی۔

❖❖○❖❖

وہ بہت روئی تھی۔ بے تحاشا رونے کی وجہ سے سر بوجھل ہو گیا تھا۔

جب اس کی آنکھ کھلی، کمرے کی کھڑکیوں سے روشنی سارے کمرے میں پھیل چکی

تھی۔ وہ سستی سے لیٹی رہی، رات کا منظر پھر اس کی آنکھوں کے آگے آ گیا۔

''ارے گیارہ بج گئے اور کسی نے مجھے اٹھایا بھی نہیں۔'' گھڑی پر نظر پڑتے ہی وہ چھلانگ مار کر اُٹھی۔

رات کو نیلم بتا رہی تھی کہ امی کو بخار ہے۔ وہ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر باہر آ گئی۔

امی کے کمرے سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں، وہ اسی طرف بڑھ گئی۔ اندر کا منظر نہ صرف حیران کن بلکہ شاکنگ تھا، کم از کم اس کے لئے۔ اس نے آنکھیں مسل ڈالیں۔ ممانی جان نے امی کو سہارا دے کر بٹھایا ہوا تھا۔ عمر دراز کی والدہ شہناز بیگم، امی کے ساتھ ان کے بستر پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں اور کرسیوں پر ماموں جان اور عمر دراز بیٹھے تھے، ان کے آگے چائے کے کپ پڑے تھے۔ وہ وہیں سے مڑ گئی۔

''امی کو رات کو تیز بخار تھا۔ میں اور رائمہ ڈاکٹر کو بلانے جا رہے تھے کہ عمر دراز نے ہمیں روک لیا۔ ہم نے جانے کی وجہ بتائی تو انہوں نے ہمیں اوپر بھیج دیا۔ ان کے ساتھ وہ ان کے دوست فراز بھی تھے۔ وہ دونوں جا کر ڈاکٹر کو لے کر آئے۔ پھر تھوڑی دیر بعد شہناز آنٹی بھی آئیں۔ یہ دونوں رات سے ادھر ہیں۔ امی کی اور آنٹی کی صلح ہو گئی ہے۔ امی کو بیٹا مل گیا ہے اور آنٹی کو پلی پلائی بیٹیاں۔ دونوں خوش ہیں۔ امی نے عمر دراز کو خوب پیار کیا ہے اور ان کے دوست بھی رات بھر یہیں تھے۔ صبح انہوں نے اپنے گھر فون کیا اور پھر چلے گئے، یہ کہہ کر کہ لوہا گرم ہے۔''

ماموں جان اور ممانی تو صبح آئے ہیں۔ بڑے دونوں بیٹے اپنی بیویوں کو لے کر علیحدہ ہو گئے ہیں اور ممانی سے اب چولہا چکی بھی نہیں ہوتی۔'' نیلم نے ایک ہی سانس میں سب کہا۔

''آگے بھی تو بتاؤ۔'' رائمہ نے لقمہ دیا۔ ''وہ عادل بھائی کے لئے نیلم کا ہاتھ مانگنے آئے ہیں اور جھٹ پٹ شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''اور آپی! پتہ ہے، اندر کس سلسلے میں میٹنگ ہو رہی ہے؟'' رائمہ نے کہا۔ نیہاں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''فراز بھائی اپنے امی ابو کو لینے گئے ہیں۔ وہ آ کر آپ کا رشتہ مانگیں گے اور سب نے عمر بھائی کی وجہ سے اوکے بھی کر دیا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' اسے کرنٹ لگا۔

''مطلب اندر جا کر پوچھیں۔'' وہ بے نیازی سے بولی۔

''ایسا نہیں ہوسکتا۔'' وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

''کیوں نہیں ہوسکتا؟'' نیلم نے ابرو اچکائے۔

''میری جاب ابھی نئی ہے۔ پھر رائمہ ہے، امی، سنیعہ، ان کی ذمہ داریاں۔''

''سنو نیہاں! تم ہر بار یہ کیوں ثابت کرنا چاہتی ہو کہ اس گھر میں سب سے زیادہ ذمہ دار، فرض شناس تم ہو اور باقی سب نکمے، کم عقل اور غیر ذمہ دار ہیں۔'' نیلم اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

''میں نے یہ سب کب کہا؟'' وہ آنکھیں چرا کر بولی۔

''نہیں، یہ تم نے نہیں کہا مگر تمہارا انداز بتاتا ہے کہ تم ہر بار گولڈ میڈل اپنے ہی گلے میں ڈالنا چاہتی ہو۔ تم نے اپنا پتا سب سے اوپر سجا رکھا ہے کہ دیکھو، میں کتنی ذمہ دار ہوں، سب کا بوجھ اٹھا رہی ہوں۔ بعض لوگوں کو اس قسم کی ستائش کا شوق ہوتا ہے کہ لوگ انہیں باہمت گردانیں، ان کی ہمدرد فطرت اور جذبۂ ایثار کو سراہیں۔'' نیلم اس سے سب حساب آج ہی کر لینا چاہتی تھیں۔

''نیلم! تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ آخر تم میری طرف سے اپنا دل صاف کیوں نہیں کرتیں؟'' وہ زِچ ہو کر بولی۔

''واثق کا خط آیا ہے، رات تم دیر سے آئیں، اس لئے دکھا نہیں سکی۔ اس کو وہاں جاب مل گئی ہے اور اس نے دس ہزار کا ڈرافٹ بھی بھیجا ہے۔ یہ دو تین مہینے اس نے بڑی خواری جھیلی، وزٹ ویزے کے وجہ سے۔ اب اسے کچھ اچھے لوگ مل گئے ہیں، جنہوں نے اس کی مدد کی ہے اور اسے جاب بھی دلوائی ہے۔ اور اب اس گھر کا بوجھ تمہارے شانوں پر نہیں ہے، یہ جن کے کندھوں پر ہونا چاہئے، انہوں نے اسے اٹھا لیا ہے۔ اس لئے تم اب مزید فکریں چھوڑ دو۔'' اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''میں ایسا نہیں سمجھتی کہ تم کچھ کرنے کے قابل نہیں ہو۔'' وہ کچھ دکھ سے بولی۔ ''تمہاری غلط فہمی آخر کیسے دور ہوسکتی ہے؟''

''تم فراز بھائی کے لئے ہاں کر دو۔ اگر بوجھ یا فرض میں ہوں تو وہ تم بھی ہو۔ رائمہ اور سنیعہ کے لئے ان کے دو بھائی ہیں اور امی کے دو بیٹے۔ کرائسس کے دور میں تم نے واقعی اس گھر کی مثالی خدمت کی ہے۔ لیکن اب جبکہ ذمہ داریاں نبھانے والے آ گئے ہیں تو تمہیں اس بارے میں پریشان نہیں ہونا چاہئے۔''

''نیلم! اوّل تو اپنے گھر اور گھر والوں کے لئے کچھ کرنا احسان نہیں ہوتا اور اگر میں

نے کچھ کیا بھی تو اس کا فل کریڈٹ میں نہیں لوں گی کہ تم نے بھی میرے ساتھ ٹیوشنز کر کے ان کے سخت دنوں کو نرم کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔'' وہ آج ہر حال میں نیلم سے صلح چاہتی تھی۔

''مجھے کوئی شوق نہیں ہے کریڈٹ لینے کا۔ اس کے لئے تم ہی کافی ہو۔'' وہ اسی سڑے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تو مجھے شوق ہے نمائش کا؟ بھئی میں باز آئی اس طرح کا گولڈ میڈل لینے سے، جس کی وجہ سے دلوں میں فرق آئے۔'' وہ ایک لمحے کو چپ ہو گئی۔ ''تم جو کہتی ہو، میں مان لیتی ہوں۔''

''یعنی آپی! آپ کو فراز بھائی کا پرپوزل قبول ہے؟'' رائمہ نے فوراً نتیجہ اخذ کیا۔

''یہ میں نے کب کہا؟'' وہ بگڑ کر بولی۔

''آپ نے یہی کہا ہے۔ ہے نا نیلم؟''

''بالکل۔ اور صلح کی شرط بھی یہی ہے۔''

''کون سی صلح؟''

''ہم دونوں کی۔'' کہہ کر اس نے نیہاں کو گلے لگا لیا تو اس کا ذہن جیسے ہلکا پھلکا ہو گیا۔ برسوں کی دھند چھٹی تھی۔

''ارے میری بہنو! ابھی تو عید میں مہینہ باقی ہے، تم ابھی سے گلے مل رہی ہو۔ اور میری صلح اس جنگجو ہیروئن سے کون کرائے گا؟'' عمر دراز دروازے میں کھڑا تھا۔

''آپ کی صلح مشکل ہے بھائی! آپ نے اپنا تعارف ہی تھپڑ سے کرایا ہے۔'' رائمہ بولی۔

'ہیں! انہیں بھی علم ہے تھپڑ کا؟' نیہاں دل میں کھسیانی ہو گئی۔

''سوری سسٹر!'' عمر دراز نے اس کے قریب آ کر جھک کر کان پکڑ لئے تو اس کی ہنسی نکل گئی۔ اتنے لمبے قد کے ساتھ جھک کر کان پکڑنا عجیب لگ رہا تھا۔

''تھینکس۔'' وہ بولا۔

''جی نہیں، پہلے بتائیں ایمن کا کیا چکر ہے آپ کے ساتھ؟'' وہ دوستانہ انداز میں بولی۔

''میری بہن! وہی چکر جو آج سب کے ساتھ چل رہا ہے۔'' وہ عاجزی سے بولا۔

''ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ نیہاں نے اتنے سخت حالات میں بڑی ہمت کا مظاہرہ

کیا ہے۔تمہارا کردار قابل تحسین ہے مائی سسٹر! چلو اب تمہاری امی سے صلح کراؤں۔''
وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آیا۔

''امی! آپ کی بڑی بیٹی۔'' وہ شہناز بیگم کے آگے کھڑی تھی۔

''ماشاءاللہ، بڑی تعریفیں کر رہے ہیں سارے تمہاری۔'' وہ اُٹھ کر اسے پیار کرنے لگیں۔

''اس میں کوئی شک نہیں۔'' ماموں نے بھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

ممانی کیوں پیچھے رہتیں۔ٹھوکر کھا جانے کے بعد لوگ کتنے اچھے ہو جاتے ہیں، اس نے ہنستی ہوئی ممانی کو دیکھ کر سوچا۔

''مگر اب آپ کی یہ اچھی اور باہمت بیٹی آپ کے پاس چند دن کی مہمان ہے۔''
انکل فیضان کی آواز پر سب نے مڑ کر دیکھا۔وہ رانیہ اور اپنی بیگم کے ساتھ کھڑے تھے اور ان کے پیچھے فراز۔

وہ کہاں بھاگے؟ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔کمرے میں رش بڑھ گیا تھا۔

وہ آنے والے مہمانوں کو سلام کر کے باہر بھاگنے لگی۔

''شکر ہے، آج شریفانہ سچویشن میں ملاقات ہوئی ہے ورنہ تیسری بار بھی تم کسی مشکوک سچویشن میں ملتیں.....تو مشکوک ہو جانا تھا۔'' فراز کی سرگوشی وہی سن سکی۔

''کیا بکواس ہے؟'' اس کی آواز کچھ اونچی ہو گئی۔

''ہیں!'' سب نے حیرت سے دونوں کو مڑ کر دیکھا تو وہ شرمندہ ہو کر باہر نکل آئی۔

گھر آئے مہمانوں کی خاطر مدارت کا انتظام بھی تو کرنا تھا۔اور ایک مدت بعد تو اس گھر میں مہمان آئے تھے، خدا کی رحمت بن کر۔اور خوشیوں کا پیغام لے کر عید سے پہلے گھر میں عید اُتر آئی تھی۔وہ کیوں نہ شکر کرتی۔

❖❖○❖❖

بھیگی جنوری کی شام

ایکسکیوزمی! سنیے۔''

اجنبی آواز پہ اس نے نانو کی وہیل چیئر پہ جمے ہاتھ ہٹائے بغیر ذرا سی گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔چند قدموں کے فاصلے پر وہی اجنبی شناسا کھڑا اسے متوجہ کر رہا تھا، جسے وہ کئی دنوں سے باغِ جناح کی اس روش پر ٹہلتے چہل قدمی کرتے یا کسی کتاب کے مطالعے میں گم دیکھتی آ رہی تھی۔اس وقت وہ چہرے پہ بڑی دوستانہ سی مسکراہٹ لئے اسے دیکھ رہا تھا۔یہ مسکراہٹ سحر کو پہلے بھی کئی ایک بار اپنی طرف دیکھنے پہ نظر آئی تھی، مگر وہ خود ہی نظریں چرا لیتی تھی۔

''جی.....؟'' وہ استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھ کر بولی۔

''آپ کا دوپٹہ۔'' اس نے شہادت کی انگلی اور نظروں کے زاویے سے سحر کے کندھے سے لٹکتے دوپٹے کی طرف اشارہ کیا۔اس نے بے اختیار اپنے بائیں جانب گردن جھکا کر دیکھا۔اس کا آسمانی گرے کلر کا شیفون کے دوپٹے کا کونہ وہیل چیئر کے پہیے میں آ چکا تھا۔

''اوہ!'' اسے اب احساس ہوا، اس کی گرن کے گرد بڑھتا ہوا کھنچاؤ سا اس وجہ سے تھا۔وہ ذرا سا نیچے جھک کر دوپٹے کا پلو وہیل چیئر سے نکالنے لگی۔پلو کے ریشمی دھاگوں کا گچھا سا وہیل کے اندر پھنس گیا تھا۔اس کے زور سے کھینچنے پر بھی نہیں نکل سکا۔

''لائیے، میں نکال دیتا ہوں۔'' وہ اس دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے جھکا اور وہ جو..... ''نہیں نہیں رہنے دیں، میں خود نکال لوں گی۔'' کہنا چاہ رہی تھی، کہہ نہ سکی۔سحر کے جھکے ہوئے چہرے کے بے حد نزدیک اس نوجوان کا صحت مند گھنے بالوں والا سر تھا اور وہ گردن جھکائے دوپٹے کا پلو بڑی نرمی سے باہر نکال رہا تھا۔اس نے لائٹ گرے کلر کی لائننگ شرٹ کے ساتھ بلو جینز پہن رکھی تھی۔اس کے لباس سے

بھینی بھینی سی خوشبو خاصی مدھم تھی۔

''لیجیے نکل گیا۔'' وہ کہتے ہوئے تیزی سے اٹھا۔ اگر وہ ایک جھٹکے سے اپنا چہرہ نہ ہٹاتی تو یقیناً اس کا تربوز جتنا بڑا سر اُس کی ٹھوڑی کو ضرور اس کی جگہ سے ہلا چکا ہوتا۔

''واؤ! واٹ اے سین۔'' پاس سے گزرتے کسی منچلے نے ہونٹ سکوڑ کر سیٹی کی آواز میں کہا تو دونوں کو جیسے اردگرد سے گزرتے ہوئے لوگوں کی تنقیدی نظروں کا احساس ہوا۔

''شکریہ!'' وہ آہستگی سے بولی۔ وہ کمر کے پیچھے ہاتھ باندھتے ہوئے اسی مسکراہٹ کے ساتھ چند قدم کے فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔

''کوئی بات نہیں۔'' وہ اسی بے غرض سی مسکراہٹ سے بولا تو اسے ہنسی آتے آتے رہ گئی۔ اس نے چہرے کا رخ بالکل سامنے گیٹ کی طرف کر لیا۔

''آپ ہنسنا چاہ رہی ہیں غالباً۔'' اس کی زیرک نظروں نے اس کی خفیف ہنسی کو دیکھ لیا تھا۔

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' سحر قدرے سنجیدگی سے بولی۔

''شاید آپ یہ سوچ رہی ہوں گی کہ میں آگے کہوں گا، یہ تو میرا فرض تھا۔'' وہ جلدی سے بولا۔

'اُف.....'' وہ دھک سے رہ گئی۔ واقعی یہی تو وہ سوچ رہی تھی مگر کھٹ سے جی ہاں بالکل کہنا اسے مناسب نہ لگا تو وہ لاتعلقی سے جاگنگ ٹریک پر پھولے سانسوں کے ساتھ بھاگتے لوگوں کو دیکھنے لگی۔

''یہ آپ کی...'' اس نے اب آہستہ آہستہ نانو کی وہیل چیئر دھکیلنی شروع کر دی تھی۔

''میری نانو ہیں۔'' وہ نانو کے ماتھے پر آئے بالوں کو نرمی سے پیچھے کرتے ہوئے بولی۔

''کب سے ہیں یہ ایسے؟'' اس کا اشارہ نانو کے پیرالائز ہونے کی طرف تھا۔

''کچھ عرصے سے۔''

''لگتا ہے آپ کو بہت محبت ہے اپنی نانو سے۔ میں آپ کو اکثر انہیں ادھر سیر کراتے دیکھتا ہوں۔'' وہ اب آہستہ آہستہ اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

'خاصا لیچڑ بندہ ہے۔ بھئی پلو چھڑا دیا، اب جاؤ۔ کیا فیس دوں؟' وہ دل میں خوب چڑی۔

''جی سب ہی کو ہوتی ہے۔'' اس نے منکسر المزاجی سے اپنی محبت کو آفاقی سچائی

بنانے کی کوشش کی۔

''سب کو ہوتی ہے مگر اس کا اظہار عموماً سب نہیں کرتے۔ اظہار سے میری مراد اس طرح خدمت، تیمارداری وغیرہ۔'' وہ اب گیٹ کے قریب پہنچ چکے تھے۔

وہ اب اس سے جان چھڑانے کا بہانہ سوچ رہی تھی۔ نہ سردی تھی نہ گرمی جس کا نانو کی طبیعت پر برا اثر پڑنے کا کہہ کر وہ وہاں سے نکلتی۔ آج تو موسم کافی اچھا تھا۔ اگرچہ سردیاں ابھی مکمل طور پر الوداعی ہاتھ نہیں ہلا سکی تھیں اور گرمیاں جھجکتے ہوئے اپنا ہاتھ باہر نکالنے کی کوشش کر رہی تھیں، اور دونوں کی ہچکچاہٹ کے بیچ بہار کا موسم کھڑا مسکرا رہا تھا۔ مارچ کے وسط میں دوپہر میں کچھ گرمی اور تیز دھوپ کا احساس ہوتا تھا، جب کہ صبح وشام میں ہلکی ہلکی ٹھنڈک کا۔

اس نے ایک گہرا سانس لے کر باغ کی معطر فضا پر نازل ہوتی سرمئی شام کی خوشبو کو اپنے اندر اُتارا، اردگرد کیاریوں میں رنگ برنگ خوشبودار پھول سر اٹھائے مسکرا رہے تھے اور ان کے سروں پر کھڑے دور دور تک پھیلے گھنے ہرے بھرے سیاہی مائل درخت بہار کی موجودگی کا بھرپور احساس دلا رہے تھے۔

ان دنوں یوں بھی باغ میں لوگوں کی آمد بڑھ جاتی تھی۔ صبح وشام باقاعدہ واک اور جاگنگ کرنے والوں میں تو اضافہ ہوتا ہی تھا، کبھی کبھار آنے والے بھی تقریباً روز ہی ادھر کا رخ کرتے تھے۔ وہ بھی آج کل نانو کو روز ہی باغ میں لا رہی تھی۔ اسے خود یہاں آ کر بہت سکون، بہت مزہ آتا تھا تو نانو کی بے چین طبیعت بھی جیسے پُرسکون ہو جاتی تھی۔ وہ اسی ہلکی پھلکی سیر کے دوران ان سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی رہتی، جیسے ابھی اس نوجوان کی مداخلت سے پہلے وہ نانو سے کہہ رہی تھی۔

''نانو! کیا پرندے بھی انسانوں کی طرح اپنے آبائی گھروں اور شہروں سے جسمانی طور پر ہی نہیں، جذباتی طور پر بھی بہت گہری وابستگی رکھتے ہیں؟'' نانو نے اس کے سوال کا جواب ایک اثباتی مسکراہٹ میں دیا تھا۔

''دیکھیں، کتنے کوّے ہیں ادھر۔ شام ہوتی ہے تو لگتا ہے سارے شہر کے کوّے باغِ جناح کا رخ کرتے ہیں۔ ادھر لگے درخت بھی تو شاید صدیوں پرانے ہیں۔ ان کوؤں کے آباء کی جنم بھومی لگتے ہیں یہ درخت، جب ہی تو سرِشام ادھر اکٹھے ہو کر خوب غل مچاتے ہیں۔

اس نے سر اٹھا کر آسمان پر دُور دُور تک پَر پھیلائے نیچی نیچی پرواز کرتے، شور

مچاتے، کاں کاں کرتے کوؤں کو دیکھا۔

''کیا میں آپ کو سڑک پار کرا دوں؟'' وہ گیٹ سے نکل رہی تھی، جب اس نے ایک اور آفر کی۔

''نو تھینکس، میں چلی جاؤں گی، اوکے پھر ملیں گے۔'' سحر نے خود ہی الوداعی جملہ کہا اور دوپٹہ کندھوں پر جما کر نانو کی وہیل چیئر دھکیلتی گیٹ سے باہر نکل آئی۔ سحر کے کانوں نے اس کی ہلکی سی خدا حافظ کی آواز سنی تھی۔

اس کے سڑک کراس کرنے سے پہلے ہی فضا میں مغرب کی اذانیں گونجنے لگی تھیں۔ وہ دائیں طرف کچھ دیر دیکھنے کے بعد جلدی سے سڑک پار کر گئی۔ ماموں میاں کا گھر باغ کے بالکل پاس ہی تو تھا، لارنس روڈ پر۔ کبھی کبھار وہ نانو کو گاڑی میں لے آتی۔ اس صورت میں اسے رقیہ کو بھی ساتھ لانا پڑتا تھا، جو نانو کی کل وقتی اٹینڈنٹ تھی۔ کیونکہ گاڑی سے نکال کر وہ اکیلی وہیل چیئر پر نہیں بٹھا سکتی تھی۔ اکثر اسے انہیں گاڑی پر ہی لانا پڑتا، کیونکہ ان دونوں سڑکوں پر ٹریفک کا رش بہت ہوتا تھا۔

جب وہ ''وارث لاج'' میں داخل ہوئی تو لان سمیت گھر کی تمام لائٹیں جل چکی تھیں۔ پورٹیکو میں ماموں میاں کی شیورلیٹ بھی کھڑی تھی۔

رقیہ انہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر فوراً لپکی تھی۔ ماموں میاں لاؤنج میں صوفے پر بیٹھے فون پر کسی سے محوِ گفتگو تھے۔ وہ انہیں آہستگی سے سلام کرتے ہوئے رقیہ کے ساتھ نانو کو ان کے کمرے تک لے آئی۔ دونوں نے مل کر انہیں بستر پر لٹایا، رقیہ ان کی ٹانگوں پر ہلکا سا کمبل اوڑھا کر ان کی ٹانگیں دبانے لگی تو وہ باہر نکل آئی۔

❖❖○❖❖

جب تک ناہید مامی زندہ تھیں، وہ اس گھر میں ایک بے تکلف مہمان کی طرح آتی تھی۔ ان کی محبت بھری میزبانی میں بہت دن گزار کر جایا کرتی تھی۔ بچپن ہی سے ان چاروں بہن بھائیوں کے لئے نانو کا گھر، ماموں میاں کا گھر ایک ونڈرلینڈ کی طرح تھا، جہاں ان چاروں کا ہر گھڑی جانے کو جی ہمکتا تھا۔ آپی تو خیر شعور سنبھالتے ہی ماموں میاں کی سرد مہری اور کم گوئی کو ان کا دولت پہ غرور جان کر بہت جلد لاہور آنا کم کر گئی تھیں۔ لیکن سحر، رانیہ اور سنی ان کے لئے لاہور آنا، پھر ماموں میاں کے گھر آنا ایک زبردست سرپرائز سے کم نہ تھا۔ کوئی بھی بہانہ ہوتا، وہ تینوں بھاگ بھاگ کر امی ابو کے ساتھ لاہور آیا کرتے تھے۔ اگرچہ ابو ان کے ساتھ بہت کم آتے تھے۔ سیالکوٹ اور

لاہور میں کون سا بہت فاصلہ تھا۔ سفر کی سہولتیں بہتر ہونے سے پہلے کے مقابلے میں وقت بھی نصف صرف ہونے لگا تھا۔ مگر اس کے باوجود ابو بہت کم لاہور آیا کرتے تھے۔ آتے بھی تھے تو ماموں میاں کی طرف گھڑی کی گھڑی ٹھہرتے تھے اور پھر مغل پورہ میں اپنے ایک کزن چچا حمید کی طرف چلے جاتے یا پھر راج گڑھ جیسے گنجان آباد علاقوں میں رہائش پذیر اپنی خالہ زاد ثریا کی طرف۔ جہاں جانے سے ان تینوں کی جان جاتی تھی۔

چھوٹے چھوٹے ڈبی نما خستہ حال گھر، جن کے باہر گندی نالیاں کھلے سر منہ لئے بہتی تھیں، جن پر اکثر ننگ دھڑنگ بچے بیٹھے ''فارغ'' ہو رہے ہوتے تھے، اور بڑی بچیوں کے سروں میں جوؤں کی تلاش میں سرگرداں مائیں، ''وے مر جانیاں! اندر کیا کرو۔'' کی رسمی ہانک لگا کر پھر سے اپنے محبوب مشغلے میں مگن ہو جاتیں۔ پھر چچا اور پھپھو کا جتا جتا کر بار بار کہنا۔

''ہاں جی، تمہارے ان ننھے شتونگڑوں کا کب جی کرے گا چچا کی طرف آنے کو، جب ماموں کا دو کنال پر پھیلا خوب صورت بنگلہ رہنے کو نظر آتا ہے۔ پھر یہ غریب رشتہ دار کب اچھے لگیں گے، جن کے پاس خالی خولی محبت ہی ہوتی ہے۔ اور میاں! آج کل کسی کا جی خالی خولی محبت سے نہیں بھرتا۔ چاہے بچے کو دے دو، ''اونہہ'' کہہ کر اگلے کے منہ پر مار جائے گا۔ اور ہمارے پاس یہی چاہت کے کھوٹے سکے رہ گئے ہیں، جنہیں بچوں سمیت زمانے میں کوئی قبولتا نہیں۔ ماموں کے گھر تو نعمتوں کے خوان ہوتے ہیں۔ ٹرالیاں من وسلویٰ سے سج سج کر آتی ہیں، پھر ہماری دال روٹی کیونکر اچھی لگے گی۔''

چچا اور پھپھو جان کر انہیں چڑاتے اور وہ تینوں ابو کے پیچھے چھپتے اور وہ لڑاکا عورتوں کی طرح طعنے مارتے جاتے۔ بس اسی شرم ناک صورتِ حال کا بار بار سامنا کرنے کے بعد ان تینوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کبھی پھپھو اور چچا کی طرف نہیں جائیں گے۔ حالانکہ انہوں نے تو کبھی ان تینوں کو ساتھ لپٹا کر پیار بھی نہیں کیا تھا۔ کبھی اس کھوٹے سکے جیسی محبت کی ایک جھلک بھی نہ دکھائی تھی، جس کا وہ ڈھنڈورا پیٹتے تھے۔

اور یہی محبت چم چم کرتی، کھلکھلاتی، ہنستی ان کے گرد گھیرا ڈالتی ماموں میاں کے گھر دروازے پر ہی استقبال کو آ جایا کرتی تھی۔ ناہید مامی کی محبت اور خلوص بھری باتیں پل بھر میں ان کے سفر کی تکان اُتار دیتیں اور وہ چند منٹوں میں ہی جوتے اُتارے بے تکلف گھر بھر میں پھرا کرتے تھے، جیسے اپنے گھر میں آئے ہوں۔ اگرچہ ماموں میاں

خاصے لئے دیئے رہا کرتے تھے، مگر انہوں نے نہ تو انہیں کبھی ڈانٹا تھا نہ کسی بات پر ٹوکا تھا۔ ان سے تو یوں بھی صبح ناشتے پر ملاقات ہوتی یا رات کے کھانے پر اگر وہ جلدی آ جایا کرتے۔ ورنہ سارا دن تو وہ گھر ہی میں نہیں ہوتے تھے۔

ناہید مامی بہت زندہ دل، ہنس مکھ اور ملنسار تھیں۔ سحر ان کے ہر دم مسکاتے ہونٹوں، چمکتے چہرے اور جگر جگر کرتی آنکھوں کو دیکھ کر سوچا کرتی، شاید یہ سب پیسے کی فراوانی کا کرشمہ ہے جو آدمی کو کہیں پریشان حال اور غمگین نہیں ہونے دیتا۔ یوں بھی ان کے پاس کس چیز کی کمی تھی عزت، دولت، محبت کرنے والا شوہر، جان چھڑکنے والا فرماں بردار ہینڈسم جوان بیٹا اور بے تحاشا محبت کرنے والی ساس اور سب سے بڑھ کر اتنا خوب صورت، پُرآسائش، سجا سجایا گھر جس میں ہر طرح کی خدمت کے لئے علیحدہ خدمت گار ہر گھڑی مستعد۔ یہ فکریں، یہ پریشانیاں، ٹینشنز تو شاید ہم جیسے مڈل کلاسیوں کی زندگی کا ناگزیر حصہ ہوتی ہیں۔ اس کی امی بھی تو ناہید مامی کی ہم عمر تھیں۔ مامی سے دگنا بڑی لگتی تھیں۔ ابو سترہویں گریڈ کے گورنمنٹ ملازم تھے اور وہ ایک دو سالوں میں ریٹائرڈ ہونے والے تھے۔ چھوٹا سا آبائی گھر، جس میں تایا جان کا حصہ تھا۔ مگر صد شکر وہ ترکی جا کر جو سیٹل ہوئے تو انہوں نے بعد میں ابو سے کہلوا دیا کہ انہیں گھر میں حصہ نہیں چاہئے۔ انہیں اللہ نے اُدھر بے شمار دھن دولت سے نواز دیا تھا۔ یوں گھر کی طرف سے بچت ہو گئی۔ ورنہ چار مرلے کے گھر کے حصے بخرے کے بعد جو اُن کے حصے میں آتا، اس سے تو شاید ابو ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی چھت بھی نہ بنا پاتے۔ لیکن زندگی صرف چھت کے سہارے تو نہیں بتائی جا سکتی۔ چار جوان ہوتے بچوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات اور چھ افراد کے کنبے کا صرف ابو کی تنخواہ میں گزارہ کس مشکل سے ہوتا تھا، اس کا ایک ایک حرف امی کے چہرے پر بڑھتی جھریوں میں با آسانی پڑھا جا سکتا تھا۔

نانو، امی کی ڈھکی چھپی مدد کرنے کی کوشش کرتیں تو امی کے چہرے کا رنگ ہی اُڑ جاتا۔

''اماں! ناصر کو پتہ چل گیا تو طوفان اٹھا دیں گے۔ پلیز اتنی بڑی رقم نہ دیں مجھے۔ انہوں نے ساری زندگی اپنی خودداری کے آگے بچوں کی ضروریات سے بھی منہ موڑے رکھا ہے، اب لے کر جاؤں گی تو اس عمر میں بچوں کے سامنے اچھا بھلا ذلیل کر دیں گے مجھے۔'' امی ہزار ہزار کے کئی نوٹ جو نانو اُن کو تھماتیں وہ واپس اُن کی گود میں جھٹک دیتیں۔

''اے ہے..... میں ماں ہوں تمہاری، کوئی غیر نہیں۔ اتنا تو حق ہے نا میرا تم پر، تمہارے بچوں پر۔'' نانو خفا ہو کر کہتیں۔

''اماں! سب جانتی ہیں، پھر بھی۔'' امی آنکھوں میں آنسو بھر لاتیں تو نانو سرد آہ بھر کر رہ جاتیں۔

''انا اور خودداری کے معاملے میں پتھریلا بھی نہیں ہونا چاہئے کہ اپنے خون کے رشتوں کے خلوص کو بھی بدگمانی سے دیکھنے لگے۔''

''ان کی طبیعت ہی ایسی ہے، کچھ گزر گئی ہے، کچھ گزر جائے گی۔'' امی گہرا سانس لے کر آنکھیں صاف کرتیں۔

پتہ نہیں، ابو کی یہ عادات اچھی تھیں کہ بری، اسے خود بھی کبھی اتنا احساس نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ امی نے ان چاروں کو کبھی اتنی تنگی ہونے ہی نہیں دی تھی۔ بے حد سمجھ داری اور طریقے سلیقے سے ان کی چھوٹی بڑی سب ہی ضرورتیں پوری کر دیا کرتی تھیں۔ کپڑے عموماً نانو اور ناہید مامی آتے جاتے، تحفوں کی صورت میں دے دیا کرتی تھیں۔ یہ چاروں بہن بھائی رہنے آتے تو جوتے، کپڑے اور چھوٹی چھوٹی بے شمار چیزیں نانو انہیں دے کر بھیجا کرتی تھیں۔ اب کپڑوں، جوتوں پر تو ابو اعتراض نہیں کر سکتے تھے۔ ویسے بھی امی انہیں تمام چیزیں کب دکھاتی تھیں؟ یوں زندگی کسی بھی بڑی تلخ حقیقت سے نظریں ملائے بغیر کافی سہولت سے گزر رہی تھی۔

اس روانی میں پہلا پتھر رادیہ آپی کی لو میرج نے پھینکا تھا۔

فرحان بھائی اُن کی کسی کلاس فیلو کے کزن تھے، آتے جاتے ہائے ہیلو سے بات آگے بڑھی تو فرحان بھائی کا اسٹیٹس اور جما جمایا بزنس دیکھ کر رادیہ آپی اپنے بڑھتے ہوئے قدم نہ روک سکیں۔ اگرچہ فرحان بھائی شکل وصورت اور عمر دونوں میں رادیہ آپی کے ہم پلہ نہیں تھے۔ گہرا سانولا رنگ، درمیانے قد کے ساتھ بھاری جسم اور شکل و صورت میں کوئی کیا عیب نکالے۔ سب کو اللہ نے بنایا ہے۔ مگر انتخاب تو ہم کھلی آنکھوں سے کرتے ہیں اور رادیہ آپی نے کھلی آنکھوں سے صرف ان کی لش لش کرتی جہازی سائز گاڑی، ایک کنال کا جدید اسٹائلش بنگلہ، شہر کے دو معروف ترین شاپنگ سینٹرز اور ان کے قیمتی لباس کی جیب میں ہر دم پھولا پھولا والٹ ہی دیکھا۔

ابو تو اس پرپوزل کا سنتے ہی بھڑک اُٹھے اور فوراً انکار کر ڈالا۔ آپی ابو سے زیادہ جوش میں آ گئیں، امی کو دونوں کو ٹھنڈا رکھنا محال ہو گیا۔

گھر میں اچھی خاصی سرد جنگ شروع ہوگئی۔ نہ تو رادیہ آپی پیچھے ہٹنے کو تیار تھیں، نہ ابو لچک کا مظاہرہ کرنے پر راضی ہو رہے تھے۔

''یہ چاہتے ہیں، کسی اپنے جیسے گیارہویں اسکیل کے ایمان دار ٹٹ پونجیے سے میری شادی کر دیں۔ جس طرح کیڑوں کی طرح رینگ رینگ کر میں نے اس گھر میں آدھی زندگی گزار دی ہے، باقی کی آدھی زندگی اس سے بھی بدتر حال میں گزار دوں۔ اور پھر ہر چوتھے دن روتے بلکتے، بھوکے ننگے بچوں کو اٹھا کر ان سے مدد کی بھیک مانگنے آتی رہوں۔ میں ایسی ذلت بھری زندگی ان کے تو کیا کسی کے بھی کہنے پر نہیں گزاروں گی۔ میں کوئی بے زبان جانور نہیں ہوں، جس کے منہ میں زبان ہوتی ہے اور نہ دماغ میں عقل۔''

اُف! رادیہ آپی کو نہ جانے کس نے اس لہجے میں بات کرنا سکھا دی تھی، ورنہ بقول ابو کے رادیہ تو میری بہت سمجھ دار اور قناعت پسند بیٹی ہے۔ اور ابو سمجھ نہیں رہے تھے کہ یہ رادیہ اسی ''سمجھ داری'' کا تو ثبوت دے رہی ہے، جس کی فی زمانہ ضرورت ہے۔

''میں نے ساری زندگی تم لوگوں کو حلال کا لقمہ کھلایا ہے۔ ارے حرام ہی کمانا ہوتا تو میرے لئے کیا مشکل تھا؟ اور یہ نادان اندھے گڑھے میں گرنا چاہتی ہے۔ حرام، حلال کا فرق اُٹھ گیا ہے لوگوں کی نظروں میں۔ کاریں، کوٹھیاں کھڑی کر لیتے ہیں تو سمجھتے ہیں، بہت فائدے میں رہیں گے۔ ارے یہ تو نرا گھاٹے کا سودا ہے۔ حرام کا ایک لقمہ سارے بدن کو حرام خون دیتا ہے، سارے جسم کو نجس کر دیتا ہے۔ اور میں اسے اس گڑھے میں دھکیل دوں جہاں دن رات حرام دولت کے انبار جمع ہو رہے ہیں؟''

ابو بہت مذہبی نہیں تھے، بس پنج گانہ نمازیں پابندی سے ادا کرتے تھے یا پھر یہ حرام حلال کی شق تھی، جس پر وہ ساری زندگی کبھی کمپرومائز نہیں کر پائے تھے۔

''سب حرام طریقوں سے نہیں کماتے۔ بھول ہے ان کی۔ اور یہ میری زندگی ہے۔ حرام جیوں یا حلال، ان کو اس سے کچھ غرض نہیں ہونی چاہئے۔'' رادیہ گستاخی کی ہر حد عبور کر گئی تو امی کو نانو اور ناہید مامی کو لاہور سے تصفیے کے لئے بلانا پڑا۔

ایک طویل بحث مباحثے کے بعد تصفیہ ہو گیا۔ دو ماہ بعد رادیہ آپی کی فرحان بھائی سے شادی ہو گئی۔ مگر ابو نے کہہ دیا تھا، وہ اب انہیں اپنی شکل نہ دکھائیں۔ اس پر بھی نانو نے ابو کی منت سماجت کر کے انہیں منا لیا تھا کہ انہیں ماں کے گھر آنے سے نہ روکا جائے، ان کی اگلی زندگی پر اثر پڑے گا۔ یوں بھی رادیہ کون سا اب اس ڈربے میں آنے

پر راضی تھیں۔ چار پانچ ماہ بعد شکل دکھاتیں، وہ بھی دن کے دو تین گھنٹے۔ ابو سے تو ان کی ملاقات بہت کم ہوتی تھی۔ صرف سلام کی حد تک اور بس۔

اور سحر تو یہ صورتِ حال دیکھ کر ہی پسند کی شادی سے دن میں دس بار توبہ کرتی۔ ابو کی ایسی سرد مہر بے نیازی اسے تو کسی بھی خواہش کے بدلے منظور نہیں تھی۔

اور یہ بھی سب سوچنے کی باتیں ہوتی ہیں، ورنہ مستقبل جو ایک جادو کی پٹاری ہے، وہ نہ جانے کل ہمارے لئے کیا حیرت انگیز لائحہ عمل تجویز کرے اور ہم چوں بھی نہ کر سکیں۔

نانو، بی پی کی مریضہ تو بہت پرانی تھیں، مگر اچانک یوں بستر پر جا پڑیں گی، اس کا گمان تو کسی کو بھی نہیں تھا۔ بہت شدید اور بہت اچانک فالج کا اٹیک ہوا تھا کہ فوری طبی امداد اور بہترین میڈیکل سہولتوں کے ملنے کے باوجود ان کا نچلا دھڑ مکمل طور پر اور اوپر والا بایاں حصہ مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ زبان بھی بری طرح سے متاثر ہوئی تھی۔ کوئی بھی جملہ مکمل ادا نہ کر پاتیں۔ وہ تو گویا موت کی دہلیز پر قدم رکھ کر پلٹی تھیں۔

جو انہیں اس حال میں دیکھتا، لرز کر رہ جاتا۔ اور تو اور ابو بھی انہیں دیکھ کر رو پڑتے تھے۔ ساری زندگی ابو کی سرد مہری کے باوجود وہ ابو سے بہت محبت و اپنائیت سے ملتی تھیں۔ جب بھی ابو کو بلاتیں، بیٹا جان کہہ کر پکارتیں۔ اور اب یوں کھلی آنکھوں، پتھر ہوتے وجود کے ساتھ پڑی تھیں کہ ابو کتنی دیر تک ان کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر بیٹھے رہے۔

ابو کے دل میں نانو کی اس قدر محبت ہو گی، اس کا کسی کو گمان بھی نہیں تھا۔ حالانکہ ان کے اپنے سگے بیٹے ماموں میاں کا ردِعمل خاصا روایتی تھا۔ وہ کچھ پریشان تو لگ رہے تھے مگر ڈسٹرب زیادہ دِکھ رہے تھے۔ ڈیڑھ ماہ ہسپتال کی خجل خواری کے بعد ڈاکٹرز نے بالآخر نانو کو اسی حالت میں ڈسچارج کر دیا۔

ایک نرس ان کی دیکھ بھال کے لئے رکھ دی گئی۔ فزیوتھراپسٹ دو ٹائم ان کو ایکسر سائز کروانے آتی تھی مگر ابھی تک کسی خاص بہتری کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

ناہید مامی تو ایک دم سے بجھ کر رہ گئی تھیں۔ پتہ نہیں ان کی ساری شوخی و طراری، نانو کے چلتے پھرتے وجود سے تھی۔ جونہی وہ بستر پر پڑیں، ناہید مامی بہت چپ چپ رہنے لگی تھیں۔

نانو کے بیمار ہونے کے صرف چھ ماہ بعد ہی ایک دن اچانک ان کے فون کی گھنٹی

بجی کہ ناہید مامی کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے، انہیں ہسپتال لے جایا گیا۔ گئیں تو وہ دل کے علاج کے لئے تھیں مگر وہاں جا کر پتہ چلا کہ ان کا تو پورا وجود کینسر جیسے موذی مرض کے ہاتھوں کھوکھلا ہو چکا ہے۔ صرف ایک جھٹکے کی ضرورت تھی اور یہ جھٹکا انہیں ہارٹ اٹیک کی صورت میں لگا۔ وہ اس جھٹکے سے سنبھل ہی نہ سکیں اور پچیسویں دن ہی ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند گئیں۔

ہنستی کھیلتی، زندگی سے بھرپور ناہید مامی اس طرح اچانک چلی جائیں گی، کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ بعد میں سننے میں آیا کہ ماموں میاں اور ان کے درمیان ان بن رہنے لگی تھی یا کوئی اور وجہ؟

سال بھر میں ماموں میاں کا بھرا بھرا سا گھر ایک دم سے سُونا ویران ہو گیا۔ گھر کو سجانے اور سنبھالنے والے دونوں وجود کیا رُوٹھے، گھر میں بہت سے نفوس ہونے کے باوجود جیسے اُلو بولنے لگے تھے۔

سجر کے فائنل ایگزام ہونے والے تھے اور ہانیہ کے تھرڈ ایئر کے۔ امی نہ ادھر رہ سکتی تھیں، نہ گھر آ سکتی تھیں۔ بہت مشکل دن تھے۔ سارا گھر نوکروں کے سر پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ ماموں میاں اور شایان دونوں رات گئے گھر لوٹتے تھے۔ خدا خدا کر کے سجر کے ایگزام تمام ہوئے تو امی نے سکون کا سانس لیا۔

''سجر بیٹا! یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے جو میں تم پر ڈال رہی ہوں۔ اماں کی دیکھ بھال، گھر کی دیکھ بھال سے بھی ضروری ہے۔ ماں تو وہ میری ہیں اور مجھے ہی ان کی اس حالت میں خدمت کرنی چاہئے، مگر سب حالات تمہارے سامنے ہیں۔ میں نے بھائی میاں سے بات کی ہے، وہ جلد ہی اس کا کوئی حل نکال لیں گے۔ ہانیہ کی چھٹیاں ہو جائیں تو تم دونوں باری باری ادھر کچھ دن گزار جایا کرنا۔ فی الحال تمہیں ہی اکیلے یہ ذمہ داری اٹھانا پڑے گی۔ کیا تم سنبھال لو گی؟'' امی بہت آس سے اس سے پوچھ رہی تھیں۔ اس نے اپنا بیگ بند کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اور اب اسے ادھر آئے ڈیڑھ ماہ ہو چکا تھا۔ مامی کے بغیر یہی آئیڈیل گھر اسے کھانے کو دوڑنے لگا تھا۔ پھر نانو کی ایسی حالت اسے اور پریشان کر دیتی۔ سارا دن وہ کسی سے بات کرنے کو ترس جاتی۔ ماموں میاں اور شایان دونوں آدھی رات کو گھر آتے تھے، کھانا کھاتے اور اپنے اپنے بیڈ رومز کا رخ کر لیتے۔ اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس سے بات کرے۔ گھر میں تو ہانیہ اور امی کے ساتھ خوب گپ شپ رہتی

تھی یا پھر گھر کے ڈھیروں ڈھیر کام فرصت کی سانس نہ لینے دیتے۔ ادھر تو سر کھجانے کو بھی ملازم موجود تھے اور اب ملازمین سے کوئی کتنی باتیں کر سکتا ہے۔ دوست اُس کی یونیورسٹی کی حد تک رہی تھیں۔ ندا کی تو پچھلے ماہ شادی ہو گئی تھی جبکہ عظمیٰ سے کبھی کبھار فون پر بات ہو جاتی تھی۔ ماموں میاں کی لائبریری نہ ہوتی تو نہ جانے اس کیا کیا بنتا۔ امی کا تیسرے چوتھے دن فون آ جاتا۔

''میں جلد آؤں گی۔ تم گھبرانا نہیں۔ نوکروں کے سر پر موجود رہا کرو۔ اپنی نگرانی میں ان سے کام کرایا کرو۔ نانو کا بہت خیال رکھا کرو۔'' وغیرہ وغیرہ۔ وہ اُکتا کر رہ جاتی مگر ابھی تک اُس کی یہ اُکتاہٹ اُس کی با مروّت طبیعت کی وجہ سے اُس کے لہجے میں در نہیں آئی تھی، اسی لئے امی کو اس کی بیزاری اور بوریت کا احساس نہیں ہوا تھا۔

رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اس نے جمائی لیتے ہوئے وال کلاک دیکھا اور ''پیلا اُداس چاند'' بند کر کے سرہانے رکھا اور لیمپ کی لائٹ آف کر کے لیٹ گئی۔ دو چار کروٹیں بدلتے ہی اس پر نیند مہربان ہو چکی تھی۔

❖❖○❖❖

''ہیلو!'' اپریل کے وسط کی خوشگوار شام تھی۔ دن تو اب اچھا خاصا گرم ہونے لگا تھا مگر شام ابھی بھی کچھ بہتر ہوتی تھی۔ وہ تقریباً دس بارہ دن بعد آج نانو کے ساتھ باغ آئی تھی۔ رقیہ، نانو کی وہیل چیئر دھکیل رہی تھی اور وہ ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ باغ میں اس وقت عموماً خاصی رونق ہو جایا کرتی تھی۔ والدین کے آگے سڑکوں اور کیاریوں کے پاس بھاگتے دوڑتے بچے اور جاگنگ ٹریک پر روزانہ واک کے لئے آنے والے آ جا رہے تھے۔ باغ میں وہی مانوس ٹھنڈی ٹھنڈی مہک پھیلی ہوئی تھی جو گیٹ سے اندر داخل ہونے والوں کا بانہیں پھیلا کر استقبال کرتی تھی۔ بس یہی ایک جگہ تھی جہاں آنے کے لئے اس کا دل ہر دم تیار رہتا تھا۔ نانو کی طبیعت کی وجہ سے وہ اتنے دن سے نہیں آ سکی تھی۔ بیچ میں دو دن امی بھی رہ کر گئی تھیں بلکہ ابو بھی ساتھ تھے اور اس بار حیرت انگیز طور پر وہ چچا اور پھپھو کی طرف کھڑے کھڑے ہی گئے تھے۔ دونوں راتیں وہ ماموں میاں کی طرف ہی رہے تھے۔ سجر کے شعور میں وہ پہلی بار سارا ٹائم نانو کے پاس رہے تھے، ان سے باتیں کرتے رہے جن کا انہیں کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔ مگر نانو کی مسکراتی آنکھیں، ابو کی طبیعت کی اس تبدیلی پر مستقل خوش نظر آ رہی تھیں۔

آج بھی نانو کے کہنے پر وہ انہیں باغ لے کر آئی تھی۔

اس نے کچھ چونک کر ذرا سی گردن موڑ کر دیکھا۔ اس دن والا لڑکا اپنی اسی کھلی کھلی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے تک رہا تھا۔

''ہیلو!'' جواباً اُسے بھی مسکراتے ہوئے کچھ شناسائی کا مظاہرہ کرنا پڑا۔

''بہت دنوں بعد آئیں آپ۔'' سحر کی مسکراہٹ سے شاید اس کی حوصلہ افزائی ہوئی تھی، کچھ بے تکلفی سے بولا تو سحر کی پیشانی پر خفیف سا بل آ گیا تو وہ بھی جیسے سنبھل گیا۔

''کیسی ہے اب ان کی طبیعت؟'' وہ نانو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''بس اسی طرح ہے۔'' وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

''موسم اچھا ہو رہا ہے۔'' چند لمحوں کی پُرتکلف خاموشی کے بعد وہ پھر گویا ہوا۔

''ہوں!'' اس نے بھی سر اٹھا کر سرمئی پڑتے آسمان کو دیکھا۔ ہلکی ہلکی ہوا کے ساتھ بادلوں کے کچھ ٹکڑے اِدھر اُدھر منڈلا رہے تھے، روڈ کی دوسری طرف ہرا بھرا پلاٹ تھا۔ سبزے کی ٹھنڈی ٹھنڈی باس آ رہی تھی۔

''دن میں تو خاصی گرمی تھی۔'' وہ اب اس کے ساتھ ہی چل رہا تھا۔ رقیہ، نانو کی وہیل چیئر دھکیلتی دو قدم آگے چل رہی تھی۔

''آپ کیا روز باغ آتے ہیں؟''

''تقریباً روزانہ۔''

''واک کرتے ہیں یا صرف مطالعہ ہی کرتے رہتے ہیں؟ کیا آپ کے گھر والے آپ کو گھر میں کتاب پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے؟'' سحر نے اس کے ہاتھ میں پکڑی ''آواز دوست'' کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''واک تھوڑی بہت ضرور کرتا ہوں اور مطالعہ تو سمجھیں، مجھے جنون ہے اس کا۔ میں کتاب کے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

''رئیلی؟'' سحر کے مرجھائے دل کی کلی جیسے کھل اُٹھی۔ بہت دنوں بعد تو اس کی اپنے جیسے کسی کتابی کیڑے سے ملاقات ہو رہی تھی۔

''آف کورس۔ میں فاسٹ فوڈ کی نہیں، کتابوں کی محبت کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ اسی کھلی کھلی سی مسکراہٹ سے بولا۔ اس کے نیچے والے دانت ایک قطار میں تھے، تھوڑے تھوڑے مگر بالکل سیدھ میں مسکراتے ہوئے نچلے ہونٹ سے باہر نظر آتے تھے۔

''اونہوں، کتابوں سے محبت کے علاوہ میں کسی اور محبت کو نہیں مانتی۔'' وہ اپنا کیچر میں جکڑے ادھ کھلے بالوں والا سر ہولے سے جھٹک کر بولی۔

''اس کا مطلب ہے، اس معاملے میں ہم دونوں کا ٹیسٹ ملتا جلتا ہے۔'' وہ بھی جیسے دنوں بعد کسی ہم ذوق سے ملا تھا، خوش ہو کر بولا۔

''آپ کیا پڑھتے ہیں؟'' وہ دلچسپی سے بولی۔

''لٹریچر اور پوئٹری سے متعلق ہر چیز میں چاٹ جاتا ہوں، انگلش اور اُردو دونوں میں فرق کئے بغیر۔''

''واؤ، ونڈرفل۔ مجھے بھی یہی دونوں فارمز اپیل کرتی ہیں۔''

''کتنی عجیب بات ہے ہم دونوں کا یہ شوق جو ہماری پرسنالٹی کا بڑا نمایاں فیچر ہے، وہ تو ایک جیسا ہے مگر اس کے باوجود ہم دونوں ایک دوسرے سے متعارف نہیں۔'' وہ کچھ شکایتی انداز میں بولا۔

''مجھے سحر کہتے ہیں۔ سحر ناصر۔''

''میں اسد ہوں۔ اسد شفیق۔''

''آپ کیا کرتی ہیں؟'' وہ شاید آج ہی مکمل طور پر متعارف ہو جانا چاہتا تھا۔

''کر چکی ہوں، ماسٹر اِن اکنامکس۔ ایگزام دے رکھا ہے، رزلٹ کا انتظار ہے۔ اور آپ؟''

''میں نے گریجویشن سائنس کے ساتھ کیا تھا اور پھر ڈپلومہ اِن کمپیوٹر ایجوکیشن اور اب اِن جاب ہوں۔ میرا آفس ادھر سے تھوڑی دور ہے، چائنا چوک سے ذرا آگے۔''

''تو گویا آپ برسرِ روزگار ہیں، اسی لئے ہر روز آپ کے ہاتھ میں ایک نئی کتاب ہوتی ہے۔''

''یہ میری جاب کا کمال نہیں بلکہ قائداعظم لائبریری کی مہربانی ہے، جس کی میں نے ممبر شپ لے رکھی ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے گلاب کے سرخ، پیلے اور سفید قطعوں کے راؤنڈ اباؤٹ سے آگے بنی سفید پُرشکوہ قائداعظم لائبریری کی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے، مجھے بھی لائبریری لے جائیں۔ میں نے اندر سے نہیں دیکھی۔'' وہ بچوں جیسے اشتیاق سے بولی۔ وہ جب بھی لاہور آتی، سوچتی کہ اس بار ممبر شپ کارڈ بنوا ہی لے گی اور ہر بار سستی دکھا جاتی۔

''شیور۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''پھر تو آپ گھر جا کر بھی بکس پڑھتے ہوں گے۔ ویسے پریکٹیکل لائف میں آنے

کے بعد میں نے بہت کم لوگوں کو مطالعے کی عادت برقرار رکھتے دیکھا ہے۔''

''ہاں، یہ تو صحیح کہا آپ نے۔ اصل میں کتابوں میں سبق ہی تو ہوتے ہیں۔ اور جب انسان پریکٹیکل لائف میں آتا ہے تو اس کا پہلا چیپٹر ہی اتنا ہوش اُڑا دینے والا ہوتا ہے کہ اسے ساری کہانیوں کے سبق بھول جاتے ہیں۔'' وہ بولا۔

''آپ کو صرف کتابیں پڑھنے کا شوق ہے یا جمع کرنے کا بھی؟'' کتاب وہ موضوع تھا، جس پر بقول امی کے بحر کسی کا جتنا بھی دماغ چاٹ سکے، کم ہے۔''

''شوق تو دونوں ہیں مگر جیب صرف پہلا شوق ہی پالنے کی اجازت دیتی ہے۔ اور آپ کو؟''

''مجھے پڑھنے کا تو شوق ہے ہی مگر خریدنے کا بھی بہت ہے۔ ادھر سیالکوٹ میں تو میری الماری کے تینوں کیبنٹس کتابوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ میں اپنی پاکٹ منی، کپڑوں اور جوتوں کے بجائے کتابوں پر خرچ کرنا پسند کرتی ہوں۔'' وہ مزے لے کر بتا رہی تھی۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بہت پرانے دوست سے اپنا شوق شیئر کر رہی تھی۔

''تو آپ لاہور میں نہیں رہتیں؟'' وہ کچھ حیرت سے بولا۔

''نہیں، میں سیالکوٹ میں رہتی ہوں۔'' وہ کچھ سنبھل کر بولی۔

''اور ادھر کس کے پاس؟''

''اپنے ماموں کے گھر۔'' وہ اب رقیہ کو نانو کی وہیل چیئر واپس موڑنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ سرمئی شام گہری ہو رہی تھی۔ فضا میں کوؤں کا شور بڑھ رہا تھا۔

''ایک اور قدر مشترک۔'' وہ دھیرے سے ہنسا۔

''کیا مطلب؟''

''میں بھی لاہور کا نہیں ہوں۔''

''اچھا، واقعی؟'' وہ بھی کچھ حیران ہوئی۔

''ہاں، میں قصور کا رہنے والا ہوں۔''

''یعنی میڈم نور جہاں کا شہر۔''

''آف کورس جناب! یہ فخر قدرت نے ہمارے حصے میں لکھا تھا۔'' وہ کچھ اترا کر بولا جیسے قدرت نے اسی کے مشورے سے یہ فخر، قصور شہر کے نصیب میں لکھا تھا۔

''خیر، قدرت نے میرے ملک کے ہر شہر، گاؤں قصبے کے حصے میں کوئی نہ کوئی فخر

لکھا ہے۔ ہمارے شہر کے فخر کا تو کوئی بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔'' وہ جواباً بولی۔

''آپ کا اقبال بلند ہو، درست فرمایا مادام آپ نے۔'' وہ سر کو ذرا سا خم دے کر بولا تو وہ بھی بے اختیار مسکرا اُٹھی۔

''لیکن اس مقابلۂ فخر میں ہم ایک اہم شہر کو بھول رہے ہیں۔'' وہ اب کچھ تیز قدموں سے چل رہی تھی۔ کیونکہ رقیہ کافی آگے جا رہی تھی۔

''وہ کون سا شہر؟''

''بھئی شہر لاہور کو، جس نے سب شہروں کے قابل فخر، پڑھے لکھے بے روزگاروں کو بڑی فراخ دلی سے روزگار فراہم کر رکھا ہے۔''

''یس، آف کورس۔ لاہور دی گریٹ۔'' وہ بھی تائیدی انداز میں سر ہلا کر بولا۔

''یہ تو لاہور کی مہربانی ہے کہ پورے پنجاب سے ہزاروں لاکھوں لوگوں کا روزگار اس شہر سے وابستہ ہے۔''

''مگر اس گریٹنیس میں خود بے چارے لاہور کا کیا حال ہو رہا ہے، اس کا شاید کسی کو بھی احساس نہیں۔'' وہ کچھ تلخی سے بولی۔

''کیا مطلب؟'' وہ قطعاً نہیں سمجھا۔

''لاہور پر اس کی استطاعت سے بڑھ کر بوجھ ڈالا جا رہا ہے۔ آبادی کئی گنا بڑھنے سے شہر میں تنگی کا احساس بڑھ گیا ہے۔ پھر لاہور کے یادگار تاریخی علاقے چوہوں کے ڈربے بنتے جا رہے ہیں۔ ٹریفک کا بڑھتا ہوا اژدھام، بینکوں سے لیز پر نکلی ہوئی گاڑیوں نے سڑکوں پر طوفان مچا رکھا ہے۔ دھواں، شور، گرد و غبار میں شاعروں، ادیبوں کی رومان پرور محبوبہ دن بہ دن بدشکل ہوتی جا رہی ہے۔ سارے اہم گورنمنٹ ادارے، ملٹی نیشنل کمپنیوں کے دفاتر، نجی و سرکاری بینک اور نہ جانے کیا کیا، سارے پنجاب کے پڑھے لکھوں کی کھپت ادھر ہو رہی ہے۔ اَن پڑھ، ہنرمند، فیکٹریوں، شو رُومز اور ورکشاپوں میں کام کرنے والے، دور کے دیہاتوں سے بھی اُٹھ کر لوگ ادھر چلے آئے ہیں۔ کبھی جا کر مقبرہ جہانگیر کی ٹوٹی ہوئی باؤنڈری میں چھلانگیں لگاتے بکریوں، بھیڑوں کے ریوڑ اور پتنگ اُڑاتے، بیٹ بال کھیلتے منچلوں کی شرارتوں کی زد میں ٹوٹے پھوٹے خوب صورت فرش، چوبرجی کے چاروں میناروں کی خستہ حالی، مینارِ پاکستان کے مینار کی سیاہ پڑتی سفیدی اور ٹریفک کے شور میں قلعے کی لرزتی دیواروں کا نوحہ تو کوئی سنے۔ پتہ نہیں، ذمہ دار اداروں کو اس کا احساس ہے بھی یا نہیں۔'' وہ گہرے دکھ اور کچھ غصے کے

احساس سے بول رہی تھی، سوچے سمجھے بغیر۔

''پوری دنیا میں یہی ہو رہا ہے۔ جب شہر ترقی کرتے ہیں تو چھوٹے چھوٹے شہر، گاؤں، قصبے یونہی ان شہروں کی آغوش میں آ سماتے ہیں۔ جس طرح پرانے پتے ٹوٹ کر گرتے ہیں تو ان کی کھاد بننے سے بہار کے موسم میں اس مردہ کھاد سے لہلہاتے خوشبودار پھول، پودے جنم لیتے ہیں، اسی طرح پرانی تہذیب کے اینٹ گارے سے ترقی یافتہ نئے شہروں کے وجود سر اٹھاتے ہیں۔'' وہ جواباً بولا۔

''مگر یہ تو ظلم ہے۔ شملہ پہاڑی کے قریب سے گزرو تو محسوس ہی نہیں ہوتا یہ شملہ پہاڑی ہے جس کے دامن میں لگے درختوں اور ہریالی کی خوشبو پیدل چلنے والوں کا دامن اپنی جان کھینچ لیتی تھی۔ بس کانوں کو پھاڑ دینے والا شور اور اعصاب کو جھنجھنا دینے والے ہارنز ہوتے ہیں جو شملہ پہاڑی کی طرف دیکھنا تو درکنار وہاں سے جلد از جلد بھاگ جانے پر ہی مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ کیسی ترقی ہے کہ خوشی، سکون، فرصت، محبت، توجہ سب کچھ فنا ہوتا جا رہا ہے۔''

وہ یاسیت بھرے لہجے میں فضا میں گہرا سانس لے کر بولی۔ ''کوّے نیچی پروازیں کرتے ہوئے اپنے گھونسلوں کی طرف لپک رہے تھے۔

''رومانٹسزم کا دور تمام ہو چکا ہے۔ صرف پاکستان میں ہی نہیں، پوری دنیا میں۔ اور ابھی تو پاکستان پوری دنیا خصوصاً ترقی یافتہ ممالک سے سو سال پیچھے ہے، فگرز بتاتے ہیں۔ یہ ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر کا دور ہے۔ اب درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں، پیپل کے پتے، بیری کا شور، برگد کا سکون کسی کو بھی درکار نہیں۔ پتھروں کو پگھلا دینے والی گرمی کا نعم البدل بڑے بڑے ایئر کنڈیشننگ پلانٹس آ گئے ہیں اور اب کسی کے پاس فرصت نہیں، رک کر دیکھے یہ ایبٹ روڈ کی کیا ہیئت ہو گئی ہے یا مال کا کافی ہاؤس کدھر گیا۔ پاک ٹی ہاؤس کے باہر ٹائروں کی پوری مارکیٹ سر اٹھائے، دامن پھیلائے حاوی نظر آ رہی ہے۔ آج کل فرصت، خوشی، توجہ، محبت، رومانس سب پیسہ ہو چکا ہے۔ دوڑو، بھاگو کہ زمانہ چال قیامت کی چل گیا۔ مڑ کر جو دیکھے گا وہ پتھر کا نہیں ہو گا بلکہ کچلا جائے گا، اس لئے مڑ کر دیکھنے اور پھر رکنے کی حماقت کبھی مت کیجئے گا۔ وقت کے ساتھ بھاگیے، سب کچھ مانوس لگنے لگے گا۔''

پتہ نہیں وہ اسے سمجھا رہا تھا، تسلی دے رہا تھا کہ اپنی سوچ بیان کر رہا تھا۔ سحر نے کچھ عجیب نظروں سے اسے دیکھا۔

''اگر یہ آپ کی سوچ ہے تو میرا ایک مشورہ ہے۔'' وہ اب گیٹ کے پاس پہنچ چکی تھی۔ رقیہ، نانو کی وہیل چیئر لئے گاڑی کے پاس اس کی منتظر کھڑی تھی۔

''ضرور۔'' وہ پُرشوق لہجے میں بولا۔

''آپ یہ کتابیں پڑھنا چھوڑ دیجئے اور ریس میں دوڑ لگا دیجئے، خدا حافظ۔'' کہہ کر وہ رُکی نہیں اور تیز قدموں سے چلتی اسد کو حیران سا چھوڑ کر نانو کو گاڑی میں بٹھانے لگی۔ اگلے منٹ وہ بڑی مہارت سے گاڑی ریورس کرتے ہوئے مین گیٹ سے نکل رہی تھی۔ اسد ابھی تک وہیں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

❖❖○❖❖

گھر آنے تک خجالت، کھسیاہٹ اور عجیب سی شرمندگی نے اس کے دل و دماغ کو گھیر لیا تھا۔

'بھلا کیا ضرورت تھی یوں ایک اجنبی شخص کے سامنے فضول غبار نکالنے کی۔ کیا سوچتا ہو گا، کتنی احمق لڑکی ہے، شہر بھر کی فکر میں دُبلی ہو رہی ہے۔ بلکہ شاید سوچتا ہو، کچھ کھسکی ہوئی ہے۔ حد ہو گئی۔ یعنی کہ بلاوجہ اتنے غیر متعلقہ موضوع پر اس دیوانگی سے بولتے چلے جانا جو سراسر ذمہ دار حکام کا ہیڈک ہے۔'

نانو کو بستر پہ لٹا کر وہ چند لمحوں کو ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ ماموں میاں گھر آ چکے تھے۔ 'آج کل وہ جلدی گھر آنے لگے ہیں اور شایان تو پرسوں سے اسلام آباد گیا ہوا ہے۔ پتہ نہیں اس کی واپسی کب تک ہو گی۔'

اسد سے ہونے والی گفتگو سے اپنی توجہ ہٹانے کو وہ اِدھر اُدھر کی باتیں سوچنے لگی۔

''نانو! آپ سُوپ لیں گی؟''

نانو نے زور سے سر ہلا دیا۔

''ہوں..... اچھا.....'' سحر نے ٹشو لے کر ان کے ہونٹوں کے بہتے کنارے صاف کئے۔

''سُوپ پی لیں اور تھوڑا سا ریسٹ کر کے اُٹھنے کی کوشش کریں۔ میں رقیہ کی مدد سے آپ کو ایک دو قدم چلاتی ہوں۔'' وہ مسلسل ان کے ہاتھ کھول بند کر رہی تھی۔ نانو خفیف سی مزاحمت کرتے ہوئے اپنا ہاتھ اس سے چھڑانے کی سعی کر رہی تھیں۔

''یوں کام نہیں چلے گا نانو جان! تھوڑی سی ہمت کرنا ہو گی۔'' وہ اور مضبوطی سے ان کے ہاتھ تھام کر بولی۔

''نہ سج!'' وہ کچھ بے بسی سے بولیں۔

''اوکے، میں آپ کے لئے سُوپ لے کر آتی ہوں۔ پھر تھوڑی واک کراؤں گی آپ کو۔'' وہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

ماموں میاں کے بیڈروم کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ فون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔ وہ ملازمہ کو سُوپ گرم کرنے کا کہہ کر لاؤنج میں آ گئی۔

'اس نے یقیناً سوچ لیا ہوگا، اچھی خاصی کھسکی ہوئی ہے۔' ٹی وی آن کرتے ہی پھر اسی خجالت نے گھیرنا شروع کر دیا۔

'آخر ایسی کیا بات ہے؟ جنرل سا موضوع تھا۔ میں نے اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔ اس میں کھسکے ہونے کی کیا بات ہے۔' وہ کچھ بھی دیکھے بغیر کھٹ کھٹ چینل بدلے جا رہی تھی۔

''بی بی! وہ کچن میں راشن تقریباً سارا ختم ہو گیا ہے اور فریج میں گوشت اور چکن وغیرہ بھی۔'' ملازمہ اچانک اس کے پاس آ کر بولی تو اسے نامعلوم کیوں غصہ آ گیا۔

''تو میں کیا کروں؟'' وہ گردن موڑ کر اسے گھورتے ہوئے بولی۔

''جی!'' وہ کچھ ڈر کر حیرانی سے بولی۔

''جاؤ، جا کر ماموں میاں سے کہو۔ اپنے کمرے میں موجود تو ہیں۔'' وہ تیز لہجے میں کہہ کر پھر سے اپنے مشغلے میں مگن ہو گئی۔

''وہ جی صاب آپ کو بلا رہے ہیں۔'' چند منٹوں بعد وہ پھر سر پر کھڑی کہہ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے ٹی وی آف کر کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''جی ماموں میاں! آپ نے بلایا مجھے؟'' وہ ان کے کمرے کے دروازے میں ہی کھڑے ہو کر کچھ تکلف سے بولی۔

''ہوں، اندر آؤ۔'' وہ کوئی فائل دیکھ رہے تھے۔ اس سے نظریں ہٹا کر بولے۔

''جی!'' وہ قریب جا کر مؤدب انداز میں کھڑی ہو گئی۔

''ادھر کوئی پرابلم تو نہیں تمہیں؟'' انہیں خیال آ ہی گیا۔

''جی نہیں۔''

''گھر تو یاد نہیں آتا؟'' وہ شاید جبراً مسکرائے تھے، اسی لئے دھیمی سی مسکراہٹ اُن کے چہرے کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

''بس۔'' وہ اُنگلیاں چٹخا کر رہ گئی۔

''دیکھو سجر! اماں کی بیماری بہت جلد جانے والی نہیں۔ یہ آتی ہوا پہ سوار ہو کر ہے، جاتی چیونٹی کی رفتار سے ہے، اس لئے یہ خیال کہ وہ مہینہ دو مہینہ میں ٹھیک ہو جائیں گی، ناممکن ہی سمجھو۔ تم بھی بس ان کا خیال کر لیا کرو مگر خود کو ہلکان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ملازمہ موجود ہے ان کا سب کام کرنے کو۔ تم بہت ٹینشن نہ لو۔ مجھے تم کافی کمزور لگ رہی ہو۔ آپا آئیں تو تمہیں دیکھ کر کیا سوچیں گی؟ اپنا بھی خیال رکھا کرو۔ دیکھو، یہ تمہارا اپنا گھر ہے اور تم ادھر مہمان نہیں ہو کہ کوئی زبردستی تمہارا خیال رکھے۔ ہم دونوں باپ بیٹے کی مصروفیات تمہارے سامنے ہیں۔ پورے گھر کو دیکھنا فی الحال تمہاری ذمہ داری ہے، اور کوئی بھی ذمہ داری نبھانے کے لئے اسٹیمنا کی ضرورت ہوتی ہے اور اسٹیمنا کے لئے پراپر خوراک کی، اس لئے اپنی خوراک کا خیال رکھا کرو۔''

اُف..... اُس نے اپنی اکیس سالہ زندگی میں پہلی بار ماموں میاں کے منہ سے، وہ بھی اپنے لئے اتنے لمبے چوڑے فقرے سنے تھے۔ وہ تو حیران سی ان کا منہ تکے جا رہی تھی۔

''کیا میری بات سمجھ میں نہیں آئی؟'' وہ اس کی محویت دیکھ کر بولے۔

''نن..... نہیں..... سمجھ گئی ہوں.....'' وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔

''اچھا یہ لو، چالیس ہزار کا چیک ہے۔ اس میں گھر کے سارے بل وغیرہ، پٹرول خرچ اور کچن کا سارا راشن، اماں کی میڈیسن وغیرہ کے لئے۔ میں ناہید کو تقریباً اتنی ہی رقم دیا کرتا تھا۔ کم پڑ جائیں تو مجھے بتا دینا۔ یہ کل صبح اشرف کو دینا، وہ کیش کرا لائے گا۔ اس کے ساتھ جانا چاہو، بے شک چلی جانا۔ ورنہ وہ خود بھی لے آتا ہے۔''

اُس نے کچھ متردّد سا ہو کر چیک تھام لیا۔

''اور یہ پانچ ہزار تمہارے لئے۔ اپنے لئے جا کر شاپنگ وغیرہ کر لینا۔ پاکٹ منی سمجھو۔'' انہوں نے دراز سے پانچ نیلے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

''نن..... نہیں..... ماموں میاں!..... مجھے اس کی تو ضرورت نہیں۔''

''ضرورت کیوں نہیں؟ کیا گھر میں ابو سے پاکٹ منی نہیں لیتیں؟'' وہ کچھ بے تکلفی سے بولے۔ اب کے اُن کی مسکراہٹ جبراً نہیں تھی۔

''مگر ماموں میاں! یہاں میرے پاس سب کچھ تو ہے۔ کپڑے، جوتے وغیرہ۔ میں ان کا کیا کروں گی؟''

''گرمی آنے والی ہے، اس کے لئے کچھ کپڑے خرید لینا۔ آپا اور ہانیہ کے لئے کچھ

خرید لاؤ۔ چلو اور کچھ نہیں تو تمہیں کتابوں کا شوق ہے، دو چار کتابیں لے لینا۔"

وہ ان کی بات پر حیران رہ گئی۔ کیا انہیں اس کے شوق کا علم ہے۔

"بھئی تمہاری مامی ذکر کرتی رہتی تھیں کہ سحر تو کتابوں کا کیڑا ہے۔ پتہ نہیں، یہ کتابوں سے باہر جی کیسے رہی ہے؟ اور اب مجھے اُس کی اس بات پر یقین آ گیا ہے۔ میری اسٹڈی میں لٹریچر بکس کی ترتیب بدلے دیکھ کر۔" ان کی بات پر وہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

"سوری ماموں میاں! میں نے آپ سے پوچھے بغیر....."

"اوہ کم آن سحر! یہ تمہارا گھر نہیں ہے کیا؟ چلو اب جاؤ، مجھے کچھ ضروری کام کرنا ہے۔" جملے کے آخر تک وہ اپنی ازلی رکھائی پر آ چکے تھے۔ سحر نے بے دلی سے نوٹ پکڑے اور باہر کی طرف مڑی۔

"سنو، آج رات ڈنر پر میرا ایک مہمان انوائیٹڈ ہے۔ زیادہ نہیں، بس ایک دو ڈشز سرور سے کہنا اضافی بنا لے۔"

وہ مڑی۔ "کون سی ڈشز ماموں میاں؟"

"سرور کو پتہ ہے، وہ خود ہی کچھ بنا لے گا۔" وہ فائل سے نظریں ہٹائے بغیر بولے، سر ہلا کر باہر آ گئی۔

سرور کو بتا کر اس نے نانو کے لئے سُوپ لیا اور کمرے میں آ گئی۔ وہ نانو کو سُوپ پلا رہی تھی، جب رقیہ نے آ کر بتایا کہ اس کا فون آیا ہے۔

امی اُس کا حال پوچھ رہی تھیں اور نانو کی طبیعت بھی۔

"سحر! اُداس تو نہیں ہو گئی ہو؟ ویسے مجھے پتہ ہے تم ادھر آ کر اُداس نہیں ہوتیں۔" وہ خود ہی سوال جواب کرتے ہوئے بولیں تو وہ یہ بھی نہ کہہ سکی، پہلے کی بات اور تھی۔ مامی کے بغیر اُس کو یہ گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔

"تمہارے ابو کی طبیعت کچھ بہتر ہو جائے تو پھر میں آ کر کچھ دن رہ لوں گی۔ تم گھر آ جانا۔"

"کیا ہوا ابو کو؟" وہ بے چین ہو کر بولی۔

"کچھ نہیں، وہی ذرا پرسوں بی پی ہائی ہو گیا تھا۔ اب تو ٹھیک ہیں۔" امی سرسری لہجے میں بولیں، ورنہ انہیں معلوم تھا، وہ باپ کی بیماری کا سن کر فوراً آنے کو کہے گی۔

"اب ٹھیک ہیں وہ؟"

"ہاں، کہا نا بالکل ٹھیک ہیں۔"

"بات کرائیں میری ان سے۔"

"آرام کر رہے ہیں۔ اُٹھیں گے تو بات کرا دوں گی۔"

"ہانیہ اور سنی کہاں ہیں؟"

"ہانیہ پڑھ رہی ہے، سنی اکیڈمی گیا ہے۔ کال لمبی ہو گئی ہے، اپنا خیال رکھنا۔ تم کھانے پینے کے معاملے میں بہت لاپروا ہو۔ اور آدھی آدھی رات تک کتابوں پر دیدے نہ ٹکائے رکھنا۔ یہ بیماری تمہیں نہ جانے کہاں سے لگی ہے؟" وہ اس کے مطالعے کے شوق کو ہمیشہ "بیماری" کہتی تھیں۔ دو چار مزید نصیحتوں کے بعد انہوں نے فون بند کر دیا۔

کچن سے اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبوئیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ سرور لاجواب کک تھا۔ چائنیز، اٹالین، کانٹی نینٹل ہر طرح کے کھانے زبردست بنا لیتا تھا۔ سحر دوپہر میں اس کے ساتھ کلنگ ضرور کرتی تھی۔ دو تین ہفتوں میں ہی اس نے کافی ڈشز سیکھ لی تھیں۔

'پتہ نہیں، یہ ماموں میاں کا گیسٹ کون ہے؟ ڈنر پر ہو گا تو کیا مجھے بھی شامل ہونا پڑے گا؟' وہ یہی سوچ رہی تھی۔

اس کے اپنے گھر تو ابو کے مہمان ڈرائنگ روم تک محدود رہا کرتے تھے مگر ادھر گھر میں آنے والے سب مہمان خواہ وہ ماموں میاں کے ہوں یا شایان کے، سب ہی اکٹھے کھانا کھاتے تھے۔

'بھوک نہیں ہے، کہہ کر کھسک جاؤں گی۔' اس نے کوفت سے بچنے کا بہانہ سوچ لیا۔

رقیہ کے ساتھ مل کر نانو کو کمرے میں تھوڑی واک کرائی۔ دونوں طرف سحر اور رقیہ کے کندھوں پر پڑے ان کے بے جان بازو اور نیچے لٹکتا نیم مُردہ دھڑ۔ سحر کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ یہ وہی نانو تھیں جو گھڑی بھر کو ٹک کر نہ بیٹھتی تھیں، ہر دم متحرک، پُرجوش، سب کے لئے فکرمند اور اب؟

وہ بمشکل انہیں دو بار ہی کمرے میں چلا سکی۔ دوسری بار نانو نے دایاں پاؤں زمین پر جما لیا تھا اور اپنا کچھ وزن بھی اس پر ڈالا تھا۔ سحر کو بہت خوشی ہوئی مگر نانو کے چہرے کے تکلیف دہ تاثرات کو دیکھتے ہی اس کی خوشی معدوم ہو گئی۔ اس نے انہیں بستر پر لٹا دیا۔

'واقعی ماموں میاں صحیح کہتے ہیں۔ یہ بیماری چیونٹی کی رفتار سے جائے گی۔ بہت وقت لگے گا، بہت زیادہ۔ اللہ میاں! میری نانو کو جلد اچھا کر دے، انہیں اس تکلیف دہ بیماری سے نجات دے۔ وہ تو بہت اچھی ہیں، سب کا خیال رکھنے والی۔'

بھیگتی آنکھوں کے ساتھ اس نے نانو کو دوا دی اور رقیہ کو ان کی ٹانگوں کی مالش کرنے کی ہدایت دے کر باہر نکل گئی۔ اسی وقت ملازمہ نے اسے بتایا کہ ماموں کے گیسٹ آئے ہیں۔

''تو انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا.....'' اس کے الفاظ ابھی منہ ہی میں تھے کہ ایک اجنبی عورت تروتازہ مسکراتا ہوا چہرہ لئے شریفاں کے عقب سے نمودار ہوئی تھی۔

''ہیلو، آئی ایم زارا۔'' بے تکلف انداز میں کہتے ہوئے اس نے اپنی لمبی لمبی مخروطی انگلیوں والا خوب صورت ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا۔ چالیس بیالیس سال عمر تو اس کی ضرور ہو گی مگر جدید تراش کے لباس اور بہترین دیکھ بھال سے اس نے اپنی عمر کو پینتیس سال سے آگے نہیں بڑھنے دیا تھا۔ سیاہ سلیولیس شرٹ کے ساتھ سیاہ چست ٹراؤزر کے نیچے سلور نازک ہائی ہیل جوتا اُس کے دراز قد کو اور بھی نمایاں کر رہا تھا۔ اس کے جسم سے اُٹھتی مسحور کن خوشبو نے پل بھر میں فضا کو معطر کر دیا تھا۔

''میں سحر ہوں۔ سحر ناصر۔'' اس نے آہستگی سے اپنا تعارف کرایا۔ زارا نے مصافحہ کے لئے اُنگلیاں بس اس کی اُنگلیوں سے مَس ہی کی تھیں۔

''ہوں، تو آج کل آپ ادھر کیئر ٹیکر کی ڈیوٹی سنبھالے ہوئے ہیں۔'' عجیب سا اس کا جتانے والا انداز تھا۔ سحر کو بے حد برا لگا۔

''جی نہیں، میں تو.....'' اس نے لاپروا انداز میں اسے ان سنی کرتے ہوئے دائیں بائیں سر گھمایا۔

''انکفی کہاں ہیں؟'' وہ بے تکلفی سے پوچھتے ہوئے دائیں جانب کاریڈور میں ماموں میاں کے بیڈروم کی طرف بڑھی تھی کہ ماموں میاں باہر نکل آئے۔

''ہائے زارا! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' زندگی میں پہلی بار سحر نے ماموں میاں کے چہرے کو کسی گلاب کے مانند کھلتے ہوئے پایا تھا۔

''کم آن۔ اچھا انتظار ہے جو کمرے میں بیٹھ کر فرمایا جا رہا ہے۔'' وہ طنزاً بولی تو دونوں ہنسنے لگے۔ سحر کو اپنا آپ مس فٹ سا لگنے لگا۔ شریفاں پہلے ہی کھسک چکی تھی۔

''آؤ نا، بیٹھو اِدھر۔ کھڑی کیوں ہو؟'' ماموں میاں بے تکلفی سے اس کا نازک

ہاتھ تھام کر لاؤنج کی طرف بڑھے تو سحر نے حیران نظروں سے یہ منظر دیکھ کر چہرہ دوسری طرف گھما لیا۔

''بھئی بہت ہی لیزی مین ہو انکفی تم۔ ابھی تک تمہارے لاؤنج میں وہی پردے لٹک رہے ہیں جو انیس سو نوے کی بیسٹ ڈیزائننگ لسٹ میں آخری نمبر پر تھے۔ میں جتنی بار ادھر آئی ہوں، تمہیں ری مائنڈ کراتی رہی ہوں اور ہر بار پھر یہی.... چچ... چچ....'' وہ اپنی چھوٹی سی ناک چڑھائے کہہ رہی تھی۔ ''اور کیسا فضول کلر ہے، انیمل کا۔ سارے گھر کو تم نے بادامی رنگ میں رنگ رکھا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی کلر ہوا؟ ویسے کلر سینس تو تم میں یونیورسٹی کے زمانے میں بھی نہیں تھا۔ ہفتوں ایک ہی کلر کی ملتی جلتی شرٹس پہنتے رہتے تھے۔''

'تو گویا دونوں کلاس فیلو رہ چکے ہیں۔' سحر نے سوچا۔

''کہا تو ہے تم سے کتنی بار، ذرا ٹائم نکال کر آؤ تو اپنی نگرانی میں تھوڑا چینج کرا دو۔ میں تو خود یہ سب کچھ دیکھ کر اوب چکا ہوں۔ اب بزنس چھوڑ کر پردے صوفے کے کلر تو چینج کرانے سے رہا۔'' ماموں میاں اس کے ساتھ ہی ایک صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ سحر دھیرے سے نانو کے کمرے کی طرف آئی۔

''واؤ، بڑا زبردست مینٹل پیس ہے، پاکستان ہینڈی کرافٹس سے لیا ہو گا۔'' کارنر ریک پر بڑے خوبصورت ہاتھی دانت سے بنا گھوڑا اور اس پر بیٹھا شہسوار ننگی تلوار ہاتھ میں لئے انجان منزلوں کے لئے گھوڑے کو ایڑ دیئے بس روانہ ہونے ہی کو تھا۔

''نہیں، ایک شامی دوست نے بھیجا ہے۔'' ماموں میاں بولے۔

''اچھا ہے۔ بہت زبردست۔ ویسے اس طرح کا پیس میں نے پاکستان ہینڈی کرافٹس میں بھی دیکھا تھا۔'' وہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''تمہیں پسند ہے تو تم لے لو۔'' ماموں میاں فراخ دلی سے بولے۔

''ابھی نہیں۔'' وہ عجیب سے بشاش لہجے میں کہتے ہوئے مڑی اور ماموں میاں کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ کچھ کھسیا سے گئے۔

''کھانا..... کیا خیال ہے، کھانا لگواؤں یا کولڈ ڈرنک چلے گی ابھی؟''

''نہیں بھئی، کھانا۔ سخت بھوک لگ رہی ہے۔ ہمدانی کی پارٹی چھوڑ کر آ رہی ہوں کہ آفس سے بار بار کال آ رہی ہے، ایک ارجنٹ چیک پر سائن کرنے ہیں۔ ورنہ ادھر سے نکلنا کوئی آسان ہے؟ تم تو گھر بیٹھ جاتے ہو، ساتھ میں مجھے بھی چپکا لیتے ہو، اتنی

زبردست گیدرنگ تھی۔'' وہ جتاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''مس کر رہی ہو تو چلی جاؤ۔'' ماموں میاں کچھ خفگی سے بولے۔

''تم چلو ساتھ تو ابھی چلتے ہیں۔'' پھر ماموں میاں کا خفا چہرہ دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''کھانا..... بھئی کھانا لگواؤ۔ آج تو میں نے آفس میں لنچ بھی نہیں لیا تھا۔''

''سحر! بھئی آ کر دیکھو، سب تیار ہے تو شریفاں سے کہو، ٹیبل پر لگا دے۔''

ماموں میاں نے بلند آواز میں کہا تو وہ اُٹھ کر باہر آ گئی۔

''تم بھی بیٹھو، جا کہاں رہی ہو؟'' وہ کھانا لگوا کر جانے لگی تھی کہ ماموں میاں نے حکمیہ لہجے میں کہا تو وہ ہچکچاتے ہوئے بیٹھ گئی۔

''اظفی! تمہارا سرور، پرانز بہت زبردست بناتا ہے۔ میرا کک تو ایک دم ڈفر ہے، چائنیز، کانٹی نینٹل، تھائی سب کا ایک ہی ٹیسٹ ہوتا ہے اور سلاد کا تو جواب نہیں۔''

''نہیں بھئی، سرور کے معاملے میں کوئی بارگیننگ نہیں چلے گی۔'' ماموں میاں ہنس کر بولے۔

''بہت کنجوس ہو شروع ہی سے۔'' وہ چمچہ اور کانٹا پلیٹ میں رکھ کر بولی۔

''ابھی بھی کنجوس ہوں؟'' ماموں میاں اُس کی آنکھوں میں جھانک کر بولے تو وہ ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ ابھی تمہیں آزمایا ہی کب ہے؟'' وہ دونوں کھانا چھوڑ کر ذومعنی جملوں کا تبادلہ کرنے لگے تو سحر کا نوالہ حلق ہی میں اٹک گیا۔

''تو آزما کر دیکھ لو۔''

''وہ وقت بھی سمجھو، قریب آ لگا ہے۔ اب بھاگنا نہیں پہلے کی طرح۔'' یک ٹک ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے وہ دونوں کھانے سے، اردگرد پھرتے ملازموں سے بھی غافل ہو چکے تھے۔

''میرا خیال ہے، نانو آواز دے رہی ہیں۔ ایکسکیوز می۔'' سحر اس سے زیادہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ تیزی سے اُٹھی اور نانو کے کمرے کی طرف آ گئی۔ دونوں نے اُس کے اُٹھ جانے کا شاید نوٹس بھی نہیں لیا تھا۔

کھانے کے بعد قہوہ بنوایا گیا۔

''اوکے اظفی! بس اب چلتی ہوں، کل ملاقات ہو گی۔ میرے آفس آ جانا، لنچ اکٹھے

کریں گے۔'' وہ قہوہ پیتے ہی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''ارے بیٹھو نا۔ ابھی کچھ گپ شپ ہو جائے۔'' ماموں میاں تشنہ لہجے میں بولے۔

''نہیں ڈیئر! ماما پریشان ہو رہی ہوں گی۔''

اسی وقت باہر گاڑی رُکنے کی آواز آئی تھی۔ شایان کی گاڑی کا ہارن تھا۔ وہ نانو کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں جانے لگی تھی، جب شایان لاؤنج میں داخل ہوا۔ ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے بازو پر لٹکتا کوٹ۔ لیکن اس کے حلیے سے زیادہ منتشر اس کے چہرے کے تاثرات تھے۔ ماموں میاں، زارا کو چھوڑنے باہر تک گئے تھے۔ شایان نے وہیں کھڑے کھڑے بریف کیس اور کوٹ صوفے پر اُچھالے۔

''یہ کیوں آئی تھی یہاں؟'' جیسے ہی ماموں میاں لاؤنج میں داخل ہوئے، شایان اتنی زور سے دھاڑا کہ سحر اپنی جگہ سے اُچھل گئی۔ اس نے پہلی بار شایان کی اتنی بلند آواز سنی تھی۔

''کیوں، تمہیں اس کے آنے سے کیا تکلیف ہوئی ہے؟'' ماموں میاں غصیلے لہجے میں بولے۔

''پاپا! آئی وِل کل ہر۔'' وہ غرا کر بولا۔

''شٹ اپ۔ ڈونٹ کراس لمٹس۔'' ماموں میاں اسی لہجے میں بولے۔

''کراس تو وہ اپنی اوقات کر رہی ہے۔ اس کو سمجھا لیں، ورنہ میں اسے شوٹ کر دوں گا۔ میری ماں کی قاتلہ، ہمارے گھر کو دوزخ بنانے والی ڈائن۔'' وہ چبا چبا کر بول رہا تھا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟''

''وہی جو آپ سننا چاہتے ہیں۔ مگر یاد رکھیں، اب آپ کو سیکنڈ ٹائم ری مائنڈ نہیں کراؤں گا۔ اس کا خون میرے ہاتھوں سے ہو کر رہے گا۔ اسے میری ماں کو مار کر بھی چین نہیں ملا، میں اب اسے ضرور مار کر اس کی ساری بے چینی دور کر دوں گا، دیکھئے گا آپ۔'' وہ کہتے ہوئے زور زور سے زمین پر پاؤں مارتا جانے لگا۔

''یہ گیدڑ بھبکیاں کسی اور کو دینا۔ کیوں اپنی جوانی کو برباد کرنے پر تلے ہو؟ جس طرح جل جل کر، کڑھ کڑھ کر تمہاری ماں چلی گئی، تم بھی اسی کھولن میں کھولتے رہو گے۔''

اُف، ماموں میاں ایسی باتیں بھی کر سکتے ہیں۔ آج تو شاید ماموں میاں اپنے سارے چہرے دکھا کر رہیں گے۔ وہ ششدر سی کھڑی ان دونوں کو سن رہی تھی۔

''کیا لگتی ہے وہ حرافہ آپ کی؟'' شایان پلٹ کر چیخا۔

''مت چلاؤ۔ ابھی کچھ نہیں لگتی۔ اس گھر کو ایک عورت کی ضرورت ہے۔ وہ تم لے آؤ یا میں۔ بہت دفعہ کہہ چکا ہوں تم سے۔ اس گھر کو نوکروں کے ہاتھوں برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔''

''اور ایک بازاری عورت کے ہاتھ میں سب کچھ دینا چاہتے ہیں۔''

''شایان!'' ماموں میاں اتنی زور سے دھاڑے کہ سحر کا دھڑکتا دل جیسے اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی اور دروازہ اندر سے بند کر کے خود کو سنبھالنے لگی۔ باہر دونوں ابھی بھی اونچا اونچا بول رہے تھے اور اسے اپنے کانوں پر جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

چند لمحوں بعد باہر بالکل خاموشی چھا گئی۔ تیز طوفان کے بعد کی خاموشی۔ وہ بے جان جسم کے ساتھ بستر پر گر کر گھر جانے کی ترکیبیں سوچنے لگی۔

❖❖○❖❖

جون کے انتہائی گرم دنوں کے بعد یہ جولائی کی ایک نسبتاً ٹھنڈی شام تھی۔ وہ بیچ کے پندرہ دن گھر رہ آئی تھی۔ پرسوں شام واپس لوٹی تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں ہانیہ پندرہ دن گزار کر گئی تھی اور ان پندرہ دنوں میں صبح و شام پندرہ کے قریب ہی اس کے فون آئے تھے۔

''میں نہیں رہ سکتی ادھر۔ میں گھر آ رہی ہوں۔ سارا دن نوکروں کی بھیڑ میں پاگلوں کی طرح پھرتی رہوں، مجھ سے نہیں رہا جاتا۔ ماموں میاں سے کہیں، وہ اپنا یا اپنے بیٹے کا کوئی مستقل انتظام کریں۔ یہ کوئی طریقہ نہیں ہمیں ڈسٹرب کرنے کا۔''

وہ تو شروع ہی سے سب کچھ جھٹ پٹ کہہ دینے کی عادی تھی، ہر تکلیف کی آمد کے ساتھ ہی واویلا شروع۔ اور اس کے واویلے میں کچھ ایسی بات ہوتی تھی کہ امی ابو پر جھٹ اثر کر جاتی تھی۔ بقول سنی، ابو اور امی کے ہانیہ کے جانے سے پندرہ دن میں ہی ان کا گھر سخت بے رونقی کا شکار ہو گیا ہے اور اس کا سوال لبوں تک آتے آتے رہ گیا۔

''امی! میں بھی تو اتنے دن ادھر رہ کر آئی۔ کیا آپ لوگوں کو میری کمی محسوس نہیں ہوئی؟''

پتہ نہیں، کون کہتا ہے، خاموشی کی زبان بہت طاقت ور ہوتی ہے۔ کچھ اسے بھی سیالکوٹ جا کر کچھ بے چینی سی رہی۔ نانو کے ساتھ اتنے دن رہتے ہوئے ان کے ساتھ

خاص اُنسیت ہو چلی تھی۔ پھر فزیوتھراپسٹ کے آنے کے علاوہ وہ خود بھی انہیں دن میں دو تین بار ایکسرسائز کرواتی تھی، تھوڑا چلانے کی کوشش کرتی۔ اور ان دنوں وہ بہت اچھا رسپانس دے رہی تھیں۔ ڈاکٹرز کے بقول گرمیوں میں ایسے مریضوں کی بلڈ سرکولیشن بہت تیز ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے ریکوری کے چانسز بہت بڑھ جاتے ہیں۔

وہ کوشش کے باوجود امی سے ماموں میاں کی فرینڈ شپ اور شایان کے ان کے ساتھ اختلاف کا ذکر نہ کر سکی۔ سولہویں روز ابو اسے ماموں میاں کی طرف چھوڑ گئے اور شکر کا کلمہ پڑھتی ہانیہ کو لے گئے۔

سحر کے آتے ہی سارے ملازم بھی الرٹ ہو گئے۔ رقیہ اسے فرداً فرداً سب نوکروں کی کام چوری کی رپورٹ دے رہی تھی۔

مگر اسے تو اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ نانو جو اتنا اچھا خود سے قدم اٹھانے لگی تھیں، خود سے چمچہ منہ تک لے جانے لگی تھیں، اتنے دن صرف فزیوتھراپسٹ سے ہی ایکسرسائز کرواتی رہیں۔ اس نے بھی بیچ میں ہفتہ بھر کی چھٹی کی تھی، نانو پھر سے قدم اٹھانا بھول گئی تھیں۔ وہ جو صفر سے ایک قدم آگے تک پہنچی تھیں، پھر سے صفر پر آ کر رک گئی تھیں۔ اس روز اس نے دل میں فیصلہ کیا، اور کسی کے لئے نہیں، کم از کم نانو کی خاطر اسے یہاں رہنا پڑے گا۔

'کبھی کبھی اپنے ضبط اور برداشت کو آخری ڈگری تک ٹیسٹ تو کرنا چاہئے، یہاں پر رہنا جبرِ مسلسل سہی، مگر اچھے کاز کی خاطر کبھی خود پر بھی جبر کر کے دیکھنا چاہئے۔' اس فیصلے کے بعد وہ کافی مطمئن ہو گئی تھی۔

ماموں میاں اور شایان یونہی ایک دوسرے سے اور گھر سے بے نیاز تھے۔ معلوم نہیں، ان دونوں کے تعلقات کس نہج پر تھے کہ دونوں ٹائم ناشتے اور ڈنر پر بھی اکٹھے نہیں ہوتے تھے۔ ماموں میاں تو خیر پہلے بھی کم بولتے تھے، مگر شایان اتنا کم گو ہرگز نہیں تھا۔ اسے یاد تھا، بچپن میں وہ کافی شرارتی ہوتا تھا۔ ماموں میاں کے لان میں جہاں اب انیکسی بنا دی گئی تھی، وہاں کافی بڑا سوئمنگ پول تھا۔ سحر بچپن میں سوئمنگ پول میں نہانے سے بہت ڈرتی تھی اور شایان کو اس کی کمزوری کا علم تھا۔ وہ ضرور ہی اسے سوئمنگ پول میں دھکیلتا۔ سحر کی چیخوں پر ناہید مامی دوڑی آتیں۔ اور اس دوران شایان کے بے اختیار قہقہے، سنی اور ہانیہ کی ہنسی میں بہت نمایاں ہوتے تھے۔ اُس کی اس شرارت کی وجہ سے سحر اس سے بہت ریزرو ہو کر ملنے لگی تھی۔ جب بھی لاہور آتی،

شایان کو دیکھتے ہی وہ ماں کے دائیں بائیں چھپنے کی کوشش کرتی اور وہ خوب اس کا مذاق اُڑایا کرتا۔ پھر بیچ کے چند سال وہ یو۔کے چلا گیا تھا۔ ماموں میاں نے وہاں اسے ہائر اسٹڈیز کے لئے بھیجا تھا۔ اور انہی بیچ کے سالوں میں ان کا بچپن، لڑکپن ہاتھ چھڑا کر جوانی کی اوٹ میں جا چھپا تھا۔

پھر نہ پہلی سی شرارتیں رہیں نہ ویسا ہنسی مذاق۔ ان کے درمیان جیسے فاصلہ سا آ گیا تھا۔ اس کے باہر سے لوٹتے ہی ماموں میں نے اسے سرامکس کی فیکٹری میں پہلے تو انوالو کیا، پھر مکمل طور پر یہ فیکٹری اس کے حوالے کر دی۔

اپنے اور شایان کے درمیان فاصلے کی وجہ اس کی سمجھ میں آتی تھی مگر باپ بیٹے کے درمیان ایسا سرد رویہ، ایسی گہری خلیج اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ اس روز زارا کی موجودگی اس خلیج کا ایک سبب تو ثابت ہوئی تھی مگر اس کے بعد سجر نے زارا کو بھی آتے نہیں دیکھا تھا اور دونوں کے تعلقات بھی بحال ہوتے محسوس نہیں ہو رہے تھے۔

آج بھی وہ بہت دنوں بعد نانو کو لے کر باغ میں آئی تھی۔

''نانو! دیکھا آج آپ نے ہمت کی تو دو قدم آپ نے صرف اسٹک کی مدد سے اٹھا بھی لئے تھے۔ تھوڑا اور کوشش کریں، دن میں کم از کم تین چار بار۔ دیکھئے گا، گرمی جانے سے پہلے آپ خود سے چلنے پھرنے لگیں گی۔ کل میں نے آپ کا اپائنمنٹ لیا ہے، ڈاکٹر سے چیک اپ کے لئے۔'' وہ ان کی وہیل چیئر کے ساتھ چلتی آہستہ آہستہ ان سے کہہ رہی تھی۔ نانو نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ اب تو وہ چھوٹے چھوٹے فقرے آرام سے بولنے لگی تھیں۔

''سجر! ادھر جائیں۔'' وہ جی او آر والے گیٹ کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

گراؤنڈ میں کرکٹ کا میچ ہو رہا تھا۔ سجر نے رقیہ کو اشارہ کیا تو اس نے وہیل چیئر کا رخ موڑ دیا۔ میچ دیکھتے اور نانو سے باتیں کرتے وہ گھنے درختوں کے نیچے سے گزر رہی تھیں، جب اس نے سامنے سے اسد کو آتے دیکھا۔ بہت دنوں بعد وہ اسے نظر آیا تھا۔ یوں تو وہ خود بھی کافی دنوں بعد ادھر آئی تھی مگر درمیان میں تین چار بار وہ نانو کے ساتھ آئی تھی مگر اسد سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔

''ہیلو مس سجر! ہاؤ آر یو؟'' وہ قریب پہنچ کر پُر جوش آواز میں بولا۔ اُس کے ہاتھ میں حسبِ معمول کتاب تھی۔

''فائن! آپ سنائیں۔''

''میں بھی ٹھیک ہوں۔ آپ کی نانو تو بہت اچھی لگ رہی ہیں۔ صحت بھی بہتر محسوس ہو رہی ہے۔'' اس نے بیج کلر کے نفیس چکن بریزے کے سوٹ میں ملبوس نانو کے پُر رونق چہرے کو دیکھ کر کہا۔

''ہاں، اللہ کا شکر ہے، اب کافی بہتر ہیں نانو۔ یہ اسد ہیں۔ آپ کو معلوم ہے نا، ہم پہلے بھی ایک دو بار مل چکے ہیں۔'' اس نے جھک کر نانو سے کہا تو وہ مسکرانے لگیں۔

''ٹھیک ہو اسد!'' نانو نے پوچھا تو وہ حیرت انگیز خوشی سے اُنہیں دیکھنے لگا۔

''ویری گڈ پرا گریس۔ میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا اور ان کے ساتھ چلنے لگا تھا۔

''اُدھر تو میں ٹہلتے ہوئے چلا جاتا تھا۔ آتا جاتا تو میں اِدھر ہی سے ہوں۔''

''لگتا ہے، آپ کی رہائش بھی اِدھر کہیں نزدیک ہے۔''

''جی، یہ بالکل سامنے جی او آر (G.O.R) کی بغل میں آپ کو پٹیالہ ہاؤس کا بورڈ اندر کی طرف اشارہ کرتا نظر آئے گا، ادھر ہی رہتا ہوں میں۔'' وہ ہاتھ کے اشارے سے باہر روڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''پٹیالہ ہاؤس کوئی گیسٹ ہاؤس ہے کیا؟''

''گیسٹ ہاؤس۔'' وہ ہنسا۔ ''جیسے ہر خوب صورت چیز کا کوئی نظر بٹو ہوتا ہے، نظر بٹو کا پتہ ہے آپ کو؟''

سجر نے سر ہلا دیا۔

''تو جناب! جی او آر، اعلیٰ سرکاری افسروں کی شاندار رہائش گاہ کا نظر بٹو پٹیالہ ہاؤس ہے۔ اس کے نام پر نہ جائیے گا۔ تاج محل کے بغل میں سمجھیں، کچی آبادی۔''

''واقعی بھئی، نام تو بہت زوردار ہے۔'' وہ کچھ حیرت سے بولی۔

''آج کل یہی تو ٹرینڈ ہے، نام ہی کافی سمجھا جاتا ہے۔''

''تو آپ وہاں رینٹ پر رہتے ہیں؟''

''یہی سمجھ لیں۔ دو تین لڑکے ایک کمرہ ہائر کر کے اکٹھے رہتے ہیں۔ رہتے کیا ہیں، سمجھئے سیل میں رات گزارتے ہیں، اسی لئے تو میں آپ کو باغ میں منڈلاتا نظر آتا ہوں، تازہ ہوا کے لئے، رات بھر جس سے میرے پھیپھڑے محروم رہتے ہیں۔ اور اگلی رات کے لئے ادھر سے آکسیجن کی ڈبل ڈوز لے کر جاتا ہوں۔'' وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔

''کیا خیال ہے، تھوڑی واک نہ کریں؟'' چند لمحوں بعد اس نے آفر کی تو سجر نے

ذرا جھک کر نانو کی طرف دیکھا۔ انہوں نے سر ہلا دیا تو وہ رقیہ کو آہستہ آہستہ واپس جانے کا کہہ کر اسد کے ساتھ مڑ گئی کہ وہ دس منٹ تک واپس آ جائے گی۔

''کون سی کتاب ہے یہ؟'' سحر نے چلتے ہوئے پوچھا۔

''مستنصر کی بہاؤ۔'' اس نے کتاب سحر کی طرف بڑھا دی۔ ''پڑھی ہے آپ نے؟''

''ہاں، پڑھ رکھی ہے۔ اے ونڈرفل پیس آف رائٹنگ ہے۔ ڈیڑھ سو صفحات تک تو میرے سر کے اوپر سے گزر گئے اور اگلے صفحات سے اینڈ تک کس قدر ٹرانس میں لیا اس کتاب نے مجھے، میں بتا نہیں سکتی۔''

''کہتے ہیں، یہ اس صدی کا کلاسک ناول ہے، بہت امپریسیو تحریر ہے۔''

''اور جو مئی جون کی بوکھلا دینے والی بلکہ مار دینے والی گرمی میں پڑھو تو انسان کی روح کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ پانی جیسی معمولی چیز جسے ہم کچھ نہیں سمجھتے، اگر اس کا آخری قطرہ بھی ماحول سے فنا ہو جائے تو کیا ہوگا۔ اس کا تصور بھی محال ہے۔''

''آپ پچھلے دنوں کہیں گئی ہوئی تھیں؟'' اس نے موضوع بدلا۔

''دو ہفتوں کے لئے سیالکوٹ گئی تھی۔''

''ہوم سک نیس فیل کر رہی تھیں؟''

''ہوں۔ کچھ ایسی بات ہی تھی۔'' وہ گہرا سانس لے کر بولی۔

''آپ کب تک ادھر رہیں گی؟''

''پتہ نہیں۔'' وہ سر اٹھا کر گھنے درختوں میں پھیلتے اندھیرے کو دیکھنے لگی۔ ''میرا رزلٹ آنے والا ہے۔ سوچا تھا، جاب کروں گی۔ مجھے بہت کریز ہے۔ بس اللہ، نانو کو جلد اچھا کر دے۔''

''آمین، ویسے تمہارے جیسے نیچر کی لڑکیاں آج کل کہاں ہوتی ہیں؟ ماں باپ تو کجا نانی کے لئے اتنی فکر مند ہونا کہ اپنے کیریئر کو داؤ پر لگا دینا۔ میرا تو خیال ہے تم نواسیوں کی نایاب قسم ہو۔'' وہ بڑی بے تکلفی سے اسے آپ کے صیغے سے تم پر لاتا ہوا معترف لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''خیر، میں اتنی بھی اچھی نہیں ہوں اور میرا کیریئر خدانخواستہ کون سا داؤ پر لگ رہا ہے۔ چھ آٹھ ماہ کی بات ہے۔ ویکنسیز تو نکلتی رہتی ہیں۔ آپ سنائیں، آپ کی جاب کیسی جا رہی ہے؟'' اسے یوں خود کو موضوع بنانا کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔

''جاب ٹھیک جا رہی ہے۔'' وہ لاپروائی سے راستے میں آئے ننھے سے پتھر کو ٹھوکر

سے دُور اُڑاتے ہوئے بولا۔

''آپ کتنے دنوں بعد گھر جاتے ہیں؟''

''مہینے دو مہینے بعد۔''

''آپ کے گھر والے آپ کو مس نہیں کرتے؟''

''آں!'' وہ ایک لمحے کو رکا۔ ''میرا خیال ہے، جب طے شدہ جدائی کی پہلی رات بیچ میں آ جاتی ہے نا تو پھر دونوں طرف جیسے ایک خاموش سمجھوتہ طے پاتا جاتا ہے کہ فیس کرنا ہے، مگر ایک حد تک۔ کیا خیال ہے؟'' وہ مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تو وہ اس سے متفق ہوتے ہوئے بھی کندھے اچکا کر رہ گئی۔

''آپ کے گھر میں کون کون ہے؟ میرا مطلب ہے، آپ کے پیرنٹس کے علاوہ؟''

ان کی چہل قدمی اب بالکل ٹہل قدمی میں بدل چکی تھی۔ شام دھیرے دھیرے شفق کی لالیوں میں سیاہیاں گھول رہی تھی۔

''تین بھائی اور ہیں، دو بڑے، ایک چھوٹا۔''

''گویا آپ کی سسٹر کوئی نہیں۔''

''نہیں۔ گویا قدرت نے مخصوص طعنہ نسواں کے منہ توڑ جواب کا پہلے ہی سے انتظام کر رکھا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔

''جب بھی صنفِ نازک سے چھیڑ چھاڑ کرو تو پلٹ کر جواب ملتا ہے، گھر میں ماں بہن نہیں کیا۔'' اتنے دنوں کی گفتگو میں پہلی بار سحر کو اس کے لہجے میں عامیانہ پن سا جھلکتا محسوس ہوا۔ اس کی ٹہل قدمی ٹھٹک کر رہ گئی۔

''واپس چلیں؟'' وہ رخ ہی نہیں قدم بھی موڑ کر بولی۔

''آپ نے مائنڈ کیا؟'' وہ فوراً اس کے موڈ کو بھانپ کر بولا۔

''ہرگز نہیں، مجھے نانو کا خیال ہے۔ ان کی فزیوتھراپسٹ کے آنے کا ٹائم ہو رہا ہے۔ اور ہم خاصے دُور نکل آئے ہیں۔'' اس نے کہتے ہوئے کچھ رفتار تیز کی۔

''کچھ ایسے دور بھی نہیں۔ اس پلاٹ کے اندر سے شارٹ کٹ مار لیتے ہیں۔'' وہ فوراً بائیں طرف کے پلاٹ کی طرف مڑا، سحر کو اس کے پیچھے ہونا پڑا۔

''آپ شارٹ کٹ پر یقین رکھتے ہیں؟''

''بہت زیادہ۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''اچھا، واقعی؟'' سحر کچھ بے یقینی سے بولی۔

''کیوں، اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟''

''نہیں، میرا خیال تھا، شاید آپ کو لمبے مگر سیدھے راستے اچھے لگتے ہیں۔''

''سحر بی بی! آج کے انسان کی ایوریج عمر چالیس سے پچاس یا زیادہ سے زیادہ ساٹھ سال کی ہے۔ اگر تیس برس کی عمر میں وہ اپنا سفر شروع کرے کیونکہ ہمارے ہاں بندے کو شعور ہی تیس سال کی عمر میں آتا ہے تو باقی کے بیس پچیس سال تو سیدھے لمبے راستے پر چلتے ہی تمام ہو جائیں۔ جب کہ میرا خواب ایک مکمل، اچھی، پُرسکون، پُرآسائش زندگی ہے اور اس کے لئے میں کسی ناجائز یا غلط راستے پر نہیں چلنا چاہتا۔ مگر ذہانت اوور ٹیکنگ کے بل بوتے پر اگر میں دس سال کی مسافت پانچ سالوں میں طے کرلوں تو برا کیا ہے؟'' وہ اسے بالکل لارنس روڈ کی طرف نکلنے والے گیٹ کے پاس لے آیا تھا، جہاں رقیہ نانو کے ساتھ اس کی منتظر کھڑی تھی۔

''کیا میں نے کچھ غلط کہا؟''

سحر نے کچھ جواب نہیں دیا۔

''کچھ ایسا خاص نہیں۔ اس پر پھر بات ہوگی۔ اب اجازت دیں۔'' وہ نانو کی وہیل چیئر کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

''کل آئیں گی؟'' وہ پُرامید لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''یقین سے نہیں کہہ سکتی۔''

''چلیں آپ آئیں یا نہ آئیں، میں تو تقریباً روز ہی آتا ہو۔ ویسے کل آپ کے لئے ایک بہت ہی زبردست کتاب لاؤں گا لائبریری سے۔''

''گویا لالچ دے رہے ہیں۔'' وہ مسکرائی۔

''اگر آپ اس لالچ میں آجائیں تو۔''

''اوکے۔ اللہ حافظ!'' سحر اگلی بات کئے بغیر وہیل چیئر دھکیلتی گیٹ سے باہر نکل گئی تو وہ بھی کندھے جھٹک کر پیچھے کی طرف مڑ گیا۔

وہ پورچ میں گاڑی لاک کر کے جیسے ہی باہر نکلی، اس نے ماموں میاں کو اندر سے باہر نکلتے دیکھا۔ وہ خوب صورت ڈارک بلو ڈنر سوٹ میں ملبوس تھے۔ ان کے لباس سے اُٹھتی تیز خوشبو دُور ہی سے آرہی تھی۔ وہ موبائل پر کسی سے بات کر رہے تھے اور قدموں کا رخ پورچ کی طرف ہی تھا۔

''اوہ ڈیئر آئی ایم جسٹ کمنگ۔ آئی ایم ناٹ لیٹ ایٹ آل۔ اونلی ٹین منٹ لگیں گے پہنچنے میں۔ ڈنر ہی کرنا ہے نا، ابھی تو سات بجے ہیں۔'' وہ بہت عجلت میں کہتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھے، جس کا فرنٹ ڈور ڈرائیور پہلے سے کھولے کھڑا تھا۔ انہوں نے بہت ہی سرسری نظر سحر پر ڈالی تھی اور گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔ ڈرائیور نے دروازہ بند کر دیا اور اگلے لمحے ان کی گاڑی باہر نکل رہی تھی۔

'تو گویا ''ڈیئر'' سے تعلقات عروج پر جا رہے ہیں۔' سحر نے ایک گہرا سانس لے کر قدم اندر کی طرف بڑھائے۔

'آخر ماموں میاں شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ مجھے بھی ادھر سے چھٹی ملے۔' وہ کچھ جھنجلا کر اپنے آپ سے بولی۔ اندر وہی روزانہ والی خاموشی اس کے استقبال کو تیار تھی۔

❖❖○❖❖

پھر آنے والے دو تین ہفتوں میں اس کی اسد سے چار پانچ ملاقاتیں ہوئیں۔ اب تو وہ دن بھر شام ہونے کا انتظار کرتی تھی کہ چلو شام کو کوئی تو ہوگا جس سے وہ دو گھڑی دل کی بات کر سکے گی۔ وہ بھی تو اس کا منتظر نظر آتا تھا۔ کبھی کبھی اسد کی حد سے زیادہ بڑھتی بے تکلفی اُسے اُلجھن میں ڈال دیتی۔ اُسے یہ دوستی کسی اور نہج کی طرف جاتی نظر آرہی تھی۔

جولائی کے پہلے ہفتے سے جو ساون کی بارشیں شروع ہوئیں تو ان کا سلسلہ دراز ہوتے اگست کے وسط تک چلا گیا۔ پہلے آسمان گرد کے طوفان سے اٹ جاتا، ریتلی گرد آلود طوفانی ہوائیں چلتیں، ہر چیز گرد کے اس طوفان میں چھپ کر رہ جاتی۔ چند منٹوں میں آسمان کا رنگ بدل جاتا۔ مٹیالے بادل، سیاہ گھٹاؤں میں بدلتے اور گرد آلود گرم لُو ٹھنڈے جھونکوں میں اور اس کے بعد موٹی موٹی بوندیں گرنا شروع ہو جاتیں۔ آسمان گھنٹہ دو گھنٹہ جی بھر کر اپنا غبار نکالتا اور سب کچھ جل تھل ہو کر رہ جاتا۔ ایسے میں وہ نانو کے ساتھ باغ نہیں جا سکتی تھی۔ ذرا سی ٹھنڈک ان کے لئے تکلیف کا باعث ہوتی تھی۔ ایسے میں اسے ان بارشوں کو اپنے کمرے کی کھڑکیوں یا اوپر بالکونی سے جا کر محسوس کرنا پڑتا۔ حالانکہ اس کا بہت دل چاہتا کہ ان برستی بارشوں کے فوراً بعد وہ پارک ضرور جائے اور اس خوب صورت نظارے کے اندر کہیں گم ہو جائے، جس میں دھلے دھلائے پیڑ، پھول، پودے اور سربلند ہرے بھرے درخت کالی کالی میٹھی رسیلی جامنوں سے لدے خوشبوئیں بکھیر رہے ہیں۔ ایک گیلی گیلی سی مہک اسے بے اختیار اپنی طرف

کھینچتی تھی۔ لیکن اکثر وہ اس بھیگی پکار کا مثبت جواب نہیں دے پاتی تھی۔ اب تو نانو کافی بہتر ہو چلی تھیں۔ ایک ہاتھ میں اسٹک اور دوسرے سے رقیہ کے سہارے وہ کافی چل لیتی تھیں۔ واش روم بھی سہارے سے جانے لگی تھیں، کوشش کر کے تھوڑا بہت خود کھانے لگی تھیں۔

''گڈ، ویری گڈ۔ اماں! آپ تو بہت اچھی ہو رہی ہیں۔'' ماموں میاں شاید بیس دن بعد ان کے کمرے میں آئے تھے۔ نانو کو رقیہ کے سہارے چلتے دیکھ کر خوشگوار حیرت سے بولے۔ نانو نے ایک خفا سی نظر ان پر ڈالی۔

''کیا کہتے ہیں بھئی ڈاکٹر؟ کب تک اماں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی؟'' وہ پلٹ کر نانو کے لئے سیب چھیلتی سحر سے بولے۔

''اگر اسی طرح کوشش کرتی رہیں تو انشاء اللہ ایک دو ماہ میں.....''

''یہ سب.....سحر.....کی کوشش.....ہے۔'' نانو سر ہلا کر بولیں۔

''بالکل صحیح کہا اماں آپ نے۔ یہ سب سحر بیٹی کی ہمت کا نتیجہ ہے۔ ہم تو اس بچی کے بہت احسان مند ہیں۔'' ماموں میاں کے منہ سے ایسے الفاظ سن کر وہ جیسے شرمندہ سی ہو گئی۔

''اور ذرا اپنے اس بگڑے ہوئے لاڈلے سے بھی بات کر لیجئے جس کی خودسری نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اب اور انتظار نہیں کر سکتا، اس سے کہیں جو فیصلہ کرنا ہے، کرے۔'' ماموں میاں یکایک غصے میں آ کر بولے، نانو کو کھڑے گھورتے رہے اور پھر پاؤں پٹختے وہاں سے چلے گئے۔ نانو منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھیں۔ وہ قطعاً نہ سمجھی۔

یوں بھی آج کل اس کا دل بہت اُداس سا ہو رہا تھا۔ اسے گھر گئے بہت دن ہو گئے تھے۔ امی کا فون جب بھی آتا، وہ کوشش کے باوجود نہ کہہ پاتی کہ امی مجھے آ کر لے جائیں، یا میں اُداس ہوں۔ امی کا فون نانو کی صحت، ماموں میاں کے حال احوال کے متعلق ہوتا۔ پتہ نہیں وہ اس کے بارے میں کچھ بھی پوچھنا بھول جاتی تھیں یا جان کر نظرانداز کرتی تھیں۔ شایان آج کل گھر میں بہت کم نظر آ رہا تھا۔ بلکہ ہفتے میں تین دن اس کے اسلام آباد میں گزرتے تھے۔

اس کی اسد سے بھی بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہو پائی تھی۔ اس کے اندر جیسے تنہائی کا مار دینے والا احساس کسی غبار کی طرح پھیلتا جا رہا تھا۔

اگلی صبح وہ گاڑی لے کر نکل آئی۔ خیال تھا، کسی اچھے اسٹور سے گروسری کی کچھ

شاپنگ خود کرے گی۔ اس نے صبح ہی اشرف سے لسٹ لے کر بیگ میں رکھ لی تھی۔ وہ تقریباً بارہ بجے گھر سے نکلی تھی۔

اوائل ستمبر کا روشن روشن نیم گرم معتدل سا دن تھا۔ وہ سبک رفتاری سے ڈرائیو کرتی چائنہ چوک کے ریڈ سگنل پر کھڑی دائیں طرف سے باہر دیکھ رہی تھی، جب بائیں طرف کی کھڑکی کا بند شیشہ کسی نے ہولے سے بجایا۔

''اوہ اسد صاحب؟'' اس کا چہرہ اسد کو دیکھتے ہی انجانی خوشی سے چمک اٹھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا۔ اس کے بیٹھتے ہی سگنل کھل گیا۔

''ہیلو بھئی، کہاں گم ہو گئیں؟ میں تو سمجھا واپس چلی گئیں۔'' وہ بھی فوراً بولا۔

''آپ خوش مت ہوں۔ میں لاہور کی اتنی جلدی جان چھوڑنے والی نہیں۔''

''یہ تو بے چارے لاہور پر سراسر ظلم ہے۔ محض مجھے ستانے کی غرض سے معصوم لاہور پر ایک فرد لاد دیا جائے۔''

''اچھا تو جو اور ہزاروں لاکھوں قصور جیسے قصبوں سے آ بیٹھے ہیں، وہ لاہور پر بڑا احسان کر رہے ہیں؟'' وہ بھی جواباً بولی۔ ''ارے آج آفس نہیں گئے؟''

''نہیں۔ آج مجھے الہام ہوا تھا کہ آپ صبح گاڑی لے کر نکلیں گی، سو چائنہ چوک کے سگنل پر آ کر کھڑا ہو جاؤں۔ انجوائے کرنے کا موڈ تھا۔''

''اکیلے اکیلے؟''

''اب میں اکیلا کب ہوں؟ آپ ہیں نا میرے ساتھ۔'' وہ رک رک کر دھیمی آواز میں بولا تو سحر کے دل کی دھڑکنیں بے اختیار اِدھر اُدھر ہو گئیں۔

''ہمارے سر پر نہ جائیے گا۔'' چند لمحوں میں وہ خود کو سنبھال کر بولی۔

''ہاں، وہ تو مجھے معلوم ہے۔ آپ تو نہ جانے کہاں کس گھڑی منہ پھیر کر چل دیں۔''

''ایسا سمجھ رکھا ہے؟'' وہ شکوہ آمیز نظروں سے دیکھ کر بولی۔

''سمجھ نہیں رکھا، بلکہ آپ کو ایسا پایا ہے۔'' وہ فوراً جتا کر بولا۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''آج معلوم ہے کتنے دنوں بعد ملی ہو؟'' وہ اچھی خاصی اپنائیت سے بولا تو وہ جز بز ہو کر رہ گئی۔

''گھر سے نکلنا کب آسان ہوتا ہے۔'' گاڑی اب پارک کی باؤنڈری کے ساتھ دوڑ رہی تھی۔

''پرائی ذمہ داریاں نبھانے کا بڑا شوق ہے۔ ان ہی ذمہ داریوں میں ایک مجھ سے بے ضرر کے خلوص کو بھی شامل کر لیجئے۔'' اس کے مسکین سے انداز پر سحر کو ہنسی آ گئی۔

''پرائی ذمہ داری نہیں ہیں۔ میری گرینڈ مدر ہیں وہ۔ کدھر جانا ہے آپ کو؟'' وہ گورنر ہاؤس کے اشارے سے گاڑی بائیں طرف طرف موڑتے ہوئے بولی۔

''جدھر آپ لے چلیں۔'' وہ پُرسکون ہو کر بیٹھ گیا۔

''دیکھ لیں، اتنا اعتبار اچھا نہیں ہوتا، مطلب اندھا اعتبار۔''

''جب محبت اندھی ہو سکتی ہے تو اعتبار اندھا کیوں نہیں ہو سکتا؟''

''یہاں اندھی محبت کا کیا ذکر؟''

''نہیں ہے تو ہو بھی سکتا ہے۔'' وہ شاید آج بات بڑھا دینے کے موڈ میں تھا۔

''نہیں۔ فی الحال ایسا کوئی ذکر نہیں ہو سکتا۔'' وہ قدرے سختی سے بولی۔

''آخر آپ لڑکیوں کا مسئلہ کیا ہوتا ہے؟'' وہ جھنجلا کر بولا۔ ''ہر لمحہ، ہر گھڑی، ہر ذکر، ہر موضوع، ہر بحث کا ایک ہی جواب۔ گریز۔''

''بہت اچھی پالیسی ہے۔ کبھی اپلائی کر کے دیکھئے گا۔'' وہ جواباً مسکرا کر بولی۔

''ہاں، لگتا تو ایسا ہی ہے۔ تب ہی تو لڑکیاں یہ پالیسی اپنا کر مزے میں رہتی ہیں اور لڑکے بے چارے اظہار کر کے مارے جاتے ہیں، سارا ملبہ ان بے چاروں پر آ گرتا ہے اور میاں بیوی کی ہر لڑائی کا اختتام اسی جملے پر ہوتا ہے۔ بھاگ کر نہیں آئی تھی، تم لینے گئے تھے پوری بارات کے ساتھ۔ اور مرد بے چارے کا دم خم وہیں فشوں ہو کر رہ جاتا ہے۔''

اسد نے ایسی تصویر کشی کی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی سحر کھل کر مسکرا اٹھی۔

''آپ نے بتایا نہیں، کدھر جانا ہے؟''

''بھئی، تمہیں معلوم تو ہے، ہمارے شہر میں دو ہی ٹھکانے ہیں۔ ایک لارنس گارڈن، دوسرا فیروز سنز۔ بس مجھے ادھر الفلاح کے پاس ہی اتار دیجئے گا۔''

''ہوں، تو کتابیں خریدنے جا رہے ہیں۔'' چڑیا گھر کے اشارے سے اس نے گاڑی الفلاح کی طرف موڑی۔

''خریدنے نہیں، محض نیو کلیکشن دیکھنے۔ کیونکہ ادھر کتابوں کی قیمت روپوں میں نہیں، ڈالرز اور پونڈز میں ہوتی ہے۔''

''چلیں، میں بھی چلتی ہوں۔'' وہ گاڑی بک شاپ کے آگے پارک کرتے ہوئے

بولی۔

بہت دنوں بعد تو کوئی ہم خیال، ہم زبان ملا تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ فیروز سنز میں داخل ہوئے۔ اور واقعی اس طلسم کدے میں داخل ہو کر وقت کی سوئیاں جیسے تھم جاتی ہیں۔ جب دونوں باہر نکلے تو دوپہر کا سورج سہ پہر کی طرف رواں دواں تھا، تین بج چکے تھے۔

''اُف مائی گاڈ! تین بج گئے اور پتہ بھی نہیں چلا۔ حد ہو گئی۔'' وہ پیشانی پر ہاتھ مار کر بولی۔

''اس جگہ کا یہی تو کمال ہے۔ یہ وقت کی نبضیں تھام لیتی ہے..... کیا خیال ہے، کچھ کھا پی لیا جائے؟''

اسد کی آفر پر وہ سوچ میں پڑ گئی۔ دیر تو ہو ہی چکی تھی اور پیاس بھی بہت لگ گئی تھی۔ دونوں قریبی ریسٹورنٹ کی طرف بڑھ گئے۔

❖❖○❖❖

''سحر! آج وہ تمہارے ساتھ لڑکا کون تھا؟'' بہت دنوں بعد ماموں میاں اور شایان ڈنر ٹیبل پر اکٹھے موجود تھے۔ کھانے کے دوران اچانک ماموں میاں نے پوچھا تو اس کا منہ تک جاتا لقمہ وہیں رک گیا۔ لمحہ بھر کو اسے کوئی جواب نہیں سوجھا۔

''کب؟..... کہاں ماموں میاں؟'' وہ تھوک نگل کر بمشکل بولی۔

''الفلاح کے باہر۔'' ماموں میاں اب بغور اسے دیکھ رہے تھے۔

''وہ اسد ہو گا۔ ہے نا سحر! تمہارا کلاس فیلو۔ تم نے پہلے بھی ذکر کیا تھا۔'' اچانک شایان نے اسے مخاطب کرتے ہوئے جواب دیا تو اس کے سینے میں رکا سانس باہر آیا۔

''جی ماموں میاں!'' وہ سر جھکائے اعترافی انداز میں بولی۔

''ہوں.....!'' وہ اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''کسی دن گھر بلاؤ اسے۔''

''جی اچھا!'' وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولی اور کھانا کھاتے ہوئے سوچنے لگی، شایان کو اسد کا نام کیسے معلوم ہوا۔

''کافی میرے بیڈ روم میں بھجوا دینا۔'' ماموں میاں کھانا ختم کرتے ہی نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے کرتے اٹھ گئے۔

''آپ پئیں گے کافی؟'' شایان سویٹ ڈش میں مگن تھا۔

''ضرور۔ مگر تھوڑی دیر بعد۔ میرے روم میں بھجوا دینا۔'' وہ بھی باپ کے اسٹائل

میں کہتا ہوا اٹھا اور باہر نکل گیا اور سحر سوچتی رہ گئی، شایان کا شکریہ ہی ادا کر دے، اسے مشکل سچویشن سے نکالنے کے لئے۔ وہ کھانے کے بعد اُٹھ کر لاؤنج میں آ بیٹھی۔

'کیا ماموں میاں نے اس نظر سے مجھے اور اسد کو دیکھا ہے، جس نظر سے میں نے ابھی سوچا بھی نہیں؟'

'تو پھر یہ سب کیا ہے؟' نیشنل جیوگرافک پر اس کی انگلی تھم گئی۔

'نصف دن ایک اجنبی شناسا کے ساتھ گزارنا، اسے بے وجہ لفٹ دینا، اکٹھے کتابیں خریدنا، پھر اکٹھے فاسٹ فوڈ جانا۔ کوئی بھی دیکھے گا تو یہی محسوس کرے گا جو ماموں میاں نے محسوس کر کے پوچھا ہے۔ تو کیا ماموں میاں نے اس لئے اسے گھر بلانے کو کہا ہے؟' وہ جیسے کسی خواب سے جاگی تھی۔ HBO پر ہارر مووی لگی ہوئی تھی، وہ پلک جھپکے بغیر دیکھے گئی۔

نذیر کافی بنا چکا تھا، شریفاں سرونگ ٹرے میں تین مگ رکھے ادھر ہی آ رہی تھی۔

''یہ تم ماموں میاں کو دے آؤ۔ یہ میں شایان صاحب کے کمرے میں لے جاتی ہوں۔'' وہ دونوں مگ لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔

''ایں۔'' اُس کے قدم ٹھٹکے۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ بالکونی کی طرف سے آتی سیڑھیوں سے خوشگوار ٹھنڈا جھونکا آیا تھا۔ اس کے قدموں میں خود بخود جوش سا بھر گیا۔

''لیں۔'' اُس کے دروازہ تھپتھپانے پر شایان کی آواز اُبھری۔

''ارے سحر! آپ نے کیوں زحمت کی؟ کسی ملازم کے ہاتھ بھجوا دیتیں۔'' وہ تکلف بھرے لہجے میں کہتے ہوئے سیدھا اپنی رائٹنگ ٹیبل کی طرف بڑھا۔

''اصل میں مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔'' وہ اس کا مگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی۔

''پلیز بیٹھ جاؤ۔ اور شکریہ کس بات کا؟''

''میں شاید ماموں میاں کو فوراً ان کے سوال کا جواب نہ دے پاتی۔'' وہ بھاپ اُڑاتی کافی کے مگ پر پھیلتا سنہری غبار دیکھتے ہوئے بولی۔

''جواب یا صحیح جواب؟'' وہ بغور اسے دیکھ کر بولا۔

''فوری طور پر کوئی بھی جواب۔ صحیح یا غلط۔''

''ہاں، پاپا کو صرف تمہارے جواب سے غرض تھی۔ صحیح یا غلط ان کا ہیڈک نہیں ہوتا۔'' وہ نہ جانے کس پس منظر کے تحت بولا تھا۔

''آپ کو اسد کا نام کیسے پتہ چلا؟''

''دادو نے ذکر کیا تھا۔'' اس کا جواب بھی چونکا دینے والا تھا۔

''نانو نے.....؟''

''اس میں حیرانی والی کون سی بات ہے سحر! دادو فزیکلی پیرالائز ہوئی ہیں، مینٹلی شی اِز کوائٹ فِٹ۔'' اُس کی وضاحت نے سحر کو اندر ہی اندر شرمندہ کر دیا۔

'کیا نانو بھی اسی تناظر میں.....' اُسے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔

''ویسے اچھے دوست آج کل کے زمانے میں نایاب ہیں۔ اگر ایک بھی ہم خیال ساتھی دستیاب ہو جاتا ہے، یُو آر لکی اور اس پر تو میرے خیال میں نادم ہونے کی ضرورت نہیں۔'' شایان کہہ رہا تھا۔

'کیا مصیبت ہے؟ میرا چہرہ کیا کھلی کتاب ہے؟ ہر کوئی میرے اندر جھانک لیتا ہے۔' وہ جھنجلا گئی۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ یہی کہہ سکی تو وہ کندھے اچکا کر کافی پینے لگا۔

''باہر بارش ہو رہی ہے۔'' دونوں کے درمیان خاموشی کے بیچ بارش کی ٹپ ٹپ گرتی بوندوں نے صدا اٹھائی۔

''ہوں!'' شایان نے سرسری لہجے میں کہہ کر ٹیبل پر پڑی کتاب گھمائی۔

''آپ کو بارش کیسی لگتی ہے؟'' وہ چند لمحوں بعد پوچھ بیٹھی۔

''بارش تو بارش ہوتی ہے۔ اچھی نہ بری۔ اور میں کون سا کوئی پیڑ، پودا، پھول یا گندم کا سٹہ ہوں، جس کی شاندار پیداوار کے لئے بروقت بارش کا ہونا ضروری ہے۔'' وہ میکینکلی انداز میں بولا۔

بارش کے بارے میں سحر نے ایسی ''نایاب'' بات پہلی بار سنی تھی۔

''آپ کو بارش اپنے اندر کوئی تبدیلی، جوش، ولولہ، اُداسی کچھ بھی پیدا کرتی محسوس نہیں ہوتی؟''

''ایں۔ اچھا، بارش یہ کچھ بھی کرتی ہے؟ ویسے ستمبر میں تو بارش اتنی شدید نہیں ہوتی، ورنہ پچھلے مہینے تو ان بارشوں کی وجہ سے اچھا خاصا میرا بزنس شیڈول ڈسٹرب ہو کر رہ گیا تھا۔'' وہ بولا تو سحر کو لگا، اس نے اتنی کڑوی کافی پہلے کبھی نہیں پی۔

''آپ نے ناصر کاظمی کی ''پہلی بارش'' پڑھی ہے؟'' وہ آج شایان کے ذوق کو جان لینے کا ٹھان بیٹھی تھی۔

''ناول ہے، ڈرامہ یا پوئٹری؟'' شایان نے کافی کا آخری بڑا سا گھونٹ حلق میں

دھکیل کر دریافت کیا تو سحر کا جی چاہا، اس کا خالی مگ اٹھا کر اپنے سر پر مارے۔

''آپ کو ادب سے دلچسپی ہے؟'' وہ پھر بڑے صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھ بیٹھی۔

''یو مین لٹریچر۔'' وہ بہت معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

''آف کورس۔''

''کچھ خاص نہیں۔ اصل میں ساری زندگی اکاؤنٹس پڑھ پڑھ کر بندے میں لٹریچر کا ذوق پیدا تو کیا ہونا ہے، جو تھوڑا بہت ہوتا ہے، وہ بھی خلاص ہو جاتا ہے۔ ویسے اسٹڈیز کے دوران تھوڑا بہت ٹالسٹائی کو پڑھا تھا یا پھر..... ہاں یاد آیا، ایک امریکن پلے تھا۔ Long Days Journey into night۔ وہ مجھے کافی اچھا لگا تھا اور بس۔ تمہیں، میرا خیال ہے ماما بتایا کرتی تھیں، سحر کو کتابوں کا جنون ہے۔ کیا ابھی تک ہے؟''

''میرا خیال ہے، شوق یا ذوق کوئی لباس یا گاڑی کا ماڈل تو نہیں ہوتا کہ دو چار سالوں میں بندہ بدل لے۔'' وہ کچھ جل کر بولی۔

''نہیں، پریکٹیکل لائف میں آنے کے بعد بہت سی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''آپ کا خیال ہے، یہ وقتی شوق ہوتا ہے؟''

''بالکل۔ چند سالوں بعد میں تم سے پوچھوں گا تو ناک پونچھتے، ریں ریں کرتے بچوں کے شور میں تمہیں غالب کیا، ناصر کاظمی کا کسی چھوٹی سے چھوٹی بحر کا شعر یاد نہیں آئے گا۔''

''آئیں!'' وہ چونکی۔ ''تو کیا آپ کو پتہ ہے، ناصر کاظمی کے چھوٹی بحر میں لکھے اشعار زبردست ہیں۔''

''کافی بہت اچھی تھی۔'' وہ صاف ٹال گیا۔

''آپ کی تعریف نذیر تک پہنچا دیتی ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں مگ لے کر باہر کی طرف بڑھی۔

''سحر! ایک منٹ۔'' شایان کے کہنے پر وہ رُک کر اسے دیکھنے لگی۔

''کل رات کو شزا اور اُس کے پیرنٹس آ رہے ہیں ڈنر پر۔ سرور یا نذیر سے کہہ کر اچھی سی ڈشز بنوا لینا۔ ویسے شزا کو چائنیز اور اٹالین پسند ہیں، بس اسی لحاظ سے۔''

وہ باہر بالکونی میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ تیز بوندیں قطاروں میں نیچے گھاس تک جا کر

بلبلے سے بنا رہی تھیں۔ لان کی لائٹیں بوندوں کے تاروں میں دھندلا رہی تھیں۔

''شزا....!'' اُس نے زیرِ لب دہرایا۔

ناہید مامی کی وفات سے چند مہینے پہلے جب وہ فائنل ایئر کی تیاری کے سلسلے میں ہسپتال سے ادھر آ کر رہ رہی تھی تو اس نے ناہید مامی کو یہ نام لیتے سنا تھا، جب شایان انہیں لندن سے فون کر رہا تھا۔ اس کے بعد کی گفتگو مدھم آواز کی وجہ سے وہ نہیں سن سکی تھی۔ شایان کی اس کال کے بعد مامی بہت خاموش سی ہو گئی تھیں۔ سحر کے بہت پوچھنے پر بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔

اس دن کے بعد آج اس نے دوبارہ یہ نام شایان کے منہ سے سنا تھا۔

تو یہ لڑکی ہو گی، جس سے شایان شادی کرنا چاہتے ہوں گے۔ شاید مامی کو یہ بات اچھی نہ لگی ہو۔ حالانکہ اس نے کئی بار مامی کے منہ سے یہ سنا تھا، میں شایان کی شادی وہیں کروں گی، جہاں وہ پسند کرے گا۔ میں روایتی ماؤں کی طرح اس پر اپنی مرضی نہیں ٹھونسوں گی۔ اور سحر کو یاد آیا، مامی، نانو کے سامنے خاص طور پر یہ جملہ دہرایا کرتی تھیں تو نانو کا بشاش چہرہ دھندلا سا جاتا تھا۔

''میری ماں کو مار کر بھی اسے چین نہیں آیا، حرافہ!'' زارا کے لئے کہے گئے الفاظ جو شایان نے ماموں میاں سے جھگڑے کے دوران کہے تھے۔

''ہوں۔'' جیسے کڑی سے کڑی مل گئی، اس نے سر اٹھا کر بادلوں بھرے آسمان کو دیکھا۔

'ماموں میاں، زارا سے شادی کرنا چاہتے ہوں گے اور نانو نے زبردستی مامی کو اُن کی دُلہن بنا ڈالا۔ ماموں میاں پھر بھی اپنی پسند سے منحرف نہ ہوئے اور مامی کو ٹیز کرنے کے لئے زارا سے ملنا جلنا نہ چھوڑا۔ یہی بات ہو گی جو اوپر سے ہنستی کھیلتی ناہید مامی کو اندر ہی اندر کینسر کا ناسور کھا گیا۔'

وہ ایک گہرا سانس لے کر بارش کی خوشبو کو اپنے اندر اُتارنے لگی۔

''اسد کو کسی دن گھر بلاؤ۔'' بارش کے ٹھنڈے قطرے اُس کے منہ پر گرے تھے۔

'اسد.....' وہ زیرِ لب بولی۔ 'اچھا ہے..... شاید بہت اچھا..... ہینڈسم اور اسمارٹ بھی ہے، ویل ڈریس بھی۔ لڑکیوں کو اٹریکٹ کرنے کے سارے چارم موجود ہیں۔ مگر حیرت ہے، میں ان میں سے کسی بھی چارم سے متاثر نہیں ہوئی..... پھر کیا چیز ہے جو مجھے بار بار اس سے ملنے پر اُکساتی ہے؟..... ذہنی ہم آہنگی، مشترکہ سوچ اور ایک جیسے

خیالات۔ یقیناً یہی وہ ترجیحات ہیں جن کی بنا پر لوگ اپنے پارٹنر کا انتخاب کرتے ہیں۔'

اس کے لب انہونے احساس کے تحت خود بخود مسکرائے جا رہے تھے۔ آج پہلی بار دل کی دھڑکنوں نے اسد کا نام ایک علیحدہ تال پر گنگنایا تھا۔ برستی بارش کی بوندوں نے ہولے سے اس کے نم ہوتے چہرے کو چھوا تو اس کا جی چاہا، وہ بھی ان بوندوں کے ساتھ اپنے من کے گیت پر جھوم جائے۔ وہ گیت جو اس کی دھڑکنوں نے ابھی کمپوز کیا تھا۔

''کیا ابو مان جائیں گے اسد کے لئے؟' بوندوں کا رقص کچھ دیر کے لئے تھما تو دھڑکنوں نے اندیشوں کا سر نکالا۔

'نانو، ماموں میاں اور شایان تین مضبوط ووٹ میرے ساتھ ہیں۔ ابو کو ماننا ہی پڑے گا۔' بادل زور سے گرجے اور بارش نے پھر زور پکڑ لیا۔

'کاش اس وقت اسد میرے ساتھ ہوتا، پھر ہم اس برستی بارش میں ڈھیر ساری باتیں کرتے۔ ادب کی، شاعری کی، پسندیدہ شاعروں کی تو اس بارش کا فسوں اور بھی بڑھ جاتا۔ اور مجھ سا احمق بھی کوئی ہوگا؟ کم از کم اُس کا موبائل نمبر ہی لے لیتی۔ اس وقت یقیناً وہ میرے بارے میں سوچ رہا ہوگا اور جو میں اُسے مس کال مار دیتی یا کوئی....'

''سحر! بس کرو، بیمار پڑ جاؤ گی۔ جاؤ اپنے کمرے میں۔'' شایان کی خنک، روکھی آواز نے اسے جیسے نخلستان سے جلتے صحرا میں لا پٹخا تھا۔ وہ جی بھر کے بدمزہ ہوئی۔ جی چاہا پلٹ کر کہے۔ ''کوئی اتنی خوب صورت بارش سے بھی بیمار پڑ سکتا ہے، مسٹر بدذوق!'' مگر وہ اُس کے پلٹنے سے پہلے ہی اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔

وہ بھی سست قدموں سے سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔

❖❖○❖❖

''آج رات کو شزا اپنے پیرنٹس کے ساتھ ڈنر پر آ رہی ہے۔'' صبح ناشتے کی ٹیبل پر شایان نے ماموں میاں کو ان ڈائریکٹ اطلاع فراہم کی۔

''ہوں!'' ماموں میاں کارن فلیکس میں دودھ انڈیل رہے تھے۔ ''تو ایسا کرتے ہیں، زارا کو بھی انوائٹ کر لیتے ہیں۔'' انہوں نے تجویز پیش کی۔

''کیوں، وہ کس رشتے سے آئے گی؟'' شایان ناشتہ چھوڑ کر بولا۔

''اس میں رشتہ داری کی کیا بات ہے؟ جس رشتے سے شزا آ رہی ہے۔'' ماموں میاں نے گویا جھگڑے کا آغاز کیا۔

''تو ٹھیک ہے، میں شزا کو منع کر دیتا ہوں۔ آپ اپنی گیسٹ کو انوائٹ کر لیں۔'' شایان چند لمحوں بعد غصہ پی کر بولا۔

''ایز یو لائیک۔'' ماموں میاں کندھے اچکا کر بولے تو شایان کچھ غصے اور بے بسی سے باپ کو دیکھتا رہا۔ ماموں میاں آرام سے ناشتہ کر رہے تھے۔ ماموں میاں کا ایسا روپ سحر نے پہلی بار دیکھا تھا۔

''شزا تو شام کو آئے گی۔ اور اگر وہ عورت آئی تو انجام بہت خراب ہوگا۔ میں..... میں ہر چیز کو آگ لگا دوں گا۔ سنا آپ نے؟'' شایان چند لمحے اپنے اوپر ضبط کے بند باندھتا رہا، پھر ناکام ہونے پر آتشیں لہجے میں کہتے ہوئے اٹھا اور باہر نکل گیا۔

''ہونہہ!'' اس نے ماموں میاں کو کندھے اچکاتے دیکھا۔

''ایکسکیوز می، ماموں میاں! میں ذرا نانو کو دیکھ لوں۔'' وہ اپنی چائے کا کپ اٹھا کر اندر آ گئی۔ اسی وقت اس نے شایان کی گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔

ناشتہ کئے بغیر ہی چلے گئے۔ کبھی کبھار تو دونوں ڈائننگ ٹیبل پر آتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر پاتے۔

''نانو! ماموں میاں ایسے کیوں ہو گئے ہیں؟'' وہ رو نہ سکی تو نانو کے بستر پر بیٹھتے ہوئے کچھ بے چارگی سے پوچھ بیٹھی۔

نانو شاید مسکرائی تھیں، جیسے کہہ رہی ہوں۔ ''تمہیں نہیں پتہ چلا، ورنہ وہ ایسے ہی تھے۔''

''آپ کو باہر لے جاؤں؟'' آج کل وہ تھوڑا بہت دھوپ میں بیٹھنے لگی تھیں۔ حالانکہ ابھی دھوپ بدن کو چبھتی تھی مگر نانو کے لئے اچھی تھی۔ نانو نے نفی میں سر ہلایا۔

اس کا دن کچھ بے کل سا گزرا۔ وہ باغ جانا چاہ رہی تھی مگر شام کی متوقع دعوت کے خیال سے وہ جا نہ پائی۔ دوپہر میں اس نے شایان سے ڈنر کا کنفرم کر لیا تھا اور سرور کے سر پر کھڑے ہو کر سارا اہتمام بھی کرایا تھا۔ مگر اب جیسے ایک دم اس کا دل ادھر سے اچاٹ سا ہو گیا۔

'بس میں آج رات کو ہی امی سے کہتی ہوں، میں ادھر اور نہیں رہ سکتی۔' وہ دن میں کئی بار دل میں عہد کرتی رہی تھی۔

رات کو مہمان شایان کے ساتھ ہی آئے تھے۔

شزا واقعی ایسی تھی کہ اگر ناہید مامی اسے دیکھ لیتیں تو اسے اپنی بہو بنانے میں ایک

لمحے کی دیر نہ کرتیں۔

سیاہی مائل ڈارک گرین سلور کام والی شارٹ شرٹ کے ساتھ بلیک کلر کا ٹراؤزر تھا، جس میں اس کا نازک سراپا بہت غضب ناک لگ رہا تھا۔ خوشبوؤں میں بسی لائٹ میک اپ اور جیولری کے ساتھ وہ شایان کے پاس کھڑی بہت جچ رہی تھی۔ ماڈرن طریقے سے ملتے ہوئے اس نے نانو اور سجر کے چہرے کے دونوں طرف پیار کیا تو سجر خانخواہ سرخ پڑ گئی۔

شزا، شایان کے ساتھ ایک ہی صوفے پر بیٹھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بیٹھے تھے۔ اسے بہت عجیب لگا۔ ملازم کولڈ ڈرنک سرو کر رہا تھا۔

ماموں میاں کا مزاج صبح کے برعکس خوشگوار تھا۔ وہ شزا کے والد کے ساتھ بہت بے تکلفی سے گفتگو کر رہے تھے۔ شاید دونوں پہلے سے اچھے شناسا تھے۔ شزا کی ممی البتہ سنجیدہ سی تھیں۔

''آپ شایان کی کزن ہو؟'' اس کی ممی نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

''جی!'' وہ پہلے ہی ان کی نظروں سے خائف ہو رہی تھی۔

''کتنے دنوں سے ادھر ہو؟''

''کافی مہینوں سے۔'' سجر نے کچھ اُکتا کر جواب دیا۔

''آپ کی گرینڈ مدر کے ٹھیک ہونے میں ابھی بھی کافی مہینے لگ سکتے ہیں۔'' وہ کچھ جتا کر بولیں۔

''جی، لگ تو سکتے ہیں۔'' وہ جواباً کچھ ڈھٹائی سے بولی۔

''شایان! بہت خوب صورت گھر ہے تمہارا۔ ایریا بھی اچھا ہے۔ مگر بہت اولڈ اسٹائل کا ہے۔ پاپا نے گھر دیکھا ہے ڈیفنس میں۔ بہت ماڈرن لک ہے اس کی۔ مجھے بہت پسند آیا ہے، مگر ایک مسئلہ ہے۔'' شزا کہہ رہی تھی۔

''شزا! کم آن۔'' اس کے پاپا پیار بھرے انداز میں پچکار کر بولے۔

''پاپا!'' وہ ٹھنکی۔ ''گھر مجھے بہت پسند آیا ہے مگر مجھے ادھر رہنا ہی نہیں، یہ تو طے شدہ بات ہے۔''

''یس مائی چائلڈ! آپ کو اس گھر میں واقعی نہیں رہنا۔'' اس کے پاپا کچھ شرارتی انداز میں بولے۔

''پاپا! میں نے شایان سے پہلے ہی کہہ رکھا ہے، ہم لندن سیٹل ہوں گے۔ یہاں کا

کلائی میٹ کس قدر پلیوٹڈ ہے۔ کوئی مستقل ادھر نہیں رہ سکتا جو شروع سے یورپ رہا ہو۔ شایان! ایم آئی رائٹ؟''

''ہاں، بالکل۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ کولڈ ڈرنک دونوں کے آگے یونہی پڑی تھیں۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو شزا! جو لوگ شروع سے یورپ میں رہے ہوں، ان کے لئے پاکستان مستقل آ کر رہنا ناممکن ہوتا ہے۔'' ماموں میاں بولے تو وہ کھل سی گئی۔

''دیکھا پاپا! انکل بھی میرے ساتھ ایگری ہیں۔''

''شزا!'' اس کی ممی نے تنبیہی انداز میں کہا جسے اس نے سنا ہی نہیں۔

''انکل! آپ اپنا کوئی انتظام کر لیں۔ میں اور شایان تو ادھر رہیں گے نہیں۔'' وہ بے باکی سے ماموں میاں سے بولی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

''ڈونٹ وری مائی ڈاٹر!..... ''انتظام'' کی تم فکر نہ کرو۔'' وہ شایان کو گویا چڑاتے ہوئے بولے تو وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

''سجر پلیز، کھانا لگوائیں۔'' شایان چند لمحوں بعد سنجیدگی سے بولا۔

''شان! کیا میری بات بری لگی؟'' شزا اُس کے چہرے کو پڑھ رہی تھی۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ آؤ تمہیں اپنا روم دکھاؤں۔'' وہ اُٹھتے ہوئے پہلی سی بے تکلفی سے بولا تو شزا بھی اس کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سجر کھانا لگوانے کچن میں چلی آئی۔

کھانا بہت خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ ماموں میاں خلافِ عادت بہت چہک رہے تھے۔ کھانے کے بعد کافی سرو کی گئی۔ اس دوران نانو کے کہنے پر وہ انہیں ان کے کمرے میں لے آئی۔

'گویا اب میری جان چھوٹنے والی ہے۔ اگر شایان اور شزا کا رشتہ طے ہو جاتا ہے۔' کمرے میں آ کر اس نے سوچا۔ 'نانو بھی اب کافی بہتر ہیں، شایان کی شادی تک اور اچھی ہو جائیں گی۔ مجھے ٹھہرنے کو کوئی نہیں کہے گا۔'

'اور اسد؟' اُس کا دل سوالیہ علم اٹھائے کھڑا تھا۔

'کل میں باغ ضرور جاؤں گی۔' اس نے پختہ ارادہ کیا۔

شایان مہمانوں کو رخصت کر کے سیدھا نانو کے پاس چلا آیا۔ وہ ''نسخہ ہائے وفا'' لئے بیٹھی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد نانو کو دوا دینی تھی۔

''دیکھا آپ نے پاپا کو۔'' وہ آتے ہی نانو کے بستر پر ان کے پاس بیٹھتے ہوئے

بولا۔ سحران سے فاصلے پر بیٹھی تھی۔

''وہ.....ایسا ہی ہے۔'' نانو نے اپنا کپکپاتا ہاتھ اُس کے سر پر رکھا۔

''آخر وہ اس منحوس عورت کا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟'' وہ کچھ اونچی آواز میں بولا۔ ''کیوں نہ کر دی آپ نے اُن کی شادی اس چڑیل سے، اگر وہ انہیں اتنی پسند تھی؟'' اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔

''شزا اچھی ہے۔'' نانو آہستہ سے بولیں۔

''ہوں، اچھی ہے۔'' وہ کچھ بے مزہ سا ہو کر بولا۔

''کیا کہتے ہو پھر.....تم.....؟'' نانو کے سوال پر سحر کے بھی کان کھڑے ہو گئے تو شایان، نانو کی گود میں سر گھساتے ہوئے کچھ بولا۔ نانو جواباً کچھ بولیں۔ دونوں کی آوازیں مدھم ہو گئیں۔ آخر یہ فیصلہ ان کے گھر کا اہم ترین فیصلہ تھا۔ وہ کیوں بیچ میں گھسی بیٹھی تھی۔ وہ خائف سی ہو کر چپکے سے باہر آ گئی۔ دادی پوتا ابھی بھی سرگوشیوں میں مگن تھے۔

❖❖○❖❖

''پرسوں رات میں نے تمہیں بہت مِس کیا اور دل میں پچھتاتا رہا کہ کتنا احمق ہوں، تمہارا فون نمبر ہی لے لیتا۔ بارش مجھے بھی پسند ہے، دل کر رہا تھا، کوئی ہو جس سے یہ خوشی شیئر کی جائے۔''

آج نانو اور رقیہ بھی اس کے ساتھ تھیں۔ دن کچھ مختصر ہونا شروع ہو گئے تھے، اس لئے دھوپ کچھ عجلت دکھا رہی تھی۔ لائبریری کے قریب ہی اسد اسے مل گیا۔ دونوں ٹہلتے ہوئے مسجد والی سڑک پر نکل آئے۔ ابھی سحر اس سے بارش کا ذکر کرنا ہی چاہ رہی تھی کہ اسد خود ہی بول اٹھا۔ وہ کچھ حیرت و خوشی سے اسے دیکھے گئی۔ یہی سب تو وہ کہنا چاہتی تھی۔ کیا دونوں کے دل ایک ہی انداز میں سوچ رہے تھے؟

''ہاں، مجھے بھی خیال آیا تھا۔''

''کیا؟'' وہ رُک کر اسے دیکھنے لگا۔

''یہی کہ مجھے آپ کا موبائل نمبر لے لینا چاہئے تھا۔''

''واقعی؟'' وہ کچھ بے یقینی سے بولا۔ وہ خاموش رہی۔

''موسم بدل رہا ہے، مجھے یقین ہو چلا ہے۔'' وہ چند لمحوں بعد درختوں کے زرد پڑتے پتوں پر نظریں جما کر بولا۔ ''سحر! تمہیں کون سا موسم پسند ہے؟''

''سردیوں کا۔ دسمبر، جنوری کے بھیگے بھیگے دن اور طویل خنک راتیں۔ اور آپ کو؟''

''سردیوں کا۔ بھاپ اُڑاتی چائے اور کافی کے مگ والا موسم، ساتھ کوئی اچھی سی کتاب، دھیما سا میوزک اور سرد رات کے تاریک دھند میں لپٹے لمحات۔'' اس نے گویا سماں باندھ دیا۔

''ہم دونوں کے خیالات کس قدر ملتے جلتے ہیں۔'' سحر ہولے سے بولی۔

''یہ کوئی نئی بات تو نہیں۔'' وہ گہری نظروں سے اسے دیکھ کر بولا۔ سامنے نانو اور رقیہ تھیں۔

''میرا خیال ہے، اب اجازت دیں۔ پھر ملیں گے۔''

''ابھی تو پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے۔ اتنے دنوں کی ڈھیر ساری باتیں۔'' وہ تشنہ لہجے میں بولا۔

''مجھے بھی کرنی ہیں بہت سی باتیں۔ اپنا موبائل نمبر تو دیں۔ میں رات میں فون کروں گی۔ اصل میں ہم کافی دیر سے آئے ہوئے تھے۔ اب ٹھنڈک ہونے لگی ہے، جو نانو کے لئے اچھی نہیں۔'' وہ اس سے موبائل نمبر لیتے ہوئے بولی۔

''میں انتظار کروں گا۔''

''میں ضرور کروں گی۔ اوکے، خدا حافظ۔'' وہ جلدی سے کہہ کر نانو کی طرف آ گئی۔

رات کو ابھی کھانا بھی نہیں کھایا گیا تھا کہ اچانک امی، ابو آ گئے۔ وہ دونوں کو اپنے سامنے دیکھ کر اتنی خوش ہوئی کہ ساری ناراضی بھول گئی۔

''آ گئی آپ کو میری یاد۔'' وہ کہہ ہی بیٹھی تو امی گہرا سانس لے کر رہ گئیں۔

''تیاری کر لو، کل ہمارے ساتھ ہی جانا ہے۔'' ابو پیار بھری نظروں سے اسے دیکھ کر بولے تو وہ خوشی سے اُچھل ہی پڑی۔

''واقعی امی؟''

امی نے سر ہلا کر اقرار کیا۔

''اگلے ہفتے ہانیہ کی انگیج منٹ ہے بھائی میاں! آپ کو ضرور آنا ہے۔'' کھانے کے دوران امی نے کہا تو اسے اپنے جانے کی وجہ پتہ چلی۔

''بس اچانک ہی رشتہ آیا۔ بہت چاہت و خلوص والے لوگ ہیں۔ منگنی بھی ہمارے اصرار پر کر رہے ہیں، ورنہ تو شادی رچا رہے تھے۔'' امی بتا رہی تھیں۔

''اچھی طرح دیکھ بھال کر کرنا۔ آج کل اس کام میں بھی بڑے بڑے فراڈ ہو رہے

ہیں۔ شکلاً شریف اور مہذب نظر آنے والے بعد میں کچھ اور ہی نکلتے ہیں۔'' ماموں میاں نے خشک لہجے میں لٹھ مارا تو امی گھبرا کر ابو کی طرف دیکھنے لگیں۔

''ظہیر میرا بچپن کا دوست ہے اور ایک عرصے تک وہ ہمارے ہمسائے بھی رہے ہیں۔ کچھ سال پہلے وہ دوسرے علاقے میں شفٹ ہوئے ہیں۔ ارسل ان کا اکلوتا بیٹا ہے۔ ایک بیٹی کی شادی کر چکے ہیں، دوسری کی بیٹے کے ساتھ کریں گے۔'' ابو نے جتا کر کہا۔ ''اور ماں باپ سے زیادہ اولاد کے لئے کوئی فکر مند نہیں ہوتا۔ اتنی عمر میں کھرے کھوٹے کی پہچان تو آ ہی جاتی ہے۔''

''اچھی بات ہے۔'' ماموں میاں نے گویا بات ختم کر دی۔

''بی بی! کیسے لوگ ہیں، جہاں چھوٹی بی بی کی منگنی کر رہی ہیں؟'' رقیہ، نانو کی پنڈلیوں کی مالش کر رہی تھی، امی سے پوچھنے لگی۔

''اچھے لوگ ہیں۔ آگے اللہ اچھی کرے۔ اماں! میں کل سحر کو لے جاؤں؟''

نانو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس امی کو دیکھ کر رہ گئیں۔

''بی بی! برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔'' رقیہ پھر بولی۔ ''بڑی تو سحر بی بی ہیں، آپ چھوٹی کی منگنی کر رہی ہیں۔'' رقیہ نے کہا تو امی نے تڑپ کر نانو کی طرف دیکھا۔ نانو نے سر جھکا لیا۔

''اسی لئے تو منگنی کر رہے ہیں۔ شادی اِن شاء اللہ دونوں کی اکٹھی کریں گے، اسی دوران سحر کا بھی کر دیں گے۔''

وہ اُٹھ کر باہر آ گئی۔

'شاید نانو کی تیمارداری کی وجہ سے میرا معاملہ مؤخر کیا گیا ہے۔' اسے خیال گزرا۔

''تم باہر آ گئیں۔'' امی اس کے پیچھے ہی چلی آئیں۔

''ویسے ہی۔''

''چپ چپ کیوں ہو؟''

''نہیں تو۔''

''بتایا نا، بالکل اچانک رشتہ آیا۔ ابھی پچھلے ہفتے کی بات ہے۔ انہوں نے تو سوچنے کو بھی دو دن دیئے۔ تمہیں فون کیا تھا، تم باہر گئی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد گھر کا فون ڈیڈ ہو گیا۔''

''میں ناراض نہیں ہوں۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''یہ اسد کون ہے؟'' چند لمحوں بعد انہوں نے اچانک پوچھا۔

''جی!'' وہ جواب نہ دے سکی۔

''میں پوچھ رہی ہوں، اسد کون ہے؟'' ان کا لہجہ سخت ہو گیا۔

''آپ کو کس نے بتایا؟'' وہ گہرا سانس لے کر بولی۔

''اس بات کو چھوڑو، جو پوچھ رہی ہوں، وہ بتاؤ۔''

''کوئی نہیں۔ نانو کو پارک سیر کرانے لے جاتی ہوں، وہیں ایک دو بار سرسری ملاقات ہوئی ہے۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

''کیا تمہیں ادھر اس مقصد کے لئے بھیجا گیا ہے کہ تم اجنبی لڑکوں سے یوں.....'' امی نے کئی تند جملے منہ ہی منہ میں روک لئے۔

''تو کیا مجھے یہاں کسی مقصد کے لئے بھیجا گیا ہے؟'' وہ چیخ کر بولی۔

''سحر! زمانہ بہت خراب ہے..... پھر بیٹیوں کی عزت..... میں تو تمہیں ادھر رکھنے پر خائف تھی..... پھر رادیہ کی خودسری..... بہت ڈرے ہوئے ہیں ہم۔'' امی متذبذب لہجے میں بولیں تو وہ انہیں جھوٹی تسلی بھی نہ دے سکی کہ میں ایسا کچھ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ سب کچھ بے اختیاری سا ہوتا جا رہا تھا۔

''اچھا خیر، جا کر سو جاؤ۔ صبح میرے ساتھ بازار چلنا ہے۔ ہانیہ کی ساس اور نندوں کے لئے کپڑے خریدنے ہیں۔ کل شام تک ہم لوگ نکل جائیں گے، پیچھے چار دن ہی تو ہیں۔''

ناشتے کے بعد وہ امی کے ساتھ بازار چلی آئی۔ سہ پہر تین بجے دونوں کی واپسی ہوئی۔ امی کی ایک جگہ سے تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ رقیہ، نانو کو کھانا کھلا رہی تھی، جب وہ گھر میں داخل ہوئیں۔

''اس وقت نانو کو کھانا کھلا رہی ہو؟'' سحر کے تھکے ہوئے اعصاب جھنجھنا اُٹھے۔

''وہ..... جی..... میں نے دو تین بار پوچھا، بیگم صاحب مان نہیں رہی تھیں۔''

''اب کھانا کھائیں گی تو دوا کب لیں گی؟ ذرا تم لوگوں کو ڈھیل دو، دماغ خراب ہو جاتا ہے تم لوگوں کا۔'' وہ غصے میں اس پر برس اُٹھی۔

''مجھے بھوک نہیں تھی سحر!'' نانو آنکھوں میں آنسو لے آئیں۔

''دیکھو رقیہ! بات سنو میری۔ اب سحر کوئی یہاں بیٹھی نہیں رہ سکتی یونہی۔ تم اس گھر کی سب سے پرانی ملازمہ ہو، اس کے نمک کا حق ادا کرو۔ اماں اب ٹھیک ہونے کے

قریب ہیں۔ مجبوری نہ ہوتی تو میں سحر کو نہ لے جاتی۔ دنیا داری نبھانا بہت مشکل ہے۔ سحر! تم جا کر اپنا بیگ تیار کرو۔ رقیہ اتنی دیر میں کھانا لگواتی ہے۔ پانچ بجے تک ہم نکل جائیں گے۔'' وہ سارے شاپنگ بیگز اُٹھا کر اندر آ گئی۔

شام پانچ بجے وہ سیالکوٹ کے لئے نکل آئے تھے۔ اگرچہ اس نے آنے سے پہلے کوشش کی کہ کسی طرح اسد کو فون کر دے کہ وہ جا رہی ہے مگر موقع ہی نہ مل سکا۔ نا نو بار بار آنکھیں بھر لاتیں، اُس کی ساری خوشی ماندی پڑ گئی۔

امی کا موڈ نہ جانے کیوں خراب ہو رہا تھا۔ سحر کو ڈانٹ رہی تھیں، ملازموں پر برس رہی تھیں۔ ماموں میاں کو بھی فون پر بس الوداعی سلام کہا۔ ابو بھی چپ چپ تھے۔

'معلوم نہیں کیا ہوا ہے، کل آئے تھے دونوں تو بالکل ٹھیک تھے۔' وہ رات بھر سوچتی رہی۔

ہانیہ داخلی دروازے پر ہی کھڑی تھی ان کے استقبال کے لئے۔ کتنی پیاری لگ رہی تھی یا اس نے دنوں بعد دیکھا تھا۔

''کیا پہچان نہیں رہی ہو مجھے؟'' ہانیہ اُس کی محویت دیکھ کر بولی۔

''نہیں، بالکل نہیں۔ امی! یہ لڑکی کون ہے؟'' وہ پلٹ کر امی سے بولی۔

''کتنی پیاری لگ رہی ہو۔ تب ہی تو چپکے چپکے کسی کو پسند آ گئیں۔ میرا ابھی لڑائی کا لمبا چوڑا پروگرام ہے، ابھی تم سے نمٹتی ہوں۔'' سحر اُسے دھمکاتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی۔

''ہاہ..... ہوم سویٹ ہوم۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے۔'' وہ آتے ہی اپنے بیڈ پر گر گئی۔ سامنے کتابوں کی الماری کو دیکھنے لگی۔

'کتنی احمق ہوں میں، ایک منٹ کے لئے اُس بے چارے کو فون بھی نہ کر سکی۔ کیا سوچتا ہو گا وہ؟..... چلو ایک ہفتے کی تو بات ہے، ہانیہ کو اس کے بارے میں بتاؤں کہ ہانیہ! میں آنکھیں بند کرتی ہوں تو وہ چھم سے میرے خوابوں کی ہولیز پر تعبیر کے پھول لئے کھڑا ہوتا ہے۔'

''ہش..... بالکل نہیں۔'' وہ خود ہی مسکراتے ہوئے بولی اور ہنستے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''دیواروں سے باتیں کرنا، تنہائی میں دیوانوں کی طرح ہنسنا۔ سحر بی بی! کیا گڑبڑ مچا کر آئی ہو؟'' ہانیہ نے اندر جھانک کر کہا۔

''گڑبڑ تو تم نے مچائی ہے، آ کر حساب لیتی ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے واش روم میں گھس گئی۔

❖❖○❖❖

ہانیہ کا منگیتر ارسل ظہیر بہت ہینڈسم تھا، وہ اگلے دن امی ابو کے ساتھ ان کے گھر ملنے گئی تھی۔ بہت سلجھے ہوئے، پڑھے لکھے لوگ تھے۔

''ہانیہ! تم بہت لکی ہو، ارسل بھائی جیسے ہم سفر قسمت والوں کو ملا کرتے ہیں۔''

''اس کی وجہ امی ابو کی رضا، ان کی خوشی ہے۔ ارسل کو انہوں نے منتخب کیا، اس لئے۔'' ہانیہ کی بات پر وہ چونک سی گئی۔

'اور اگر امی، ابو اور ہانیہ کو اسد کے بارے میں پتہ چلے تو.....؟'

''ہانیہ! رادیہ آپی کو انوائٹ کیا ہے؟'' اسے خیال آیا۔

''ابھی تک تو نہیں۔'' وہ بے نیازی سے بولی۔

''کیا مطلب، کیا انہیں نہیں بلانا؟'' وہ کچھ بے چین سی ہو کر بولی۔

''اُن کا اپنے ہسبنڈ سے کلیش چل رہا ہے۔ ٹھیک سے پتہ نہیں، ویسے امی کہہ رہی تھیں، انگیجمنٹ سے ایک دن پہلے فون کر دیں گی۔ آنا ہوا تو آ جائیں گی اور بہتر ہے نہ آئیں۔ ابو کا موڈ خراب ہو گا انہیں دیکھ کر۔''

''ہانیہ! وہ ہماری بڑی بہن ہیں۔ کیا سوچیں گے تمہارے سسرال والے اور ہماری فیملی؟''

''وہ اگر ہماری بڑی بہن ہوتیں تو ایسا کام کبھی نہ کرتیں۔''

''ہانیہ! پسند کی شادی کرنا اتنا بڑا جرم تو نہیں۔''

''ماں باپ کے ہوتے ہوئے خود سے لڑکے چنتے پھرنا کون سی اچھی بات ہے؟ سحر! ہماری سمجھ ناپختہ ہوتی ہے۔ ہم سامنے والے کی شخصیت کا صرف ایک چمکتا دمکتا رُخ دیکھ کر اُس کو اپنانے کے لئے اڑ جاتے ہیں لیکن والدین حتی الامکان ہر چیز کو پرکھتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ارینج میرج میں ناکامی کے چانسز نہیں ہوتے۔ ہوتے ہیں مگر بہت کم اور اگر خدانخواستہ کچھ ہو جائے تو آپ کے پیچھے آپ کے اپنے ہوتے ہیں سہارا دینے کے لئے۔ اب اگر خدانخواستہ رادیہ آپی کا کلیش بڑھتا ہے تو کون ان کی فیور میں آگے بڑھے گا۔'' ہانیہ کہے جا رہی تھی۔

'میں بھی تو اسد کو پسند کرنے لگی ہوں۔ کیا اتنا زیادہ کہ ابو کے سامنے کھڑی ہو

سکوں؟' وہ خود سے پوچھنے لگی۔

'ہمارے والدین بیٹیوں کے بارے میں ایک ہی پیمانہ سیٹ کر لیتے ہیں۔ فرماں بردار، شریف، سلجھی ہوئی، نیک، آنکھوں کی اندھی، زبان کی گونگی۔ اس سے ہٹ کر وہ کچھ بھی برداشت نہیں کر پاتے۔ ہمیں پسند کے کپڑے، جوتے خریدنے کی اجازت ہے مگر پسند کا ہم سفر چننے کی نہیں۔ اُف! میں یہ کیا کر بیٹھی ہوں جبکہ مجھے معلوم ہے، میں ابو کے سامنے کھڑی نہیں ہو سکتی، اپنی ضد نہیں منوا سکتی۔'

وہ بے چین ہو کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ اسے کھلی ہوا میں سانس لینے کی شدید خواہش ہو رہی تھی۔

'میں کون سا اس سے لیلیٰ مجنوں والا عشق کرنے لگی ہوں؟ امی ابو کی شدید مخالفت کا خیال ہے تو مجھے اپنے قدم پیچھے ہٹا لینے چاہئیں۔' وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔

'کیا..... یہ اتنا آسان ہے؟' وہ رُکی۔ 'اسد کے ساتھ باتیں کرنا، کتابوں پر سیر حاصل تبصرے کرنا، بے دھڑک ہر بات کہہ جانا۔ کیا اتنا ہم مزاج، ہم خیال کوئی اور مجھے ملے گا؟ امی، ابو ہانیہ کی طرح کوئی اجنبی ڈھونڈیں گے اور منگنی کھڑکا دیں گے۔ ہانیہ ایڈجسٹ کر سکتی ہے، اس کے کون سے مجھ جیسے شوق ہیں..... میں تو کتابوں کے بغیر، ان پر ڈھیروں ڈھیر باتیں کئے بغیر رہ نہیں سکتی۔ پھول، درخت، پودے، ہریالی، دن کے مختلف پہروں میں دھوپ کے بڑھتے گھٹتے سائے، چاندنی سے چمکتی رات، جگر جگر کرتے تاروں سے سجا فراخ آسمان، ساون کی بوچھاڑ میں برستی بارش یا دسمبر، جنوری میں ٹپ ٹپ گرتی روتی یادوں کی پٹاری سینے سے لگائے ہولے ہولے ایک ایک یاد کا پرت کھولتی بارش، خزاں میں درختوں کے زرد زرد گرتے پتے سرگوشیاں کرتے اور ان سرگوشیوں کو دھیان سے سننا۔ کیا میری یہ پاگلوں والی عادتیں کوئی اور برداشت کرے گا جو میرے اندر کی ادبی بھڑاس باہر نہ نکلے گی؟ تو کیا میں خالی خولی بیوی بن کر جی پاؤں گی؟'

'بہت مشکل..... بہت مشکل۔' اُس کا سر دُکھنے لگا تو وہ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

❖❖○❖❖

منگنی کی تقریب بہت اچھی ہوئی۔ ہانیہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ سچی خوشی کی چمک اس کے چہرے کو بہت معصوم، نظروں کو لبھا دینے والا حُسن بخش رہی تھی۔ رادیہ آپی انگوٹھی پہنانے کی رسم سے فقط آدھ گھنٹہ پہلے آئیں۔ ان کا سوٹ بے حد قیمتی تھا تو جیولری بیش قیمت۔ اُن کے ہینڈ بیگ کی کھلی زِپ سے نوٹوں کی گڈیاں دُور ہی

سے جھانکتی نظر آ رہی تھیں۔ نہیں تھی تو اُن کے چہرے پر پہلی سی معصوم دلکشی اور رونق۔ آرٹسٹ میک اپ کی تہوں میں بھی ان کے چہرے کا رُوکھا پن اور بے رونقی محسوس کی جا سکتی تھی۔ فرحان بھائی تو ویسے ہی اُکھڑے اُکھڑے تھے۔ علیحدہ نشست پر بیٹھے رہے۔ سحر کو رادیہ آپی سے بے پناہ ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔

''اتنی دیر سے کیوں آئیں، بالکل غیروں کی طرح؟'' اس نے گلے لگ کر شکوہ کر ڈالا۔

''ڈھیٹوں اور بے شرموں کی طرح آئی ہوں، ورنہ امی نے فون اس طرح کیا تھا کہ نہ آؤ تو بہتر ہے۔ اپنے گھر میں خوش ہو، سو خوش رہو۔'' وہ بڑی مشکل سے پلکوں تک آتے آنسو پرے دھکیل کر بولیں۔ ''اپنا گھر اور خوشی..... روز کانٹوں پر چلتی ہوں اور انگاروں پر سوتی ہوں۔ خود ساختہ فیصلے کی سُولی پر جھول رہی ہوں۔ دیکھو، پھر بھی کتنی شان سے زندہ ہوں۔'' وہ عجیب کٹیلے سے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

''فرحان بھائی آپ کے ساتھ اچھے نہیں؟'' چند لمحوں بعد اس نے پوچھا۔

''سب اچھے ہیں۔ اچھی نہیں تو میری قسمت، جسے میں نے خود تراشنا چاہا۔ تم کیسی ہو؟''

''آپی! آپ ابو سے معافی مانگ لیں۔ ابو اتنے سخت دل نہیں۔'' وہ ان کے دکھی چہرے کو دیکھ کر بولی۔

''معافی کا لمحہ بیت چکا ہے، چھوڑو۔ نانو کیسی ہیں؟ چلتی پھرتی ہیں؟''

''تھوڑا بہت۔''

''رہو گی یا چلی جاؤ گی؟''

''دیکھیں، نانو کے لئے تو جانا پڑے گا۔''

''یہ جو مفت کی بیگار ہے، یہ ابو کو نظر نہیں آتی۔ سب سمجھتی ہوں تمہیں وہاں بٹھانے کا مطلب۔'' رادیہ زیر لب بڑبڑائیں۔

''کیا مطلب؟''

''اچھا، میں ہانیہ سے مل لوں۔ پھر چلتی ہوں۔ فرحان کو آدھ گھنٹے کا کہہ کر آئی تھی، ورنہ طوفان اُٹھا دیں گے۔'' وہ اُٹھ کر ہانیہ کے پاس چلی گئیں اور تھوڑی دیر بعد فرحان بھائی کے پیچھے چلتی باہر نکل گئیں۔ وہ سحر کے لئے سوچ کا نیا در وا کر گئیں۔

فنکشن کے بعد ماموں میاں نے اُسے چلنے کو کہا تو امی نے اُنہیں ٹال دیا۔ وہ خود

یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ گھر کی ہر دیوار، اینٹ پتھر اُسے شک کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''پتہ نہیں، امی کو کیا ہو گیا ہے؟ کیوں مجھ سے اُکھڑی اُکھڑی رہنے لگی ہیں۔''

''سحر! پلیز، میں سونے لگی ہوں۔ تم دس منٹ بعد ابو کو دوا کے لئے دودھ دے آنا۔'' رات کے بارہ بجنے کو تھے۔ دونوں نے ابھی سارا گھر سمیٹا تھا، ہانیہ اس کا جواب سنے بغیر ہی بستر میں لیٹ چکی تھی۔

''ہوں، آنکھوں کو سپنے سجانے کی جلدی ہو گی۔'' اسے پلکیں موندتے دیکھ کر سحر نے سوچا۔

''کیا بات ہے، گم صم کیوں ہو؟'' ہانیہ نے پوچھا۔

''نہیں، یونہی۔ تم نے رادیہ آپی کو دیکھا؟''

''ہاں، کیا ہوا انہیں؟''

''کتنی کمزور لگ رہی تھیں۔''

''کچھ ایسی خاص نہیں۔'' ہانیہ لاپروائی سے بولی۔

''اچھا، میں ابو کو دودھ دے آؤں پھر باتیں کرتے ہیں۔'' سحر اُٹھ کر باہر آ گئی۔

''دیکھو، میری بات کان کھول کر سن لو۔ نہ آج، نہ ہفتہ بعد، نہ مہینہ بعد۔ اب سحر لاہور نہیں جائے گی۔ میری بیٹی ان کی ملازمہ نہیں ہے، گھر میں دس نوکر بھرے پڑے ہیں، گھر سنبھالنے کو کم ہیں۔'' ابو کہہ رہے تھے۔

''مگر اماں!'' امی منمنائیں۔

''وہ اب ٹھیک ہیں اور یہ بھی ہماری مروّت ہے جو اتنے دنوں تک سحر کو ادھر چھوڑے رکھا، ورنہ ان لوگوں نے جو دھوکا ہمیں دیا ہے، ان سے تو تعلق بھی نہیں رکھنا چاہئے۔'' ابو کی بات پر وہ چونکی۔

''ابھی بھائی میاں نے جواب تو نہیں دیا۔'' امی رونکھی سی ہو کر بولیں۔

''اور جواب کیا ہوتا ہے؟ پانچ سال سے ہم ان کے بیٹے کے نام پر اپنی بیٹی بٹھائے بیٹھے ہیں اور باپ بیٹے کے مزاج ہی نہیں مل رہے۔ اور برا مت ماننا، تمہارے بھائی کے دماغ میں جو غرور کا کیڑا ہے، وہی یہ رشتہ نہیں ہونے دے رہا۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔ ایسی بات ہوتی تو پانچ سال پہلے بھائی میاں، بھابی جان کے ساتھ کیوں آتے شایان کے لئے سحر کا ہاتھ مانگنے؟''

''تو اب کیا آفت آ گئی ہے؟ ناہید بھابی کو گزرے سال ہوا۔ اب کیا رکاوٹ ہے؟ اور میں تمہیں بتاؤں، میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے، تمہارے بھائی بھابی نے اپنے لاڈلے سے پوچھے بغیر یہ بات طے کر دی تھی اور مجھے حمید بھائی بتا رہے تھے کہ اس کے تعلقات کسی اور لڑکی سے ہیں جو اس کے ساتھ باہر پڑھتی رہی ہے۔ جو کچھ ساری زندگی باپ نے کیا، وہی بیٹا کرے گا۔ میں اپنی بیٹی کو محض ان کی دولت کے لالچ میں نہیں پھینک سکتا۔'' ابو پھنکارتے ہوئے انداز میں کہہ رہے تھے۔

''شایان ایسا نہیں ہے۔''

''بہرحال، ایک ماہ تک وہ اگر مجھے دوٹوک جواب نہیں دیتے تو میری طرف سے انکار ہے۔ مکمل انکار۔ میری بچی کی یہی عمر ہے۔ میں ہانیہ اور سحر کی رخصتی اکٹھی کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے باوجود دونوں پر پوزلز آئے ہیں، تم ان پر غور کرو اور یہ اپنے بھائی والا ''لارا'' ذہن سے نکال دو۔ یوں بھی ہم ان لوگوں کے ہم پلہ نہیں۔ ایسے رشتے آگے جا کر بگاڑ ہی پیدا کرتے ہیں۔''

''آپی! یہاں کیوں کھڑی ہو؟'' سنی کی آواز پر وہ چونکی۔

''تم یہ دودھ ابو کو دے آؤ۔ میں ذرا واش روم میں جا رہی ہوں۔'' وہ جلدی سے اسے گلاس تھما کر پلٹ آئی۔

'تو یہ ہے اصل بات۔ امی کا گم صم بجھا بجھا رویہ..... اور یہ سب کچھ پانچ سال پہلے ہو چکا اور میں بے خبر تھی۔' وہ سر پکڑ کر بستر پر بیٹھ گئی۔

❖❖○❖❖

پھر ایک ماہ تو کیا، ڈیڑھ ماہ گزر گیا۔ نہ امی نے اسے بھیجنے کا ذکر کیا، نہ وہ خود پوچھ سکی۔ کہاں تو وہ لاہور سے گھر آنے کے لئے بے چین تھی اور اب جی چاہتا، اُڑ کر لاہور چلی جائے ایک بار، صرف ایک بار اسد سے ملاقات کر لے۔ دو بار اس نے اسد کے موبائل پر فون کیا، دونوں بار موبائل آف تھا۔

ہانیہ کے کالج کھل گئے تھے، اس کا فائنل ایئر تھا۔ واپس آ کر بھی وہ یا تو اسٹڈیز میں گم رہتی یا تھوڑا بہت کچن کا کام دیکھ لیتی اور وہ بیزار سی، چپ چاپ صبح سے شام کئے جا رہی تھی۔ بدلتا ہوا موسم اور اُداس کئے جا رہا تھا۔

''ویسے سحر! لگتا ہے، تم اس بار لاہور میں اپنا کچھ گم کر آئی ہو۔'' ہانیہ نے رات کہہ ہی ڈالا۔

''سجر! تمہارے ماموں میاں بلا رہے ہیں۔'' امی نے کمرے میں جھانک کر اسے کہا۔

''بھول گئی ہو جا کر بے وفا لڑکی!'' یہ طرزِ تخاطب ماموں میاں کا تو نہیں تھا۔

''آپ ٹھیک ہیں ماموں میاں؟''

''ٹھیک ہیں تو تمہیں فون کر رہے ہیں۔''

''نانو ٹھیک ہیں؟''

''تمہارا کیا خیال ہے، وہ ٹھیک ہو گئی تھیں جو تم نے پلٹ کر خبر نہ لی۔'' ان کے شکوے کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''تمہاری نانو تمہیں بہت یاد کر رہی ہیں۔ آ جاؤ، اپنی امی کو فون دو۔'' اس کی چپ پر وہ بولے تو اس نے ریسیور امی کو تھما دیا۔

''ٹھیک ہے، تم دونوں آج لاہور چلی جاؤ، کل شام تک آ جانا۔'' صبح آفس جانے سے پہلے ابو نے سجر اور امی سے کہا تو اس کے ہاتھ میں چائے کا مگ کانپ کر رہ گیا۔

''تمہاری نانو کی طبیعت اچھی نہیں۔ رات بھر میں سو نہیں سکیں۔ شکر ہے، تمہارے ابو مانے تو۔'' امی نے کوچ میں بیٹھ کر بتایا۔

نانو کی طبیعت واقعی اچھی نہیں تھی۔ اگرچہ اب وہ اسٹک کے سہارے چلنے لگی تھیں، مگر سردیاں شروع ہوتے ہی ان کی پرانی سانس کی تکلیف لوٹ آئی تھی۔ نانو اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

رات کو کھانے کی میز پر ماموں میاں اور شایان سے ملاقات ہوئی۔ ماموں میاں بہت تپاک سے ملے تھے۔

''آپا! اب میں اپنی بیٹی کو جانے نہیں دوں گا۔ ارے اتنی اُداسی تو ناہید کے جانے کے بعد بھی محسوس نہیں ہوئی تھی، جتنی سجر کے جانے کے بعد ہوئی۔''

کھانے کے دوران ماموں میاں نے کہا تو امی گہرا سانس لے کر رہ گئیں۔ شایان نے ہاتھ روک کر ایک نظر سامنے بیٹھی سجر کو دیکھا۔ بلیک وائٹ ڈاٹس والے سادہ سے کاٹن کے سوٹ میں وہ لڑکی خود بھی بالکل سادہ تھی۔ میک اپ اور جیولری سے بے نیاز، ہلکی سی شرمیلی مسکراہٹ لئے لمبی پلکوں والی سیاہ آنکھوں کو جھکائے کھانے میں مگن تھی، نہ جانے کیوں شایان کو اس کے گرد کشش کا انوکھا سا حصار کھنچتا محسوس ہوا تھا۔ وہ سر جھٹک کر پھر سے کھانے لگا۔

''سجر کے ابو تو مجھ سے بھی نہیں پوچھ رہے، دو ایک رشتے اس کے آئے ہیں۔ ہانیہ کی انگیج منٹ کے دوران اسی میں سے ایک او کے کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ اسی ہفتے وہ لوگ آئیں گے، اب میں انہیں اور کتنا ٹالوں؟''

وہ امی اور ماموں میاں کے لئے چائے لئے ان کے کمرے کی طرف آ رہی تھی، جب اس نے امی کی روہانسی آواز سنی۔

''صبر نہیں ہے؟ میں انکار کب کر رہا ہوں؟ صرف چند دنوں کی مہلت۔'' ماموں میاں جھنجلا کر بولے۔

''مہلت..... بھائی میاں! لڑکی والوں کے پاس اتنی مہلت نہیں ہوتی۔ سجر ماسٹرز کر چکی ہے، اس سے آگے ایک سال اور گھر بیٹھی تو آپ کو نہیں معلوم ہمارے مسائل میں کتنا اضافہ ہو جائے گا۔ بہرحال آپ کے کہنے پر میں نے انہیں بڑی مشکل سے ایک ماہ روکا تھا اور اب تو ڈیڑھ ماہ سے بھی زیادہ گزر چکا۔ اگر آپ کو بات کرنی ہے تو آپ خود کر لیں۔''

امی کے دوٹوک انداز میں کہنے پر کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا تو دونوں کسی گہری سوچ سے چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ اس نے دونوں کو چائے دی اور الٹے قدموں لوٹ آئی۔

'ہاں، ابو کسی سے بھی نہیں پوچھیں گے۔ وہ خود ہی کچھ کر گزریں گے۔ انہوں نے ساری زندگی امی کی رائے یا مشورے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور امی نے بھی زندگی بھر ایسی کوئی کوشش نہیں کی اور نہ اب کریں گی۔ امی اور ابو کا رشتہ جیسے خوف اور سمجھوتے کا رشتہ، اسی طرح کا رشتہ ابو میرا بھی جوڑ دیں گے۔ خوف سمجھو کہ مصلحت، مجبوری سے گندھا، اور یہی خوف ڈر میں اپنی بیٹی میں منتقل کر دوں گی، نسل در نسل۔ لاجواب، کامیاب انتقال۔' وہ کمرے میں ٹہل ٹہل کر سوچتی رہی۔

'اگر ابو کا زور نہ چلا تو امی کی منشا پوری ہو گی۔ شایان کا مطلب ایک دوسرے ماموں میاں..... خاموشی، کم گوئی اور سرد مہری کا خول چڑھائے ساری زندگی بظاہر مجھ سے جڑے، اندر سے شزا کے دیوانے..... اور وہ زارا کی طرح جب چاہے گی، دندناتی ہوئی آئے گی اور میری گرہستی، میرے جذبات کو روندتی چلی جائے گی۔ اور بالآخر میں بھی ناہید مامی کی طرح اندر ہی اندر لاعلاج ناسور کی پرورش کروں گی اور بس.....'

دوسری تصویر پہلی سے بھی زیادہ بھیانک تھی۔

چند لمحے وہ فیصلہ کن انداز میں کھڑی سوچتی رہی، پھر بے اختیار اس کے قدم فون کی طرف بڑھے۔

❖❖○❖❖

''میں ادھر تین چار سالوں سے اکیلا ہوں، اس سے پہلے میں نے کالج، یونیورسٹی میں بھی کبھی گہری دوستی نہیں کی، جس کے راستے میں اگر جدائی آ جائے تو دل کی رگیں کٹتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہیں، تمہاری طرف بھی قدم بڑھانے سے پہلے میں نے سوچ رکھا تھا، ایسی دوستی نہیں کرنی کہ بچھڑ جائیں تو سانس دوبھر ہو جائے۔ مگر یہ پتہ تو مجھے ان پینتالیس دنوں میں چلا کہ عام سی دوستی کب محبت میں ڈھلی۔ اور محبت کبھی پلاننگ سے نہیں ہوتی۔ مجھے بتائے بغیر، ملے بغیر، تم کہاں چلی گئی تھیں؟''

سحر کو علم نہیں تھا کہ بے قراری کا جہنم صرف اس کے ہی وجود میں نہیں سلگ رہا تھا بلکہ اسد بھی اتنے دنوں سے اسی آگ میں دہک رہا تھا۔

''سوری۔'' وہ یک ٹک اس کو دیکھتی یہی کہہ سکی۔

''سحر! زندگی بے وفا ہے، اور بہت عجلت پسند بھی۔ اکثر ہمیں علم بھی نہیں ہونے دیتی اور ہماری تقدیر کی سب سے قیمتی لکیر کو مٹا ڈالتی ہے۔'' وہ ایک گہرا سانس لے کر بولا۔ ''مجھے اسی ڈر نے اتنے دن ایک پل چین نہ لینے دیا کہ زندگی کہیں تمہیں مجھ سے چھین کر تو نہیں لے گئی۔''

'اُف، وہ تو بہت آگے نکل گیا تھا۔

سرد برفیلی ہوا سحر کے چہرے سے ٹکرائی تو اس کے ساکت بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ اس نے یونہی سر اٹھا کر دیکھا۔ دسمبر کا آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوں، سروں پر جھکا جا رہا تھا۔ سرد یخ بستہ ہوا میں درختوں کے کمزور پیلے پتے ٹھٹھر ٹھٹھر کر باغ کی روشوں پر گر رہے تھے۔

''آج پندرہ دسمبر ہے نا؟'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

''پندرہ کا تو علم نہیں، مگر ہماری محبت کا پہلا دسمبر ہے۔'' اسد نے جواب دیا۔ ''کیا تمہیں نہیں لگتا؟'' وہ اس کے سرد چہرے کی طرف جھک کر بولا تو وہ ذرا سا ہنسی اور سر ہلا کر دو قدم آگے بڑھ گئی۔ پارک میں بہت کم لوگ تھے۔ ایسے قاتل موسم کا مزہ ہر کوئی لینے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔

''لگتا ہے بارش ہو گی۔''

''جب کہ مجھے لگتا ہے، بارش ہو چکی ہے۔'' وہ شوخ نظریں اس پر جما کر بولا۔

''آج مال روڈ پر پیدل چلیں۔'' وہ سرمستی کے عالم میں بولی۔ یہ تو اُس کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ لارنس کے فٹ پاتھ کے سامنے چلے۔

دونوں چلتے ہوئے گورنر ہاؤس کی طرف کھلنے والے گیٹ کی طرف آ گئے۔

''دیکھ لو، سردی بہت ہے اور بارش بھی تیار۔''

''جب دونوں ایک ساتھ ہیں تو پھر ڈر کیسا؟'' وہ پہلی بار اتنی ہلکی پھلکی ہو کر بولی تھی۔

''سحر! میرے پیرنٹس پڑھے لکھے نہیں ہیں، بلکہ تینوں بھائی بھی واجبی سا پڑھے ہیں۔ میری شدید خواہش تھی کہ میری ہم سفر کم از کم میرے جتنا پڑھی لکھی ہو۔ میں اپنے والدین جیسی زندگی نہیں گزارنا چاہتا۔'' وہ براؤن جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیئے کہہ رہا تھا۔

''میں اپنے پیرنٹس کو تمہارے گھر بھیجنا چاہ رہا تھا۔'' وہ چند لمحوں کے توقف سے بولا۔ ''تم میرا ساتھ دو گی نا؟''

''ابھی بھی یقین نہیں؟'' وہ ہولے سے مسکرائی۔

''سحر! میرے پاس سوائے اس جاب کے اور کچھ بھی نہیں۔ نہ گھر، نہ گاڑی، نہ لمبا چوڑا بینک بیلنس۔ میرے والدین میری شادی میری خالہ زاد ثوبیہ سے کرنا چاہ رہے ہیں۔ ثوبیہ انڈر میٹرک ہے، اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی، پندرہ مرلے کے گھر اور دو کلے زمین کی وارث۔ مگر میں کسی بھی طور اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ محض سمجھوتے کی زندگی میں نہیں گزار سکتا۔ ہم خیال، ہم مزاج، ہم سفر کے بغیر۔ کبھی نہیں.....'' وہ قطعی انداز میں بولا۔

''کیا تم میرا ساتھ دو گی؟'' وہ چلتے ہوئے جی سی یونیورسٹی کے بیالوجی گارڈن کے پاس رک کر بولا۔

''میں وعدہ نہیں کر سکتی۔ سب کچھ میرے اختیار میں کب ہے؟'' وہ بارش کے پہلے قطرے پر کچھ ٹھٹھر کر بولی۔

''کافی.....اس موسم میں کافی کے بغیر واپسی ناممکن۔''

اُسے خود اس وقت کافی یا چائے کی طلب ہو رہی تھی۔

''اسد! میں فنانشل پرابلمز سے خوف زدہ نہیں ہوں، اس کا مقابلہ ہم دونوں کر سکتے

ہیں۔ مجھے دس بارہ ہزار کی جاب با آسانی مل سکتی ہے۔ انکم کے اور بھی سورسز ہم دونوں مل کر پیدا کر سکتے ہیں، مگر اصل مسئلہ میرے گھر والوں کے راضی ہونے کا ہے۔'' وہ یخ ہاتھوں کو رگڑتے ہوئے بولی۔

''وہ کیوں نہیں مانیں گے؟'' وہ متفکر لہجے میں بولا۔ اسی وقت گرما گرم بھاپ اُڑاتی کافی آ گئی تھی۔ باہر بارش ابھی سست روی سے ہو رہی تھی۔

''یہ دسمبر کی جھڑی ہے، اسد! کافی پی کر چلتے ہیں۔'' اسے فکر لاحق ہوئی۔

''کل آؤ گی نا؟''

''دیکھو، فون کر دوں گی۔'' موسم کی خرابی کی وجہ سے آج ان کا واپس جانا ناممکن لگ رہا تھا۔

''میں کب اپنے پیرنٹس کو لے کر آؤں؟'' کافی ہاؤس سے باہر نکلتے ہی اسد نے بے قراری سے پوچھا۔ بارش ابھی بھی بہت کم تھی۔ جب کہ ہوا کی رفتار خاصی بڑھ گئی تھی، لوگ دکانوں میں دبکے بیٹھے کافی، چائے، ڈرائی فروٹ، گرما گرم پکوڑوں، سموسوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

''میں رات کو فون کر کے بتا دوں گی اور گھر کا ایڈریس بھی لکھوا دوں گی۔ ابھی امی فکر کر رہی ہوں گی۔'' وہ پارکنگ تک آتے تقریباً بھیگ گئے تھے۔

اسد کو پٹیالہ ہاؤس کے باہر اُتارتے ہوئے سحر نے کہا اور اُس کے سر ہلانے پر خدا حافظ کہہ کر گاڑی آگے بڑھا لے گئی۔

❖❖○❖❖

وہ ایک بار پھر فون نہ کر سکی۔

رات کو نانو کی طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ انہیں آئی سی یو میں لے جانا پڑ گیا۔

ان کی سانس کی پرابلم بڑھ گئی تھی۔ پوری رات اور اگلا پورا دن ان کی طبیعت سنبھل نہیں سکی تھی۔ امی کا رو رو کر برا حال تھا۔ اگلے روز ابو اور ہانیہ بھی آ گئے تھے۔

شام کو نانو کو ہوش آیا تو سب کی جان میں جان آئی۔ شایان اور ماموں میاں اپنے دفاتر نہیں گئے تھے۔ آج تو پہلی بار سحر نے ماموں میاں کو بھی نانو کے لئے بہت پریشان دیکھا۔

''آپا! وہی تو اس گھر کا بند ہیں، جس نے ہر طوفان کو روک رکھا ہے۔'' وہ امی کی گود میں سر رکھے کہہ رہے تھے۔

جیسے ہی نانو کی طبیعت سنبھلی، ابو اور ہانیہ واپس چلے گئے۔ ہانیہ کے دسمبر ٹیسٹ ہو رہے تھے۔ امی نے اگلے دن چلے جانا تھا۔ ماموں میاں نے خود ابو سے سحر کے لئے بات کی تھی کہ وہ اسے یہاں چھوڑ جائیں۔ نانو کی حالت دیکھ کر ابو چپ کر گئے۔

امی اگلے دن چلی گئیں تو اسے اسد کا خیال آیا۔ اس نے نانو کی طبیعت خراب ہونے کے تیسرے دن اسے فون کر کے بتا دیا تھا۔

'آج ملنے کی کوشش کرتی ہوں۔' وہ ہسپتال کے کاریڈور میں ٹہلتی سوچ رہی تھی۔

''سحر! گھر چلنا ہے؟'' شایان، نانو کے روم سے باہر نکلا تو اسے ٹہلتے دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں، میں شام میں چکر لگا لوں گی۔'' وہ سر ہلا کر آگے بڑھ گیا۔

'پتہ نہیں، ان کا شزا والا معاملہ کہاں تک پہنچا ہے۔' اسے خیال آیا۔

پورا ایک ہفتہ ہسپتال میں رہنے کے بعد آج نانو کو ڈسچارج کیا جا رہا تھا۔ شام کو ڈاکٹرز نے فائنل رپورٹ دیکھ کر انہیں ڈسچارج کرنا تھا، یوں بھی وہ اب کافی بہتر تھیں۔

''نانو! میں ذرا گھر ہو آؤں۔ آپ کے کمرے کی صفائی اور گھر کا انتظام دیکھ لوں۔ بس گھنٹہ بھر میں آ جاؤں گی۔'' وہ نانو کو دوا کھلا کر باہر نکل آئی۔ دھوپ آج بھی نہیں نکلی تھی۔ سرد ہوائیں موسم کی شدت کو بڑھا رہی تھیں۔ پہاڑوں پر ہونے والی برف باری کی ساری ٹھنڈک ان ہواؤں میں اُتر آئی تھی۔ گاڑی کے شیشے بند ہونے کے باوجود سردی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ گھر آ کر نانو کا کمرہ دیکھنے لگی۔ بستر کی چادر تبدیل کروائی۔ ابھی وہ پردے بدلوا رہی تھی، جب ملازم نے اسے کسی مہمان کے آنے کی خبر دی۔

'اس وقت کون آ گیا؟' وہ ٹائم دیکھتی باہر نکلی۔ دو بجنے کو تھے، اُسے ہاسپٹل بھی پہنچنا تھا۔

''اسد! آپ؟'' وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے اسد کو دیکھ کر خوشگوار حیرت سے بولی۔ وہ بھی جیسے گہرے دھیان سے چونکا تھا، مسکرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

''میں نے سوچا، تمہاری نانو کی خبر لے آؤں۔ کیسی ہیں اب وہ؟'' وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

''بہت شکریہ۔ اچھی ہیں اب۔ شام تک گھر آ جائیں گی۔ اور آپ ٹھیک رہے؟'' اسے عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

''فائن، تم سناؤ۔'' ڈرائنگ روم کا تفصیلی جائزہ لیتے اُس نے ایک پل کو سحر کی

طرف دیکھ کر رسمی سے انداز میں پوچھا۔

''میں بھی اچھی ہوں۔ کیا لیں گے، چائے یا کافی؟ ویسے کھانے کا ٹائم بھی ہے۔''

وہ ابھی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

''یار! بڑا زبردست ڈرائنگ روم ہے۔ کس قدر قیمتی فرنیچر ہے، میں تو دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔ اور تمہارے ماموں کی کوٹھی اتنی زبردست لوکیشن پر ہے۔ آج کل تو ادھر زمین کی قیمت ہی کروڑوں میں ہے۔ یہ کوٹھی تو کئی کروڑ کی ہو گی۔ بڑی موٹی آسامی ہیں تمہارے ماموں میاں۔ میں تو سمجھا تھا، یونہی سے امیر ہوں گے۔''

وہ دبیز قیمتی قالین کی فر میں بوٹ کی ٹوہ دبا کر بولا۔ سحر کو بہت عجیب سا لگا۔ اسے اسد کی نگاہوں میں انوکھی سی حرص ٹپکتی محسوس ہوئی۔ اُس کا دل ٹھٹک سا گیا، وہ یک ٹک اُسے دیکھے جا رہی تھی جو چیزوں کی قیمتوں کا اندازہ لگا کر سراہ رہا تھا۔

''میرا تو خیال ہے، یہ قالین ہی دس پندرہ لاکھ کا ہو گا۔ کیا خیال ہے تمہارا؟'' اُس کی بھٹکی بھٹکی سی نظر اِک پل کو سحر کے اُڑے چہرے پر رُکی۔

''ہوں، میں چائے لے کر آتی ہوں۔'' وہ بجھے ہوئے لہجے میں کہہ کر اُٹھی اور چائے لانے کے دوران ہی اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔

محبت کو آزمانے کا، پرکھنے کا فیصلہ۔

''ویسے سحر یار! تمہارے ماموں تمہاری شادی پر تو خوب دیں گے۔ دیکھو، کیش میں لینا اور ٹھیک ٹھاک۔ ہم کوئی چھوٹا موٹا گھر لے لیں گے۔ یا ان سے کسی گھر کی ہی فرمائش کر دینا۔ اسی ایریے میں چاہے چھوٹا سا ہو، امریکن اسٹائل کا بنا ہوا۔ آخر تم نے ان کے گھر کی اتنی خدمت کی ہے، کچھ تو صلہ ملنا چاہئے۔'' وہ لوازمات سے سجی چائے کی ٹرالی لئے اندر آئی تو اسد نے کہا تو وہ مسکرا بھی نہ سکی۔

آزمائش سے پہلے ہی نتیجہ دکھائی دے رہا تھا۔

وہ بیٹھ کر چائے بنانے لگی۔

''اسد! مجھے آپ سے ایک بات کرنا ہے۔'' وہ چائے کا کپ اس کے آگے رکھ کر بولی۔

''ہاں کہو!'' وہ اب ٹرالی میں سجے لوازمات کو چکھ رہا تھا۔

''میں نے امی ابو سے بات کر لی ہے۔''

''سچ۔ پھر کیا کہا انہوں نے؟'' وہ خوشی سے بولا۔

''وہ مان گئے ہیں۔''

''واقعی، ونڈرفل۔ تم اتنی اُداس کیوں ہو؟'' اس نے اب اس کے چہرے پر غور کیا تھا۔

''اسد! ابو نے کہا ہے، اگر میں پسند کی شادی کر لوں گی تو وہ مجھے جہیز تو کیا، ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں دیں گے۔ اور ماموں میاں تو ابو سے بھی زیادہ خفا ہیں، وہ تو مجھے ادھر رکھنے پر بھی راضی نہیں ہیں۔ میں تو آپ کی وجہ سے رک گئی۔ اب بتائیں میں کیا کروں؟ ویسے مجھے ان کی شرط پر کوئی اعتراض نہیں، مجھے کسی چیز کا لالچ نہیں سوائے آپ کی محبت کے۔''

اسد کے چہرے کی ساری روشنیاں ایک ایک کر کے بجھتی چلی گئیں۔ وہ چائے پینا بھول گیا تھا۔

''کچھ کہیں نا!'' اس کی مستقل چپ پر وہ بولی۔

وہ دل ہی دل میں حساب لگا رہا تھا۔ ثوبیہ کا پندرہ مرلے کا گھر اور زمین بیچ کر جو رقم ملے گی، اس سے باآسانی اچھا گھر اور ایک چھوٹی سی گاڑی خریدی جا سکتی ہے۔ ثوبیہ پڑھی لکھی تو ہے نا۔ کیا ہوا جو ادب، شاعری پر بات نہیں کر سکتی۔ اس کی طرح کنگال نہیں..... اس سے شادی کا مطلب ایک طویل لاحاصل جدوجہد۔ پھر کہاں کی شاعری، کہاں کا ادب؟ خالی پیٹ، بے گھر کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔

سارا حساب ہو گیا۔

''میں تم سے یہی بات کرنے آیا تھا۔'' اس نے کپ ٹیبل پر رکھا اور کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ''امی، ابا نے زبردستی میرا رشتہ ثوبیہ سے کر دیا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی انہیں منانے کی، مگر امی نے خودکشی کی دھمکی دی تو میں مجبور ہو گیا۔'' اس نے آہستہ آہستہ کہہ ڈالا۔ سحر ڈبڈبائی نظروں سے محبت کی پرکھ کو دیکھتی رہ گئی۔

''ہم اچھے دوست ہیں، رہیں گے، میں مجبور.....''

''شکریہ اسد صاحب! آپ نانو کی خیریت دریافت کرنے آئے۔'' وہ ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی تو وہ بھی اُٹھ گیا۔

''اور پلیز، آئندہ مجھ سے ملنے کی زحمت نہ کیجئے گا۔ میں ایسی دوستی افورڈ نہیں کر سکتی۔ آپ کو معلوم ہے نا۔'' وہ باہر جا رہا تھا، جب سحر نے اس سے کہا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور پھر گردن جھکا کر ایک حسرت بھری نظر اس عالی شان کوٹھی پر ڈالتا باہر نکل گیا۔

اور سحر کو یوں لگا جیسے کسی نے اُسے سوتے سے زمین پر پٹخ کر مارا ہے۔

''ہم صرف تصویر کا ایک رُخ دیکھتے ہیں، جو بہت چارمنگ ہوتا ہے اور اسی کی بنا پر فیصلہ کر بیٹھتے ہیں، جب کہ اس تصویر کے دوسرے رُخ کو اگر ہم دیکھ سکیں تو ہمیں یقین نہ آئے۔''

ہانیہ نے چند دن پہلے اپنی بات دہرائی تھی تو اس نے نہیں مانا تھا اور آج اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ آنسو آنکھوں سے بہتے چلے آ رہے تھے۔ اُسے یاد ہی نہیں رہا کہ نانو کو لینے بھی جانا ہے۔ باہر ہونے والے شور پر وہ چونک کر باہر نکلی تو شایان، نانو کو سہارا دیئے اندر لا رہا تھا۔ وہ خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔

❖❖○❖❖

امی ابو اُسے لینے آئے تھے۔ نانو کے ہسپتال سے آنے کے دوسرے دن اس نے خود فون کیا تھا کہ آ کر اسے لے جائیں۔ وہ کمرے میں پیکنگ کر رہی تھی، باہر لاؤنج میں سب ہی بیٹھے تھے۔ ماموں میاں، نانو، ابو، امی اور شایان۔ نہ جانے وہ کون سی خوش گپیوں میں مصروف تھے، جب کہ اسے تو آج کل کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''سحر! ہو گئی پیکنگ؟'' امی اندر آ کر بولیں۔

''جی!'' وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''سحر بیٹا! ایک بات کہنا تھی۔'' امی کچھ جھجک کر بولیں۔

''جی امی! کہیئے۔''

''تمہارے ماموں میاں اگلے ماہ شادی پر زور دے رہے ہیں۔''

''جی کس کی شادی.....اپنی.....؟'' وہ چونکی۔

''پاگل ہوئی ہو؟ وہ کیا اب اس عمر میں شادی کریں گے؟ میں تمہاری اور شایان کی شادی کی بات کر رہی ہوں۔''

''کیا.....؟'' وہ زور سے چیخی۔ ''کیا کہہ رہی ہیں آپ؟''

''کیوں، ایسا کیا کہہ دیا میں نے؟''

''شایان جو چند دن پہلے شزا کے ساتھ انوالو تھے، اب آپ سب کے مجبور کرنے پر مجھ سے شادی کے لئے تیار ہو گئے، کیونکہ ان کے گھر کو، دادی کو ایک کیئر ٹیکر، بے زبان کیئر ٹیکر کی ضرورت ہے، اس لئے؟''

وہ زور زور سے بول رہی تھی۔

اسی وقت شایان اندر داخل ہوا۔ اس نے امی کو اشارہ کیا تو وہ اُٹھ کر باہر نکل گئیں۔

''ہاں تو تم کیا کہہ رہی تھیں، میں تم سے اس لئے شادی کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اس گھر کے لئے ایک نگران کی ضرورت ہے؟'' وہ اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

''اس میں جھوٹ کیا ہے؟'' وہ بے خوفی سے بولی۔

''واقعی، اس میں جھوٹ کچھ بھی نہیں ہے۔ واقعی اس گھر کے لئے تم جیسی دھیان رکھنے والی، محبت کرنے والی مالکن کی ضرورت ہے۔ سحر! اگر شزا سے شادی کرنا ہوتی تو میں لندن میں کر چکا ہوتا۔ میں جب بھی اس سے شادی کے بارے میں سوچتا، نہ جانے مجھے کون سی چیز اندر ہی اندر روک لیتی تھی۔ پھر میں نے ماما سے بات کی تو وہ گم صم سی ہو گئیں۔ میں نے اُنہیں شزا کی تصویر بھیجی تو انہوں نے مجھے صرف ایک جملہ لکھ بھیجا۔ ''شایان! ایسی لڑکی سے شادی کرنا جو میرے گھر کو گھر بنا کر رکھ سکے مجھے تم سے اور کچھ نہیں مانگنا۔''

بس ماما کے اس جملے نے گویا میرے ہاتھ باندھ دیئے۔ ساری زندگی زارا جیسی عورت کے ہاتھوں ماما کی مجبوری اور پاپا کی بے بسی کو ایکسپلائٹ ہوتے دیکھتا رہا تھا۔ میں کسی زارا کو اپنے گھر میں نہیں لانا چاہتا تھا۔ پھر شزا نے میرے پرپوز کرنے پر جب لندن سیٹل ہونے کی ضد کی تو مجھے لگا، ماما کی روح بہت تکلیف میں ہے۔ انہوں نے اس گھر کو گھر بنائے رکھنے کے لئے ساری زندگی اپنی عزتِ نفس کا خون کیا تھا اور میں ان کے اس خواب کو سنبھال کر رکھنا چاہتا تھا، اپنی ہم سفر کے ہمراہ۔ اور شزا میرے اس خواب کو کبھی سنبھال نہیں سکتی۔ وہ تو مجھے یہاں سے اُکھاڑ لے جانا چاہتی ہے۔ میری اس سے انڈر اسٹینڈنگ ہے، لیکن صرف چند معاملات میں ورنہ ہمارے درمیان اختلافی پوائنٹس زیادہ ہیں، جو شادی کے بعد زیادہ بڑے ہو سکتے ہیں۔ اس سے شادی کا مطلب مجھے اپنا آپ، اپنا گھر سب کچھ اُس کی خواہش کے مطابق بدلنا ہو گا۔ اس سے محبت تو مجھے کبھی بھی نہیں رہی، مگر انڈر اسٹینڈنگ کا نام محبت ہے تو مجھے اس سے ایک حد تک محبت ہو گئی تھی اور جب اس نے اپنی ڈیمانڈز پیش کیں تو یہ محبت اڑنچھو ہو گئی۔ تم ہی کہو، کیا واقعی یہ محبت تھی؟'' وہ بلا تکان اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''ہاں، میں تم سے بھی محبت کی بنا پر شادی نہیں کر رہا، صرف اس بنیاد کی خاطر کر رہا ہوں، جس کے لئے سب شادیاں ہوتی ہیں۔ ایک مضبوط، پُراعتماد، خوب صورت گھر کی

بنیاد رکھنے کے لئے۔ کیا تم ایسے گھر کی بنیاد رکھنے میں میرا ساتھ دو گی؟'' اس نے اپنا ہاتھ اس کے آگے پھیلا دیا تھا۔

ہاں، ایسا ہی خواب تو وہ دیکھتی تھی۔ ایسا گھر جس میں محبت ہو، اعتماد ہو، اعتبار ہو، اور سب کو فیصلہ کرنے کی آزادی ہو۔ اسی گھر کی تعمیر کے لئے تو وہ ہم مزاجی کے چکر میں اسد کی طرف بڑھی تھی اور دھوکا کھا گئی۔ شایان نے اسے محبت کا خواب دکھا کر کھوکھلے خواب نہیں دکھائے تھے، ایک گھر کا وعدہ کیا تھا اور اُس کی آنکھوں سے چھلکتا یقین سحر کو چند لمحوں میں بالیقین کر گیا۔ اس نے آہستگی سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''تھینک یُو۔ اُوپر ٹیرس پر چلیں، بارش ہو رہی ہے۔'' وہ آہستگی سے بولا۔

''کیا آپ کو بارش پسند ہے؟''

''پہلے نہیں تھی، مگر اب پسند کرنے کی کوشش کروں گا۔'' وہ شریر لہجے میں بولا تو وہ اپنا ہاتھ کھینچنے لگی جو مضبوط گرفت سے نکالنا محال لگ رہا تھا۔ چند لمحوں کی مزاحمت کے بعد اس نے ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیا۔

''چلیں پھر.....؟''

''کہاں؟''

''بارش کے پاس۔ اُسے اپنے دل کا احوال بتانے۔''

شایان کی بات پر وہ حیرانی سے اُسے تکنے لگی۔

''اتنے بدذوق نہیں ہیں ہم۔ اتنا رومانس تو کر ہی سکتے ہیں۔'' اس نے کہا تو وہ زور زور سے ہنس پڑی۔ باہر بیٹھے سب لوگوں نے ان کی ہنسی کی آواز سنی تھی اور مطمئن ہو گئے تھے۔

❖❖○❖❖

دل نہیں ہارا ہے

''یس، دِس اِز سول ایوی ایشن انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ۔''

دوسری جانب مکمل خاموشی تھی۔ صرف سانس لینے کی مدھم سی آواز آ رہی تھی۔ وہ دوبارہ بولنا چاہتی تھی کہ ایئر پیس سے ایک گمبھیر آواز اُبھری۔

''ونس مور۔ (ایک بار پھر)''

''دِس اِز سول ایوی ایشن انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ۔ واٹ کین آئی ہیلپ یُو؟ (میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟) اُس نے نرم لہجے میں کہا۔

''ونس مور۔'' ریسیور سے وہی گمبھیر آواز اُبھری۔

''پلیز ٹیل می، واٹ انفارمیشن یُو وانٹ؟ (مجھے بتائیں، آپ کو کیا معلومات چاہئیں؟)'' اُس نے بڑے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''ونس مور!''

وہ بھونچکی رہ گئی، ریسیور کان سے ہٹا کر اُسے گھور کر دیکھا۔

''میڈ مین۔ (پاگل آدمی)'' اور بڑبڑاتے ہوئے کریڈل پر رکھ دیا۔

ابھی ریسیور رکھا ہی تھا کہ پھر بیل بج اُٹھی۔ اس نے فون کو ایک نظر دیکھا اور پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں مگن تھے۔ تنزہ کے منہ میں چیونگم تھی اور وہ تیز تیز منہ چلاتے ہوئے فائل ورک کر رہی تھی۔ شاہد اور عمران آپس میں کچھ ڈسکس کر رہے تھے۔ نوید صاحب کمپیوٹر کے ساتھ مگن تھے۔ راحیلہ فون اٹینڈ کر رہی تھی اور عامرہ ٹانگ پر ٹانگ جمائے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی۔ جب چوتھی بیل ہوئی تو اس نے ریسیور اُٹھا لیا۔

''یس، دِس اِز سول ایوی ایشن انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ؟''

''ونس مور۔'' وہی گمبھیر آواز۔ اُسے آگ سی لگ گئی۔ لوگوں نے فون کو بھی کھیل بنا رکھا ہے۔ پھر بھی بڑے حوصلے سے دوسری بار اس نے اپنے فارمل ورڈز دہرائے۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

''ونس مور۔''

اس نے ریسیور رکھ دیا۔

اُس ڈھیٹ نے ری ڈائل دبایا تھا۔ بیل فوراً ہی بج اُٹھی۔ اُسے کوفت ہونے لگی۔ اُس نے فائل اپنے آگے کر لی۔ فائل کھلنے تک تین گھنٹیاں اور بج اُٹھیں۔ اُس نے گہرا سانس لیا اور ریسیور اُٹھا لیا۔

''یس۔'' اُس نے صرف یس پر اکتفا کرتے ہوئے کہا۔

''ونس مور۔''

اُس کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لے۔

''دیکھیں، آپ جو کوئی بھی ہیں، یہ مذاق بند کریں۔ یہ فون عوام کی سہولت کے لئے ہے۔ آپ اس طرح سے اسے بزی نہیں رکھ سکتے۔'' اس نے بڑے صبر سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ونس مور۔'' ڈھٹائی کی انتہا تھی۔

اُس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

''ہیلو! کیا ہو رہا ہے؟'' تنزہ اُس کی ٹیبل پر آ کر بولی۔ اُس کا منہ حسبِ معمول جگالی کر رہا تھا۔

''یار! اس مصیبت کو تو کبھی منہ سے نکال لیا کرو۔'' اُس نے جھلا کر ببل بناتی تنزہ کو ٹوکا۔

''ہونہہ!''

ساتھ ہی بیل بج اُٹھی۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

''تنزہ! تم دیکھنا ذرا۔ مجھے نوید صاحب سے ایک بات کہنی ہے۔'' اُسے بروقت بہانہ سوجھا اور وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی۔ تنزہ نے کندھے اچکاتے ہوئے ریسیور اُٹھا لیا۔ اُس کے ہیلو کے جواب میں دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر فون بند ہو گیا۔ تنزہ نے ریسیور اُس کی طرف بڑھایا۔

''کوئی نہیں تھا۔ یا شاید تھا اور اسے میری آواز پسند نہیں آئی۔'' اس نے ریسیور لے

کر رکھ دیا۔ ایک لمحے کے توقف سے بیل پھر بج اُٹھی۔

اس نے مدد کے لئے تنزہ کی طرف دیکھا۔ وہ آرام سے کرسی پر بیٹھ کر میگزین پڑھنے لگی۔ عشنا نے خود ہی ریسیور اُٹھا لیا اور ہیلو کہا تو دوسری طرف پھر ''ونس مور'' تھا۔ اب تنزہ کی وجہ سے وہ ایسے ہی فون بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔

''جی سنگاپور جانے والی فلائٹ ایک گھنٹہ لیٹ ہے۔''

دوسری طرف اُس کے ونس مور کے جواب میں اس نے تلخی سے شکریہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ اب فون اُس کے گھر کا تو تھا نہیں، ورنہ اب تک تو وہ سیٹ اُٹھا کر باہر پھینک چکی ہوتی۔ نوکری میں بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔

اب اس نے وہاں کھڑے ہونے کی حماقت نہیں کی اور تیزی سے نوید صاحب کی ٹیبل کی طرف بڑھ گئی۔

''سر! میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ میں گھر جانا چاہتی ہوں۔''

انہوں نے عینک کو جو پہلے ہی ان کی ناک سے کھسکی جا رہی تھی، مزید نیچے کھسکا کر اسے گھور کر دیکھا۔

''چھٹی میں تو صرف آدھ گھنٹہ باقی ہے۔ آپ کچھ دیر ویٹ کر لیں۔''

''لیکن سر!'' اُن کی بات بھی صحیح تھی، وہ اٹک گئی۔

''دیکھیں، آپ کو کنوینس کا مسئلہ ہو جائے گا۔ کیونکہ گاڑی تو آپ کو چھٹی کے وقت ہی ڈراپ کر سکے گی۔''

وہ چپ رہی۔

''ویسے اگر آپ اپنے طور پر جانا چاہ رہی ہیں تو آپ کی مرضی۔'' انہوں نے بات ختم کر کے اپنا رخ کمپیوٹر کی طرف پھیر لیا۔

''ٹھیک ہے سر!'' اس نے کچھ مایوسی سے کہا اور اپنی ٹیبل کی طرف بڑھ گئی۔ تنزہ ابھی تک وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔

''بھئی پتہ نہیں کیا بات ہے۔ فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ میں اُٹھاتی ہوں تو کوئی نہیں بولتا۔ واٹس میٹر؟ (کیا معاملہ ہے؟)'' اُس کی آنکھوں میں تجسس تھا۔

''ہیں..... پتہ نہیں۔'' وہ جھلا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

''خیریت؟'' اُس نے تشویش سے پوچھا۔

''بس یونہی سر میں درد ہے۔ میں گھر جانا چاہ رہی تھی۔''

''رہنے دو۔ پندرہ بیس منٹ تو ہیں۔ اور ویسے بھی تمہارا گھر تو بذاتِ خود سردرد ہے۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' اس کے منہ سے آہ نکلی اور اس نے تھکن زدہ انداز میں کرسی کی پشت سے سر ٹکا لیا۔

''کیا بات ہے؟ کچھ پریشان ہو؟''

پتہ نہیں اُس کے ساتھ ایسا کیوں ہوتا تھا کہ جب وہ کچھ چھپانا چاہتی، اس کے چہرے اور آنکھوں سے عیاں ہو جاتا تھا۔ کوشش کے باوجود اس کا چہرہ اُس کی ہر کیفیت کو نیون سائن کی طرح جگمگا کر پیش کرتا۔ اب پھر یقیناً پریشانی اُس کے چہرے سے ہویدا تھی۔ حالانکہ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا کہ جس پر ضرور ہی پریشان ہوا جاتا۔ کیونکہ اس طرح کی رانگ کالز تو دن میں دو چار تو ضرور موصول ہو جاتی تھیں اور وہ لوگ اس کی عادی بھی تھیں۔ مگر تواتر سے اور ایک ہی شخص، اُسے پریشانی لاحق ہو رہی تھی۔ پوزیشن بھی تو اُس کی اتنی نازک تھی۔ اس طرح کی کوئی بھی لگژری وہ افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔

''نہیں بھئی، کچھ نہیں۔ بس ذرا سر میں درد ہے۔'' اس نے سیدھے ہو کر کہا۔

''کل تو تمہاری نائٹ ہے نا!'' تنزہ نے میگزین میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں!'' اس نے مختصراً کہا۔ اس اختصار کے پیچھے بھی پریشانی نمایاں تھی۔

''عشنا! میرا جی چاہتا ہے کہ میں ایئر ہوسٹس کے لئے اپلائی کروں۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ نوکری کی نوکری، سیر کی سیر۔'' اس نے کرسی کے نیچے ٹانگیں پھیلائیں اور مزید پھیل کر بیٹھ گئی۔

''ہاں اور وہ تمہارا منگیتر جانے دے گا تمہیں دنیا کے سیر سپاٹے پر تن تنہا؟''

''سکندر! ارے وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اور اگر میں ضد کروں نا تو کر بھی سکتی ہوں۔'' وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ''لیکن پھر سوچتی ہوں، چھوڑو پرے۔ کسی کے صبر کو اتنا نہیں آزمانا چاہئے۔ آہ لگ جاتی ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بائیں آنکھ دبا کر کہا۔

''پھر بھی تم اُس کی قدر نہیں کرتیں۔ اُسی نے تمہیں جاب کی اجازت لے کر دی تھی۔''

''ارے رہنے دو۔ اور بھلا قدر کیا ہوتی ہے؟ اسی کی وجہ سے تو خود کو اتنا پابند کر رکھا ہے میں نے۔ گھر سے آفس اور آفس سے گھر۔ اوہ ہاں، میں تو بھول ہی گئی۔'' اُسے کچھ یاد آ گیا، فوراً کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''مجھے سکندر نے لینے آنا تھا۔ ذرا سا انتظار کرنا

پڑ جائے تو اتنا منہ پھول جاتا ہے موصوف کا۔ دو دو گھنٹے منتیں کرنی پڑتی ہیں۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنی میز کی طرف بڑھ گئی۔ فائلیں سمیٹ کر دراز میں ڈالیں، لاک لگایا، کرسی کی بیک سے لٹکا بیگ اُتار کر کندے پر ڈالا، راحیلہ اور عامرہ کو ہاتھ کے اشارے سے بائے کہا اور عشنا کے ٹیبل کے پاس آ کر رک گئی۔

''تم بھی اُٹھ چکو اب۔ گھڑی کے چھ بجنے میں تو ابھی چھ سات منٹ باقی ہیں، تمہارے منہ پر البتہ بج چکے ہیں۔ اچھا خدا حافظ۔'' وہ بڑے فریش موڈ میں تھی۔ مسکراتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اس نے رشک بھری نظروں سے اسے جاتے دیکھا اور اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ باقی لوگ بھی جانے کو تیار تھے۔

اگلے روز اُس کی نائٹ تھی۔ اُس کے ساتھ شہزاد، زیبی، فہد اور سعدیہ تھے۔ فہد اور سعدیہ کی شادی کو چھ ماہ ہوئے تھے۔ وہ چاہے ڈے ہو یا نائٹ، اپنی ڈیوٹی اکٹھے ہی رکھواتے تھے۔ کام تو جو ہوتا سو ہوتا، اس کے علاوہ ان کی باتیں ختم ہونے میں نہ آتیں۔ اُن کی موجودگی میں کمرے میں ہر وقت مکھیوں سی بھنبھناہٹ ہوتی رہتی۔ پہلے سب ان کا مذاق اُڑاتے تھے، پھر جھلانے لگے۔ اب سب نے اُن کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ ایک دوسرے میں مگن، ساری دنیا سے بے خبر۔ اور بے خبری فی زمانہ سب سے بڑی نعمت ہے۔ شہزاد، عشنا کی طرح بہت سیریس اور کم گو تھا۔ لئے دیئے رہنے والا، فارمل سا۔ اُس کے خواب بڑے اونچے تھے۔ ایئرپورٹ کی عمارت سے بھی بلند۔ وہ سی ایس ایس کی تیاری کر رہا تھا۔ مستقبل میں ممکنہ افسری کے شایانِ شان رویہ اپنانے کی پریکٹس کر رہا تھا۔ یہ زیبی کی رائے تھی، شہزاد کے بارے میں۔ اور خود زیبی کے بارے میں ہر شخص کی رائے مختلف تھی۔ وہ سب کے لئے ایک معمہ کی طرح تھی۔ بقول تنزہ کے لوگ اتنی جلدی موڈ نہیں بدلتے جتنی جلدی زیبی، منگیتر بدل لیتی ہے۔

اور یہ بات کسی حد تک سچ بھی تھی۔ عشنا کو یہاں جاب کرتے ہوئے تین سال ہو چکے تھے اور اس دوران اس نے چار زبانی منگنیاں کی تھیں اور ہر بار آفس والوں کو مٹھائی بھی کھلائی تھی۔ اور نوید صاحب کے بقول ان کی شوگر کنٹرول نہ ہونے کی بنیادی وجہ زیبی کی منگنیوں کے لڈو تھے۔ وہ یہاں چھ سات سال سے ملازمت کر رہی تھی۔ چھوٹی بہن اور ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ البتہ باپ کا معاملہ مشکوک تھا۔ پہلے وہ کہتی تھی کہ وہ لندن میں ہیں، پھر ان کے ایک کولیگ لندن جانے لگے تو انہوں نے اس کے والد کا ایڈریس مانگا۔ پہلے تو ٹال مٹول کرتی رہی، پھر کچھ دنوں بعد کہنے لگی، پاپا تو آج

کل ہالینڈ میں ہوتے ہیں۔ پھر انہیں آسٹریلیا پہنچا دیا۔ اور آج کل وہ اس موضوع پر بات کرنے سے کتراتی تھی۔ سب کہتے کہ اگر تمہارے فادر فارن سے تمہیں اتنا سپورٹ کرتے ہیں تو پھر تم جاب کیوں کرتی ہو؟ تو وہ کندھے اچکا کر کہتی۔

''یہ میرا شوق ہے۔''

اور اس بات کا کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ وہ یہ کام شوقیہ کر رہی ہے۔ پھر کچھ اُس کی حرکتیں اس قسم کی تھیں کہ کوئی بھی اس کی باتوں کا اعتبار نہیں کرتا تھا۔ کئی بار دفتر کے لوگوں نے اسے پینوراما اور مختلف شاپنگ اسپاٹس پر کسی نہ کسی اجنبی کے ساتھ ڈھیروں شاپنگ کرتے دیکھا تھا، جنہیں وہ بعد میں کزن یا منگیتر بتاتی تھی۔

شروع شروع میں تنزہ اُس کی شخصیت کے سحر کو جاننے کے لئے بڑی متجسس تھی۔ مگر وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیتی تھی۔ پھر سب کی مختلف آراء نے جو نتیجہ اخذ کیا تھا، وہ یہ تھا کہ وہ ایک اچھی لڑکی نہیں ہے۔ صرف ایک بات میں وہ مستقل مزاج تھی، اپنی ماں کے ساتھ شدید قسم کی محبت تھی اسے۔ اگر کبھی اس کی ماں بیمار ہو جاتی، وہ ہفتہ ہفتہ بھر آفس نہ آتی۔ وہ ہمہ وقت کسی کھلے ہوئے گلاب کی طرح امپورٹڈ خوشبوؤں میں بھیگی تروتازہ رہتی تھی۔ مگر جب اُس کی ماں بیمار ہوتی، وہ کسی پژمردہ پھول کی طرح مرجھا جاتی۔ ساری شوخیاں اُداسی میں ڈھل جاتیں۔ اُس کی شخصیت کا یہ رنگ سب کے لئے بڑا متاثر کن تھا۔ کبھی کبھی اُسے دیکھ کر عشنا کو اسکول کی درسی کتاب میں پڑھی ہوئی کہانی بہروپیا یاد آ جاتی، جس کا کوئی بھی روپ اصل نہ تھا۔

تنزہ اب اُس کے ذکر سے بڑا چڑتی تھی۔ بلکہ شاید دل میں نفرت بھی کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ ایسی لڑکیاں ہیں جو دوسری باہر نکلنے والی لڑکیوں کا امپریشن بھی خراب کرتی ہیں اور لوگ سب کو ایک ہی ترازو میں تولنے لگتے ہیں۔ گاؤں کے گھٹے ہوئے ماحول سے شہر کی فضاؤں میں آتے ہی اس نے ایسا رنگ بدلا تھا کہ کوئی اسے دیہاتی نہیں کہہ سکتا۔ یہ بھی تنزہ کی رائے تھی۔ عشنا چونکہ اسے سمجھ نہ سکی تھی، اس لئے کوئی رائے نہ دے پاتی۔

وہ فلائٹس کا شیڈول نوٹ کر رہی تھی، جب فون کی گھنٹی بجی۔ ابھی تو ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔ اس نے فون اٹھاتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی۔

''یس، سول ایوی ایشن انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ۔''

''ونس مور۔'' وہی گمبھیر آواز۔

اُس کا جی جل گیا۔ اس پاگل کو کیسے پتہ چلا کہ آج میری نائٹ ہے؟ سعدیہ اور فہد سر سے سر جوڑے خدا جانے کون سی گتھیاں سلجھا رہے تھے۔ زیبی فائل پر جھکی ہوئی لکھ رہی تھی۔ شہزاد اپنی کتاب کھولے بیٹھا تھا۔ کمپیوٹر کے پاس کوئی نہیں تھا۔ عرفان صاحب شاید باہر گئے ہیں، اس کو تو آج سیدھا کروں۔ اُس نے سوچا۔

''دیکھیں مسٹر! یا تو آپ واقعی پاگل خانے سے چھوٹ کر آئے ہیں یا مجھے پاگل کر دیں گے۔ ٹھیک ہے، اگر آپ بات کرنا چاہتے ہیں تو بات کریں۔ یہ طوطے کی طرح ونس مور رٹنا چھوڑیں۔'' اس نے دھیمی آواز میں لہجہ سخت کرتے ہوئے کہا۔

''ونس مور۔''

اُف.....! اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر بیٹھے۔ دل میں تو اب گالیوں کا طوفان اُٹھ رہا تھا، جس پر بند باندھنے کے لئے اس نے کریڈل کو دبایا اور ریسیور اس پر رکھ دیا۔ چند لمحوں کے توقف سے پھر بیل بجنے لگی۔

'یا اللہ! کیا کروں؟' اُس نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''ارے بھئی عشنا! کیا کر رہی ہو؟ فون اٹینڈ کرو۔'' چوتھی بیل پر زیبی نے فائل کا صفحہ پلٹتے ہوئے اسے ٹوکا۔

اُس نے بادل نخواستہ ریسیور اٹھایا۔

''یس۔'' اُس نے مری آواز میں کہا۔

''ونس مور!''

''کاش تم میرے سامنے ہوتے تو تمہارا میں وہ حال کرتی کہ تمہارا رواں رواں پکار اُٹھتا، ونس مور، ونس مور۔'' وہ دانت کچکچا کر غصے سے بولی۔

''ونس مور۔''

اس نے عاجزی سے ریسیور کو دیکھا، پھر اس نے ریسیور سائیڈ پر رکھ دیا اور میز پر کہنیاں ٹکا کر کچھ سوچنے لگی۔ اسی وقت فون کی بیل بجی۔ اُس نے گھبرا کر سائیڈ پر پڑے ریسیور کو دیکھا۔

''یہ بیل کی آواز کہاں سے آئی؟'' اس نے غائب دماغی سے سوچا۔

''ارے عشنا! یہ تم نے ریسیور سائیڈ پر کیوں رکھا ہے؟ ہمایوں صاحب کا فون ہے۔ کہہ رہے ہیں کہ تمہارا فون مسلسل بزی مل رہا ہے۔ تم ان سے کانٹکٹ کرو۔'' سعدیہ ریسیور کان سے لگائے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھے بول رہی تھی۔

''اوہ سوری، مجھے یاد نہیں رہا۔'' اس نے گھبرا کر کہا اور ریسیور اٹھا کر کریڈل پر رکھ دیا۔ اسی وقت بیل بجی۔ اس نے پہلی گھنٹی پر ہی ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف ہمایوں صاحب تھے۔ اس کی سستی پر اچھی خاصی ڈانٹ پلائی۔

اس کے بعد وہ ساری رات اونگھ بھی نہ سکی۔ اس کے دل میں خوف سا بیٹھ گیا تھا۔ پتہ نہیں کون ہے؟ اور میرے ہی پیچھے کیوں پڑ گیا ہے؟ پتہ نہیں کیا چاہتا ہے؟ گو نگا تو کم از کم نہیں ہے اور لفظوں کے استعمال میں کوئی شخص اتنا کفایت شعار ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اگر گھر میں کسی کو پتہ چل گیا تو؟ وہی لڑکیوں کے ازلی اندیشے اُسے سر اُٹھا اُٹھا کر دھمکانے لگے۔ کچھ نہیں ہوتا..... ہاں، کیا ہو گا؟ وہ ایک دن تنگ کرے گا، پھر پیچھے ہٹ جائے گا۔ دفع کرو۔ اُس نے خود کو تسلی دی۔

''نہیں تو پھر تنزہ سے بات کروں گی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی بہتر مشورہ دے سکے۔''

سوچ سوچ کر اُس کے سر میں درد ہونے لگا۔ پتہ نہیں، یہ رات اتنی لمبی کیوں ہو جاتی ہے؟ اُس نے جھنجلا کر سوچا۔ اور میری رات ہی کیوں اتنی طویل ہو گئی ہے؟ زندگی کے کسی اُفق پر کوئی اُمید کی کرن دکھائی نہیں دے رہی۔ افسردگی کے سائے رات کی تاریکی کو بڑھانے لگے۔

نائٹ سے اگلے روز اس کا آف تھا۔ تیسرے دن ڈیوٹی جوائن کرنے کے تین گھنٹے بعد پھر وہی کالز، اگلے روز پھر، یہ سلسلہ جیسے چل نکلا۔ وہ پانچ چھ کالیں لگاتار کرتا تھا۔ کوفت تو جو ہوتی سو ہوتی، مگر پریشانی سب سے بڑھ کر تھی۔ اگر امینہ آپا کو پتہ چل گیا یا فاروق بھائی کو اس کی بھنک بھی مل گئی تو؟ وہ تو پہلے ہی اس کی نوکری سے چڑے بیٹھے ہیں، انہیں تو بہانہ مل جائے گا۔ اگر وہ کچھ کہہ دیتا تو پتہ چل جاتا کہ وہ چاہتا کیا ہے؟ کم از کم یہ وسوسے تو نہ ہوتے۔ اس نے اسے جھڑک کر بھی دیکھ لیا تھا۔ حتیٰ الامکان مہذب گالیاں بھی دے کر دیکھ لی تھیں۔ اُس کی غیرت کو بھی للکارا تھا، حتیٰ کہ اس کی منتیں بھی کی تھیں کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے، کہہ ڈالے مگر وہ پتہ نہیں کس مٹی کا بنا تھا کہ ونس مور سے آگے ایک لفظ نہ بکتا۔ اس کا دماغ دن رات پکنے لگا تھا۔ پہلے ہی کیا کم اُلجھنیں تھیں جو یہ بن بلائی مصیبت اس کے گلے پڑ گئی تھی۔ کیا کروں؟ کس سے کہوں؟ پریشانی دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اس نے تنزہ سے اس کا ذکر کر ہی دیا۔

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟'' اس نے تشویش سے کہا۔

''تم کیا کر لیتیں؟'' وہ چڑ کر بولی۔

''کم از کم سر سے اُس کی شکایت کر دیتے، ویسے کہتا کیا ہے؟'' وہ ذرا سا آگے کی طرف جھک کر بولی۔

''بتایا تو ہے تمہیں۔ وہی مرغے کی ایک ٹانگ، ہر بات، ہر صلوات کے جواب میں ''ونس مور!'' اُس کا تو وہ حال ہے کہ گالیاں کھا کر بھی کہتا ہے ونس مور۔ بالکل بے مزہ نہیں ہوتا ڈھیٹ انسان۔'' اس کے منہ میں کڑواہٹ گھل گئی۔

''پھر تو سچا عاشق ہے، جسے تمہاری گالیاں بھی شہد کی طرح شیریں لگتی ہیں۔''

''تنزہ!'' وہ غصے سے اسے دیکھنے لگی۔

''بھئی میرا مطلب ہے، ہوتے ہیں بعض ایسے بھی لسوڑے کی طرح لیس دار۔ جوں جوں پیچھا چھڑاؤ، چمٹتے ہی جاتے ہیں۔ اچھا میں سر سے بات کروں گی۔''

''وہ کیا کریں گے بھلا؟'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''وہ فون پر آبزرویشن لگوا دیں گے یا اس کا کوئی بندوبست کروا دیں گے۔''

''اس طرح تو بات پھیل جائے گی۔'' وہ ڈر گئی۔ ''یہ تو پبلک فون ہے۔ ہو سکتا ہے وہ کسی بوتھ وغیرہ سے کرتا ہو۔ ایویں ہی سر کو بتانا۔ رہنے دو، میرا خیال ہے دو ایک روز اور دیکھ لیتی ہوں۔ اگر پھر بھی باز نہ آیا تو پھر سوچیں گے۔'' اس نے ٹالتے ہوئے کہا۔

''دیکھ لو، کہیں زیادہ مسئلہ نہ کھڑا کر دے وہ۔ اُسے تمہاری ٹائمنگ کا بھی علم ہے۔'' تنزہ نے اسے ڈراتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔ ایسا ویسا کچھ نہیں کرنے والا وہ۔'' اس نے بڑے اعتماد سے کہا تو تنزہ اسے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی تو وہ کچھ کھسیا گئی۔

''ایک طرف اتنا خوف اور دوسری طرف اتنی تسلی۔ حیرت ہے۔'' تنزہ نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو نا، سر تک بات پہنچی تو کچھ اور لوگوں کو بھی علم ہو جائے گا۔ اس طرح تو بات پھیل جائے گی۔ اور تمہیں تو پتہ ہے.....'' اس نے کچھ بے بسی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''وہ تو ٹھیک ہے، مگر احتیاط اچھی چیز ہے۔ ہم سر سے رازداری کا کہہ دیں گے۔ اور یہ کوئی ایسی معیوب بات بھی نہیں۔ اب تو عام زندگی کے معمولات میں سے ہیں یہ رانگ کالز۔''

''اچھا، ابھی تم فی الحال رہنے دو۔ کچھ دن اور دیکھ لیتے ہیں۔'' اس نے بات سمیٹتے ہوئے کہا۔

''کیا خیال ہے، سکندر سے نہ بات کروں؟'' اس کی آنکھیں نئے خیال سے چمک اُٹھیں۔

''خدا کے لئے تنزہ! ایسی حماقت مت کرنا۔ میں تو تمہیں بتا کر پچھتا رہی ہوں۔'' اس نے تنزہ کے آگے ہاتھ جوڑے۔

''توبہ ہے تمہارے اس فضول خوف و ہراس سے۔ پتہ نہیں کیوں اتنا ڈرتی ہو تم۔ کیا ہو جائے گا اگر کسی کو پتہ چل جائے گا؟'' وہ کچھ غصے سے بولی۔

''تمہارے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر میرے لئے یہ بہت بڑی بات ہے۔'' اُس کی آواز بھرّا گئی۔

''اچھا بابا! نہیں کرتی کسی سے ذکر۔ ایک تو میں تمہاری اس زود رنج طبیعت سے بڑی عاجز ہوں، بات بات پر بچوں کی طرح بسورنے لگتی ہو۔'' وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

''اچھا اب اگر وہ فون کرے تو مجھے بلا لینا۔'' وہ میز پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے بولی۔

''ویسے بندہ خاصا مستقل مزاج لگتا ہے، اپنے موقف سے ہٹتا نظر نہیں آتا۔ ایسے لوگ تو نایاب ہوتے ہیں اور تمہیں ایسے ہی کسی ضدی اور اڑیل کی ضرورت ہے۔ میری مانو تو بات کو ذرا آگے بڑھاؤ۔'' وہ مدھم آواز میں شرارت سے بولی۔

''شٹ اپ، اپنا منہ بند کرو۔'' وہ غصے سے بولی۔

''آخر کب تک مجھے شٹ اپ کرو گی؟ ایک نہ ایک دن.....''

''تنزہ!'' وہ چیخ کر بولی تو تنزہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی میز کی طرف مڑ گئی۔

❖❖○❖❖

اس روز اس کا آف تھا۔ گہری نیند سوئی ہوئی تھی کہ کانوں میں فاروق بھائی کے چلّانے کی آواز آئی۔

''آخر میں پوچھتا ہوں یہ تماشا کب تک چلے گا؟ سب نے اس گھر کو ہوٹل سمجھ رکھا ہے اور اس ہوٹل کے اخراجات میری برداشت سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔''

مہینے میں ہونے والے بیس میں سے پندرہ جھگڑے اس لفظ اخراجات کی وجہ سے ہوتے تھے اور فاروق بھائی کو غصہ دلانا کون سا مشکل کام تھا۔ بجلی کا بل زیادہ آ جاتا، وہ چیخنے چلّانے لگتے۔ بچوں کی پروگریس رپورٹس میں اگر کسی کا بی گریڈ آ جاتا تو وہ طوفان

اٹھا دیتے۔ جس روز عشنا کی نائٹ ہوتی اس روز تو ان کا مزاج سوا نیزے پر ہوتا۔ جن دنوں ان کے کاروبار میں نقصان ہو رہا ہوتا، وہ سارے کھاتے گھر آ کر صاف کر لیتے۔ ان کے مزاج کی اس کیفیت نے امینہ آپا کو بالکل کنفیوز کر دیا تھا۔ وہ گھر آتے تو امینہ آپا گھبراہٹ میں ہی کتنے کام الٹ پلٹ کر جاتیں۔ کیونکہ غصے میں فاروق بھائی کا ہدف امینہ آپا ہی ہوتیں اور وہ اپنے غصے کو ٹھکانے لگانے کے لئے اس ہدف کو ہر جگہ ڈھونڈ لیتے اور وہ زیادہ انہیں کچن میں ہی ملتیں، وہ دروازے میں کھڑے ہو کر لڑاکا سوکن کی طرح چیخنا شروع کر دیتے۔ نتیجتاً چائے میں نمک، سالن میں چینی، چاول ادھ کچے، ادھ پکے اور بریانی کھچڑی کا نقشہ پیش کر رہی ہوتی۔ اس بات پر کھانے کی میز پر ہنگامہ کھڑا ہو جاتا اور اس ہنگامے میں امینہ آپا کی ساس بیٹے کی دست راست بن جاتیں۔

'آج پتہ نہیں کیا مسئلہ ہے؟' اُس نے بیزاری سے سوچا۔ عشنا کی صورت میں فاروق بھائی کے ہاتھ امینہ آپا کی کمزوری آ گئی تھی۔ وہ اشاروں کنایوں میں اس سر دردی کا رونا روتے۔ حالانکہ شادی سے پہلے تو کیا، بعد میں بھی وہ اسے کبھی ایسے نہیں لگے تھے یا شاید اس کا اتنا واسطہ ہی ان سے نہیں پڑا تھا۔

فاصلے بہت سوں کا بھرم رکھ جاتے ہیں اور نزدیکیاں اسی بھرم کو پاش پاش کر دیتی ہیں۔ یا شاید ان کی یہ بہادری عشنا کی بے سائبانی کا نتیجہ تھی۔ کبھی کبھی کسی کی کمزوری کسی کو طاقتور بنا جاتی ہے۔ بہادری کا پہلا اصول کسی کمزور پر اپنی برتری ثابت کرنا ہے اور ان کی یہ برتری ثابت شدہ تھی۔ زیر بار ہونا بھی تو آدمی کو کمزور کر دیتا ہے۔ عشنا بھی ان کے زیر بار تھی، ان کی سرپرستی کی محتاج، اور وہ کیا کرتی؟ کہاں جاتی؟ امینہ آپا کے سوا اس دنیا میں اور تھا ہی کون؟

گھر تو بے شک تھا مگر وہ دیواریں اس کی قتل گاہ تو بن سکتی تھیں مگر پناہ گاہ نہیں۔ بھلا اینٹ اور گارا بھی کسی کی حفاظت کر سکتا ہے؟ فاروق بھائی تو شاید اس سے اتنا عاجز نہ تھے، مگر وہ خود گلے تک اس ماحول سے بیزار ہو چکی تھی، کہیں بھاگ جانا چاہتی تھی۔ کہیں اور جہاں کم از کم یہ بناوٹی مجبوریاں نہ ہوں۔ مگر یہ فرار ممکن کب تھا؟ زندگی کس قدر دشوار ہو گئی تھی۔ اُس نے تکیے پر سر پٹخا۔

وقت نے اسے جیسے عرش سے فرش پر لا پھینکا تھا۔ زندگی نے محبت کی، کرم کی، مہربانی کی ہر نظر اس سے پھیر لی تھی۔ جیسے کسی اناڑی دیہاتی کو شہر کی مصروف ترین سڑک کے بیچوں بیچ لا کھڑا کر دیا گیا ہو۔ عقل تو مختل ہو ہی چکی تھی، نجات کا، فرار کا کوئی

رستہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

❖❖○❖❖

''اماں! میرا دل چاہتا ہے، میں آپ کو کیا کہوں؟ ممی نہیں، ماما ٹھیک ہے۔ کیوں ماما! ٹھیک ہے نا؟'' وہ اماں کی بانہوں میں جھول کر ہنستے ہوئے ان سے لپٹ جاتی۔

''اب تم چاہے ماما کہو، چاہے اماں کہو، کیا فرق پڑتا ہے؟ اب ماں بن جو گئے۔ لفظوں کے ہیر پھیر سے رشتہ تو نہیں بدل جائے گا۔'' اماں پیار سے اس کا ماتھا چوم کر کہتیں۔ اس کے بچکانہ سوالوں سے وہ کبھی بیزار نہیں ہوتی تھیں۔ ہاں اُس کے بے ڈھنگے طریقے سے کام کرنے پر چڑ جاتیں۔

''دھیان سے چھیلو گاجریں۔ اتنا موٹا موٹا نہیں چھیلتے۔ سارے وٹامن ضائع ہو جاتے ہیں۔'' گاجریں چھیلتے ہوئے اماں اسے ٹوکتیں۔

''ہائے اماں! آپ کو بھی پتہ ہے وٹامن کا؟'' وہ چھری ہاتھ سے رکھ کر زور سے کھلکھلاتے ہوئے پوچھتی۔

''کیوں، میں جاہل ہوں کیا؟'' اماں خفگی سے کہتیں۔

''نہیں، میری اماں کو کوئی جاہل کہہ سکتا ہے بھلا؟ کیمبرج کے روشن دماغ، مختلف نکات پر اماں سے رائے مانگنے آتے ہیں۔ مثلاً سر میں خشکی ہو جائے سرسوں کا تیل، بدن پر خشکی ہو جائے سرسوں کا تیل، کان میں درد ہو، سر میں یا ناک میں سرسوں کے تیل سے بڑھ کر کوئی آزمودہ نسخہ نہیں ملے گا۔ ہر مرض کا علاج سرسوں کا تیل۔ اماں! سچ بتائیں کیا سرسوں کے تیل پر آپ نے ریسرچ کی تھی؟'' وہ کام چھوڑ چھاڑ جھٹ ان سے آ کر لپٹ کر بیٹھ جاتی۔

''نہ مجھے کیا ضرورت ہے اس موئی کی؟'' اب ریسرچ ان سے کہا نہ گیا۔ ''اللہ نے ہر چیز بنائی تو ان کے استعمال کرنے کے لئے عقل بھی دی ہے کہ نہیں؟ میں نے یہ باتیں اپنے پاس سے تھوڑا گھڑی ہیں؟ برس ہا برس کے تجربوں کا نچوڑ ہے یہ۔''

''سرسوں کا تیل۔'' وہ ان کی بات کاٹ کر کہتی، انہیں غصہ آ جاتا۔

''عشنا! تُو مجھے پاگل نہ بنایا کر۔ چل ہٹ پرے۔ دیر ہو رہی ہے، تجھ سے تو کوئی کام ہوتا نہیں۔ ابھی تمہارے ابا آنے والے ہیں اور تم نے مجھے سبزی میں ہی اُلجھا دیا ہے۔'' وہ اسے ہاتھ سے پرے جھٹکتیں۔

''آپ بھلے بابا کو صبح کا کھانا رات کو دے دیں۔ وہ اُف نہیں کریں گے۔ چپ

چاپ سلائس پر مکھن لگا کر کھا لیں گے۔'' وہ چھری رکھ کر اسے گھورنے لگتیں۔

''سچ اماں! ایسے سیدھے ہیں میرے بابا!'' وہ بدستور ان سے لپٹی رہتی۔

''تیرے بابا ہیں نا، اس لئے تجھے ایسے لگتے ہیں۔''

''ہاں تو وہ ہیں ہی اتنے اچھے، اتنی محبت کرنے والے۔ ایک وہ عفرا کے ابا ہیں۔ توبہ، اگر کبھی بھول کر اس کے گھر فون کرو تو وہی اُٹھائیں گے، اس قدر جرح کریں گے کہ بندہ بھول جائے گا کہ اس نے فون کیوں کیا تھا۔'' اس نے پھر سے چھری اٹھا کر گاجریں چھیلنی شروع کر دیں۔

اماں تو اس کی ماں ہی نہیں سہیلی، رازدار، دوست، بہن، بھائی سب ہی کچھ تھیں۔ گھر میں وہ دونوں ہوتیں تو انہیں کسی تیسرے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ بس وہ اور اماں۔ وہ بول بول کر ان کے کان کھا جاتی۔ وہ جس جس کمرے میں جاتیں، وہ سائے کی طرح ان کے ساتھ ساتھ رہتی۔ باتیں، مشورے، لطیفے، چٹکلے سبھی کچھ ان کے ساتھ شیئر کرتی۔ پھر اس کی دونوں دوست تھیں۔ عفرہ اور تنزہ۔

اسکول سے لے کر کالج تک یہ تکون ایسے ہی چلی آ رہی تھی۔ کالج میں ان کے گروپ کا سمبل تھا ہنسی۔ وہ تینوں اس قدر ہنستی تھیں کہ راستے سے گزرتی لڑکیاں ٹھٹک کر انہیں دیکھنے لگ جاتیں۔ ایک دو تو بازو پکڑ کر پوچھ بھی بیٹھتیں کہ کیا ہوا ہے؟ اور جب بات کا پتہ چلتا تو منہ میں پاگل کہہ کر چل پڑتیں۔ پتہ نہیں، سبھی لڑکیاں اس عمر میں اتنا ہنستی ہیں یا وہی اتنا ہنستی تھیں۔ اُس نے کروٹ بدلتے ہوئے سوچا۔

پھر ان کے مذاق کا سب سے بڑا نشانہ پرنسپل کا پیون بشیر تھا۔ میڈم سویرے سویرے دفتر آ جاتی تھیں۔ پتہ نہیں انہیں گھر میں کیا پریشانی تھی۔ پھر بشیر ان کے لئے چائے لینے ان کے گھر جاتا جو کالج کے بالکل نزدیک تھا۔ ٹرے لا کر باہر برآمدے میں میز پر رکھ کر میڈم کی اجازت لینے اندر جاتا۔ یہ تینوں ستون کی آڑ سے نکل کر دودھ میں ڈھیر سارا نمک ملا دیتیں۔ پھر ہاتھ پشت پر باندھ کر آفس کے باہر لگے نوٹس بورڈ کو یوں غور سے پڑھنے لگتیں جیسے پہلی بار دیکھا ہو۔ وہ چائے لے کر اندر جاتا، پھر باہر آ کر اسٹول جھاڑ کر مؤدب بیٹھ جاتا۔ اسی وقت گھنٹی بجتی۔ بے چارہ اندر جاتا اور جب باہر آتا تو اس کی شکل ایسی ہوتی کہ ابھی رو دے گا۔ وہ ایک دوسرے کو بھاگنے کا اشارہ کرتیں۔ لیکن تنزہ بڑی ڈھیٹ تھی، اُس کے پاس جا کر کہتی۔

''کیا ہوا بشیر چاچا؟ ایسے کیوں بیٹھے ہو؟'' وہ ابرو اچکا کر اسے گھور کر دیکھتا تو جلدی

سے کہتی۔ ''وہ، ہمیں میڈم سے ملنا تھا۔''

''میڈم مصروف ہیں ابھی۔ پھر کسی وقت آنا۔ چلو بھاگو یہاں سے۔'' وہ جھلا کر غصے سے کہتا۔

''لگتا ہے انہوں نے تمہیں کان پکڑوائے ہیں۔'' وہ ڈھٹائی سے کھڑی رہتی۔

''جاتی ہو تم لوگ یہاں سے کہ میں میڈم سے تمہاری شکایت کروں؟'' وہ غصے سے بولتا تو وہ ہنستی ہوئی واپس آ جاتیں۔ پتہ نہیں بشیر کا حافظہ کمزور تھا یا نظر۔ وہ میڈم سے ان کی شکایت کرنا بھول جاتا۔

کسی دن بشیر کی سائیکل کی ہوا نکال دیتیں، ٹائر پنکچر کر دیتیں۔ تنزہ کو بڑی اچھی سائیکلنگ آتی تھی۔ وہ ان دونوں کو آگے پیچھے بٹھا کر پورے گراؤنڈ کا چکر لگواتی۔ وہ چیخیں مارتا ان کے پیچھے بھاگتا تو وہ زور زور سے کہتیں۔ ''بشیرا اِن ٹربل۔'' دو ایک بار میڈم کے سامنے پیشی ہوئی مگر وہ اتنی معصوم شکل بنا کر مکر جاتیں کہ ڈانٹ بے چارے بشیر کو ہی پڑتی۔ عشنا کو اس پر بڑا ترس آتا مگر تنزہ اُس کی ایک نہ سنتی۔

پھر عفرا بے حد کنجوس تھی۔ تنزہ اور عشنا کو دل کھول کر جیب خرچ ملتا تھا، عفرا ان دونوں کی کمائی پر عیش کرتی۔ وہ دونوں اُسے پیرا سائٹ کہتیں مگر اُس پر اثر نہیں ہوتا تھا۔ پھر ایک دن تنزہ کے ہاتھ اس کی فائل لگ گئی، جس میں تین سو روپے تھے۔ انہوں نے اس روز کینٹین کا کوئی آئٹم نہ چھوڑا۔ عفرا کو بھی ٹھنسا ٹھنسا کر کھلایا۔

پھر جب آخری پیریڈ میں اس نے اپنی فائل کی پاکٹ میں سے پیسے نکالنے چاہے تو ان دونوں کی ہنسی اور فراخ دلی اس کی سمجھ میں آ گئی۔ پھر جو وہ ان کے پیچھے بھاگی۔ پورے کالج کے انہوں نے شاید دو چکر لگائے۔ ان کے سانس پھول گئے اور ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔

''کمبخت نے جو کچھ کھلایا تھا، گھر جانے سے پہلے ہضم کروا دیا۔'' تنزہ نے پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان کہا۔

اور اب تو جیسے سارا کچھ ہی ختم ہو گیا تھا۔ بس یادیں تھیں یا مار دینے والی تنہائی۔ کبھی کبھی اس کا جی چاہتا، بہبودِ آبادی کے محکمے کو آگ لگا دے۔ کہاں ہے آبادی جس کی افزائش نے اس محکمے کی نیندیں اُڑا رکھی ہیں۔ کہاں ہیں انسان؟ اُسے تو ایک بھی ہم نوا اور ہمراز میسر نہیں ہے۔ کروڑوں کی آبادی اور اتنی تنہائی۔ کیا تضاد تھا۔ اُس کی آنکھیں آنسو بہانے لگیں۔

''اماں، بابا کیوں چلے گئے مجھے چھوڑ کر؟ کیا کروں میں؟'' یادیں قطرہ قطرہ اُس کے دل کا آنگن بھگونے لگیں۔

''خالہ آنٹی! خالہ آنٹی! مما کہہ رہی ہیں، آ کر کھانا کھا لیں۔'' تیمور نے دروازے سے جھانک کر اسے آواز دی تو وہ سانس روک کر سوتی بن گئی۔

''سو رہی ہیں۔'' اس نے خود سے کہا اور چلا گیا۔

پھر وہ کتنی دیر روتی رہی۔

''عشنا! اُٹھیں نہیں ابھی تک۔'' امینہ آپا کی پیار بھری آواز اسے قریب سے سنائی دی۔ ''مجھے پتہ ہے، تم سو نہیں رہی تھیں۔ اتنے ہنگامے میں بھلا کس کو نیند آ سکتی ہے؟ اُٹھو میری جان! تم نے صبح بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ اب بھی تین بجنے کو ہیں، اُٹھ کر کچھ کھا لو۔'' انہوں نے پیار سے اس کے بال سنوارتے ہوئے اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی۔

''آپا! مجھے ابھی بھوک نہیں ہے۔'' اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

''یوں رونے سے کیا ہو گا؟ فاروق کی تو یہ عادت ہے۔ تمہیں اب تک سمجھ جانا چاہئے تھا۔ دل کے برے نہیں ہیں۔ بس غصہ ذرا زیادہ آتا ہے۔'' وہ شوہر کی صفائی پیش کر رہی تھیں اور دل کا برا کون ہوتا ہے؟ یہ تو زبان اور روّیے ہی ہیں جو انسان کے دل کے اچھے برے ہونے کا پتہ دیتے ہیں۔ ورنہ اسے ان کے دل سے کیا لینا دینا تھا۔

''اُٹھو میری گڑیا! اُٹھ کر کچھ کھا لو۔ اتنا لمبا فاقہ نہیں کرتے۔'' انہوں نے پھر اسے پیار سے چمکارا تو وہ ہاتھوں سے بال درست کرتے ہوئے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اتنے مخدوش حالات میں اتنا پیار بھی غنیمت تھا۔

''میں منہ ہاتھ دھو کر آتی ہوں، آپ جائیں۔'' اس نے بستر سے اُترتے ہوئے کہا۔

وہ نیم خاموش کالز اسی تواتر سے آ رہی تھیں بلکہ ایک دن تو معاملہ گھر تک آن پہنچا۔ وہ فاروق بھائی کے ساتھ ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھ رہی تھی۔ اس معاملے میں فاروق بھائی فوراً اس سے دوستی گانٹھ لیتے تھے۔ امینہ آپا کو میچ سے دلچسپی نہیں تھی اور فاروق بھائی کمپنی کے بغیر میچ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس لئے جب بھی میچ ہوتا، وہ بطورِ خاص عشنا کو کمرے سے بلوا بھیجتے۔ میچ دیکھتے ہوئے وہ ساتھ ساتھ تبصرہ بھی کرتے جاتے تھے اور عشنا سر ہلا کر ان کے اندازوں اور پیشین گوئیوں کی تصدیق کر رہی تھی، جب آپا نے آ کر کہا۔

''عشنا! تمہارا فون ہے۔''

اُس نے ریسیور اُٹھا کر ہیلو کہا تو ونس مور سن کر وہ دھک سے رہ گئی۔ تو نوبت یہاں

تک آ پہنچی، وہ جس بات سے ڈر رہی تھی۔ کتنے خاموش پل گزر گئے۔ اسے کوئی جواب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ فون رکھ دینے کی صورت میں اسے دوبارہ رِنگ کرنے سے کون روک سکتا تھا؟

''عشنا! بھئی جلدی آؤ۔ کیا زبردست اسٹروک ہے۔'' فاروق بھائی کی آواز اُسے حقیقت کی طرف کھینچ لائی۔

''پلیز، میری آپ سے ریکویسٹ ہے، اگر یہ مذاق ہے تو اسے آفس تک ہی رکھئے۔'' اس کی آواز مدھم تو تھی ہی، اسے کانپتی ہوئی بھی محسوس ہوئی۔

''میں آپ کو اس ہستی کا واسطہ دیتی ہوں جو آپ کو سب سے زیادہ عزیز ہے، پلیز دوبارہ یہاں فون مت کیجئے گا۔'' وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ کسی کے سامنے اس طرح بھی گڑگڑا سکتی ہے۔ اس نے فون رکھتے ہوئے سوچا۔

پھر میچ میں اس کی دلچسپی صفر ہو گئی۔ اس کا پورا وجود سماعت بنا ہوا تھا، آنکھیں اسکرین پر تھیں اور دھیان پیچھے پڑے فون کی طرف۔

رات بھر پریشانی کی وجہ سے اسے ٹھیک سے نیند بھی نہ آئی۔

دوپہر بارہ بجے کے قریب آفس میں پھر اس کا فون آیا۔ اس نے بڑے تحمل سے اس کا ونس مور سنا تھا اور پھر شکریہ کہہ کر فون رکھ دیا تھا۔

تنزہ نے ایک دو بار پوچھا تھا، وہ صاف مکر گئی کہ اب ایسی کوئی کال نہیں آتی۔ کیا فائدہ تماشا بننے کا۔ اور لوگوں کو تو ایک موضوع ملنا چاہئے، ہاٹ کیک وہ خود ہی بنا لیتے ہیں۔ زیبی کی مثال اُس کے سامنے تھی۔ اُس کے فون اسی تواتر سے آتے۔ بیچ میں ایک آدھ دن کا ناغہ بھی ہوا، مگر سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کالیں بے ضرر ہیں اس لئے خاموشی سے سن لیتی۔ شروع میں وہ سمجھی کہ شاید اس بندے کو اس سے وہ مشہورِ زمانہ محبت ہو گئی ہے مگر جب اتنے مہینے گزرنے کے بعد بھی اس نے اپنا مدعا بیان کیا نہ اس کی ضرورت سمجھی تو اس نے بھی دھیان دینا چھوڑ دیا۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

اور پھر اتنی ڈھکی چھپی محبت تو آج کل لڑکیاں نہیں کرتیں کہ وہ مرد ہو کر ایسی بزدلانہ اور پردہ دارانہ محبت کا اس نے کیا کرنا تھا۔ جس قسم کے حالات سے وہ دوچار تھی، اسے تو کسی جی دار کی ضرورت تھی جو ان کڑے حالات میں اس کے ساتھ قدم جما کر کھڑا ہو سکے اور اس کی بے اعتبار سوچوں کو احساسِ معتبری دلا سکے۔

❖❖○❖❖

اس روز وہ نائٹ ختم ہونے کے بعد گھر جانے کے لئے کھڑی ہوئی جب تنزہ صبح کا اخبار لے کر اندر داخل ہوئی۔

''عشنا! تمہارا رزلٹ آ گیا ہے۔'' بیگ پکڑتی عشنا کا سانس جیسے وہیں تھم گیا۔ تنزہ نے پیپر اس کے آگے ٹیبل پر پھیلاتے ہوئے کہا۔

''کیا رول نمبر ہے تمہارا؟'' اس نے رول نمبر والے کالم پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

''میں خود ہی دیکھتی ہوں۔'' عشنا نے آگے جھکتے ہوئے کہا۔

''اوہ تھینک گاڈ!..... تنزہ! میں پاس ہو گئی۔'' خوشی سے اُس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔

''رئیلی..... مبارک ہو بہت بہت۔'' تنزہ نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

''کیا بات ہے بھئی، آج عید تو نہیں جو تم لوگ یوں گلے مل رہے ہو۔'' زیبی نے انہیں گلے ملتے دیکھ کر کہا۔

''وہ عشنا کا ایم۔اے کا رزلٹ آ گیا ہے۔ پاس ہو گئی ہے نا، اس لئے۔''

تنزہ نے عادت کے برخلاف زیبی کو نارمل لہجے میں جواب دیا۔ ورنہ وہ زیبی سے بات کرنا بھی برا سمجھتی تھی۔

''اچھا، یہ تو بڑی خوشی کی خبر ہے۔ مبارک ہو عشنا!'' اس نے خوش دلی سے کہا۔

''تھینک یو۔'' عشنا نے مسکرا کر کہا۔

''اس بات پر تو اچھی خاصی ٹریٹ ہونی چاہئے۔'' وہ پاس آ کر بولی۔

''کیوں نہیں، بالکل۔'' عشنا نے سر ہلا کر کہا۔ ایک مدت بعد تو کوئی خوشی ملی تھی۔

''ٹریٹ ہم آواری میں لیں گے۔'' تنزہ کے چہرے کے زاویے بدل رہے تھے۔

''جہاں تم لوگ کہو۔'' اس نے بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور جانے کی تیاری پکڑی۔

''اس اضافی ڈگری سے تمہارے انکریمنٹ میں بھی اضافہ ہو جائے گا'' زیبی کا تو ڈے تھا، اس لئے بے فکر تھی، گفتگو کو شاید طول دینا چاہ رہی تھی۔

''نہیں، میں یہ جاب چھوڑ دوں گی۔'' عشنا نے رک کر کہا۔

''جاب چھوڑ دو گی؟'' زیبی نے حیرت سے کہا۔ تنزہ بھی رک کر اس کی شکل دیکھنے لگی۔

''کیوں بھئی، جاب کیوں چھوڑ دو گی؟''

''تمہیں تو پتہ ہے تنزہ! میں لیکچرار بننا چاہتی تھی۔ یہ تو بس ایسے ہی۔ اب میں لیکچرر شپ کے لئے ضرور اپلائی کروں گی۔'' اس نے سنجیدگی سے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''اتنی اچھی جاب تم بلاوجہ چھوڑ دو گی۔ ایسی نوکری کے لئے تو لوگ ترستے ہیں۔'' زیبی کے لہجے میں افسوس تھا۔

''اپنی اپنی سوچ ہے۔ مجھے یہ جاب پسند نہیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جیسی تمہاری مرضی۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے اپنی سیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

''کیا واقعی عشنا! تم یہ جاب چھوڑ دو گی؟'' تنزہ نے کمرے سے نکلتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں بھئی، تمہیں تو پتہ ہے اس نوکری نے میرے لئے کتنی مشکلات کھڑی کر دی ہیں۔''

''تو کیا لیکچرر شپ میں مشکلات نہیں ہوں گی؟''

''ہوں بھی تو کیا؟ یہ روز روز کی چخ چخ سے تو جان چھوٹ جائے گی۔'' فاروق بھائی کا غصہ، آپا کی پریشانی اور ممانی جان کے طعنے۔ کم از کم یہ تو نہیں ہوں گے نا۔''

''اچھا، تمہارے خیال میں یہ جاب چھوڑ دینے سے ان کی نگاہوں میں تم بہت معتبر ہو جاؤ گی۔ کیا پڑھانے کے لئے گھر سے نہیں نکلنا پڑے گا؟ یہاں تو آنے جانے کا بھی کوئی مسئلہ نہیں۔'' اس نے اسے قائل کرنا چاہا۔

''تم جو بھی کہو، میں بہرحال یہ جاب چھوڑ دوں گی۔ ویسے بھی تم یہاں دو چار ماہ ہو، اس کے بعد میں مزید اکیلی ہو جاؤں گی۔ بہتر نہیں کہ پہل میں کر دوں۔''

''سکندر اگر مجھے شادی کے بعد بھی جاب کی اجازت دے گا تو میں ضرور کروں گی۔'' اس نے اسے آس دلانا چاہی۔

''ایسا ممکن نہیں۔ سکندر بھائی تمہاری اسی ضد کو بڑی مشکل سے ہضم کر رہے ہیں، اس لئے چھوڑو اس ٹاپک کو۔ کل کس نے دیکھی ہے؟ چلو، اب دیر ہو رہی ہے۔'' اس نے موضوع کو سمیٹتے ہوئے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔

وہ ابھی سیکنڈ ایئر میں تھی، جب اماں کے سر میں شدید درد رہنے لگا۔ دن میں تو یہ درد قابل برداشت ہوتا، مگر رات کو اس کی شدت میں اضافہ ہو جاتا۔ وہ ساری ساری رات سر پکڑ کر کراہتی رہتیں۔ ماں کو تکلیف میں دیکھ کر اسے ایک پل چین نہ آتا۔ گھر

کے قریبی ڈاکٹر کے علاج سے جب افاقہ نہ ہوا تو اسپیشلسٹ کو دکھایا۔ پھر دوسرے کو، پھر تیسرے کو۔ مگر کسی کو ان کی بیماری سمجھ آ نہیں رہی تھی۔ ان کا بی پی بھی نارمل تھا اور درد تھا کہ دن بہ دن بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ پتہ نہیں کیسی بیماری تھی جسے ایکسرے، الٹراساؤنڈ اور سٹی اسکین کوئی بھی ٹیسٹ ڈی ٹیکٹ (دریافت) نہیں کر پا رہا تھا۔ میڈیکل سائنس انسانی وجود کے اسرار و رموز کے سامنے آج بھی طفلِ مکتب کی طرح ہے اور بظاہر کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ ان کی زندگی اسی روٹین سے گزر رہی تھی اور ڈاکٹرز کا یہ کہنا کہ انہیں کوئی ذہنی پریشانی ہے، ناقابل یقین سی بات تھی۔ بابا اتنے چاہنے والے، بہت زیادہ نہیں تو پھر بھی ان کا شمار، خوش حال گھرانوں میں ہوتا تھا۔ ہاں ایک بیٹے کی کمی ضرور تھی مگر اس کمی کا بھی اماں نے کبھی اتنی شد و مد سے ذکر نہ کیا تھا کہ روگ لگا بیٹھتیں۔ انہیں تو عشنا کے وجود میں ہی دو جہاں کی خوشیاں ملی ہوئی تھیں، پھر یہ اچانک اتنی بڑی تکلیف؟ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

پھر بابا نے اپنے ایک دوست کے توسط سے امریکہ کے ڈاکٹرز کو رپورٹس بھجوائیں، پھر انہیں ڈاکٹرز کے مشورے پر اماں کو باہر لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ اس کا دل سہم گیا تھا۔ پتہ نہیں، کیا ہونے والا تھا۔ اس نے تو پہلی بار زندگی کا اتنا تکلیف دہ پہلو دیکھا تھا۔ اسے پڑھائی، دوستیاں سب بھول بھال گیا۔ یاد تھا تو بس اماں کا سر درد، ان کی مبہم سی خاموشی اور درد میں ڈوبی ہوئی اُداس سی مسکراہٹ۔ وہ عشنا کو تسلی دینا چاہتی تھیں مگر شاید انہیں آنے والے وقت کا علم پہلے سے ہو گیا تھا کہ اسے جھوٹا دلاسا بھی نہ دے پاتیں۔ ان دنوں اس کی اپنی کیفیت سمجھ سے بالاتر تھی۔ دھوپ پھیلتی تو اس کی پیلاہٹ میں اُسے اُداسی گھلی ہوئی محسوس ہوتی۔ شام ہوتی تو اسے لگتا جیسے کوئی آسیب ہر طرف پھیل رہا ہے، خاموشی کا، سناٹے کا۔ اُس کا دل ڈوبنے لگتا۔ بارش ہوتی تو اسے لگتا کہ مظاہرِ فطرت برستی ہوئی بوندیں، روتے ہوئے بادل، گیلی دیواریں اس سے کہنا چاہ رہے ہیں۔ جو کہنا چاہ رہے تھے، وہ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یا شاید وہ جان کر انجان بننا چاہتی تھی۔

گھر کے پچھلے صحن میں لگا پیپل کا درخت بڑا پرانا تھا۔ ذرا سی ہوا چلتی تو اسے لگتا تھا، جیسے پتے تالیاں بجا رہے ہوں۔ اسے بہت مزہ آتا، وہ اماں سے کہتی۔

''اماں! دیکھیں لگتا ہے جیسے ڈھیر سارے بچے مل کر تالیاں بجا رہے ہوں۔'' پتوں کا کھلکھلاتا شور اس کے اندر ڈھیر ساری خوشی بھر دیتا۔ مگر ان دنوں اسے لگتا جیسے پتے

رو رہے ہیں۔ ذرا سی ہوا چلتی تو وہ دھیمی دھیمی سسکیاں لینے لگتے۔ وہ غور غور سے پتوں کو دیکھتی۔

سارے کا سارا پیپل ہی جیسے گہری سوچ میں ڈوبا نظر آتا تھا۔ وہ سر جھٹک دیتی کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ محض اُس کی قوتِ متخیلہ ہے جو یہ فسانہ گھڑ رہی ہے۔ ورنہ پتے تو بالکل ساکن ہیں۔ بالکل نہیں روتے۔ مگر کوشش کے باوجود وہ اس وہم سے پیچھا نہ چھڑا سکی۔ اور اس روز اس کا وہم مجسم ہو کر سامنے آ گیا، جب اماں فجر کی نماز پڑھ کر جو بستر پر لیٹیں تو پھر اُٹھ ہی نہ سکیں۔ نہ بابا کے گھر والی! کہنے سے، نہ اماں، مما اور ماما کہنے سے۔ وہ ان سب آوازوں سے منہ موڑ گئی تھیں اور موت ان کی کوششوں پر ہنستی ہوئی انہیں لے اُڑی۔ اُس کی چیخوں سے گھر ہل گیا۔ مگر اماں کے وجود میں حرکت پیدا نہ ہوئی۔

اماں کیا گئیں، اسے لگتا، اس کا زندگی سے ہر رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ لگن، جستجو، شوق، ولولے سب بے معنی ہو گئے۔ بے فائدہ و بے کار۔ ان کے قدموں کی آہٹ، کپڑوں کی سرسراہٹ، کچن میں کام کے دوران عشنا کو پکارنا، اسے زندگی کی حقیقتوں سے زیادہ دلفریب دکھائی دینے لگا۔ اماں کی الماری کے سب سے اوپر والے خانے میں اسے چھوٹے بچے کے بہت سے سلے ہوئے کپڑے ملے تو وہ سوچ میں پڑ گئی، کیا اماں کو واقعی بیٹے کی اتنی شدید آرزو تھی؟ کیا وجہ تھی، ان کے یوں بے وقت چلے جانے کی۔ اتنے سوال، اتنے اُلجھاؤ اس کے ذہن میں تھے اور جواب جیسے سارے کہیں گم ہو گئے تھے۔

اُسے ہر چیز فنا نظر آتی۔ موت سب کچھ فنا کر دینے والی، محبتیں، قربتیں، رشتے، دوستیاں سب موت کے سامنے خس و خاشاک کی طرح ہیں۔ زیور، کپڑے، اسبابِ زندگی، عالیشان گھر اور ان سب کی خواہش، موت کے سامنے کس قدر بے حقیقت ہیں۔

اس کا سال ضائع ہو رہا تھا۔ بابا کے اصرار کے باوجود وہ خود کو کالج جانے کے لئے تیار نہ کر سکی۔ تنزہ اور عفرا کبھی کبھار آ جاتیں اُس کا دل بہلانے، اُسے پڑھائی کی طرف آمادہ کرنے۔ مگر اس کے ذہن پر جیسے جمود سا طاری ہو گیا تھا۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے بابا جا کر چچی، چچا اور عثمان بھائی کو گھر لے آئے۔ ویسے بھی چچا جان گھر بنوا رہے تھے۔ بابا نے کہا کہ جب تک گھر نہیں تیار ہوتا، تم لوگ ادھر آ جاؤ۔ یہ اتنا بڑا گھر بھی تو خالی پڑا ہے۔ امینہ آپا بھی اکثر فاروق بھائی کے ساتھ آ جاتیں۔

ان لوگوں کے آ جانے سے اس کا ذہن واقعی کسی حد تک تبدیل ہو گیا۔ وہ زندگی کی

طرف واپس لوٹنے لگی۔ عثمان بھائی اسے باتوں میں لگائے رکھتے اور باتوں باتوں میں انہوں نے اس کے ہاتھ میں کتابیں پکڑا دیں۔ چچی بھی اس کا بہت خیال رکھتیں۔ عثمان بھائی ان دنوں فائنل ایئر کا امتحان دے کر فارغ تھے، اس کو پڑھانے کی صورت میں مصروفیت ان کے ہاتھ آ گئی۔ اور پھر یوں بھی اگر یہ سب نہ ہوتا تو بھی گزرتا ہوا وقت تو بڑے سے بڑے زخم کو مندمل کر دیتا ہے۔

اُس کی بے قراری کو بھی کچھ سکون آ گیا۔ اس نے دل لگا کر پڑھنا شروع کر دیا اور وقت پر ایگزام دے بھی دیا۔ اس کے رزلٹ سے پہلے عثمان بھائی کا رزلٹ آ گیا۔ انہوں نے اپنے ڈیپارٹمنٹ میں ٹاپ کرتے ہوئے فزکس میں گولڈ میڈل لیا تھا۔ ایک مدت کے بعد جیسے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ امینہ آپا، بھائی کی اتنی بڑی کامیابی کا سن کر دوڑی آئیں۔ دوست احباب سب مبارکباد دینے آئے۔ شام تک اچھی خاصی پارٹی کا اہتمام ہو گیا۔ بابا نے عثمان بھائی کو گاڑی لے کر دینے کا وعدہ کیا۔

''ابھی تم فی الحال میرے اس، بقول تمہارے، چھکڑے پر ڈرائیونگ سیکھو، پھر اِنشاء اللہ تمہیں زیرو میٹر لے کر دوں گا۔'' انہوں نے بھتیجے کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ سب نے اتنے شارٹ نوٹس پر مقدور بھر گفٹ دیئے۔

''اور گڑیا! تم مجھے کچھ نہیں دو گی؟'' انہوں نے چچی کے پاس مطمئن بیٹھی عشنا سے کہا۔

''میں نے جناب! آپ کو سب سے قیمتی تحفہ دیا ہے۔'' اس نے جواباً کہا۔

''کون سا؟'' وہ حیرانی سے بولے۔

''میں نے آپ کو پورے خلوصِ دل سے مسکراتے ہوئے مبارکباد دی ہے اور ایک پُرخلوص مسکراہٹ ہزاروں قیمتی تحائف پر بھاری ہے۔ ہے نا چچا جان؟'' اس نے مسکراتے ہوئے چچا جان کی طرف دیکھا۔

''بالکل، بالکل!'' انہوں نے کہا۔ سب نے اس کی تائید کی۔

''بہت چالاک ہو تم۔'' عثمان بھائی بھی ہنس پڑے۔

مگر یہ خوشی تو جیسے اندھیری رات میں جگنو کی طرح تھی، اس کے بعد تو.....

''تم سوئیں نہیں ابھی تک؟'' امینہ آپا نے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے آگے ہارڈی کا ناول کھولے پتہ نہیں کب یادوں کی پٹاری کھول کر بیٹھ گئی تھی، امینہ آپا کی آواز سن کر چونک اُٹھی۔

''نہیں، بس سونے لگی ہوں۔'' اس نے کتاب بند کر دی۔

''اتنی دیر مت جاگا کرو۔ صبح جلدی اُٹھنا ہوتا ہے۔ پہلے ہی اتنی کمزور ہو گئی ہو۔'' وہ اس کے پاس ہی بیڈ پر آ بیٹھیں۔

''بچے سو گئے کیا؟'' اسے موضوعِ گفتگو بننے سے اب بڑی اُلجھن ہوتی تھی۔

''ہاں، سب سو گئے۔ میں تو باہر کی لائٹس چیک کرنے کے لئے نکلی تو تمہاری لائٹ جلتے دیکھ کر ادھر آ گئی۔ ٹائم بھی تو کافی ہو گیا ہے۔'' انہوں نے کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی بس میں سونے جا رہی تھی۔'' اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ورنہ اس نیند کو لانے کے لئے تو اسے کتنی جدوجہد کرنا پڑتی تھی۔

''اور آفس میں سب ٹھیک جا رہا ہے؟'' کچھ خیال آنے پر انہوں نے پوچھا تو اسے یکدم ''ونس مور'' کا خیال آ گیا۔

''جی، سب ٹھیک ہے۔''

''ہاں، یاد آیا۔ آج ایاز کا خط آیا تھا۔ وہ اگلے ہفتے آ رہا ہے۔ دن اور تاریخ کہہ رہا تھا، فون پر بتاؤں گا۔'' انہوں نے اسے حالاتِ حاضرہ سے باخبر کرنا چاہا۔

وہ چپ رہی۔

''ممانی نے پوچھا تھا اس سے، کہہ تو رہا تھا کہ وہاں شادی نہیں کی۔ آگے کی اللہ جانے۔ دیکھو، آئے گا تو پتہ چلے گا۔ اتنے سال تو ہو گئے ہیں گئے ہوئے۔'' پتہ نہیں وہ کیا کہنا چاہ رہی تھیں۔ اسے چپ بیٹھے دیکھ کر پھر بولیں۔

''تم دیکھ لینا، ویسے ممانی کا خیال تو ہے سہی مگر میرے لئے تو تمہاری مرضی زیادہ اہم ہے۔'' انہوں نے اُسے اِن ڈائریکٹ طریقے سے سمجھانا چاہا۔

''آپا! آپ کو پتہ تو ہے سب۔ اور پھر ممانی جان؟'' وہ کچھ دیر بعد بولی۔

''یہی تو ساری بات ہے۔ ممانی کی سُوئی یہاں آ کر اٹک جاتی ہے، ورنہ تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔ خیر دیکھیں گے۔ کیا پتہ وقت اس میں کیسی تبدیلیاں لایا ہو۔ اب تم سو جاؤ۔'' وہ کھڑی ہو گئیں۔

''عثمان بھائی کا کوئی خط نہیں آیا؟''

''نہیں وہی، جو چار ماہ پہلے آیا تھا۔ اُس کی غفلت نے تو یہ دن دکھائے ہیں۔ ورنہ کاہے کو تم یوں خود کو بے آسرا محسوس کرتیں۔'' وہ تلخی سے بولیں۔

''ان کا قصور نہیں ہے، آپ کو پتہ تو ہے۔''

''معلوم ہے مجھے۔ مگر کسی اور کا بھی تو قصور ہو؟ اس طرح اگر ہر کوئی زندگی کی تلخ سچائیوں سے بھاگنے لگے تو یہ دنیا کب کی خالی ہو چکی ہوتی۔'' ان کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ یہ موضوع تو ہمیشہ انہیں رنجیدہ کر دیتا تھا، وہ چھیڑ کر دل میں پچھتائی۔

''اچھا، اب تم سو جاؤ۔ اللہ مالک ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' پتہ نہیں وہ کس کو تسلی دیتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

اس کی آنکھوں میں پانی اُتر آیا۔ وہ کتاب سائیڈ پر رکھ کر نیچے اُتر آئی۔ کھڑکی سے باہر تاریک آسمان پر جھلمل کرتے تارے روشن دن کی اُمید دلا رہے تھے۔ مگر ابھی تو رات باقی ہے، بہت لمبی، بہت طویل۔ اس نے گہرا سانس لیا اور لائٹ بند کر دی۔

پھر اس دوسرے واقعے نے جو شاید اس کی زندگی کا ہی نہیں، ان کے خاندان کا بھی سب سے بڑا سانحہ تھا، بہت سوں سے سفر کی لگن ہی چھین لی۔ چچا جان اپنے پلاٹ پر گھر بنا رہے تھے۔ بابا کے اصرار پر وہ تینوں اپنے کرائے کا گھر چھوڑ کر مستقل ان کے ہاں آ گئے تھے۔ عثمان بھائی نوکری کی تلاش میں تھے بلکہ نوکری ان کی تلاش میں تھی۔ انہیں اپنے ڈیپارٹمنٹ میں اعزازی طور پر پڑھانے کی آفر ہو چکی تھی۔ ان کی سوچ سائنٹفک تھی۔ ان کے پاس بہت سے نئے نئے آئیڈیاز تھے۔ ماڈرن فزکس ان کی فیلڈ تھی۔ بہت سے ادارے ان کی خدمات مستعار لینا چاہ رہے تھے۔ وہ ریسرچ میں جانا چاہ رہے تھے۔ پاکستان اٹامک سیل یا پھر ہائر اسٹڈیز کے لئے بیرون ملک۔ دونوں آپشنز ان کے سامنے تھیں اور وہ انہی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ چچا جان نے ہمیشہ ان کی رائے کو فوقیت دی تھی۔ ان میں باپ بیٹے والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ دوستی سے بڑھ کر کوئی اور ہی قلبی تعلق ان کے درمیان تھا۔ عثمان بھائی کے دل میں کوئی بات ہوتی، چچا جان کا ذہن اسے پہلے سے جان لیتا۔

اسے ان دونوں کی اس یک جان دو قالب والی رفاقت پر رشک آتا۔ عشنا کو اماں سے بہت محبت تھی اور جذبہ فطری اور لاشعوری تھا، جیسے ایک بچہ اپنی ماں سے یا باپ سے کرتا ہے۔ جبکہ عثمان بھائی کو چچا جان سے شعوری پیار تھا اور اس کی جڑیں شاید لاشعور سے بھی آگے تک تھیں۔

گھر کی تعمیر کا کام تیزی سے ہو رہا تھا۔ اس روز بابا کے ساتھ وہ دونوں پلاٹ پر ہی گئے ہوئے تھے۔ بابا شام میں جلدی گھر آ گئے۔

''وہ دونوں باپ بیٹا ابھی ٹھہر کر آئیں گے۔ میں نے کہہ دیا تھا، آتے وقت مٹھائی

لیتے آنا۔ بھابی! آپ بھی کھانے میں کوئی اچھی سی ڈش بنا لیجئے گا۔ شاید امینہ اور فاروق بھی آجائیں۔'' انہوں نے کچن کے دروازے میں کھڑے ہو کر چچی جان سے کہا۔

پھر مٹھائی تو آ گئی مگر.....

عثمان بھائی ڈرائیونگ کر رہے تھے اور چچا جان ان کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے تھے۔ چھوٹا سا اوور ہیڈ برج تھا، پانی کے ایک نالے کے اوپر بنا ہوا جہاں سے ان کی گاڑی گزر رہی تھی۔ ان کے سامنے سے اچانک موڑ کاٹ کر ایک لینڈ کروزر شاید پچانوے کی سپیڈ سے گزری تھی۔ پیچھے سے آتی موبائل پولیس کی گاڑی سے اس لینڈ کروزر پر گولیوں کا برسٹ مارا گیا۔ ڈاکوؤں کا تو شاید کچھ نہ بگڑا کیونکہ ان کی اسپیڈ بہت تیز تھی، البتہ ایک اندھی گولی لمحے بھر میں چچا جان کا سینہ چیر گئی۔ اُن کی چیخ اور سینے سے اُبلتے فوارے نے عثمان بھائی کے ہاتھ پاؤں پھلا دیئے۔ انہوں نے گاڑی سرپٹ دوڑائی اور جو پہلا ہاسپٹل راستے میں آیا، گاڑی روک کر چچا جان کو بازوؤں میں اٹھا کر اندر بھاگے۔ ایمرجنسی میں کوئی سینئر ڈاکٹر موجود نہیں تھا۔ ابھی تو شام بمشکل رات سے گلے ملی تھی اور ایمرجنسی میں کوئی ڈاکٹر نہ تھا۔ معاشرے کی بے حسی کے سامنے زندگی جاں بلب تھی۔ چچا جان نے عثمان بھائی کی آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ پھر جب ایمبولینس ان کے گھر کے دروازے کے پاس آ کر رُکی تو اس کے آگے گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر شکست خوردہ عثمان بھائی تھے اور پچھلی سیٹ پر پڑا مٹھائی کا ڈبہ ان کی لمحاتی خوشیوں پر جیسے ہنس رہا تھا۔

عثمان بھائی کو چچا جان سے کتنی محبت تھی، یہ تو کوئی نہیں جان سکتا تھا کیونکہ محبت ناپنے کے پیمانے ابھی ایجاد نہیں ہوئے۔ مگر چچا جان ان کے لئے ایسے تھے، جیسے انسان کی کوئی پرانی عادت جو کہ نشہ بن چکی ہو۔ اور جب نشہ ٹوٹتا ہے تو روشنی ہو یا تاریکی، سب بے معنی دکھائی دیتے ہیں۔

''کیا جرم کیا تھا ہم نے؟ صرف یہ کہ ہم اس ملک کے شہری ہیں یا ہم اس راستے سے کیوں گزرے جہاں موت کے سوداگر دھندا کر رہے تھے؟ یہ کیسے محافظ ہیں ہماری جان و مال کے؟ جان لے کر پلٹ کر دیکھتے بھی نہیں۔ یہ کیسا قانون ہے؟ کہاں پر انصاف بانٹتا ہے؟ زندگی بچانے والے ادارے، قتل گاہیں بن گئے ہیں۔ جو قانون کی اندھی گولی سے بچ جائے، وہ مسیحاؤں کی نالائقی کے ہاتھوں قتل ہو جائے۔''

اُن کی سرخ آنکھوں میں لہو اُتر آتا۔

''میں کس سے اس خونِ رائیگاں کا حساب مانگوں؟ کون ہے میرا مجرم؟ کون ہے یہاں جوابدہ؟ نہ حاکمِ شہر، نہ داروغۂ شہر۔ کسی کو میرے نقصان کا ملال تک نہیں۔ کس کا گریبان پکڑوں جا کر؟'' وہ بابا کی تسلی کے جواب میں چیخنے لگتے۔ ''ان ہاتھوں میں دم دیا انہوں نے میرے سامنے، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر، تڑپ تڑپ کر جان دے دی انہوں نے۔ کیا اتنا سستا ہے انسان؟ میں بے بسی سے تماشا دیکھتا رہا۔ کچھ بھی نہ کر سکا۔ کچھ بھی نہیں۔'' وہ سسکنے لگے۔

''بس بیٹا! حوصلہ کرو۔ یہی اللہ کی مرضی تھی۔'' بابا ان کا شانہ تھپکتے۔

''اللہ کی مرضی نہیں تھی یہ۔ قتل ہوئے ہیں وہ، قتل۔ اور قتل بندوں کی مرضی سے ہوتا ہے، ان کی حیوانیت اور درندگی سے۔ اللہ کی رضا سے نہیں۔ اور اگر اللہ کی رضا اس میں تھی تو ہم نے کون سی خدا کی خدائی بانٹ لی تھی جو وہ ہم پر یہ قہر نازل کرتا؟'' غم کی زیادتی نے صبر کی ہر دلیل کو مسترد کر دیا تھا۔

''کفر کی باتیں نہیں کرتے۔ اللہ ناراض ہوتا ہے۔'' چچی آنسو پونچھتے ہوئے ٹوک دیتیں۔

''میرے شکوہ کرنے سے اللہ ناراض ہو جائے گا۔ اور جو بھیڑیے اور قاتل دندناتے پھر رہے ہیں، ان سے اللہ ناراض نہیں ہوگا؟ ان کے لئے دین کی کوئی حد نہیں؟ قانون کی، انصاف کی کوئی دفعہ اُن پر لاگو نہیں ہوتی؟ زندگی ان کے لئے کھیل ہے، جب چاہو ٹھوکر مار دی، جب چاہا پکڑ کر توڑ دی۔ وہ کسی اصول و ضابطے کی گرفت میں نہیں آتے۔'' ان پر جنون سوار ہونے لگتا۔

جس طرح مالی بیج بوتا ہے، پھر اس بیج کی قوتِ نمو کا اندازہ کیسے لگایا جا سکتا ہے، جو دیکھتے ہی دیکھتے ننھے پودے سے تناور درخت میں ڈھل جاتا ہے۔ اسی طرح محبت کی قوتِ نمو کا اندازہ لگانا بے حد مشکل ہے۔ یہ کب اور کیسے انسان کے وجود کے اندر ہی اندر پھیل جاتی ہے، اتنی گہرائی، اتنی وسعت و قوت کے ساتھ کہ اگر اسے وہاں سے اذنِ ہجرت مل بھی جائے تو بھی یہ وہاں سے نہ نکلے۔ کسی آسیب کی طرح وہ انسان کی روح میں پنجے گاڑ کر بیٹھ جاتی ہے۔ شکل تو بدل لیتی ہے، مگر نکلتی نہیں۔ عثمان بھائی کے دل میں بھی چچا جان کی محبت اتنی ہی گہری، اتنی ہی جڑ دار تھی۔ اور جب یک بیک اسے وہاں سے نکلنے کا حکم ملا تو ان کے لہو میں دوڑتے ذرّے ذرّے کو جھنجوڑ کر رکھ دیا، اُس کے بہاؤ کے رستے بدل دیئے۔ اب وہ موجود تو تھی مگر اِک جنون اور نفرت کی شکل

میں۔ سسٹم سے، معاشرے سے اور ظلم و بے انصافی سے نفرت کی شکل میں۔ نفرت، بیگانگی، بیزاری..... یہ سب بھی تو محبت کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ نفرت بھی تب ہی ہوتی ہے، جب یہ دھیان میں رہے کہ کس چیز سے، کس انسان سے نفرت کرنی ہے۔ اس طرح درحقیقت نفرت کی نمود بھی محبت سے ہوتی ہے۔

سب انہیں سمجھا سمجھا کر تھک گئے۔ پہلے تو چیخ چیخ کر بولتے تھے، خوب دل کی بھڑاس نکالتے، پھر انہوں نے بالکل چپ سادھ لی۔ سارا دن خاموش منہ سر لپیٹے کمرے میں پڑے رہتے۔ بابا، چچی جان اور خود اس نے کتنی کوشش کی کہ وہ کمرے سے نکلیں اور زندگی کی طرف اپنا رخ کریں۔ مگر ان کی حالت اور گم صم روّیے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ پھر سب نے انہیں ان کے حل پر چھوڑ دیا کہ وقت گزرنے کے ساتھ خود ہی سنبھل جائیں گے۔ آخر کوئی کب تک سوگ منا سکتا ہے؟ پھر ایک دن صبح صبح جب بابا گھر پر نہیں تھے، چچی جان قرآن پاک کھول کر بیٹھی تھیں، اور وہ ان کے پاس ہی بیٹھی اپنی کتاب پڑھ رہی تھی، جب وہ اپنے کمرے سے نکل آئے۔ آ کر ان کے پاس خاموشی سے بیٹھ گئے۔ چچی جان نے کلامِ پاک بند کر دیا اور محبت سے بیٹے کی طرف دیکھنے لگیں۔

''کیا بات ہے، آج جلدی اُٹھ گئے۔ ناشتہ بنا دوں؟'' انہوں نے زمانے بھر کی مٹھاس لہجے میں سموتے ہوئے پوچھا۔ وہ ان کے لہجے کو یکسر نظر انداز کر گئے۔

''امی جان! میرے پاس صرف دو راستے ہیں۔ یا تو میں خودکشی کر لوں یا یہ ملک چھوڑ کر چلا جاؤں۔''

عشنا کے ہاتھ سے کتاب چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ ان کا لہجہ انتہائی سرد تھا۔

''خدا خدا کرو بچے! کیسی ہولناک باتیں کر رہے ہو؟'' چچی جان دہل کر بولیں۔

''میں نے آپ کو بتا دیا ہے، آگے آپ کی مرضی۔ اگر میں یہاں رہا تو میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ کیونکہ میں یہاں بہرحال زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ مر کر البتہ۔'' وہ اسی بیگانگی سے بولے۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ ارے یہ موت کیا پہلی بار اس دنیا میں نازل ہوئی ہے؟ جس نے آنا ہے، اس نے جانا بھی ہے۔ اور گئے ہوؤں کے پیچھے کون جاتا ہے بھلا؟ تمہارا تو دماغ ہی اُلٹ گیا ہے۔'' اُنہیں غصہ آ گیا۔

''اس بحث کو چھوڑیں، آپ مجھے دونوں میں سے ایک کام کی اجازت دیں۔'' انہوں نے یوں کہا جیسے وہ چچی جان سے حج یا عمرے میں سے کسی ایک کی اجازت

مانگ رہے ہوں۔''

''گویا یہ حرام کام بھی میری مرضی سے ہو گا۔ سبحان اللہ! دوہرا عذاب بیٹا۔ میرے بچے! ہوش کر، گھر سے باہر نکل۔ کچھ دنیا میں جی لگا۔ نہ مجھے یوں ہلکان کر۔ میں تو پہلے ہی مری ہوئی ہوں، میرے بڑھاپے پر ہی ترس کھا۔'' وہ رونے لگیں۔

''آپ کے بڑھاپے پر ہی تو ترس کھا رہا ہوں، ورنہ ابا کے ساتھ کل اسی جگہ بیٹھ کر مجھے بھی رو رہی ہوں گی۔'' وہ سنگ دلی سے بولے۔

''پلیز عثمان بھائی! ایسی باتیں تو نہ کریں۔'' وہ بے طرح ڈر گئی تھی۔

انہوں نے عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور کھڑے ہو گئے۔

''ٹھیک ہے امی! فیصلہ ہو گیا۔ میں کچھ دنوں تک یہ ملک چھوڑ دوں گا۔ اگر دنیا سے جی لگا سکا تو واپس آ جاؤں گا۔ ورنہ میرا انتظار نہ کیجئے گا۔'' وہ لمبے لمبے قدم اُٹھاتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

''بیٹا! اتنا علم، اتنی ذہانت، ملک کو ضرورت ہے تمہاری۔ چند لوگوں کے جرم کی سزا اس ملک کو نہ دو۔ ذرا اپنے دل کو وسعت دو۔'' بعد میں بابا نے انہیں سمجھایا۔

''کیا دیا ہے اس ملک نے مجھے جو میں جھولیاں بھر کر اس کے لئے کچھ کروں؟ اور اگر کچھ دیا بھی ہے تو بمعہ سُود کے بہت کچھ بے دردی سے چھین بھی لیا ہے۔ مجھے اس سوسائٹی سے، معاشرے سے نفرت ہو گئی ہے۔ سب بھیڑ چال ہے، دکھاوا، دھوکا اور فریب۔ اس کے قوانین اتنے بودے جیسے ریت کی دیوار۔ مجھے اب کوئی توقع، کوئی اُمید نہیں اس سے۔ اور تایا ابا! جب اُمید ختم ہو جاتی ہے نا تو پھر کچھ باقی نہیں رہتا۔ انسان کی بقا اس کے خواب ہی تو ہیں۔ آئندہ کے خواب، روشن اور چمکیلے۔ انہوں نے میرے خواب مجھ سے چھین لئے، میرے آئندہ کو ختم کر دیا۔ اب میرا یہاں رہنا یا نہ رہنا ایک برابر ہے۔ میں ان کے کسی کام کا نہیں۔ بس آپ مجھے نہ روکیں۔'' وہ نم آلود آنکھیں لئے پلٹ گئے۔

پھر واقعی انہیں کوئی بھی نہ روک سکا۔ نہ کوئی رشتہ، نہ کوئی محبت، نہ کوئی خواب اور نہ اس زمین کی مٹی، جس کو سونا بنانے کے خواب کبھی انہوں نے دیکھے تھے۔ اور وہ چلے گئے، یہ دیکھے بغیر کہ جس ماں کو وہ کچھ دن بھیک میں دیئے جا رہے ہیں، وہ بھیک اسے موافق بھی آتی ہے یا نہیں۔ چچی جان دیکھنے میں جتنی باہمت نظر آتی تھیں، اندر سے اتنی ہی کمزور نکلیں۔ عثمان بھائی کے جانے کے سال بعد ہی وہ بھربھری مٹی کی طرح

ڈھے گئیں۔

اور جب عثمان بھائی کو بابا نے اطلاع دی تو انہوں نے کہا۔

''اب میں کیا کروں گا؟ مر کر سب کچھ تو ختم ہو گیا۔ مٹی کے ڈھیر بھلا مجھ سے کیا کہیں گے؟ نہ کوئی شکوہ، نہ کوئی محبت بھرا لمس۔ میں نہیں آسکوں گا، تایا ابا!'' اور یوں ان کے خاندان کا ایک پورا باب خاموشی سے بند ہو گیا۔ اور ابھی تو.....''

''توبہ ہے، تم پتہ نہیں، کن خیالات میں ہمہ وقت کھوئی رہتی ہو۔ کتنی دیر سے آوازیں دے رہی ہوں، کچھ سنائی دیا تمہیں؟'' تنزہ اس کے پاس آ کر چیخ کر بولی۔ وہ چونک کر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''کیا بالکل ہی گئیں کام سے؟'' اس نے ہاتھ اس کی آنکھوں کے آگے لہرایا تو وہ جیسے ہوش میں آ گئی۔

''کیا بات ہے؟ کیوں چیخ رہی ہو؟'' اُس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''گویا کہ میں پاگل ہوں جو بلاوجہ چیخ رہی ہوں۔ عشنا یار! تمہیں کیا ہو جاتا ہے؟ کبھی تو تم بالکل ہی کٹ آف ہو جاتی ہو ہر چیز سے۔'' اس نے کچھ عاجزی سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں ہو جاتا مجھے۔ تم بتاؤ، کیوں بلا رہی تھیں مجھے؟'' اس نے نظریں چراتے ہوئے فائلیں درست کرنا شروع کر دیں۔

''مت اتنا سوچا کرو۔ کیا گھر میں پھر کوئی بات ہو گئی ہے؟ اور وہ امینہ آپا کے دیور صاحب آ گئے؟''

''ہاں آ گئے ہیں۔'' اس نے کچھ بیزاری سے کہا۔

''لگتا ہے، تمہیں کچھ بھائے نہیں۔ کیا ایسے ہی ہیں؟ میرا مطلب ہے، کوئی دُم چھلا وغیرہ۔'' اس نے کچھ تجسس سے پوچھا۔

''دُم! ایک تو پیچھے ہوتی ہے، اس لئے عام نظر سے دیکھنے پر دکھائی نہیں دیتی۔ اور دوسرے انسانوں کی دُم ہوتی ہی نہیں اور جن کی ہوتی ہے، وہ کمال صفائی سے اسے چھپا جاتے ہیں۔'' اس نے بات کو جیسے گھمانے کی کوشش کی۔

''کیا مطلب بھئی؟ کیا واقعی ''پیچھے'' کچھ چھوڑ آئے ہیں؟''

''بظاہر تو ایسا کچھ نہیں۔'' اس نے لاتعلقی سے کہا۔

''آؤں گی ایک دو روز میں تمہاری طرف اس امپورٹڈ برانڈ کو دیکھنے۔ جتنے سالوں

کے بعد آئے ہیں، اتنے سالوں میں بندہ ہاف امپورٹڈ تو ہو ہی جاتا ہے نا۔ اور وہ تمہارے عثمان بھائی کی کوئی خیر خبر؟''

''آتے رہتے ہیں امینہ آپا کو خط۔ بس ایک بہن کا ہی تو انہیں کچھ خیال ہے۔''

''ویسے بھئی آئیڈیل شخص تھے تمہارے یہ عثمان بھائی۔ اور تمہارے لئے تو موسٹ سوٹیبل (مناسب)۔''

''تنزہ.....!'' اس نے خفگی سے کہا۔

''سوری بھئی، تمہارے تو بھائی ہیں لیکن اس میں کوئی حرج بھی نہیں تھا، اگر وہ حالات سے اس حد تک بدظن نہ ہوتے تو۔ ہمارے ملک کا المیہ بھی تو یہی ہے کہ ہیرے موتی مٹی میں سے رول کر نکالتے ہیں اور غیر کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔ پھر اپنی پسماندگی کا رونا روتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں افسوس تھا۔

''ہاں یہ تو ہے۔ اب وہاں بہت اچھی جاب پر ہیں، مگر پھر بھی مطمئن نہیں۔ چاہے کتنا ہی کیوں نہ ظاہر کریں، مگر ان کو اس ملک سے دلی لگاؤ تھا۔''

''ہاں، صحیح کہا تم نے۔ جڑوں سے کٹ کر درخت ہرے بھرے کہاں رہتے ہیں۔ کہیں شادی وغیرہ نہیں کی انہوں نے؟''

''نہیں، ابھی تک تو نہیں۔''

''ہوں۔'' وہ چپ کر گئی۔ ''میں بات کیا پوچھ رہی تھی۔ ہاں، یاد آیا، وہ ایاز صاحب موضوعِ گفتگو تھے۔ دیکھنے میں کیسے ہیں؟'' اسے پھر بھولا ہوا ٹاپک یاد آ گیا۔

''انسانوں جیسے۔'' اس نے پیچھا چھڑانے کے لئے کہا۔

''میں نے کب بندر کے بارے میں پوچھا ہے؟ تم کبھی اصل بات نہیں بتاتیں۔'' اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''خود ہی تو کہہ رہی ہو کہ آ کر دیکھوں گی تو پھر آ جانا۔ میں اب کیا بتاؤں؟'' اس نے چڑ کر کہا۔

دیکھنے میں وہ واقعی عام سا ہی تھا، یعنی ایوریج مین۔ بلکہ اسے تو فاروق بھائی سے بہتر ہی لگا تھا۔ لیکن فاروق بھائی بھی تو پہلے بہت اچھے ہوتے تھے۔ یہ ساری خوبیاں تو بعد میں دریافت ہوئی تھیں۔ امینہ آپا تو ایاز سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں، اب دن رات اس کے کان کھا رہی تھیں کہ اس سے اچھا رشتہ اور کون سا ملے گا۔ اسے تمہاری شرط پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ طبعاً کوآپریٹو (تعاون کرنے والا) ہے۔ کچھ سال یہاں

رہ لینا، پھر وہ تمہیں وہاں بلوائے گا۔ سیلف میڈ ہے، اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ کرتا ہے۔ اتنے سالوں سے باہر ہے، اپنا آپ اس نے خود بنایا ہے۔ ممانی جان بھی بیٹے کی خوشی میں راضی ہیں اور فاروق تو بہت خوش ہیں۔ اپنا خون پھر اپنا ہوتا ہے، دیکھا بھالا۔ گھر کا رشتہ کہاں ملے گا۔ ''اپنے'' پر آ کر اُن کی سُوئی اٹک جاتی۔ یہ خوبی تو سب خوبیوں سے بڑھ کر تھی۔ ایاز کے خیالات کم از کم ممانی جان سے اعلیٰ تھے۔ امینہ آپا کی خوشی کو دیکھتے ہوئے اب وہ بھی سوچ رہی تھی۔

''اچھا، باقی کی سوچیں گھر جا کر سوچ لینا۔ ابھی ذرا میرے ساتھ بازار چلو۔'' تنزہ اپنا سامان سمیٹ کر دوبارہ اس کی طرف آتے ہوئے بولی۔

''بازار کیا کرنے جانا ہے؟'' اس نے کچھ بے دھیانی سے پوچھا۔

''سونے جانا ہے۔'' وہ چڑ کر بولی۔ ''ظاہر ہے، آدمی بازار کیا کرنے جاتا ہے اور تمہیں تو میرے خیال میں اس وقت نیند کی ضرورت ہے۔ پتہ نہیں، کون سے سپنے ہیں جو دن میں دیکھے جا رہے ہیں۔'' وہ غصے سے جھنجلا کر بولی۔

''اچھا بابا! چلتی ہوں۔'' وہ جلدی سے کھڑی ہوگئی۔ ''تم تو بلاوجہ شور مچانے لگتی ہو۔ اور ویسے بھی ابھی سب گئے کہاں ہیں۔'' اس نے زیبی کی طرف دیکھتے ہوئے اسے احساس دلایا کہ ابھی آفس ٹائم ختم نہیں ہوا۔

''ٹائم ختم ہو چکا ہے اور جو بیٹھے ہیں، ان کی آج ڈیٹ ہے، اسی کو بھگتانے کے لئے بیٹھے ہیں۔'' نہ تو اس کی آواز نیچی تھی، نہ الفاظ بے ضرر۔ خفت سے زیبی کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

''فضول نہ بولا کرو۔ آدمی ڈھنگ سے بھی بات کر سکتا ہے۔ چلو اب۔'' اس نے بیگ گھسیٹتے ہوئے اسے آگے دھکیلا اور زیبی کی طرف ایک معذرتی نظر ڈالتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑی۔

''اب سچ کو سچ بھی نہ کہیں۔'' دروازے سے نکلتے وہ تندی سے بولی۔

''کیا سچ کا اشتہار بنانا ضروری ہوتا ہے؟ اور تمہارے پاس کون سی جادو کی چھڑی ہے جو تمہیں سچ اور جھوٹ کا فرق بتائے گی۔'' عشنا نے اسے جھاڑتے ہوئے کہا۔

''جادو کی چھڑی نہیں، مگر عقل تو ضرور ہے۔ خدا کو دیکھا کس نے ہے مگر عقل کے زور پر جانا ہے۔ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔'' لابی میں اس کی آواز خاصی بلند تھی۔

''بس اپنے نقارے اپنے پاس ہی رکھو تم۔ آہستہ نہیں بول سکتیں؟ اور چھوڑو اب

اس غریب کی جان کو۔ پتہ نہیں، اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ کوئی اور بات کرو۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے اس کے ساتھ چلنے لگی۔

''خیر، وہ اتنی غریب نہیں ہے۔'' اس نے 'اتنی غریب' کو چبا کر کہا۔

''خیر، تم کہتی ہو تو چھوڑو۔ ہاں، وہ تم نے اپلائی کر دیا تھا لیکچررشپ کے لئے؟ ایڈ آیا تھا نا اخبار میں پبلک سروس کمیشن والوں کا۔'' اس نے شرافت سے موضوع بدل دیا۔

''ہاں کر دیا ہے۔ دیکھو کیا بنتا ہے۔''

''اچھی بھلی نوکری کو لات مار رہی ہو۔ انہوں نے کون سا ڈائریکٹ تمہیں لاہور کالج کی پرنسپل شپ آفر کر دی ہے۔ ان کے ٹرائل بھی کالے پانی سے کم نہیں ہوتے۔ یہاں کم از کم اپنے گھر اور شہر کا سکون تو ہے نا۔'' اس نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

''وہ تو تم جیسوں کے لئے ہے۔ میرے لئے اب سب جگہیں ایک سی ہیں۔'' اس نے تلخی سے کہا۔

''ارے ہاں، یاد آیا۔ وہ 'ونس مور' کا فون نہیں آتا اب؟'' اُسے اچانک یاد آیا۔

''نہیں۔ خدا خدا کر کے تو جان چھوٹی ہے۔ لگتا ہے، پاگل خانے والوں نے واپسی بلا لیا ہے۔'' واقعی تین چار ہفتوں سے اس کی کوئی کال نہیں آئی تھی، اس نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

❖❖O❖❖

"My father is my ideal.

He is a great man.

I love my father."

''خالہ آنٹی! پہلے میں میتھس کا ہوم ورک نہ کر لوں؟ یہ مضمون تو صرف یاد کرنا ہے۔''

''مائی فادر'' کا مضمون پڑھتے پڑھتے ایک دم تیمور نے کہا تو عشنا جو اس کے لفظوں میں کھوئی ہوئی تھی، چونک اُٹھی۔

''ہاں ٹھیک ہے، پہلے وہ کر لو۔'' وہ کاپی بند کر کے میتھس کی بک کھول کر بیٹھ گیا۔

''آئی لو مائی فادر'' اُس کے دل میں ہوک سی اُٹھی۔

اماں، چچا جان اور چچی کے جانے کے بعد بابا کتنے خاموش ہوگئے تھے۔ ان کے گھر میں اب سناٹے کی آواز سب سے بلند تھی۔ اتنی کہ اسے با آسانی سنا جا سکتا تھا۔

کبھی یادوں کی شکل میں اور کبھی آوازوں کی شکل میں سناٹا بگولے کی طرح گھر کی فضاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ در و دیوار جیسے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارہ کر رہے ہوں۔ ''چپ۔'' مگر وہ چپ بھی تو چپ نہ تھی۔ اس میں بڑا شور تھا۔ اماں کی پیار باری ڈانٹ، آنکھوں میں غصہ اور ہونٹوں پر دبی دبی مسکان، عشنا کی معصومانہ ہنسی، بابا کے چھوٹے چھوٹے برجستہ جملے، پھر عثمان بھائی کی زندگی سے بھرپور باتیں، بابا اور چچا جان کی دھیمی دھیمی گفتگو، چچی جان کی سرد آہیں۔ وہاں اس سناٹے میں سب کچھ تھا۔ آوازوں کا اِک خزانہ، یادوں کا اِک دفینہ، بس دھیان اس طرف لگتا تو جیسے رونق سی ہو جاتی۔ یہ صرف اس کے محسوسات تھے یا بابا بھی ایسا ہی محسوس کرتے تھے، یہ تو اسے پتہ نہیں تھا۔ مگر ان کی خاموشی اسے اتنی محتاط لگتی کہ اگر وہ اونچا بولیں گے تو یہ طلسم ٹوٹ جائے گا۔ ہاں، ان دنوں گھر اُسے کوئی طلسم کدہ ہی لگتا تھا۔ پتہ نہیں کون اسے سحر زدہ کر گیا تھا کہ زندگی کی ہر رمق معدوم ہو گئی تھی۔ ہر خواہش، ہر ارمان جیسے دم توڑ گیا تھا۔ اسے گمان بھی نہ تھا کہ ان کی اتنی چھوٹی سی دنیا میں اتنے بڑے بڑے غموں کی گنجائش نکل آئے گی۔ پھر اس نے گریجویشن کر لیا۔ سول ایوی ایشن میں ویکنسیز نکلی تھیں، تنزہ اسے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ کر لے گئی۔ دونوں کی سلیکشن ہو گئی۔ بابا نے بخوشی اجازت دے دی تو امینہ آپا کس قدر خفا ہوئی تھیں اس کی جاب کا سن کر۔ بابا کے ساتھ انہوں نے باقاعدہ بحث کی۔

''تایا ابا! یہ کیا کر رہے ہیں؟ کوئی اچھا سا رشتہ دیکھ کر عشنا کو رخصت کریں۔ بھلا نوکریوں کی کیا ضرورت؟''

''بیٹا! پہلی بات تو ہے کہ ایسا اچھا رشتہ کوئی ابھی تک آیا نہیں ہے۔ اور جو آئے ہیں، وہ اتنے اچھے نہیں ہیں کہ میں فوری فیصلہ کر لوں۔ دوسرے جب تک ایسا اچھا رشتہ نہیں آتا، میں اپنی بیٹی کو سناٹوں کے حوالے نہیں کر سکتا۔ گھر میں اب سناٹے ہی تو ہیں۔ وہ گھر میں بیٹھے گی تو پاگل ہو جائے گی۔ پہلے تو آدھا دن کالج میں گزر جاتا تھا اور میں شام ڈھلنے سے پہلے گھر آ جاتا تھا، اب اگر وہ اکیلی سارا دن رہے گی تو بیمار پڑ جائے گی۔''

آپا تو قائل ہوئی ہی تھیں، بابا کے جذبات جان کر اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہیں اس کی تنہائی کا کس قدر خیال تھا۔ حالانکہ وہ ان کے سامنے حتی المقدور پہلے والی عشنا بننے کی کوشش کرتی تھی مگر شاید والدین کو قدرت نے یہ اضافی حس دی ہوتی ہے کہ

وہ اولاد کے اندر تک اُتر کر ان کے دل کی کیفیت کو جان سکیں۔ پھر جاب سے واقعی اس کے ذہن پر بہت اچھا اثر پڑا۔ دل کی وحشت انگیز تنہائی سے دھیان ہٹ گیا۔ نئے نئے لوگوں سے ملنے اور ان کے ساتھ ڈیلنگ کرنے میں لطف آنے لگا۔ بے شک باہر کی دنیا ایک نئی ہی دنیا تھی۔ گھر کی جامد و ساکن فضاؤں سے ہٹ کر۔

اگرچہ وہ یہاں بھی بہت لئے دیئے رہتی، مگر اس کے لئے تو یہ بھی ایک بہت بڑی تبدیلی تھی۔ لیکن ابھی وہ اس تبدیلی سے پوری طرح مصافحہ بھی نہ کر پائی تھی کہ زندگی نے آخری وار بھی کر ڈالا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ اتنے سارے سانحوں نے بابا کو اندر ہی اندر اس قدر تھکا ڈالا ہے کہ زندگی کے ساتھ بھاگنا اب ان کے لئے ممکن نہیں رہا۔ وہ اپنے دُکھوں میں مگن تھی، اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب انہوں نے اپنی کم گوئی کو خاموشی میں ڈھال لیا ہے۔ انہوں نے کسی سے بھی اپنے دکھ کا، اپنی تنہائی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ کسی سے بھی نہیں۔ اماں کے بعد ان کی دوستیاں جیسے ختم ہو گئی تھیں۔

عشنا کی خاطر وہ سرِشام ہی گھر آ جاتے اور پھر اپنے کمرے میں ہی پڑے رہتے۔ باہر کی دنیا سے سارے رابطے، سلسلے منقطع کر کے اندر کی دنیا کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ اتنا دباؤ ان کے دل کی رگیں سہہ نہیں سکیں۔ بوجھ بھی تو ایک حد تک ہی سہا جا سکتا ہے، ان کی حد بھی یہیں تک تھی۔ غموں کی دیمک نے ان کے دل سے زندگی کو چاٹ لیا تھا اور اس کی خبر عشنا کو اُس روز ہوئی جب عصائے سلیمانی کی طرح ان کا وجود ڈھے گیا ورنہ اندر سے تو وہ کب کے ختم ہو چکے تھے۔ آسمان ٹوٹ پڑتا یا زمین پھٹ جاتی تو اُسے اس قدر حیرانی نہ ہوتی کیونکہ ان تبدیلیوں کا ذکر تو انسان روزِ ازل سے جانتا ہے، مگر تا امروز اس سے مانوس نہیں ہو سکا۔ انسانوں کو وحشت زدہ کر دیتی ہے اور یہ موت جب جب آتی ہے، حیرت سے ہماری زبانوں کو گنگ کر دیتی ہے اور عقلوں کو مختل۔ وہ بھی شاید اس سانحے سے مخبوط الحواس ہو جاتی، مگر قدرت کو شاید اس کی قوتِ برداشت کا اندازہ تھا۔ اسی لئے پے در پے حادثوں کے لئے اس کے دل کو تختۂ مشق بنایا گیا تھا۔ بظاہر اس کے لئے دنیا ختم ہو گئی تھی، بابا کے بعد اب کیا تھا۔ مگر دنیا تو ابھی باقی تھی کیونکہ وہ خود زندہ تھی، دھڑکتی ہوئی نبضوں کے ساتھ، دیکھتی ہوئی بصارتوں کے ساتھ اور سننے والی سماعتوں کے ساتھ۔ ان ہی سماعتوں نے اسے اک نئے کشف سے آگاہ کرایا۔

''ارے گھر کا گھر ہی اُجڑ گیا۔'' سیپارہ پڑھتی ایک عورت نے سرد آہ بھری۔

''ہاں بہن! گھر ہی اُجڑ گیا۔ سچ کہتی ہو، آج کو کوئی بیٹا ہوتا، ماں باپ کا نام ہوتا۔

کم از کم گھر کا دروازہ تو کھلا رہتا۔ باپ کا نام تو زندہ رہتا۔ اِک بیٹی کا وجود ہے سو پرایا دھن۔ آج نکاح کے دو بول پڑھوائے، آج پرائی۔ ماں باپ کا نام ونشان تو مٹ گیا تھا۔'' دوسری کا صدمہ شاید عشنا سے بھی سوا تھا، بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔

''بس خدا کو نہیں منظور تھا۔ ورنہ اِک بیٹا ہوتا تو کاہے کو بے نامی رہتی؟'' تیسری نے بھی کلامِ خیر میں حصہ لیا۔

''کتنے ہیں آج یہاں، جن کو اپنے باپ کے علاوہ دادا اور دادا کے باپ کے نام کا بھی پتہ ہے۔ اگر بیٹے نام کی پائیداری کی ضمانت ہوتے تو آج قبرستانوں میں ہزاروں قبریں بے نام کیوں ہیں، جن پر کوئی فاتحہ پڑھنے والا نہیں، کوئی چراغ جلانے والا نہیں۔ اور جو قتل و غارت کرتے ہیں، دہشت و بربریت پھیلاتے ہیں، وہ بھی تو نام ہی روشن کرتے ہیں اپنے اجداد کا۔ وہ ابھی موجود تھی تو اس کے ماں باپ کا نام کیسے مٹ گیا؟ یہی طعنہ تو دیا تھا عرب کے کفار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو۔ اور آج کہاں ہیں وہ کفار، بڑے ناموں والے، پُرغرور، تمکنت کے تمغے سینوں پر سجانے والے، کثرتِ مال اور کثرتِ اولاد پہ اِترانے والے۔ انسان بھی کیسا دیوانہ ہے۔ جانتا ہے یہ مال و اولاد تو آزمائش ہیں، پھر بھی اس آزمائش میں پڑنے کے لئے دیوانگی کی حدوں کو چھونے لگتا ہے اور اس دیوانگی کا احساس اُسے تب ہوتا ہے، جب خالی ہاتھ اس دنیا سے جاتا ہے۔ اس کے ساتھ جاتے ہیں تو اس کے اعمال۔ یا کام آتے ہیں پیچھے رہ جانے والی اولاد کے اعمال۔ نیک اولاد صدقہ جاریہ اور بد، وسیلۂ اذیت۔ جب ذکر اولاد کا ہو تو اس میں بیٹے یا بیٹی کی کیا تخصیص؟ اور اس کے والدین نے جیسی اُس کی تربیت کی تھی، وہ کبھی ان کے لئے ایذا رسانی کا باعث نہیں بن سکتی تھی۔

اور یہ ساری عورتیں روز روز کلامِ پاک پڑھتی تھیں اور جانتی تھیں کہ سورۂ رحمٰن میں حق تعالیٰ نے فرما دیا کہ اس کے نام اور ذات کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہے گی۔ تو پھر یہ کس نام کی تکرار ہے؟ اگر انسان کے نام کی بقا اولاد ہے تو وہ اپنے ماں باپ کی اولاد ہے۔ پھر وہ کیوں اسے نظر انداز کر رہی تھیں؟ یعنی اس کا وجود، اس کا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ محض Nonenitity (بے بنیاد تشخص)۔ اُس کے دل میں اُبال اُٹھنے لگے۔ وہ رکھے گی زندہ اپنے ماں باپ کے نام کو۔ اس طرح کہ دنیا دیکھے گی۔ اُس نے دل میں عہد کیا اور اس عہد نے ایک بار پھر اسے زندگی کی طرف لوٹا دیا۔

پھر جیسے ہی چالیسواں ہوا، امینہ آپا نے اس کا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ وہ انہیں

خاموشی سے دیکھتی رہی۔ منع بھی کیسے کر سکتی تھی؟ جس گھر سے چار جنازے اُٹھے ہوں، وہاں کسی ذی روح کا دن رات تنہا رہنا کیسے ممکن تھا؟ اگر موت کسی گھر سے ایک بار گزر جائے تو مدتوں تک اس کی دہشت پیچھے رہ جانے والوں کو راتوں کو سونے نہیں دیتی۔ اس نے تو اتنی سی عمر میں چار بار ہنستی کھیلتی زندگیوں کو مٹی کی ڈھیریوں میں بدلتے دیکھا تھا۔

دنیا کا مشکل ترین اور سب سے اذیت ناک کام میت کے سرہانے بیٹھنا ہے۔ اپنے جسم کے حصوں کو کندھا دینا اور لحد میں اُتارنا، دنیا کی سب تکلیفوں سے بڑھ کر تکلیف دہ ہے۔ اسے لگتا، موت گھر کی دہلیز سے لپٹ کر بیٹھ گئی ہے اور اپنا وعدہ پورا کئے بغیر نہیں ٹلے گی۔ وہ چپ چاپ گھر کے سب کمروں کو اور اسباب کو تالوں کے حوالے کر کے امینہ آپا کے ساتھ آ گئی۔ وہ گھر، جس سے سکول کے چند گھنٹوں کی جدائی اسے گراں گزرتی تھی، آج اُس کی اس بے سروسامانی اور بے سائبانی پر بے رخی سے کھڑا دیکھتا رہا۔ دیواروں سے تعلق کا ذریعہ بھی انسان ہیں اور اگر انسانوں سے تعلق ٹوٹ جائے تو در و دیوار بھی بیگانے ہو جاتے ہیں۔

وہ کتنی دیر دیواروں سے، دروازوں سے لپٹ کر روتی، آنسو بہاتی رہی۔ ان دیواروں نے پرانی شناسائی کے حوالے سے کیسے درد جگائے تھے۔ مگر کسی دیوار نے، دروازے نے بڑھ کر اس کا ہاتھ نہ تھاما، اس کا راستہ نہ روکا۔ نہ پیپل کے درخت نے اسے آواز دی، نہ پتوں نے پکارا، نہ سیڑھیوں نے، نہ صحن نے۔ سب یکسر اجنبی ہو گئے تھے۔ آپا نے اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لگایا اور گھر سے باہر لے آئیں۔

امینہ آپا کے گھر آ کر بھی دہشت جو موت نے پھیلائی تھی، اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اسے کمرے کی تاریکی سے خوف آتا۔ وہ لائٹ جلا کر سونے لگی۔ ہوا کے چلنے میں قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگتی۔ کسی کے رونے کی آواز سنتے ہی اس کا دل ڈوب جاتا۔ حالانکہ اب تو کھونے کے لئے کچھ بھی نہ بچا تھا۔ پھر نہ جانے کیسے دھڑکا لگ گیا تھا، جو راتوں کو سونے نہ دیتا۔ کھل کر مسکرانے بھی نہ دیتا۔ وہ شاید Death Fixation کا شکار ہو رہی تھی۔ موت کے سائیکلون (گردباد) نے اسے چاروں طرف سے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ موت کا اتنا پھیلاؤ تو اس نے کسی افسانے، کہانی میں بھی نہ پڑھا تھا۔ زندگی اس کے لئے کسی کہانی سے زیادہ تلخ ہو گئی تھی۔ اس کی خاموشی جامد ہوتی جا رہی تھی۔ ڈر، خوف، تنہائی اور عدم تحفظ کے احساس نے اُس کی سوچوں کو Morbid (بیمار) کر دیا تھا۔ پھر آپا کے اصرار پر اس نے غم کو اپنے ساتھ سلانا شروع کر دیا۔ مگر

چند روز بعد ہی اس نے سنا، آپا کی ساس کہہ رہی تھیں کہ ''وہ عنم کو خدا جانے کون سی پٹیاں پڑھاتی رہتی ہے۔ بچی نافرمان ہوگئی ہے۔''

اس نے خاموشی سے عنم کو واپس اُس کے کمرے میں بھیج دیا اور درحقیقت ممانی جان کے طعنے ہی اُسے واپس دنیا کی تلخ حقیقتوں کی طرف لائے تھے کہ اب اسے تن تنہا اس زندگی کا نہ صرف مقابلہ کرنا ہے بلکہ اپنے عہد کو بھی پورا کرنا ہے۔ پھر فاروق بھائی کے بدلتے ہوئے تیور، اسے بہت کچھ سمجھ میں آنے لگا۔ اب ہاتھ پکڑ کر راستہ دکھانے کی روایت پرانی ہو چکی ہے۔ اب کوئی جگنو، کسی تنہا بلبل کو اندھیری رات میں راستہ نہیں دکھاتا۔ اب زندگی کی تاریک راہوں کے لئے اپنے اپنے جگنو کا انتظام خود کرنا پڑتا ہے۔ مانگے کی روشنی سے انسان بھٹک تو سکتا ہے، اپنے گھر نہیں پہنچ سکتا۔

پھر امینہ آپا اور تنزہ کے مشورے پر اس نے فلاسفی میں ایم اے کا امتحان دیا۔ اس فلسفے نے اسے زندگی کا فلسفہ سمجھنے کا سلیقہ دیا۔ وہ مہینے کے مہینے اپنی تنخواہ میں سے بچوں کے لئے چیزیں لے آتی۔ کبھی کبھی ممانی جان کے لئے اور فاروق بھائی کے لئے۔ اور بزنس میں نقصان کی صورت میں فاروق بھائی نے اسے خاموشی سے اپنا سلیپنگ پارٹنر بنا لیا تھا۔ قرضِ حسنہ کے طور پر لی گئی بڑی بڑی رقوم وہ واپس کرنا ہی بھول جاتے۔ اس کی تنخواہ بہت اچھی تھی۔ پھر بابا کا بینک بیلنس، اماں کے ڈھیروں ڈھیر زیورات، بابا اس کے اکاؤنٹ میں علیحدہ سے رقم جمع کرواتے تھے۔ اس کے اپنے اخراجات تو بہت کم تھے، وہ اس پیسے کو کام میں لانا چاہتی تھی، اس لئے فاروق بھائی کے اِن ڈائریکٹ تقاضوں سے اکثر جھنجلا جاتی اور.....

''تیمور! تمہیں دادو بلا رہی ہیں۔ جاؤ ان کی بات سن کر آؤ۔'' امینہ آپا کی آواز سن کر وہ خیالوں کی دنیا سے باہر آئی۔

''پڑھ لیا تیمور نے؟''

''جی بس تھوڑا سا کام رہ گیا تھا۔'' اس نے تیمور کو جاتے دیکھا۔

''کافی ٹائم ہو گیا ہے، فاروق ابھی تک نہیں آئے۔ ایاز کا بھی پتہ نہیں، صبح سے کہاں نکلا ہوا ہے۔ تمہیں بھوک لگ رہی ہو گی۔'' وہ پتہ نہیں کس بات کے لئے تمہید باندھ رہی تھیں حالانکہ جانتی تھیں کہ اس طرح کے لاڈ اُٹھوانے والا خانہ اس نے کب سے بند کر دیا ہوا ہے۔ وہ چپ رہی۔

''پھر تم نے کیا سوچا؟'' وہ دراصل اس کی طرف آ ہی گئیں۔

''کس بارے میں؟'' اس نے تیمور کی کتاب اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''ایاز کے بارے میں، اس کی چھٹی تھوڑے دنوں کی رہ گئی ہے۔ ویسے تو وہ کچھ دن اور بھی رہ سکتا ہے کیونکہ وہ کون سا کسی ادارے کا ملازم ہے مگر اس کے اپنے کام کا حرج ہو رہا ہے۔ پھر ممانی بھی جواب کی منتظر ہیں۔''

''آپ کا کیا خیال ہے، وہ کیسے راضی ہوئی ہوں گی؟'' اس نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

''پتہ نہیں۔ شاید ایاز نے ان پر دباؤ ڈالا ہو۔ فاروق نے بھی اصرار کیا تھا۔'' سوال کی گہرائی کو وہ بھی سمجھتی تھیں مگر کبھی کبھی انجان بننا بھی سودمند ہوتا ہے اور فاروق بھائی کے ''اصرار'' کا تو اسے پتہ تھا۔

''دیکھو عشنا! شادی تو ویسے بھی ایک رِسک ہوتی ہے اور تمہارے کیس میں اس کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ کسی کے آئندہ کے ارادوں کے بارے میں جاننا ازحد مشکل کام ہے۔ پھر ابھی تو صرف نکاح ہو گا۔ رخصتی ایک ڈیڑھ سال بعد۔ اس دوران اس کے ارادوں کو اچھی طرح جانچ لینا اور ہو سکا تو اس کے تعاون سے اپنا کام شروع کر دینا۔ کیونکہ رہنا تو تم نے یہیں ہے۔ اور نوکری پر بھی ایاز کو کوئی اعتراض نہیں۔ اور پھر اس کا ارادہ یہاں مستقل سیٹل ہونے کا ہے۔ یہ تمہارے لئے مزید اچھا ہو گا۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ اور باقی رہا کردار و خصائل وغیرہ تو اس کے لئے وقت ہی سب سے بڑی کسوٹی ہے۔ ہم ظاہری آنکھ سے اسے نہیں پرکھ سکتے۔'' انہوں نے رسانیت سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''پتہ نہیں آپا! کیوں میرا دل مطمئن نہیں ہو رہا۔'' اس نے صوفے کی بیک سے ٹیک لگاتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

''اطمینان ایسے کیسے ہو گا؟ تم سب اللہ پر چھوڑ دو۔ وہ یقیناً بہتر کرے گا۔ ہم بہت سے معاملوں میں آخری دم تک مطمئن نہیں ہوتے، مگر پھر بھی کرتے رہتے ہیں۔ اسی کو تقدیر کہتے ہیں۔''

''تقدیر؟ پتہ نہیں، کہاں کہاں خود کو منوائے گی یہ تقدیر۔ اگر سب کچھ تقدیر ہی ہے تو پھر ہمارے عمل کی کہاں ضرورت رہ جاتی ہے۔'' وہ بہت ڈسٹرب تھی۔

''جتنا سوچو گی، اتنا اُلجھو گی۔ بس اب تم یہ سوچنے والا کام چھوڑو اور حامی بھرو۔ اِنشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''نکاح ہی کیوں آپا؟ خالی منگنی بھی تو ہو سکتی ہے۔ جبکہ مجھے رہنا بھی یہیں ہے۔''

وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''ممانی کا اصرار ہے، پھر اگر ایاز وہاں سیٹل ہو گیا تو تمہارے کاغذات بنوانے میں آسانی ہو گی۔'' پتہ نہیں، اس کے ذہن میں کون کون سی اُلجھنیں تھیں جو زبان پر آنے سے قاصر تھیں۔ وہ خاموش بیٹھی اپنی انگلیوں کو چٹخاتی رہی۔

''ٹھیک ہے، پھر جیسی آپ کی مرضی۔'' اس نے بہ دقت تمام یہ جملہ کہا۔

''خدا نے چاہا تو بہت خوش رہو گی، میری دعائیں بلکہ ہم سب کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں اور میں تمہیں بتاؤں، یہ دعائیں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں، بس صورتیں بدل بدل کر ہمارے رستے کی کٹھنائیاں دور کرتی رہتی ہیں۔ خاروں پہ آسانیاں اُگاتی ہیں اور اندھیروں میں روشنی بن کر ہاتھ تھام لیتی ہیں۔ بڑی طاقت ہوتی ہے دعا میں۔ تم کوئی فکر اور پریشانی کو اپنے ذہن پر طاری نہ کرو۔'' انہوں نے پیار سے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ آنکھوں سے موٹے موٹے قطرے برسنے لگے تھے۔

''اب آؤ، کھانا لگاتے ہی۔ تمہارے بھائی آنے والے ہوں گے۔'' وہ اُٹھ کر کھڑی ہو چکی تھیں۔

اُس نے سر مزید جھکاتے ہوئے تیمور کا بیگ ٹٹولنا شروع کر دیا۔ سب سے بے قیمت موتی ہوتے ہیں جو آنکھوں سے برستے ہیں۔

''آپ جائیں، میں ذرا تیمور کا کام چیک کر کے آتی ہوں۔'' وہ اُس کی کاپی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

جھکا دیا جنہیں آج گردشِ حالات نے
وہ لوگ کبھی وقت کے خدا ہوا کرتے تھے
جن پتوں کو ہواؤں نے کر دیا بے گھر
کڑی دھوپ میں شہہ پناہ ہوا کرتے تھے

نکاح کی تاریخ ایک ماہ بعد رکھی گئی۔ وہ اسی طرح آفس جاتی رہی۔ ایاز، فاروق بھائی سے اس لحاظ سے بہت مختلف تھا کہ وہ بہت ریزرو سا تھا۔ شاید کم سخن بھی کیونکہ عشنا کو وہ بہت کم مخاطب کرتا تھا۔ بلکہ زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتا۔ عشنا کو تو پے در پے حادثوں نے نڈھال سا کر دیا تھا مگر اسے بھی لگتا تھا، اسے کام (نکاح) سے کوئی خاص دلچسپی نہیں یا اس کے جذبات بھی اتنے ہی سرد تھے جتنا اس کا رویہ۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اُس کے اس محتاط رویے کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتی۔

امریکہ جانے سے پہلے اس نے بی کام کیا تھا۔ نوکری نہیں ملی تھی بلکہ ڈھنگ کی نہیں ملی تھی۔ اس لئے باہر کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ پھر فاروق بھائی کے ایک دوست کے توسط سے باہر چلا گیا۔ وہاں اس نے کسی اسٹور میں جاب کر لی تھی اور اب اس کا اپنا اسٹور تھا۔ نوکری کا خیال اب اس کے دل میں نہیں تھا۔ اپنی ڈگریوں کو اس نے شاید پرانے کسی صندوق میں رکھ دیا تھا۔ یہ سب اسے امینہ آپا نے بتایا تھا۔ ایک بہت بڑی تبدیلی اس کی زندگی میں آنے والی تھی مگر اُس کا دل جیسے بجھ سا گیا تھا۔ والدین کی یاد تو تھی ہی جو ان دنوں زیادہ شدت سے آ رہی تھی۔ ایاز کے رویے سے مستقبل کے اندیشے بھی سر اُٹھانے لگے تھے۔ اس کی کم گوئی اور خاموش طبیعت نے ان خدشوں کو اور ہوا دی تھی۔ پتہ نہیں وہ کس ذہنیت کا مالک تھا۔ اور سب سے بڑی بات امریکہ جیسے ملک سے وہ یونہی چلا آیا تھا۔ بقول تنزہ کے بغیر کسی دُم چھلے کے گھر کی گہما گہمی میں وہ کم ہی شامل ہوتی۔ امینہ آپا اور فاروق بھائی ہی سرگرم تھے۔ آج کل فاروق بھائی کا موڈ بھی بڑا خوشگوار تھا۔ پھر تنزہ کی شادی کی تاریخ بھی رکھی جا چکی تھی، اس کے نکاح سے پندرہ دن پہلے۔

اس نے دفتر سے ریزائن کر دیا تھا اور اب دھڑا دھڑ بازاروں کے چکر لگا رہی تھی اور ساتھ عشنا کو بھی لے جاتی۔ اسی مصروفیت کی وجہ سے وہ عشنا کی گومگو کیفیت کو بھی محسوس نہ کر سکی اور خوشی میں یوں بھی انسان کو اِدھر اُدھر دیکھنے اور سمجھنے کی فرصت کم ہی ہوتی ہے۔

تنزہ کی شادی میں اس نے بھرپور طریقے سے شرکت کی کوشش کی۔ تینوں دن وہ قبل از وقت پہنچتی رہی۔ اسٹاف کے لوگوں میں بھی کبھی آتے تھے، سوائے زیبی کے۔ وہ نکاح والے دن آئی تھی۔ ممانی جان کا رویہ اب اُس کے ساتھ خاصا بہتر ہو چلا تھا کیونکہ اس کے تینوں دن جانے پر بھی ممانی جان نے اُس کی اس غیر ضروری سرگرمی کا برا نہ منایا ورنہ انہیں عشنا کا گھر سے نکلنا بہت چبھتا تھا۔

تنزہ کی شادی خیر خیریت سے ہو گئی۔ وہ اور سکندر شادی کے فوراً بعد ہی شمالی علاقہ جات کی سیر کو چلے گئے۔ البتہ جانے سے پہلے وعدہ کر گئے کہ نکاح میں ضرور شامل ہوں گے۔ نکاح سے تین دن پہلے آپا نے اسے گھر بٹھا لیا۔ فاروق بھائی دل کھول کر خرچ کر رہے تھے۔ انہوں نے بڑے خوب صورت کارڈ چھپوائے تھے اور پھر خود ہی جا کر دفتر میں سب کو دے بھی آئے تھے۔ پتہ نہیں، بھائی کی خوشی کا خیال تھا یا بیوی کے جذبات

کا، وہ بہر حال اپنی ذمہ داری بڑے احسن طریقے سے نبھا رہے تھے۔

پھر نکاح کا دن بھی آن پہنچا۔ ٹائم شام پانچ بجے کا تھا۔ فاروق بھائی کا ننھیال خاصا بڑا تھا اور ممانی جان نے دُور دُور سے مہمانوں کو بلایا تھا۔ کافی لوگ ایک دن پہلے سے آ گئے تھے۔ آج صبح سے ہی رش لگا ہوا تھا۔ گھر جیسے بھر سا گیا تھا۔ مہمانوں کا شور، برتنوں کا شور اور بچوں کی چیخ و پکار کا شور۔ اسے عجیب سی اُلجھن ہو رہی تھی۔ دو دن سے تو وہ بالکل ہی کمرہ نشین ہو گئی تھی۔ ابھی تک تنزہ نہیں آئی تھی اپنے ہنی مون ٹرپ سے۔ آپا نے اصرار کر کے کسی رشتہ دار لڑکی سے کہہ کر اسے مہندی بھی لگوا دی تھی۔

وہ تنہائی اور خاموشی کی اس قدر عادی ہو گئی تھی کہ شور اس کے دماغ کو ہلا رہا تھا۔ وہ کھڑکی میں کھڑی کتنی دیر سے باہر کی ہلچل کا نظارہ کرتی رہی، پھر اُکتا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ 'اس مصیبت سے تو جان چھڑاؤں۔' اُس نے ادھ سوکھی مہندی کو بے زاری سے دیکھتے ہوئے سوچا اور اُٹھ کر دھونے چل دی۔ جب خوب رگڑ رگڑ کر ہاتھ دھو کر باہر نکلی تو لاشعوری طور پر ہاتھوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ رنگ تو خوب آیا تھا۔ وہ ہاتھوں کی طرف دیکھ رہی تھی کہ اسے محسوس ہوا کہ کمرے میں کوئی اور بھی ہے۔ آپا کمرے کے دروازے میں کھڑی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ جھینپ گئی اور فٹافٹ ہاتھ نیچے کر لئے۔ آپا نے شاید اُس کی اس حرکت کی طرف بالکل دھیان نہیں دیا بلکہ وہ شاید کچھ پریشان سی تھیں۔

''کیا بات ہے آپا! خیریت؟'' اس نے ان کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔

''ہاں ٹھیک ہے، کوئی بات نہیں۔'' وہ کچھ اٹک کر بولیں اور اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔ ''تم نے کھانا کھا لیا؟'' انہوں نے جیسے بات بنائی۔

''جی، آپ خود ہی تو دے کر گئی تھیں۔'' اس نے بغور انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، مجھے خیال نہیں رہا۔ اتنا تو ہجوم اکٹھا کر لیا ہے ممانی جان نے۔'' ان کے لہجے میں اُکتاہٹ سی آ گئی۔ وہ کیا کہتی، خاموش رہی۔

''میرا خیال ہے، تم نے چائے نہیں پی۔ میں بھجواتی ہوں جا کر۔'' اسے واقعی چائے کی طلب ہو رہی تھی اور اس جملے کے بعد اصولاً انہیں باہر کی طرف جانا چاہئے تھا مگر وہ اسی پوزیشن میں کھڑی رہیں۔

''آپا! کیا بات ہے؟ کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتائیں۔'' اس نے نرمی سے کہا۔

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' ان کی آواز شاید پاتال سے آئی تھی، ڈوبتی ہوئی۔ اُس کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

''آپا پلیز، کچھ تو کہیں۔'' اس کی آواز لمحہ بھر کو کانپی۔ ''اچھا، بیٹھ تو جائیں۔'' اس نے کندھوں سے پکڑ کر انہیں کرسی پر بٹھانا چاہا۔ تب اسے خیال آیا کہ وہ کافی دیر سے دونوں ہاتھ پیچھے باندھے کھڑی ہیں۔

''دیکھو گڑیا! میں نے تو حتی الامکان تمہارا اچھا ہی چاہا تھا۔ مگر پتہ نہیں، خدا کو کیا منظور ہے۔ ہر سیدھی تدبیر اُلٹی ہو رہی ہے۔'' ان کی آواز جیسے پھٹ رہی تھی۔

''آپا! کیا بات ہے؟ پلیز مجھے بتائیں، مجھ میں بہت حوصلہ ہے۔'' اُس کا حوصلہ تو مستند تھا، اس لئے اس نے بظاہر مضبوطی سے کہا۔

''کیا ایاز نے کچھ کہا ہے؟'' اس نے اندازہ لگایا۔

''وہ کچھ کہہ دیتا تو اچھا تھا۔ کم از کم اس تکلیف سے تو بچ جاتے۔ بھرم تو رہ جاتا۔'' پھر وہ جیسے تھک کر کرسی پر بیٹھ گئیں۔ دونوں ہاتھ گود میں رکھ لئے۔ ان کے ہاتھ میں ڈاک کا لفافہ تھا۔

''اس میں کیا ہے؟..... کیا خط ہے کسی کا؟..... عثمان بھائی کا؟'' اس نے سوالوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے لفافہ ان کے ہاتھ سے لینا چاہا۔ انہوں نے لفافے پر اپنی گرفت سخت کی تو اس نے ہاتھ ہٹا لئے۔

''عثمان کا ہی ہے۔ میں نے پچھلے ماہ اسے لکھا تھا کہ وہ امریکہ جا کر ایاز کے بارے میں ساری معلومات اکٹھی کرے۔ کینیڈا سے امریکہ کیا دُور ہے۔ میں نے صرف اشارتاً بتایا تھا کہ ہم عشنا کی شادی ایاز سے کرنا چاہ رہے ہیں۔ اسی کا خط اسی سلسلے میں آیا ہے۔ شاید صبح سے آیا ہوا ہے۔ میں تو باہر گئی ہی نہیں لان کی طرف۔ یہ مجھے ابھی تیمور دے کر گیا ہے۔ گیٹ کے پاس کھیلتے ہوئے اسے ملا تھا۔ شکر ہے، کسی اور کے ہاتھ نہیں لگ گیا۔'' ان کی آواز میں تھکن تھی۔

''کیا لکھا ہے عثمان بھائی نے؟'' اس نے ناخن کھرچتے ہوئے مدھم آواز میں پوچھا۔

''تم بیٹھ جاؤ۔'' انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اسے بیڈ کی سائیڈ پر بٹھا لیا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ممانی جان کیسے مان گئیں۔ اب سمجھ میں آیا کہ اس رضا کے پیچھے کون سی سازش ان کے ذہن میں پل رہی تھی۔'' وہ زہر خند لہجے میں بولیں۔ ''امریکہ میں پہلے سے شادی کر رکھی ہے ایاز نے۔ ایک بیٹی کا باپ ہے۔''

ایٹمی دھماکا پتہ نہیں، کس تاریخ کو ہوا تھا مگر اسے لگا، آج ہی ہوا ہے۔

''سوزی نسلاً فرنچ ہے۔ جس اسٹور پر ایاز کام کرتا تھا، وہ اُس کی ماں کا تھا۔'' آپا

کی آواز بہت دور سے آ رہی تھی، بلکہ دھند میں ان کا چہرہ بھی اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ''دونوں نے شادی کر لی۔ پہلے اس کی ماں راضی نہیں تھی، مگر پھر بیٹی کی ضد پر ہار گئی۔ اب وہ اسٹور سوزی اور ایاز دونوں چلاتے تھے کہ اسٹور کا کام گھاٹے میں جانے لگا۔ رفتہ رفتہ نوبت قرضہ لینے تک آ گئی۔ اب ایاز کے ذمے بینک کا ہزاروں ڈالر کا قرضہ ہے۔ اس کی ماں نے اسے گھر سے نکال دیا ہے اور کہا ہے کہ قرض اور نقصان کی رقم پوری کر کے لائے اور وہ یہ نقصان تمہاری صورت میں پورا کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ کچھ دن پہلے اس نے سوزی کو لکھا تھا کہ رقم کا انتظام ہو گیا ہے۔ اب وہ بہت جلد رقم لے کر آ جائے گا۔ کہاں سے انتظام ہو گا؟ یہ سوال مجھ سے عثمان نے پوچھا ہے اور کہا ہے، اگر یہ انتظام عشنا کی شکل میں ہے تو کبھی ایسا ارادہ بھی نہ کرنا۔ ایاز بہت عیاش انسان ہے۔ وہ یہاں بھی ماں بیٹی کو کنگال کر چکا ہے۔ اسے جوئے کی لت ہے۔ ثبوت کے طور پر اس نے سوزی اور اس کی دو سولہ بیٹی کی ایاز کے ساتھ تصویر بھی بھیجی ہے۔''

انہوں نے لفافے میں سے تصویر نکال کر اس کی بے جان آنکھوں کے سامنے کی۔

وہی گوری رنگت، لمبوترا چہرہ، نیلی آنکھیں، ریڈ منی اسکرٹ میں دو سالہ اپنے جیسی سرخ و سفید بچی کا ہاتھ تھامے، وہ ایاز کی بانہوں میں لپٹی کھڑی تھی۔ اس نے اچٹتی نظر تصویر پر ڈالی اور نظریں جھکا لیں۔

نصیبوں کی لڑائی میں زور ازوری نہیں چلتی۔ اور یہ مقام کم از کم رونے کا نہیں تھا۔ اس لئے اس نے بھی فضول سے آنسوؤں کو باہر نکلنے سے پہلے ڈانٹ دیا۔ کیا اس کی آنکھیں صرف رونے کے لئے بنی تھیں؟ اس نے کیا جرم کیا تھا کہ سپنوں کو اس کی آنکھوں میں داخل ہونے سے پہلے ہی نوچ لیا جاتا تھا۔ ہر ملال اُس کے حصے میں ہی کیوں آئے؟ دھوکا دینے والے کیوں نہ روئیں؟ بدعہد اور جھوٹوں کی بھی تو کچھ سزا ہونی چاہئے، ایک آدھ آنسو ان کی آنکھوں میں بھی آنا چاہئے۔ کس نے حق دیا تھا انہیں کہ لوگوں کے خوابوں کے ساتھ کھیلیں، اپنے خوابوں کو تعبیر دینے کے لئے دوسروں کی زندگیاں کانٹوں میں گھسیٹ ڈالیں۔

''پھر؟'' آپا کا یہ پھر اتنی جامعیت لئے ہوئے تھا کہ جیسے اس کی پوری حیات کو چاٹ لے گا۔

''پورا گھر بھرا ہوا ہے مہمانوں سے، عزت و رسوائی کا سوال ہے۔ ان ماں بیٹے کو تو یہی سزا ملنی چاہئے کہ تم انکار کر دو۔ مگر فاروق کبھی ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ پتہ نہیں وہ

اس گیم کا حصہ ہیں یا نہیں مگر بظاہر تو وہ بہت خوش تھے۔'' وہ جیسے سوچ سوچ کر بول رہی تھیں۔

''کتنا بڑا دھوکا ہے۔ یہ مرد کہیں اپنا روپ دکھانے سے نہیں چوکتے۔ کہیں بچوں کے ذریعے اور کہیں نکاح جیسے مقدس بندھن کے ذریعے عورت کو ایکسپلائٹ کیا جاتا ہے۔ چن چن کر اس کی کمزوریوں کا نشانہ لیا جاتا ہے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایاز ایسا ہو گا۔'' اُن کا لہجہ افسوس بھرا تھا۔ وہ شاک سے نکل آئی تھیں مگر اس کے تو جیسے ہونٹ ہی سل گئے تھے۔

''میرا خیال ہے، میں فاروق سے بات کرتی ہوں۔'' وہ کچھ سوچ کر اُٹھتے ہوئے بولیں۔

''لیکن وہ بھی کبھی نہیں مانیں گے۔ اتنی جگ ہنسائی کہاں سہنے کا حوصلہ ہے ان میں؟'' ان کے اعصاب چٹخنے لگے۔

''خیر، اب ایسے تو نہیں یہ سب ہونے دوں گی میں۔ میں بات کرتی ہوں فاروق سے۔ دیکھتی ہوں کیا کہتے ہیں۔ نہ مانیں تو پھر دیکھیں گے۔ اوپر سے پانچ بجنے والے ہیں، تقریباً سب ہی لوگ آ گئے ہیں۔''

پریشانی سے جیسے ان کے حواس معطل ہوئے جا رہے تھے، اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

''تم فکر نہیں کرو، میں انہیں یہ زیادتی نہیں کرنے دوں گی۔ تم حوصلہ کرو۔'' وہ اُس کا کندھا تھپکتے ہوئے پتہ نہیں کس کو حوصلہ دے رہی تھیں۔ پھر تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل گئیں۔

حوصلہ؟..... کیا اُس نے حوصلے کا ٹینڈر بھرا تھا کہ اس کے سوا کوئی حوصلے کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ فاروق بھائی حوصلہ کریں گے تماشا بننے کا؟ وہ کبھی بھی خاندان بھر میں اپنی اور اپنے ماں جائے کی ناک نہیں کٹوانا چاہیں گے۔ ان کا آخری فیصلہ بہر حال نکاح ہی ہو گا چاہے کچھ شرائط کے تحت ہی کیوں نہ ہو۔ اور میں اُس دھوکے باز کے ساتھ کوئی بندھن نہیں باندھ سکتی چاہے وہ کاغذی ہی کیوں نہ ہو۔ اور کیا آپا حوصلہ کریں گی شوہر کی مخالفت کرنے کا؟ کیا ممانی جان حوصلہ کریں گی بیٹے کے کرتوت کا سامنا کرنے کا؟ یا خاندان بھر کے سامنے اس جھوٹ کا اقرار کرنے کا؟ جب کسی میں اتنا حوصلہ نہیں تو میں کیوں کروں؟ ان کے جھوٹ کو سر جھکا کر تھپکی دے دوں اور پھر ساری زندگی لمحہ لمحہ جلتی رہوں، ان کی لمحے بھر کی شانتی کے لئے دکھوں کی بھٹی میں چھلانگ لگا دوں۔

وہ خط اُٹھا کر پڑھنے لگی۔ نظریں لفظوں پر تھیں اور دھیان حل کی طرف۔ پھر جیسے حل اُس کی سمجھ میں آ گیا، لفافہ اُٹھا کر خط اور تصویر اس میں ڈالے اور اسے تکیے کے نیچے رکھا۔ بیڈ کے نیچے سے چھوٹا سفری بیگ نکالا، الماری سے دو جوڑے کپڑوں کے گھسیٹ کر بیگ میں ڈالے، الماری کے اندرونی خانے کا لاک کھول کر ساری ڈاکومنٹس نکالیں، دراز سے ساری رقم اور تھوڑی سی جیولری، جو وہ کبھی کبھار پہن لیتی تھی، نکال کر بیگ میں ڈالی، چادر الماری سے نکال کر اچھی طرح اوڑھی۔ اس طرح کہ سوائے آنکھوں کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

ایک سرسری سی نظر اس نے مڑ کر کمرے پر ڈالی۔ یہ فیصلہ اگرچہ جذباتی تھا، مگر سوچ سمجھ کر تو پلاننگ کی جاتی ہے۔ اور پلاننگ کا وقت کس کے پاس تھا۔ اس سے پہلے کہ وضع داری اُس کو جکڑ لے یا آپا کی سماجت اُس کا دل پگھلا دے، اُسے عملی قدم اٹھا لینا چاہئے تھا۔ اگرچہ اس طرح وہ آخری ووٹ سے بھی محروم ہو سکتی تھی۔ آخری پناہ گاہ، آخری رشتہ۔ اور دنیا بے سائبانوں کا کیا حشر کرتی ہے، اس کی بھی اسے خبر تھی۔ مگر وہ یہاں رہ کر اپنوں کے ہاتھوں یہی حشر نہیں کروا سکتی تھی۔ اُس کا یہ بے باک قدم ہمیشہ کے لئے اسے بدنامی و رسوائی کے اندھے غار میں بھی دھکیل سکتا تھا۔ مگر اسے کچھ پروا نہیں تھی۔ اس وقت وہ پہلے والی عشنا بن گئی تھی۔ ضدی اور نڈر، ہر خطرے اور پریشانی پر امان سے کہنے والی I don't care (مجھے پروا نہیں) اور جو رشتے آپ کو زندہ دفن کرنے کے درپے ہوں، ان سے بچھڑ جانا ہی اچھا ہے۔ وہ ساری کشتیاں جلا کر دھیرے سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ برآمدے میں کوئی نہیں تھا۔ آوازیں کمروں سے آ رہی تھیں۔ لوگ تیاریوں میں مصروف تھے۔ وہ تیز قدموں سے باہر نکل آئی۔

لان کے پرلے سرے پر فاروق بھائی لائٹنگ والے سے اُلجھ رہے تھے۔ تیمور اور عنم دوسرے بچوں کے ساتھ ان کے قریب ہی کھیل رہے تھے۔ وہ ان سب کی نظروں سے چھپتی چھپاتی گیٹ کراس کر گئی۔ باہر شام ڈھل رہی تھی۔ کھلا آسمان دعوتِ پرواز دے رہا تھا۔ مگر کدھر؟ ایک لمحے کی سوچ نے اُس کے قدم ڈگمگا دیئے مگر پھر اس نے سر جھٹکتے ہوئے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔ موڑ مڑتے ہی اس نے سواری کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ سڑک پر اس وقت ٹریفک بہت کم تھا۔

''ایک تو اتنی دُور اُتار دیا ہے، اوپر سے پانچ روپے زائد مانگ رہے ہو۔ اچھا اندھیر مچایا ہوا ہے تم لوگوں نے۔'' رکشے کے شور میں بھی اس نے زیبی کی تیز آواز

پہچان لی تھی۔ وہ موڑ کے پاس ہی رکشے سے اُتر رہی تھی۔ عشنا تیزی سے اس کی طرف بڑھی جو رکشے والے کے ساتھ جھگڑ رہی تھی۔

''زیبی!'' اس نے اس کے بازو کو جھٹک کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے دھیمی آواز میں پکارا۔

''کیا ہے؟..... کون ہے؟'' وہ کچھ جھنجلا کر پلٹی۔ ''کون؟'' اُس کی آنکھوں میں تحیر تھا۔

''میں ہوں، عشنا۔ پلیز یہاں سے چلو۔'' کہتے ہوئے چھلانگ مار کر رکشے میں بیٹھ گئی اور بیگ قدموں کے پاس رکھ لیا۔ زیبی حیرانی سے اسے دیکھے گئی۔

''آؤ نا، پلیز جلدی کرو۔ اتنا وقت نہیں ہے۔'' اس نے آگے بڑھ کر زیبی کا بازو پکڑ کر کھینچا۔ وہ حیرت زدہ سی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''اب کہاں جانا ہے بی بی جی؟'' رکشے والا کچھ بیزاری سے بولا۔

''کہاں جانا ہے؟'' زیبی نے اپنی حیرت پر قابو پا کر اس سے پوچھا۔

''مجھے پناہ چاہئے۔ جہاں تم لے چلو۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''رکشے والے! جہاں سے مجھے لیا تھا، وہیں لے چلو۔'' اس نے منہ آگے کر کے رکشے والے سے کہا۔

''اچھا تماشا ہے جی۔ آپ کیا صفا و مروہ پر دوڑیں لگائیں گی؟ اب کے پیسوں پر جھگڑا نہیں کرنا بی بی جی! اگر ڈبل کرایہ منظور ہے تو لے چلتا ہوں ورنہ آپ اُتر جائیں۔'' رکشے والا بھی گرم مزاج کا تھا، بگڑ کر بولا۔

''اچھا لے لینا بابا! مگر اب ذرا جلدی کرو۔'' عشنا نے تیزی سے کہا۔ شیشے میں اسے لگا، پیچھے سے فاروق بھائی کی وہائٹ کرولا آ رہی ہے۔ وہ مزید پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔ اب تک تو یقیناً خبر پھیل چکی ہوگی۔ اس نے سوچا۔

''ارے بی بی! اتنی جلدی آ بھی گئیں۔'' دروازہ کھولنے والی اُنیس بیس سال کی دراز قامت لڑکی نے حیرت سے زیبی کی شکل دیکھ کر کہا۔ اس کا رنگ زیبی سے صاف تھا اور آنکھیں بھی کشادہ تھیں اور لمبی پلکوں نے ان پر سایہ کر رکھا تھا۔ وہ یقیناً زیبی کی بہن تھی مگر اس کا پہلا تاثر خوب صورتی تھا۔

''ہاں، بس جلدی آ گئی۔'' زیبی نے مبہم انداز میں کہتے ہوئے عشنا کو راستہ دیا۔

''یہ میری دوست ہیں۔ آں.....'' وہ کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ ''عاشی۔''

عشنا نے کچھ حیرت سے زیبی کی طرف دیکھا تو اس نے ہلکے سے اس کا ہاتھ دبا کر

اسے آگے بڑھنے کو کہا۔

''فنکشن اتنی جلدی ختم ہو گیا۔'' وہ ان کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔ ''آپ کہہ رہی تھیں، دیر سے آؤں گی۔''

''ہاں بس میں ذرا لیٹ گئی تھی، اس لئے۔'' زیبی نے پلٹے بغیر جواب دیا۔

''بے بے سو رہی ہیں؟'' اس نے رک کر بہن سے پوچھا۔

''نہیں، جاگ رہی ہیں۔''

''ہاں عاشی! یہ موتیا ہے، میری چھوٹی بہن۔ اصل نام تو اس کا اُم کلثوم ہے، مگر میں اسے موتیا ہی کہتی ہوں۔'' وہ کاریڈور میں رک کر تعارف کروانے لگی۔ دراصل جس دن یہ پیدا ہوئی نا تو اس دن ہمارے موتیے کے پودے میں پہلا پھول کھلا تھا، بس میں نے اسے موتیا کہنا شروع کر دیا اور اس نے جو پہلا نام سیکھا، وہ میا تھا۔ توتلی زبان سے زیبی نہ کہا جاتا تو اس نے بی بی کہنا شروع کر دیا اور بڑے ہو کر بھی اس میں کوئی ترمیم نہیں کی۔'' زیبی نے محبت پاش نگاہوں سے چھوٹی بہن کو تکتے ہوئے کہا۔

'میڈیکل کے تیسرے سال میں ہے۔ بہت ذہین ہے۔'' اس کے لہجے میں بہن کے لئے فخر تھا۔

''اندر آؤ، تمہیں بے بے سے ملواؤں۔ اور ہاں یہ بیگ موتیا! میرے کمرے میں رکھ آؤ۔'' اس نے بیگ عشنا کے ہاتھ سے لے کر موتیا کو تھما دیا۔

زیبی کی ماں بستر پر تکیے کے سہارے بیٹھی گہری سانولی رنگت اور براؤن آنکھوں والی، گھٹے ہوئے جسم کی عورت جوانی میں بہت مضبوط توانا رہی ہوگی۔ مگر اب تو شاید زندگی کی شام ڈھلنے کو تھی۔ چہرے پر جھریوں کا جال اس بات کا گواہ تھا اور کانپتے ہوئے اعضاء اپنی ناتوانی کا اعلان کر رہے تھے۔

''یہ میری بے بے ہیں۔ مجھے اس جہان کی ہر چیز سے بڑھ کر عزیز۔'' زیبی نے آگے بڑھ کر ماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ماں کا رشتہ قدرت نے کیسا عجیب بنایا ہے۔ گوری ہو یا کالی ہو، بھدی ہو، موٹے ہونٹوں والی یا سفید گالوں والی، اولاد کو سب سے حسین دکھائی دیتی ہے۔ اس کا ہونا ہی اس کی اولاد کو ڈھیر سارا اعتماد عطا کرتا ہے۔ اور زیبی کی ماں کی محبت اس کے اعتماد کا ماخذ دکھائی دے رہی تھی۔

''اور بے بے! یہ میری دوست عاشی ہے، ابھی یہیں رہے گی ہمارے ساتھ۔''

''السلام علیکم جی۔'' اس نے کچھ جھجک کر سلام کیا تو اس نے مسکراتے ہوئے جواب

دیا اور پھر بیٹی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''تُو اتنی جلدی آ گئی۔ میں تو سمجھی تھی، رات تک آئے گی۔''

''بس بے بے! میں دیر سے گئی تھی۔ فنکشن تقریباً اختتام پذیر تھا اور پھر میری یہ دوست مل گئی۔ مدت بعد ملاقات ہوئی ہے۔ بس میں اصرار کر کے اسے ادھر لے آئی۔ دوسرے شہر سے آئی ہے نا۔'' اس نے اونچی آواز میں ماں کے بال سنوارتے ہوئے بتایا۔ عشنا کو لگا جیسے اس کی ماں اس کا محور تھا اور زیبی کی نظریں اسی محور کے گرد گھوم رہی تھیں۔

''چلو پھر دوست کو کچھ کھلاؤ۔ کوئی خاطر داری کرو اس کی۔ تھکی ہو گی وہ۔'' ماں بیٹی کے والہانہ انداز اس کے اندر سیلاب اٹھا رہے تھے۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ چلو عاشی! اندر چلتے ہیں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا بے بے!'' وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی۔

''ارے جھلی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ نہ میری فکر میں رات دن گھلا کر۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اسے لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

''تم یہاں ایزی ہو کر بیٹھو۔ کیا کھاؤ گی؟ بھوک لگی ہو تو کھانا لے آؤں؟''

''نہیں۔'' وہ چادر اتار کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

''اچھا پھر چائے لے آتی ہوں۔ موتیا بنا لے گی۔ اتنے میں، میں ذرا چینج کر لوں۔'' وہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔

'پتہ نہیں، میں نے صحیح کیا کہ غلط۔ پیچھے کیا کیا نہیں ہوا ہو گا۔ ہوا کرے، میں اندھے کنوئیں میں ان کے کہنے پر چھلانگ لگا دیتی۔' پھر رات تک نہ زیبی نے اس سے کچھ پوچھا نہ اس نے بتایا۔

''میرا خیال ہے، اب سونا چاہئے۔ کافی رات ہو گئی ہے۔ میں ویسے تو بے بے کے پاس سوتی ہوں، آج تمہارے پاس سو جاتی ہوں۔'' وہ بستر کی چادر درست کرتے ہوئے بولی۔

''زیبی!'' اُسے لفظ نہیں مل رہے تھے۔

''ہوں!'' اس نے مصروف انداز میں کہا۔

''صبح آفس میں میرا کسی کو نہ بتانا۔'' وہ شاید کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔

''جیسی تمہاری مرضی۔'' وہ بستر پر بیٹھ گئی۔ ''اب سو جاؤ۔ خود کو اتنا نہ تھکاؤ۔''

''ہوں، نیند؟..... نیند تو پہلے ہی مجھ سے خفا رہتی تھی آج تو۔'' اس نے کنپٹیاں

دباتے ہوئے کہا۔

''کوئی ٹرانکولائزر لے لو۔'' اس نے ہمدردی سے کہا۔

''تم مجھ سے کچھ پوچھتیں کیوں نہیں؟'' اس نے اچانک کہا۔

''اگر تم کہنا چاہتی ہو تو کہہ ڈالو۔ اگر نہیں تو میں اصرار نہیں کروں گی۔'' اس نے سہولت سے کہا۔

''کہے بغیر کیسے نیند آئے گی؟'' پھر اس نے کہنا شروع کر دیا۔ لا ابالی و بے فکری کے دنوں سے لے کر مصائب و آلام میں گھرے دنوں تک۔

''ہوں، تم نے جو کیا، سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔'' اس نے ساری بات سن کر غیر جانبداری سے کہا۔

''تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہئے تھا؟''

''ہر انسان وہی کرتا ہے جو اس کے حالات تقاضا کرتے ہیں۔ تم نے بھی اپنے تئیں ٹھیک ہی کیا۔ ہر شخص تمہارے اس عمل کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھے گا اور اپنی اپنی ذہنیت کے مطابق فیصلہ کرے گا۔ عمل کرنا ہمارے بس میں ہے۔ نتیجے کو حسبِ خواہش لانا ہمارے بس میں نہیں۔ چلو اب جو ہوا، اچھا ہی ہوا۔ اسے ایسا ہی ہونا ہوگا۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

''ہوں۔'' وہ دونوں چپ کر گئیں۔

''تم لوگ اکیلی رہتی ہو؟'' عشنا کا مطلب وہ سمجھ گئی۔

''اکیلی؟ تین اکیلی کیسے ہو سکتی ہیں؟ اس اکیلے پن نے تو مجھے پاگل بنا دیا تھا۔ قدرت جو کچھ ہمارے لئے تجویز کرتی ہے، اگر ہم اس سے متفق نہ ہوں تو بہت تکلیف اُٹھاتے ہیں۔ میں نے بھی اس اکیلے پن کے برعکس چاہا تھا بلکہ اس کو بدلنا چاہا تھا۔ اس مرد کے معاشرے میں مرد کے بغیر زندگی گزارنا کس قدر دشوار ہے، یہ مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جان سکتا۔''

''تمہارے والد؟'' وہ اس کے سابقہ بیانات دہرانا نہیں چاہتی تھی۔

''وہ صرف ہمیں جنم دینے کا ذمہ دار تھا۔ اس کے علاوہ وہ ہمارا باپ تھا۔ ہمارا اس سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ نہ انسانیت کا، نہ رفاقت کا، نہ محبت کا۔ اسے صرف خود سے محبت تھی۔ اپنی ذات سے اور اپنے بیہودہ دوستوں اور دلچسپیوں سے۔ گاؤں میں چوہدری کے ڈیرے پر سارا دن بھنگ گھوٹنا اور پھر بھیک میں ملی ہوئی بھنگ پی کر نشے میں دھت

ہو کر پڑے رہنا۔ گاؤں میں ہماری تھوڑی سی زمین تھی، وہ بھی ویران پڑی تھی۔ کون اسے محنت سے آباد کرتا؟ پتہ نہیں، گاؤں کے جفاکش ماحول میں رہتے ہوئے کب کاہلی کا زہر اس کی رگوں میں اُترا۔ چوہدری کے ڈیرے پر جوا ہوا کرتا تھا، ابا کو بھی یہ لت لگ گئی۔ غربت کی طرح برائی بھی کبھی تنہا نہیں آتی، اپنی طاقت کے مظاہرے کے لئے بہت سی برائیوں کو ہمراہ لاتی ہے۔ جوئے کے ساتھ نشہ، پہلے چرس اور افیون اور پھر آگے تک وہ تھوڑی سی زمین بھی بے آسرا ہو گئی۔ بے بے نے مامے کی منت کی تو وہ زمین کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ گھر کا دال دلیا چلنے لگا۔ ماما بالکل تنہا تھا بیوی کی وفات کے بعد۔ اللہ نے اسے ہمارے رزق کا وسیلہ بنا دیا۔ گھر کا چولہا جلتا دیکھ کر ابے کو ہر دوسرے چوتھے دن رقم کی ضرورت پڑنے لگی اور پھر وہی ہونے لگا جو ہر نشہ خور کے گھر میں ہوتا تھا۔ بیوی کی پٹائی اور اسبابِ حیات کی فروخت۔ گاؤں کے اسکول سے آٹھویں کرنے کے بعد میں شہر آ گئی۔ پھر اپنے زورِ بازو پر بی اے بھی کر لیا۔ خدا کا شکر ہے کہ بغیر سفارش کے نوکری بھی فوراً مل گئی۔ موتیا ان دنوں نائکھ میں تھی، جب مامے کے انتقال کے بعد ابا زمین بیچنے کے لئے پَر تول رہا تھا۔ میں نے شہر میں ایک وکیل سے مشورہ کیا اور زمین کے کاغذات بنوا کر نشے کی حالت میں ابے سے انگوٹھا لگوا لیا۔ بے شک میں نے غلط کام کیا مگر اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی نہ تھا اور غلط اور صحیح کا سوال وہاں اُٹھتا ہے جہاں پیٹ بھرا ہو۔ خالی پیٹ یہ نظریات ہضم نہیں ہوتے۔

اسی وکیل کے توسط سے میں نے زمین فروخت کر دی۔ اگر ہم پاتال میں بھی جا چھپتے تو ابا ہمیں ڈھونڈ نکالتا۔ اڈے پہ جوا ہو رہا تھا۔ کھلے عام نشہ فروخت ہوتا، کتنے گھروں کے چراغ اس زہر سے بجھ رہے تھے۔ چودھری کی طاقت کے آگے کوئی نہیں بول سکتا تھا۔ میں نے مخبری کر دی۔ کامیابی کی امید تو اگرچہ کم تھی مگر نیا ایس پی نوجوان خون تھا۔ ایمانداری اور فرض شناسی کے اصولوں سے لبالب بھرا ہوا۔ جیپ بھر کر فورس لے گیا، رنگے ہاتھوں سب پکڑے گئے۔ میں نے تو ابے کے لئے بڑا آسان راستہ چنا تھا، اس کے گناہوں کے کفارے کے لئے جیل کی سلاخیں۔ مگر اس نے کبھی نہ ختم ہونے والے عذاب کو سینے سے لگایا۔ اس نے کانسٹیبل کی بندوق چھین کر خود کو گولی مار لی۔ لوگ کہتے ہیں، نشے میں وہ دیوانہ ہو رہا تھا۔ وہ نشے میں نہ بھی ہوتا تو بھی یہی کچھ کرتا۔ بزدلوں کو زندگی سے فرار کا اور کوئی راستہ جو نہیں نظر آتا۔ پھر میں ان دونوں کو لے کر شہر آ گئی۔ بڑی بھاگ دوڑ کے بعد یہ گھر خریدا۔ مگر سکون اور احساسِ تحفظ ابھی تک نہیں خرید

پائی۔" اس کا لہجہ نم ناک تھا۔

"بے بے گاؤں میں ابے کی مار کھاتی تھی اور کبھی بیمار نہیں ہوتی تھی۔ یہاں میں نے اتنا اچھا گھر لیا ہے۔ ہر طرح کی سہولت ہے، عزت ہے، محبت ہے، مگر اسے سرسوں کی خوشبو راتوں کو سونے نہیں دیتی۔ گاؤں کی ٹوٹی پھوٹی گلیاں، کچے پکے راستے، کھیتوں کی منڈیریں اور ٹیوب ویل کا ٹھنڈا پانی یاد آتا ہے۔ گندم کی بالیاں، دھان اور کماد کی فصلیں، رہٹ کی آواز، بیلوں کے گلے میں پڑی گھنٹی کی آواز اُسے چین نہیں لینے دیتے۔ یہ ان آوازوں کی، خوشبوؤں کی اسیر ہے۔ ہم کسی کے جسم کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر سکتے ہیں مگر اس کی روح کو ہجرت پہ مجبور نہیں کر سکتے۔ بے بے کی روح ان ہی گرد آلود پگڈنڈیوں میں کسی نیم کی چھاؤں تلے ستاتی رہ گئی ہے۔ ماضی کو ہم کسی بھی صورت اپنے ذہن سے کاٹ کر نہیں پھینک سکتے۔ موتیا ایم بی بی ایس کر لے۔ تین سال رہ گئے ہیں۔ تھرڈ پروفیشنل میں ہے وہ، پھر اِنشاء اللہ ہم بے بے کو گاؤں لے کر جائیں گے۔" اس نے اُمید بھرے لہجے میں کہا۔

"شہر میں آتے ہی جیسے بے بے ڈر گئی، عدم تحفظ کے احساس سے۔ وہاں گاؤں میں لوگ کتنے ہی ظالم ہو جائیں، اپنے لوگوں کی عزت کرتے ہیں، ان کی چادروں کی حفاظت کرتے ہیں۔ مگر شہروں میں تو ہمسایہ بھی ہمسائے سے بے خبر نظر آتا ہے۔ یہاں آتے ہی بے بے کا اصرار کہ میں شادی کر لوں، کسی مرد کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔ اور اس معاشرے کے مرد، جن کے لئے اکیلی عورت کسی دلفریب اشتہار سے کم نہیں۔ سب تو شاید نہیں مگر میرے تجربے میں جتنے آئے، سب کے سب لالچی، حرص و ہوس کے دیوانے۔ سب کی تان اس گھر کی ملکیت پر آ کر ٹوٹتی، سب ہی نیتوں کے گندے نکلے۔

اصل میں مجھ سے بھی بہت حماقتیں سرزد ہوئیں۔ انسان، انسان کے کام آتا ضرور ہے۔ مگر ضروری نہیں، جو دکھ درد سنے وہ ہاتھ پکڑ کر سہارا بھی دے۔ میں دم بھر کے ساتھ کو رفاقت سمجھتی رہی۔ میں یہ لیبل خود پر لگانا چاہتی تھی کہ میں تنہا نہیں ہوں، ہم تنہا نہیں ہیں، ایک مرد کے زیر سایہ ہیں۔ مگر جب یہ سایہ ہم سے کھڑے ہونے کی جگہ بھی چھیننے لگا تو میں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ان تجربوں نے مجھے لوگوں کی پہچان کروا دی ہے۔ مگر بے بے کی بچوں جیسی ضد اور اب ایک نیا اصرار کہ مجھے حج کرواؤ۔ میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کروں، مگر اس کے لئے بھی شرط ہے محرم کی اور میں محرم کہاں سے لاؤں؟"

کتنے غلط اندازے تھے تنزہ کے اس فرمانبردار زیبی کے بارے میں۔ آنکھیں اور

کان ہمارے کتنے بے اعتبار وسیلے ہیں۔ حقائق کے سفر میں قیاس، اندازے، قیافے محض ان ہی کی بنیاد پر ہم دوسروں کی کمزوریوں پر اپنے حتمی اور بے رحم رویوں کی عمارت کھڑی کر لیتے ہیں اور یہی اندازے اور قیافے آج سب نے اس کے بارے میں لگائے ہوں گے۔ امینہ آپا کی کہانی کس کس کو مطمئن کرے گی؟ اور پتہ نہیں، انہوں نے سچ بتایا بھی ہو گا کہ نہیں۔ فاروق بھائی نے کیا طوفان اٹھایا ہو گا اور ممانی نے تو اس کے مرحوم والدین کو بھی نہیں بخشا ہو گا طعن و تشنیع کرتے وقت۔ بدنامیوں اور بدگمانیوں کا ایک سیلاب اُٹھا ہو گا جو اُس کی ساری نیک نامی کو بہا لے گیا ہو گا۔ بستر میں یکایک جیسے کانٹے اُگ آئے۔

جو مرضی سوچیں، مجھے پروا نہیں۔ میرا ضمیر مطمئن ہے اور میرے ہاتھ بھی صاف ہیں۔ کم از کم میں نے کسی کو دھوکا نہیں دیا۔

سوچتے سوچتے پتہ نہیں کب اس پر نیند مہربان ہو گئی۔

❖❖○❖❖

نہ پوچھ دل کی تڑپ کو، ان خوابوں کی چبھن کو
آنکھوں کو جن کی قید سے ہم نے رہا کیسے کیا
پھول سا نازک دل، تتلی سے نازک خواب
نہ پوچھ زمانے کی آندھیوں کو ہم نے روا کیسے کیا

پھر اسے وہاں رہتے ہوئے کئی دن گزر گئے۔ زیبی کا اندر اسے پہلے دن سے بھی زیادہ اُجلا اور شفاف لگا۔ پتہ نہیں، وہ واقعی ایسی ہی تھی یا قدرت نے عشنا کے لئے اسے اس قدر مہربان کر دیا تھا۔ زیبی نے بتایا، اس روز باہر کے لوگوں کو یہ کہہ کر واپس کر دیا گیا کہ خاندان میں فوتگی ہونے کی وجہ سے تقریب ملتوی کر دی گئی ہے اور خاندان میں یہ اُڑایا گیا کہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

اُسے توقع تھی کہ اس پر یہی الزام لگایا جائے گا۔ اس سے زیادہ پستی میں اسے نہیں گرایا جا سکتا تھا۔ ایک دن زیبی کے کہنے پر امینہ آپا سے ملنے گئی۔ وہ اس سے بہت خفا تھیں۔ اس نے بھری سسرال میں ان کی ناک کٹوا دی تھی۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ ممانی جان تو انہیں بھی برخاست کرنے پر تل گئی تھیں کہ انہوں نے ہی عشنا کو کسی کے ساتھ بھگایا ہے۔ اس روز گھر میں بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ وہ ایاز کا نکاح اسی وقت کسی اور سے کرنے پر تیار تھیں، مگر ایاز بدک گیا۔ آج کل وہ واپس جانے کے

چکر میں ہے۔

ظاہر ہے، یہ سب باتیں اس کو کمزور کرنے والی تھیں۔ مگر اب ان باتوں کا وقت گزر چکا تھا۔ اس لئے پچھتانے سے کیا حاصل۔

''ایسے کب تک چھپ کر بیٹھو گی؟ تمہاری چھٹی بھی طویل ہوتی جا رہی ہے۔ باہر نکلو، دنیا کو فیس کرو۔'' زیبی اُسے اُکساتی۔

''ابھی ٹھہر جاؤ۔ میں کچھ حوصلہ تو کر لوں۔ اگرچہ میں کسی سے ڈرتی نہیں، مگر میں بہت بہادر بھی نہیں ہوں۔''

''اس طرح تو لوگوں کو اور موقع مل جائے گا باتیں بنانے کا۔ پہلے ہی آفس میں چہ مگوئیاں ہو رہی ہیں۔ وہ فاروق بھائی جو اس دن سن گن لینے آ گئے تھے۔''

''لوگوں کا اور کیا کام ہے۔'' وہ بظاہر لاپروائی سے بولی۔

''ہاں یاد آیا۔ آج تنزہ آئی تھی آفس۔ مجھ سے تو خیر اس نے کچھ نہیں پوچھا، عمرانہ وغیرہ سے تمہارا پوچھا تھا۔ میرا خیال ہے، وہ گھر سے ہو کر آئی تھی۔ اگر کہو تو اسے بتا دوں؟''

''نہیں، ابھی نہیں۔ کچھ دن ٹھہر جاؤ۔'' پتہ نہیں اسے کس بات کا انتظار تھا۔ پھر ایک دن اُس کا انتظار ختم ہو گیا، جب زیبی دفتر سے آئی تو اُس کے ہاتھ میں خاکی لفافہ تھا۔ وہ دروازے سے ہی اسے پکارتی آ رہی تھی۔

''عشنا! یہ تمہارے نام آیا تھا آج آفس میں۔ نوید صاحب سے میں نے لے لیا کہ تمہارے گھر پہنچا دوں گی۔ محکمہ تعلیم کی طرف سے ہے، باہر اسٹیمپ لگی ہے۔ میرا خیال ہے، یہ تمہارا اپائنمنٹ لیٹر ہے۔ ذرا دیکھو۔'' اُس نے جوش سے لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ عشنا نے بھی بے تابی سے کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا تھا۔

''کیا ہے؟ بتاؤ نا۔'' زیبی نے آگے ہو کر پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، تمہارا خیال صحیح ہے۔ وہی ہے، اپائنمنٹ لیٹر، ایز اے لیکچرار آف فلاسفی اِن سرگودھا ڈگری کالج فار ویمن۔'' اس نے پوری لائن پڑھی۔

''مبارک ہو بہت بہت۔'' اس نے خوش دلی سے اسے مبارکباد دی۔ ''مگر تم اتنی دور کیسے جاؤ گی؟'' اس نے کچھ فکرمندی سے کہا۔

''کتنی دُور، کوہ قاف سے بھی پرے؟ کتنی دُور ہو گا یہ شہر؟ اور ویسے بھی تمہارے

خیال میں یہاں میں کون سا اپنے گھر میں بیٹھی ہوں۔ جب بھٹکنا ہی ٹھہرا تو کیا اِس شہر، کیا اُس شہر۔'' اس نے لفافہ بند کیا۔

''تو کیا تم واقعی جاؤ گی؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

''یس، آف کورس۔ بھئی یہ تو میرا خواب تھا۔ اور پھر ان حالات میں یہ شہر بدری تو میرے لئے تحفۂ الٰہی ہے۔ یہ سب کچھ نہ ہوتا تو بھی۔ خیر، پانچ تاریخ کو مجھے جوائن کرنا ہے، ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔'' اس نے حساب لگایا۔

پھر اس ہفتے کے دوران اس نے کچھ شاپنگ کی۔ تنزہ سے ملنے گئی۔ ساری بات سن کر وہ حیران رہ گئی۔ امینہ آپا تو بہت غصے میں تھیں، جیسے سارا قصور اُسی کا تھا۔

''تم نے جو کیا، صحیح کیا۔ میں بھی ہوتی تو یہی کرتی۔'' تنزہ نے اس کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔

پھر پانچ تاریخ کو صبح نو بجے کے قریب زیبی اسے اسٹیشن چھوڑنے آئی، اسے سیٹ پر بٹھا کر تاکید کر گئی کہ جاتے ہی فون کر دینا۔

جیسے ہی کوچ شہر سے باہر نکل کر مضافات میں داخل ہوئی، اُس کی آنکھیں خود بخود بھیگنے لگیں۔ پہلی بار اماں اور بابا کے بغیر وہ شہر سے باہر جا رہی تھی۔ اسے واقعی کالے پانی کی سزا ملی تھی۔ جیسے کوئی مجرم جیل کی سلاخیں توڑ کر فرار ہوتا ہے۔ اس شہر کی زمین بھی بالآخر اس پر تنگ ہو گئی تھی۔ حالات و واقعات کچھ اس حد تک ہماری زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں کہ فرار کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ اگرچہ یہ فرار ایک دھوکا سہی مگر فی الحال یہ دھوکا دینا خود کو ضروری تھا۔ انتخاب کے مرحلے تو بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ اُس نے سوچتے ہوئے آنکھیں بند کر کے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا لیا۔

❖❖○❖❖

اجنبی شہر کے اجنبی راستے، اجنبی چہرے اس کے اردگرد تھے۔ بلکہ شاید اجنبی تو ہم ہوتے ہیں۔ اور یہ اجنبیت بھی اس کے لئے فائدہ مند تھی کہ کوئی اس کے بارے میں نہ تو جانتا تھا اور نہ جاننے کا متمنی تھا۔ پھر کالج کی اپنی زندگی تھی۔ پڑھنے کے بعد پڑھانا اسے ایک دلچسپ عمل لگا تھا۔ تروتازہ، فریش چہرے زندگی کی اُمید سے سجے ہوئے، علم کی لگن لئے ہوئے، بار بار اُسے ماضی کی طرف لے جاتے اور اس کے ماضی میں تو اتنی کشادگی تھی کہ اسے اپنے اندر سمیٹنے میں ایک پل نہ لگاتا۔

پھر بھی وہ پوری توجہ اور دیانت داری سے اپنا فرض انجام دے رہی تھی۔ بہت جلد

وہ اپنے کالج میں مقبول ہو گئی۔ لڑکیاں اس سے محبت کرنے لگی تھیں، اس کے بارے میں جاننا چاہتی تھیں، اس سے باتیں کرنا چاہتی تھیں۔ شاید جب ہم گم نام ہونا چاہتے ہیں تو یہی خواہش ہمارے اندر دوسروں کے لئے کشش کا باعث بنتی ہے۔ وہ جتنا محفلوں سے بھاگتی، اتنا لوگ اس سے گھل مل جانا چاہتے تھے۔ واقعی محبت کا دامن کبھی تنگ نہیں ہوتا۔ جب تک ہم زندہ رہتے ہیں، کسی نہ کسی سے مل ہی جاتی ہے۔ ان ہی محبتوں نے اسے ماضی کی تلخیوں کو بھلانے میں مدد دی تھی۔

تنزہ اور زیبی کا اکثر فون آ جاتا۔ تنزہ تو ہفتے میں ایک بار ضرور فون کرتی تھی، زیبی البتہ خط لکھا کرتی تھی۔ مہینے میں اس کا ایک خط آ جاتا تھا۔ ہوسٹل کی ویران زندگی میں یہی دو چیزیں اس کا سہارا تھیں۔ جب ویک اینڈ پر ہوسٹل کے کمروں میں شور شرابہ ہوتا اور گیٹ پر طالبات اور ٹیچرز کو لینے آنے والوں کا رش ہوتا تو اِک بے کلی سے اُس کے اندر اُتر جاتی۔ وہ کس قدر اکیلی رہ گئی تھی، یہ احساس اُس کے دل میں جوار بھاٹا اُٹھا دیتا۔ احساسِ محرومی کچھ اور شدت سے بڑھ جاتا۔

دن یونہی دھیرے دھیرے گزرنے لگے۔ اسے پتہ بھی نہیں چلا، کب دسمبر کے بعد جنوری، فروری اور پھر مارچ بھی گزر گیا۔ آگے صرف دو ماہ تھے، پھر تین ماہ کی طویل چھٹیاں۔ وہ چھٹیوں میں کہاں جائے گی؟ زیبی کو تکلیف دینا وہ اب مناسب نہیں سمجھتی تھی، اس لئے اُس کے اصرار کے باوجود اس نے دسمبر کی چھٹیاں بھی ہوسٹل کے اسی سرد کمرے میں تنہا گزار دیں۔ کھڑکی میں کھڑے ہو کر خزاں کے اک اک عمل کو اس نے جیسے دل میں اتارا تھا۔ جب سارے درخت ویران ہو رہے تھے تو اسے لگا کہ کوئی ہے اس دنیا میں جو اس کی طرح اُداس ہے۔ چاہے خزاں ہی سہی۔ مگر اب تو دس دن کی نہیں، اکٹھے تین ماہ کی چھٹیاں تھیں۔

امینہ آپا کا دل اگرچہ پسیج چکا تھا اور انہوں نے تنزہ سے کہا تھا کہ وہ فون پر ان سے بات کرے۔ مگر وہ انہیں اب اپنی وجہ سے کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ اس لئے تنزہ کی بات کو ان سنی کر گئی۔ کیا کروں؟ پھر زیبی کی طرف پتہ نہیں اس کا خط کیوں نہیں آیا۔ میرے پچھلے خط کا بھی اس نے جواب نہیں دیا۔ دو ماہ سے اوپر ہو گئے اسے خط لکھے۔ وہ دیوار پر لگے کیلنڈر پر دن گننے لگی۔ حیرت ہے۔ وہ کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ باہر لان میں رنگ رنگ کے پھول کھل رہے تھے۔ موسم بہار کی آمد تھی۔ کیا بہار، کیا خزاں۔ اس کی زندگی میں تو جیسے ایک ہی موسم، ایک ہی رُت ٹھہر سی گئی تھی۔ اُداسی

اور تنہائی کی۔ دسمبر میں یہ لان اسے بہت اچھا لگتا تھا، اس کی اپنی حالت جیسا اُجڑا اُجڑا۔ اور جب تیز سرد ہوائیں چلتیں تو درختوں کے خزاں رسیدہ پتے شور مچانے لگتے تو اسے یہ شور بھی اچھا لگتا۔ مگر اب تو جیسے گھاس نے، درختوں نے نیا لباس پہن لیا تھا۔ ہرا ہی ہرا۔

پھر تین چار دن بعد ہی اسے زیبی کا خط ملا۔

''ڈیئر عشنا!

السلام علیکم۔

خدا تمہیں زندگی کی تمام خوشیوں سے نوازے۔

تم حیران ہو رہی ہو گی کہ میں نے دو ماہ سے تمہیں کوئی خط کیوں نہیں لکھا۔ مگر میرے لئے یہ دو ماہ تو جیسے کسی طوفان کی طرح آئے اور گزر بھی گئے۔ تم سوچ رہی ہو گی، ایسا کیا ہوا کہ مجھے وقت کا احساس ہی نہ ہو سکا۔

پچھلے پانچ چھ ماہ سے بلکہ کئی مہینوں سے موتیا کا اپنے ایک کلاس فیلو کے ساتھ افیئر چل رہا تھا۔ مجھے کچھ اندازہ تو تھا مگر وہ یہ کچھ کر لے گی، یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ میں نے تو اس کے متعلق بہت بلند خواب دیکھے تھے اور اس نے ان خوابوں کو اتنی ہی بلندی سے نیچے گرایا کہ مجھے تو کیا، سارے زمانے کو ان کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے عاصم کے ساتھ کورٹ میرج کر لی۔

میں نے پتہ نہیں کیا کیا سوچ ڈالا تھا اس کے متعلق۔ اور وہ اندر سے وہی نکلی، اک گھر اور مرد کی چاہ میں سب کچھ تج دینے والی عام سی لڑکی۔ لیکن اگر وہ عام سی بھی ہوتی تو مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا، اس نے مجھے زمین سے اٹھا کر پاتال میں دے مارا۔ اسے میرے کردار پر شک تھا۔ بلکہ شک تو بہت چھوٹا لفظ ہے۔ اُسے مجھ سے نفرت تھی کیونکہ میں اس کے باپ کی جائیداد ہضم کرنے کے چکر میں تھی اور وہ مجھے ایسا کچھ نہیں کرنے دے گی۔ اس نے مکان کی تقسیم اور رقم کے بٹوارے کا نوٹس بھجوایا۔ اگر بے بے کا خیال نہ ہوتا تو یقین کرو، میں اسی گھڑی گلے میں پھندا ڈال کر جھول جاتی۔

میں ابھی اگلے قدم کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ بے بے نے ایک ہی جست میں سارے فاصلے طے کر لئے۔ انہیں شاید موتیا کی بہت فکر تھی۔ اُس کی فکر سے آزاد ہوتے ہی انہوں نے زندگی سے آزادی حاصل کر لی۔ میری بہن کو کوئی فکر نہیں تھی، کیونکہ انہیں معلوم تھا، میں بہت سخت جان ہوں۔ جو دوسروں کو پار لگانے کا عزم لے کر

نکلتے ہیں، وہ لوگوں کے نزدیک سخت جان ہی ہوتے ہیں، اسی لئے انہیں بھنور میں بھی اپنے لئے خود ہی رستے بنانے پڑتے ہیں۔ آخری لمحات میں ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لب پھڑ پھڑا رہے تھے۔ میں نے چہرہ ان کے قریب کیا تو کہنے لگیں۔ ''زیبیے! اللہ تیرا نگہبان۔''

آنسوؤں کے قطروں نے تحریر کا کچھ حصہ مٹا دیا تھا۔

''پھر تمہیں پتہ ہے، جس کا اللہ نگہبان ہو جائے، اسے کسی کی نگہ داری کی حاجت باقی نہیں رہتی۔

میں نے بے بے کے گزرنے کے چند دن بعد ہی مکان بیچ دیا۔ آدھی رقم موتیا کو دے دی۔ سارے کھاتے صاف کر کے میں ویمن ہوسٹل میں آ گئی۔ میں سمجھی تھی کہ اب باقی ماندہ زندگی یہیں کٹے گی، مگر خدا کو ایسا منظور نہیں تھا۔

سہیل سنگاپور کے لئے ٹکٹ کنفرم کروانے آیا تھا۔ وہ کاسمیٹکس پروڈکٹس ایکسپورٹ کرتا تھا۔ ٹکٹ کے سلسلے میں دو تین دن آتا رہا، نوید صاحب کا دوست تھا۔ پتہ نہیں قدرت نے اسے میرے لئے بھیجا تھا۔ بہرحال، سنگاپور سے ایک ہفتے بعد وہ سیدھا نوید صاحب کے پاس گیا اور اپنا پیغام میرے لئے دیا۔ میری طرح دنیا میں تنہا ہے۔ نوید صاحب نے اس کی بڑی سفارش کی۔ کتنے دن کے انکار و تکرار کے بعد آج شام ہمارا نکاح ہو گیا۔ رات نو بجے کراچی کی فلائٹ ہے ہماری، میں تمہیں فون نہیں کر سکی۔ بس سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ یہ خط نوید صاحب کو دے کر جا رہی ہوں، وہ صبح پوسٹ کر دیں گے۔ اس کے علاوہ جا کر فون بھی کروں گی اور تمہیں ایڈریس بھی لکھوں گی یا پھر آنے کی کوشش کروں گی۔ اب اجازت دو۔ خفا نہ ہونا، سب کچھ بہت جلدی میں ہوا۔ تم میری مجبوری کا خیال کرو گی۔ اچھا، فلائٹ کا ٹائم ہو چلا ہے۔

خدا حافظ۔ دعا گو زینب۔''

وہ خط پڑھ کر حیران سی بیٹھی رہ گئی۔ واقعی بہت حیرت انگیز بات تھی کہ دو ماہ میں اتنی تبدیلیاں۔ ان سب واقعات نے اسی طرح وقوع پذیر ہونا تھا۔ اپنے مقررہ وقت پر سب کچھ ہو کر رہتا ہے۔ بس، ہم ذرا جلدی مچا دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ کا ہاتھ پکڑ کر کہیں، ابھی کرو۔

بے بے کا جان کر اسے دکھ ہوا۔ اور موتیا۔ یقیناً دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔ فیشن کی طرح لوگ بھی ذرا جلدی بدلنے لگے ہیں۔

'اور اب عشنا بی بی! چھٹیاں کہاں گزاروں گی؟'

اس پریشانی کا خیال آتے ہی اس کی ساری خوشی کافور ہو گئی۔

❖❖○❖❖

ہے اب یہ تمنا کہ تم زندگی کی نوید بن کر آؤ
کسی سحر کا نہ ڈر ہو اس طلسم کی کلید بن کر آؤ
پھوٹے جس کی ہر لہر سے نغمۂ بہاراں
شوقِ تمنا کے اس دریا کی تمہید بن کر آؤ
مٹا دے جو عمرِ رائیگاں کا احساس بھی
ایسا ہی کوئی خواب، کوئی خواہشِ شدید بن کر آؤ

پھر دن گزرنے لگے اور مئی کا مہینہ آن پہنچا۔ زیبی کا ایک خط اور فون آیا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔ سہیل بہت محبت کرنے والا شوہر ثابت ہوا تھا۔ اس کی چچی اُس کے ساتھ رہتی تھیں، وہ بیمار تھیں۔ زیبی کو خدمت کے لئے ایک اور بے بے مل گئی تھی اور وہ اس خدمت گزاری میں بہت خوش تھی۔

مگر وہ کیا کرتی؟ اب تو چھٹیوں کا سرکلر بھی آ گیا تھا۔ پندرہ دن بعد چھٹیاں تھیں۔ تنزہ کا فون آیا تھا، اس نے سرسری سے انداز میں کہا تھا کہ چھٹیوں میں وہ اس کی طرف آ جائے مگر وہ خود ایسا مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ سکندر بھائی کتنے ہی اچھے سہی مگر ان کی اچھائی کو اب برائی میں بدلتے دیکھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ پھر وہ اپنے سسرال میں تھی، جوائنٹ فیملی سسٹم۔ اس پریشانی نے اس کی راتوں کی نیند اُڑا دی تھی۔ کئی بار سوچا کہ اپنے گھر چلی جائے مگر خوف کی سرد لہر اُس کے رگ و پے میں دوڑ جاتی۔

اُس روز وہ سیکنڈ ایئر کی کلاس لے کر نکلی تھی، جب پیون نے اسے بتایا کہ ویٹنگ روم میں اس سے کوئی ملنے آیا ہے۔ وہ بڑی حیران ہوئی کہ اس سے ملنے کون آ سکتا ہے۔ زیبی کا تو پرسوں فون آیا تھا اور تنزہ بھلا کیسے آ سکتی تھی۔ پھر کون ہے؟ وہ خود سے اُلجھتی ہوئی ویٹنگ روم میں داخل ہوئی تو ملاقاتی کو دیکھ کر دروازے میں ہی ٹھٹک کر رک گئی۔

فل یونیفارم میں اونچا لمبا فوجی جوان اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے کچھ پریشانی سے مڑ کر چپراسی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں مگر وہ جا چکا تھا۔

''پلیز۔'' گمبھیر مردانہ آواز۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے صوفے کی طرف

بیٹھنے کا اشارہ کیا تو اس نے اپنے اوپر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''معاف کیجئے گا، میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔''

''آپ مجھے کیسے پہچان سکتی ہیں، جبکہ آپ نے مجھے پہلی بار دیکھا ہے۔'' اس کے لبوں پر گہری مسکراہٹ تھی۔

''پھر؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بیٹھ گئی۔

''وہ دراصل.....'' وہ کیپ ہاتھ میں پکڑ کر کچھ سوچنے لگا۔

''آپ بیٹھ تو جائیں۔'' اس نے جم کر کھڑی عشنا سے کہا۔

''جی نہیں، شکریہ۔ آپ بتائیں، کون ہیں؟ اور مجھ سے کیا کام ہے؟'' اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔

''اصل میں بات خاصی طویل ہے، میں سمجھاؤں گا تو آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی، اس لئے۔'' وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پہلے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا، پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ''اوہ، یہ پڑا ہے۔'' سائیڈ چیئر پر پڑے لفافے کو اس نے جلدی سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ یہ پڑھ لیجئے گا، آپ کو ساری بات سمجھ میں آجائے گی۔ ایک بار نہیں، کم از کم تین چار بار۔ پھر کچھ فیصلہ کیجئے گا۔ میں کل اسی وقت آؤں گا جواب لینے۔'' اس نے لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے اُلجھن بھری نظروں سے لفافے کو دیکھا۔

''کھول کر پڑھیں گی تو پتہ چل جائے گا۔ کم از کم تین چار بار ضرور پڑھئے گا، میری آپ سے درخواست ہے۔'' وہ پھر بولا۔

''مگر یہ ہے کیا؟ اور آپ کون ہیں؟'' وہ پریشان ہو گئی۔

''یہ کسی کا حالِ دل ہے اور مجھے کیپٹن یاسر شیرازی کہتے ہیں۔ پیشہ میرا مسیحائی ہے اور ملازم میں پاکستان آرمی کا ہوں۔ باقی سب کچھ اس میں لکھا ہے۔ اب اجازت دیں۔'' وہ دروازے کے قریب رک کر بولا، اس پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور باہر نکل گیا۔

اس کے باہر نکلتے ہی اس نے پھر لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ لفافے کا منہ گم سے بند تھا۔ خیر اس وقت تو ابھی دو پیریڈ باقی ہیں، ہوسٹل جا کر دیکھوں گی۔ اس نے سوچتے ہوئے لفافے کو ہینڈ بیگ میں رکھا اور باہر نکل گئی۔

پھر دوپہر میں لیٹنے سے پہلے اس نے لفافہ بیگ سے نکالا اور کھول کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ رجسٹر سائز کے دو پیپرز تھے۔ تبھی لفافہ اتنا وزنی تھا۔ سوچتے ہوئے پڑھنے لگی۔

''عشنا!

السلام علیکم!

تم حیران ہو گی کہ اتنی بے تکلفی سے مخاطب کرنے والا کون ہے؟ حالانکہ بے تکلفی کے القابات تو اور بھی بہت تھے جو دل میں مچل رہے تھے مگر فی الحال صرف نام پر اکتفا کر رہا ہوں۔ اور رہا ''تم'' کہہ کر مخاطب کرنا تو اب تک دل میں تم سے اتنی باتیں کر چکا ہوں کہ آپ جناب کی ساری دیواریں منہدم ہو چکی ہیں۔ یہ باتیں تو بعد میں ہوں گی، پہلے میں اپنا تعارف تو کرواؤں۔ بلکہ تعارف کے لئے صرف دو لفظ کافی ہوں گے اور تم مجھے فوراً پہچان لو گی۔ نہیں سمجھیں؟ تو پھر کہو، ونس مور۔''

اُس کا دل دھڑکنے لگا۔

''بالکل ٹھیک پہچانا۔ میں وہی ہوں۔ سیمی سائیلنٹ کالز (نیم خاموشی) والا۔ بات کہاں سے شروع کروں؟ اگرچہ ابتدا یہیں سے ہوتی ہے اور تمہارے لئے کیا، جو بھی سنے گا حیران ہو گا۔ پہلی نظر کے عشق و محبت کے چرچے تو اس دنیا میں بڑے عام ہیں مگر پہلی بار کسی کی آواز سن کر مبتلائے عشق ہو جانا یقیناً اچنبھے کی بات ہے۔ اس روز مجھے کراچی کے لئے فلائٹ کا ٹائم معلوم کرنا تھا۔ تایا جان نے مجھے کراچی بلوایا تھا۔ میں نے تمہارے آفس کا نمبر ملایا۔ تمہاری آواز کے سحر نے جیسے مجھ پر کوئی جادو سا کر دیا۔ حیران کن حد تک مقناطیسیت تھی کہ میں اس کے اثرات سے اندر تک گھائل ہو گیا۔ خواہش کے طور پر ونس مور کہا اور پھر جی چاہا کہ اس آواز کو سنتا رہوں۔ یہ کیا بھید تھا؟ میں چار کالز کر کے بھی نہ جان پایا اور تھوڑی دیر بعد تمہارے آفس میں تھا۔ وہاں چھٹی ہو چکی تھی۔

پھر اگلے روز۔ اس روز تمہاری نائٹ تھی۔ بہرحال چوتھے روز جا کر مجھے منتہائے مقصود ملا۔ میں عین تمہارے سامنے فہد کے ساتھ ایک گھنٹہ بیٹھا رہا۔ وہ میرے دوست کا کزن تھا۔ بہرحال باتوں باتوں میں کافی معلومات لے لیں۔ پہلے جو میں خود کو آواز پر مرمٹنے پر خود کو ڈانٹ رہا تھا، تمہیں دیکھ کر تم سے ملنے کا شوق بڑھ گیا۔ میں کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا کہ تایا جان کراچی سے آگئے۔

تایا جان میرا سب کچھ تھے۔ یعنی ماں باپ تو جنم دینے کے صرف چند ماہ بعد ہی ایک حادثے کا شکار ہو کر اس دنیا سے چلے گئے۔ میری پرورش تایا جان نے کی۔ بری بھلی، جیسی بھی کی، بہرحال انہوں نے مجھے اس مقام تک پہنچایا اور میرا رواں رواں ان

کے احسانوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ تائی جان کے متعصب روّیے کے باوجود میرے دل میں ان کا بڑا احترام تھا۔ کیونکہ جنم دینے والے سے زیادہ تو پالنے والے کا احسان ہوتا ہے۔ کیونکہ جنم دینے والی ماں نے تو چند ماہ کی تکلیف اٹھائی تھی، انہوں نے تو کئی سال مجھے پروان چڑھانے میں لگائے تھے۔ اس لئے میں ان کا کوئی بھی کہا نہیں ٹال سکتا تھا۔ جب میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا تو تایا جان نے اپنی بیٹی فرح کے لئے مجھے منتخب کرنا چاہا تو تائی جان کو اپنے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بھانجے کے سامنے تایا جان کے اس لیفٹیننٹ بھتیجے میں کوئی خوبی نظر نہ آئی۔ انہوں نے بڑی نخوت سے تایا جان کے فیصلے کو ٹھکرا دیا، فرح کی شادی وقار سے کر دی۔ میری کون سی اس سے دلی وابستگی تھی، جو میں خود کو روگ لگاتا؟ میں تو یہ سب تایا جان کی محبت میں کرنا چاہتا تھا۔

بہرحال، کچھ عرصے بعد میں لاہور آ گیا اور اس روز تایا جان میرے پاس آئے تو بہت رنجیدہ تھے۔ انہوں نے بتایا کہ فرح نے وقار سے طلاق لے لی ہے۔ کیونکہ ان کا پہلے سے کسی کے ساتھ سیریس افیئر تھا جو شادی کے بعد بھی قائم تھا، جسے فرح برداشت نہ کر سکی اور اس نے علیحدگی اختیار کر لی۔ بہرحال اب تایا جان مجھے لینے آئے تھے کہ میں فرح کی دلجوئی کا سامان کروں اور یہ کہ تائی جان مجھے بہت یاد کر رہی ہیں۔ ساری بات تو کسی عقل کے اندھے کو بھی سمجھ میں آ جانی تھی، مجھے کیوں نہ آتی۔ میں نے انہیں ٹال کر بھیج دیا کہ میں چند روز بعد آؤں گا۔ مجھے اپنا اس طریقے سے استعمال کرنا بے حد برا لگا۔ میں کوئی اسپیئر پارٹ تو نہیں تھا کہ جب مشینری میں خرابی پیدا ہوئی تو اس کو دور کرنے کے لئے مجھے استعمال کر لیا جائے۔ تائی جان کے دن رات بلاوے آنے لگے۔

لوگوں کے صبر کا یہ عالم ہے کہ نیکی کرتے ہیں اور اسی جہان میں اس کا اجر بھی چاہتے ہیں۔ اور اگر میرا دل تمہاری طرف مائل نہ ہوا ہوتا تو شاید مجھے یہ سب اتنا ناگوار نہ گزرتا۔ مگر اب میرے دل کی اپنی غرض بھی شامل ہو گئی تھی۔ عجیب دوراہے میں پھنس گیا تھا۔ تم سے مل کر تایا جان کے احسانوں کو بھی نہیں جھٹلا سکتا تھا۔ اسی کشمکش میں روز فون کرتا، اسی ارادے سے کہ بات آگے بڑھاؤں۔ مگر تمہاری آواز سن کر پھر ارادے کمزور پڑنے لگتے۔ تمہیں کسی قسم کا دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا اور نہ جھوٹی آس دلانا چاہتا تھا۔ کسی سے کوئی وعدہ کرنا، کوئی خواب دکھانا کچھ مشکل نہیں اور میرے لئے بھی مشکل نہیں تھا۔ مگر وعدے اور آس وقوع پذیر ہونے سے لے کر اس کے ٹوٹنے کا دورانیہ انتہائی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ لوگ وعدہ کر بیٹھتے ہیں، یونہی بات کہہ دیتے ہیں مگر پورا کرنا

اکثر بھول جاتے ہیں اور بھول کی یہ معمولی خطا کسی کو عمر بھر کے لئے بے اعتبار کر دیتی ہے۔ اور میں تمہارا اعتبار کھونا نہیں چاہتا تھا۔

اسی دوران سیاچن جانے کے لئے کچھ ڈاکٹرز کی خدمات طلب کی گئی۔ میں نے والنٹیرز میں اپنا نام شامل کروا دیا۔ کچھ عرصے کے لئے اس ٹینشن سے میں بھاگ جانا چاہتا تھا۔ جانے سے ایک روز پہلے تایا جان کو اطلاع کر دی۔

مگر افسوس، قرار تو وہاں جا کر بھی نہ آیا۔ یہاں کم از کم تمہاری آواز تو سننے کو مل جاتی تھی۔ وہاں زندگی کی عجیب صورت دیکھی۔ انسان کے وجود کو برف کیا جا سکتا ہے، مگر اس کے احساسات و جذبات کو برف کی سل کے نیچے بھی رکھ دیں، تو بھی وہ نہ صرف زندہ رہیں گے بلکہ طوفان اُٹھاتے رہیں گے۔ وہاں بھی جسم تو برف تھے مگر ذہن و دل میں جذبۂ جہاد نے جون جولائی کی سی گرمی اٹھا رکھی تھی۔ سب سے پُرلطف موت شہادت کی ہے کیونکہ اس سے ملنے کے لئے وہاں پہ بڑی گرمجوشی پائی جاتی ہے۔ فرائضِ منصبی تو انجام دے ہی رہا تھا مگر دھیان کی جنگ بھی جاری تھی۔ اور ایک رات تو اس کا نقطۂ عروج تھا۔ میں سوچتا کہ میں تمہیں کچھ تو کہہ کر آتا۔ کچھ بھی وعدے کی زنجیر جو تمہیں پابند کر سکتی۔ اور اس دوران اگر وہ کچھ ہو گیا، جسے سوچ کر ہی میری روح جسم سے بچھڑتی ہوئی محسوس ہوتی تھی تو کیا ہو گا۔ میرے تصورات اب تمہارے وجود سے اس قدر آباد تھے کہ سردی گرمی کا احساس مٹ گیا تھا۔ اتنی شدت سے کسی نے کسی کو نہ سوچا ہو گا۔

اس رات..... ہاں، بیس اگست کی رات تھی جب آسمان پہاڑوں سے گلے مل رہا تھا۔ میں نے پورے خشوع و خضوع سے دعا مانگی کہ جب میں یہاں سے سرخرو ہو کر جاؤں، تم صرف میری منتظر ہو۔ اس رات آسمان سے برف کے ساتھ میری روح پر یقین کا نزول ہوا تھا کہ میری دعا قبول ہو گئی ہے۔

'بیس اگست وہ نکاح والی تاریخ تھی۔' اُس نے سوچا۔

بس اس یقین کے بعد باقی کے دن بہت اچھے گزرے۔ پھر میرا جسم موسم کی شدتوں سے گھبرا کر بیمار پڑ گیا، روح اسی طرح ہشاش بشاش تھی۔ بہرحال مجھے میدانی علاقے میں تعینات کر دیا گیا۔ پہلے پنڈی سی ایم ایچ علاج کے بعد میں لاہور اور اب سرگودھا۔ اور لاہور میں تمہاری تلاش میں کہاں کہاں نہیں پھرا، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ تمہاری دوست تنزہ کے گھر دو بار گیا مگر وہ گھر پر نہ ملی۔ بہرحال، کل وہ مجھ ملی، ساری تو نہیں مگر چیدہ چیدہ باتیں جان کر خاصی حیران ہوئی۔ اس نے مشکلوں سے تمہارا

ایڈریس دیا۔ یہ جان کر حیرت ہوئی کہ تم اس شہر میں تھیں اور میں ہر ویک اینڈ پر لاہور بھاگا جاتا تھا۔

یہ ساری داستان لکھنے کا مقصد اپنے جذبات کی کیفیت سے تو تمہیں آگاہ کرنا ہی تھا، یہ بھی بتانا تھا کہ میرے ارادوں کو یقین کی مہر لگ چکی ہے۔ جس طرح پھولوں کے لئے خوشبو کا وجود لازم ہے، اسی طرح میرے لئے تم ناگزیر ہو۔ اب اس سے زیادہ اور کیا لکھوں اور کہوں؟ کل میں پھر آؤں گا مگر صرف ہاں کے لئے۔ اور ہاں، اس یقین کے سلسلے میں میرا گواہ اور ضامن صرف میرا خدا ہے۔

یاسر شیرازی۔"

خط تھا یا عجوبہ روزگار۔ وہ کتنی دیر اسے ہاتھ میں لے کر بیٹھی رہی۔ کیا ایسے بھی ہو سکتا ہے؟ اس طرح کی محبت تو اب افسانوں اور ناولوں میں بھی نہیں ملتی کجا کہ حقیقی زندگی میں۔ ویری اسٹرینج۔ (بہت عجیب)

'پتہ نہیں، کون ہے، کون نہیں؟' اس نے سوچا۔

'نہیں، اب تم یہ نہیں کہہ سکتیں۔' اس کے دل میں کوئی بولا۔

'میں کیسے یقین کر لوں؟ ایسی محبت دیکھی نہ سنی۔' وہ اُٹھ کر کھڑکی کے پاس آ گئی۔

'محبت تو محسوس کی جاتی ہے۔ نہ دیکھی جا سکتی ہے نہ سنی جا سکتی ہے۔ میری محبت کو اپنے دل میں محسوس کرو۔' پھر کوئی بولا۔

وہ پھر آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اُلجھتی ہوئی نظروں سے خط کو دیکھا اور پھر اُٹھا کر پڑھنے لگی۔ آدھا پڑھ کر رکھ دیا۔ ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔

'کس کو دکھاؤں؟ کس سے مشورہ کروں؟' اُسے اپنی بے بسی پر رونا آیا۔

'ارے بے وقوف! یہ سب مذاق ہے اور تم سچ سمجھ بیٹھیں۔'

'اپنے دل سے پوچھو کیا، کیا واقعی یہ مذاق لگتا ہے؟' وہ مسکراتا ہوا اس کے سامنے آ گیا۔

اس نے جھنجلا کر خط میز پر پٹخا اور دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔

❖❖○❖❖

اگلے دن چھٹی تھی۔ رات بھر اسے ٹھیک سے نیند بھی نہیں آئی۔ دن چڑھ آیا تھا۔ ماسی ناشتے کا پوچھنے آئی تو اس نے منع کر دیا۔ رات بھر کی بے آرامی نے اسے تھکا دیا تھا۔ اس نے چور نظروں سے کرسی پر پڑے خط کو دیکھا اور پھر منہ دوسری طرف کر لیا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی تو وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کون ہے؟" اس نے بیزاری سے کہا۔

"میں ہوں مس صاحبہ!" ماسی دروازے سے اندر آ کر بولی۔ "وہ جی، یہ بی بی! آپ سے ملنے آئے ہیں۔ میں نے کہا، میں اطلاع کرتی ہوں اور....."

"ارے ہٹو، تم کیا اطلاع کرو گی۔ مس صاحبہ ہوں گی تمہاری۔" تنزہ اُس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے اندر آ گئی۔

"یہ تم پوستیوں کی طرح ابھی تک بستر میں پڑی ہوئی ہو۔ چھٹی کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی سارا دن بستر میں گزار دے۔" وہ اس کے قریب آ کر زور سے بولی۔

"تم کب آئیں؟..... مجھے یقین نہیں آ رہا۔" وہ اس سے گلے ملتے ہوئے بولی۔

"تمہیں یقین دلانے ہی تو آئی ہوں۔"

"کس بات کا یقین؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہے ایک بات۔" اس نے ٹالتے ہوئے کہا۔ "مجھے لگتا ہے، تم نے ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا۔ ہے نا؟"

"ہاں بس، جی نہیں چاہ رہا تھا۔" اس نے سستی سے کہا۔

"جی کو کیا ہو گیا؟ آہا، یہ کس کا خط ہے؟" اس نے جھپٹ کر کرسی سے خط اٹھایا۔

"تنزہ! بری بات، کسی کا خط نہیں پڑھتے۔ لاؤ دو مجھے۔" اس نے خط لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"تم کسی نہیں ہو۔ ماسی! تم پلیز دو کپ چائے، ساتھ میں اپنی مس صاحبہ کے لئے کچھ لے آنا۔ میں صرف چائے پیوں گی۔" اس نے دروازے میں کھڑی ماسی سے کہا اور کرسی پر بیٹھ کر آرام سے خط پڑھنے لگی۔ عشنا کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر باتھ روم کی طرف چل دی۔ ہاتھ منہ دھو کر باہر نکلی تو وہ ابھی تک خط پڑھ رہی تھی۔ عشنا بال کھول کر برش کرنے لگی۔

"ہوں!" اس نے خط پڑھ کر گہرا سانس لیا۔ "میں نے نہیں کہا تھا، بڑا مستقل مزاج بندہ ہے۔ تمہارے لئے سوٹ ایبل بھی۔"

"بکو نہیں۔ مجھے پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ بھلا ایسا بھی کہیں ہوتا ہے؟" وہ اس کے قریب آ بیٹھی۔

"ہوتا تو نہیں مگر ایسی انہونی بھی نہیں۔ اور یہ سائنٹفک دور ہے۔ محبت کرنے کے

نئے نئے طریقے ایجاد ہو چکے ہیں، کم خرچ بالانشیں۔ اور یہ تمہارے مجنوں صاحب نے تو مجھے مروانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ پرسوں مجھ سے ملنے آئے۔ اس سے پہلے بھی شاید دو تین بار آئے تھے، میں گھر پر نہ ملی۔ پرسوں مجھ سے ملے، بڑی منتیں کیں تو میں نے بھی بڑا ستا کر اُنہیں ایڈریس دیا۔ وہ نکل کر گیا تو سکندر صاحب آ گئے۔ نوکر سے پوچھنے لگے، کون آیا تھا؟ اس نے کہہ دیا، کوئی فوجی صاحب ہیں۔ پہلے بھی بی بی کا پوچھنے تین چار بار آئے تھے، میں نے کہا بھی کہ صاحب سے مل لیں۔ کہنے لگے نہیں، بی بی سے ملنا ہے۔ آج بھی ان سے ملے ہیں۔ اس رحمت کا تو دیکھنا میں کیا حشر کروں گی۔'' وہ دانت کچکچا کر بولی۔ ''سارا فساد اُس کی چغل خور طبیعت نے پھیلایا۔ جب شک کرنے کا وقت تھا، میں نوکری کرتی تھی، اس وقت شک کیا نہیں اور اس فضول سی بات پر جرح کرنے لگے۔ مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے بھی کچھ نہ بتایا۔ اور اگر بتاتی تو انہوں نے تمہیں غلط سمجھنا تھا۔ بس لڑائی ہو گئی اور میں غصے میں نکل آئی۔ پہلے خیال تھا، پاپا کی طرف جانے کا۔ پھر سوچا، مجنوں سیدھا تم تک پہنچے گا، اس لئے تمہاری مدد کو پہنچ گئی۔ رات آئی تھی خالہ کی طرف، اب اُٹھتے ہی ادھر آ گئی ہوں۔'' اس نے تفصیل سے بتایا۔

''اور سکندر بھائی؟''

''وہ شام میں ہی مجھے ڈھونڈنے نکل پڑے ہوں گے۔ اُن کی تم فکر نہ کرو۔''

''وہ خفا ہوں گے تنزہ!'' اس نے پریشانی سے کہا۔

''وہ نہیں خفا ہوتے۔ اور یوں بھی خفا ہونے کا حق میرا ہے۔ نفرت ہوتی ہے ان مردوں کی گھٹیا ذہنیت پر۔ ذرا سی بات پر چراغ پا ہو گئے۔ چھوڑو تم۔ لو، چائے آ گئی۔ پہلے ناشتہ کر لو، پھر سوچتے ہیں۔'' اس نے ماسی کے ہاتھ سے ٹرے پکڑ کر دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

''پھر کیا فیصلہ کیا تم نے؟'' تنزہ نے چائے پیتے ہوئے سوچا۔

''میں کیا فیصلہ کروں؟ بات بالکل ناقابل یقین ہے۔''

''اور میں کہتی ہوں، ہنڈرڈ پرسنٹ پیور ہے۔ دیکھو نا، یہ اس کا یقین ہی تھا جس نے تمہیں عین نکاح کے وقت گھر سے بھگا دیا۔ ورنہ عثمان بھائی کا خط ایک گھنٹہ یا ایک دن بعد بھی آ سکتا تھا، تم کیا کر لیتیں؟ دعائیں دو اس بے چارے کو، وہاں پہاڑوں پہ بیٹھ کر تمہارے لئے وظیفے کرتا رہا ہے۔''

''تنزہ!'' وہ غصے سے اسے گھورنے لگی۔

''دیکھو نا، اتنا ثابت قدم آج کل کون ہوتا ہے؟ پھر اس نے سب کچھ تو خط میں لکھ دیا ہے۔''

''اس نے لکھا ہے نا، ہمیں کیا خبر سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے۔''

''سچ اور جھوٹ کا پتہ لگانا تو واقعی مشکل ہے، مگر پھر بھی ہم ساری معلومات اکٹھی کریں گے۔ پاپا سے کہوں گی، ان کے دوست کرنل مجید کا بیٹا کیپٹن ہے، وہ ساری انفارمیشن اکٹھی کرے گا۔ اس کی تم فکر نہیں کرو۔ تم مجھے اپنے دل کی رائے بتاؤ، وہ کیا کہتا ہے؟''

''میں پہلے کب دل کے فیصلوں پر چلی ہوں، اب تک تو۔'' اُس کی آواز بھرا گئی۔

''دیکھو عشنا! کوئی نہ کوئی فیصلہ تو تمہیں بہر حال کرنا ہی ہے۔ پھر یہی کیوں نہیں؟ وہ تمہارا سچے دل سے طلب گار ہے۔ اسٹیبل ہے۔ کم از کم لالچی تو نہیں ہوگا۔''

''بی بی جی! کوئی صاحب آئے ہیں مس صاحبہ سے ملنے۔'' ماسی نے اطلاع دی۔

''وہی ہوگا۔ چلو چلتے ہیں۔'' تنزہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

''نہیں، میں نہیں جا سکوں گی۔ تم جا کر بات کر لو۔'' عشنا نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

''واہ کیا بات ہے۔ وہ تم سے ملنے آیا ہے اور بات میں کروں۔ اُٹھو تم۔'' اس نے رعب سے اس کا ہاتھ پکڑا۔

''پلیز تنزہ!'' اس نے ملتجی لہجے میں کہا۔

''اچھا بابا! میں ہی بات کر لوں گی۔ تم آؤ تو سہی۔'' اس نے اسے کھڑا کیا۔

''تم..... تم کیوں آئے ہو؟'' سکندر کو ویٹنگ روم میں دیکھ کر وہ اونچی آواز میں چلائی۔

''آہستہ بولو۔ یہ تمہارا ڈرائنگ روم نہیں۔'' اس نے جواباً کہا۔

''السلام علیکم سکندر بھائی!''

''وعلیکم السلام۔ کیا حال ہے عشنا!'' سکندر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''تھوڑی سی سلام دعا اپنی دوست کو بھی سکھا دو۔''

تنزہ اُسے گھورنے لگی۔

''اچھا اب بیٹھ تو جاؤ۔'' اس نے منہ پھلا کر کھڑی تنزہ سے کہا۔

''بیٹھ جاؤں گی میں۔ مگر تم چلتے پھرتے نظر آؤ۔'' وہ اسی تندی سے بولی۔

''تنزہ! ایسے بات کرتے ہیں؟'' عشنا نے اسے جھاڑا۔

''ایسوں سے ایسے ہی بات کرتے ہیں۔''

''اچھا بیٹھو تو سہی۔'' اس نے بازو پکڑ کر اسے بٹھایا۔

''مس صاحبہ! کوئی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔'' چپراسی نے اندر آ کر وزیٹنگ کارڈ عشنا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

تنزہ نے جلدی سے کارڈ لے کر پڑھتے ہوئے کہا۔ ''بھیج دو انہیں اندر۔''

عشنا گھبرا گئی۔

''کچھ نہیں ہوتا۔ کھا نہیں جائے گا تمہیں۔'' وہ سکندر کا غصہ اس پر اتار رہی تھی۔

یہ تم دونوں کیا کھسر پھسر کر رہی ہو؟ کون آیا ہے؟'' سکندر نے دونوں کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''السلام علیکم۔'' اندر آنے والے کے سلام پر سکندر نے مڑ کر دیکھا۔

''ارے یاسر! تم۔'' وہ اسے دیکھ کر خوشی سے چلایا۔

''سکندر! تم یہاں؟'' نو وارد بھی حیرت سے بولا۔ دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔

''چلو، یہاں معاملہ اور آسان ہو گیا۔'' تنزہ نے اس کے کان میں کہا۔

''میرا خیال ہے تعارف کی ضرورت تو نہیں۔'' یاسر نے مسکراتے ہوئے دونوں کو دیکھا۔

''جی آپ کا تعارف مجھے پہلے ہی خاصا مہنگا پڑا ہے۔'' اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے سکندر کو گھورا۔ ''یہی تھے وہ صاحب جو پرسوں مجھ سے ملنے آئے تھے، عشنا کا ایڈریس معلوم کرنے۔'' اس نے جتا جتا کر سکندر کو بتایا۔

''ہاں تو میں کون سا پوچھ رہا ہوں؟'' سکندر نے کھسیاتے ہوئے کہا۔

''یار! یہ میری وائف ہیں۔ ان سے تو تم مل ہی چکے ہو گے۔'' اس نے بادل نخواستہ تنزہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم دونوں اسکول لائف سے ایک دوسرے کے دوست رہے ہیں۔ پھر بیچ میں اس کے تایا جان کراچی چلے گئے تو کافی گیپ آ گیا۔ اس کے بعد بھی ملتے رہے ہیں۔ کچھ عرصہ سے رابطہ منقطع تھا۔'' سکندر نے بتایا۔

''تم نے مجھے اپنی شادی پر نہیں بلایا۔''

''تم یہاں ہوتے تو ضرور بلاتا۔'' اس نے جواباً کہا۔ ''اب میں پوچھ سکتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے بیگم صاحبہ!'' سکندر نے لہجے کو مسکین بناتے ہوئے کہا۔

''میں بتاتا ہوں۔'' یاسر نے اجازت طلب نظروں سے تنزہ کی طرف دیکھا۔

''جی نہیں، آپ خاموش رہیں۔ میں بتاتی ہوں۔'' پھر اس نے مختصراً سکندر کو ساری بات بتائی۔

''مسئلہ رضامندی کا ہے۔ یاسر تو جیسا کہ ان کی حالت سے ظاہر ہے، سر تا پا ہاں ہیں۔ البتہ عشنا کو ان کا کوئی خاص اعتبار نہیں۔'' اس نے عشنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا..... ابھی بھی میرا اعتبار نہیں؟'' وہ چلایا۔ ''اتنے مہینوں سے خوار ہو رہا ہوں، اور اب جبکہ میں سکندر کا دوست بھی ہوں۔''

''سکندر کا دوست ہونا کوئی قابل اعتبار بات نہیں۔ مجھے تو ان پر بھی شک ہے۔'' اس نے سکندر کے غصے کی پروا کئے بغیر کہا۔

''کیا؟..... تمہیں تو میں گھر جا کر پوچھوں گا۔'' اس نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔

''اصل میں یاسر بھائی! عشنا کے والدین کا گھر ہے، تقریباً ایک کنال کا۔ وہ اس پر ان کے نام سے کوئی میموریل یا ٹرسٹ وغیرہ بنانا چاہ رہی ہے۔ یعنی وہ اپنی وراثت سے اپنی مرضی سے دستبردار ہونا چاہ رہی ہے۔ جبکہ آج تک جتنے پرپوزلز آئے ہیں، وہ سب اسی گھر اور بینک بیلنس کے لالچ میں آئے۔ یہ بات میں آپ پر ابھی واضح کر دینا چاہتی ہوں، اور اس کی آج تک اُلجھنوں کا کافی حد تک سبب یہ جائیداد بھی ہے جس کی عشنا تنہا وارث ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''مجھے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ اس نیک کام میں اگر میں بھی شامل ہو سکوں تو مجھے خوشی ہو گی۔ مجھے ان کے مال و دولت سے کوئی دلچسپی نہیں، یہ بات میں حلفیہ لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔ آپ مجھے نیکی کے اس مشن میں کسی طور بھی پیچھے نہیں پائیں گی۔ یہ البتہ نیکی کرنے سے گریزاں نظر آ رہی ہیں۔'' اس نے عشنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''دیکھیں نا، ایک یتیم و یسیر بندہ ان کے ساتھ کا طلب گار ہے اور یہ مسلسل انکار کر رہی ہیں۔'' اس نے شرارت سے کہا تو وہ دونوں ہنس پڑے۔

''میرا خیال ہے یہ والی نیکی تو آپ ایک دوسرے سے کر ہی ڈالیں تو اچھا ہے۔ کیوں عشنا؟'' اس نے عشنا کے جھکے ہوئے چہرے کی طرف دلچسپی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن اس کے باوجود آپ کو ایکسکیوز کرنا چاہئے۔ اگر آپ کوئی وعدہ کر کے گئے ہوتے تو میری دوست اس قدر مصیبتیں تو نہ اٹھاتی۔ دوسرے آپ نے فون کر کے بے چاری کا دم نکال دیا۔ اس کے لئے آپ کو معافی مانگنی پڑے گی۔'' تنزہ نے کہا۔

''میں سب احوال کہہ چکا ہوں، پھر ایکسکیوز کی کیا ضرورت؟''

''نہیں، ایکسکیوز تو آپ کو کرنا پڑے گا۔ اس کے بغیر بات آگے نہیں بڑھے گی۔'' اس نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب، یہ کنڈیشن ہے؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''جی یہی شرط ہے، سمجھ لیں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''چلو یار! کر لو۔ اسی بہانے میں بھی کر لیتا ہوں۔ ورنہ بعد میں تو میرے لئے اور بھی مشکل ہو جائے گی۔'' سکندر نے جلدی سے کہا۔

''اچھا چلو تم کہتے ہو تو۔'' اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ایکسکیوز می عشنا!''

''نہیں، اُردو میں کہیں۔ اور مسٹر سکندر! آپ بھی ساتھ بولیں ان کے۔'' تنزہ کے جی میں پتہ نہیں کیا سمایا تھا۔

''اُردو میں تو بہت مشکل ہے۔'' یاسر نے بے بسی سے کہا۔

''تو پھر ہم چلتے ہیں۔ چلو عشنا!'' وہ کھڑی ہو گئی۔

''اچھا ٹھیک ہے، ہم کوشش کرتے ہیں۔'' وہ جلدی سے بولا اور سکندر کو اشارہ کیا۔

''پلیز خواتین! ہمیں معاف کر دیں۔'' دونوں بیک زبان جلدی سے بولے۔

''ونس مور (ایک بار پھر)'' تنزہ نے شانِ بے نیازی سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' وہ دونوں چلّائے۔ لیکن تنزہ اور عشنا کے چہروں پر سجی مسکراہٹ دیکھ کر ان کی شرارت سمجھ کر ہنس پڑے۔

مئی کی گرمی کیسی جھلسا دینے والی ہوتی ہے مگر دل کے موسموں کا کیلنڈر کے موسموں سے کیا تعلق؟ باہر درختوں اور پودوں سے بہار رخصت ہو چکی تھی، مگر اس کے لئے تو بہار کا آج پہلا دن تھا۔ لمبی خزاں کے بعد بہار کا پہلا دن۔

(تمت بالخیر)